ساقی

دہلی

افسانہ نمبر

سنہ ۱۹۴۰ء

مُدیر

شاہد احمد دہلوی

قیمت ـــــــ ایک رو

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے اُن کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جرعات

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جلد ۲۲ — ساقی دہلی۔ افسانہ نمبر۔ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء — نمبر ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

پیشِ نظر افسانہ نمبر بڑی کاوش سے مُرتب کیا گیا ہے۔ افسانوں کے اعلیٰ معیار سے ہماری کاوش کا کچھ اندازہ آپ کو ہو سکے گا۔ ایسے افسانہ نمبر میں وہ مشہور افسانہ نگار بھی شریک ہوئے ہیں جنہوں نے ساقی میں اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان حضرات کے تعاون کی بدولت افسانوں کا ایک بے مثل مجموعہ ساقی کے افسانہ نمبر کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ خوش مذاق ناظرینِ ساقی ہر افسانے کو اپنے ذوق کے مطابق پائیں گے۔

افسانہ نمبر کے بہترین افسانے پر ہم نے سو روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن مضمون نگار حضرات کی کثیر تعداد نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور سو روپے کے انعام کو کئی حصّوں میں تقسیم کر دینے کا مشورہ دیا۔ بعض اِسی پر مُصر رہے کہ ایک ہی انعام سو روپے کا رکھا جائے۔ جب ہم نے اپنا فیصلہ کثرت رائے کے حق میں کیا تو قدرتاً ان حضرات کو ناراض ہو جانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ناراض ہو گئے۔ مگر ان ناراض ہونے والوں میں سے اکثر کو ہم نے منا لیا اور اُن کے افسانے اِس شرط پر ہمیں موصول ہوئے کہ مقابلے میں اُنہیں شامل نہ کیا جائے۔ چند مُستقل قلمی معاونین نے اس ہدایت کے ساتھ اپنے افسانے بھیجے ہیں کہ اُنہیں کسی رقم کے انعامی مقابلے میں شریک نہ کیا جائے۔ ایم۔ اسلم؛ لطیف الدین احمد اکبرآبادی؛ پروفیسر مُسلم؛ مرزا عظیم بیگ چغتائی؛ صادق الخیری دہلوی؛ علامہ مضحک دہلوی اور سید رفیق حسین اِس انعامی مقابلے سے علیحدہ ہیں۔

اڈیٹر ساقی نے دو اور حضرات کے مشورے سے مندرجہ ذیل دس افسانہ نگار حضرات کے افسانے انعام کے لئے منتخب کئے اور اُنہیں دس دس روپے کے انعامات بھیجدئے۔

(۱) کرشن چندر۔ ایم۔ اے؛ (۲) شاہد لطیف۔ بی۔ اے؛ (۳) راجندر سنگھ بیدی؛ (۴) سعادت حسن منٹو۔ (۵) اپندر ناتھ اشک۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (۶) احمد ندیم قاسمی۔ بی۔ اے؛ (۷) عصمت چغتائی۔ بی۔ اے؛ بی۔ ٹی؛ (۸) ظفر قریشی دہلوی۔ بی۔ اے؛ (۹) اشرف صبُوحی دہلوی اور (۱۰) ساون مل ترکھا؛

جُون کے ساقی میں جناب ماہر القادری کی جو نظم "صبحِ چمن" شائع ہوئی ہے اُس کا آخری شعر افسوس ہے کہ غلط شائع ہو گیا۔ کاتب نے "جھوم کر" کی بجائے "پھول کر" لکھدیا۔ ناظرینِ ساقی تصحیح فرما لیں۔ شعر اس طرح ہونا چاہیئے:۔

نظرِ پھول کو چُوم کر رہ گئی فضائے چمن جھوم کر رہ گئی

مولانا سید ابوالقاسم صاحب سرور کا قابلِ قدر مضمون "سوجھ بوجھ کے ڈھائی انچھر" اِس اشاعت میں ختم ہوتا ہے۔ آخری قسط اگست کے ساقی میں شائع ہونیوالی تھی لیکن شائقین نے اتنے طویل انتظار کو گوارا نہیں کیا۔ گزشتہ قسط مئی کے ساقی میں شائع ہوئی تھی۔ یہ قسط تاخیر سے موصول ہوئی تھی اِس لئے جُون کے ساقی میں شائع نہ ہو سکی۔ اب شائقین کے اصرار پر جولائی کے پرچے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ سید صاحب اُردو ہندی کشمکش پر اپنے طرزِ خاص میں آئندہ بھی حسبِ ضرورت تبصرہ فرما کر ناظرینِ ساقی کو مُستفید فرماتے رہیں گے۔

"شاہد"

جمالی

بعض اوقات حقیقتیں افسانوں سے زیادہ تعجب انگیز اور رومان خیز ہوتی ہیں۔

قدیر تعلیمیافتہ بھی تھا اور خوبصورت جوان بھی۔ بائیس تیئیس سال تک تو کامرانی اور شادمانی نے ہر منزل پر قدم چومے تھے۔ عزت، مرتبہ اور توقیر کا پرچم بخت یاور نے صبح بھی اور شام بھی ہر قدم پر بلند کیا تھا۔ جس خاندان سے اُسے نسبت تھی شہر میں وہ خاندان بھی چوٹی کا گھرانا متصور ہوتا تھا۔ وہ جس مجلس میں جا بیٹھتا لوگ تعظیم کرتے۔ اُس کی بات کا اعتبار کرتے۔ وہ بازار سے گزرتا تو سینے چلنے والے رشک کی نگاہ سے دیکھتے اور ہاتھ خود بخود سلام کے لئے اُٹھتے۔ لیکن کسی کو کیا خبر تھی کہ کسی روز ابلقِ ایام ایسی چال بھی چلنے لگے گا کہ نہ یہ رنگ رہیگا اور نہ یہ رونق!۔

چنانچہ جب قدیر کی بزمِ عیش اُجڑی تو شاید اس کی نیکیاں ہی کچھ آڑے آ گئیں۔ کہ وہ انگشت نمائی اور رسوائی سے محفوظ رہا۔ وہ لوگ جنہیں وہ اپنا سمجھتا تھا جب انہوں نے بیگانوں کا روپ بھرا تو اُمیدوں کے وہ تمام خوشنما قصر جو اُس نے بنا رکھے تھے گو مسمار تو ہو گئے لیکن دیکھنے والوں کی نگاہ نے کچھ ایسا دھوکا کھایا کہ بربادی کے اِس منظر پر بھی ظاہری شان اور وقار قائم ہی رہا۔ اور جس سراب نے لوگوں کو فریب نظر میں مبتلا کر رکھا تھا وہ طلسم ویسے کا ویسا ہی رہا اور سراب کی حقیقت سے کوئی آگاہ نہ ہوسکا۔ ہاں! قدیر اگر پست ہمت ہوتا تو شاید اس مصیبت میں اپنے ہی ہاتھوں اپنی ذلت کا سامان کر لیتا۔ لیکن اُسے جذبات پر قابو تھا۔ اس کے چلن، اس کے عمل اور اس کی خاموشی نے جھوٹے نگینوں کی آبداری کا راز کسی پر کھلنے نہ دیا۔

مطلع آسمان ابر آلود تھا۔ کسی کسی وقت نیلے نیلے بادلوں میں سے اس طرح بوندیں گرنے لگتیں جس طرح کسی دکھیا کی آنکھ سے آنسو ٹپک رہے ہوں۔ قدیر خاموش بیٹھا قدرت کے اس تغیر پر غور کر رہا تھا۔ چڑیا کا ایک جوڑا جس نے یہیں کہیں گھونسلا بنا رکھا تھا طاق پر بیٹھا ایک دوسرے سے اختلاط کر رہا تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی گو موسم کچھ اُداس اُداس سا تھا لیکن اس اُداسی میں بھی ایک لطف پنہاں تھا۔ ایک کیف تھا جو دل میں خود بخود گدگدی سی پیدا کر رہا تھا۔

"قدیر!" کسی نے باہر سے آواز دی۔

"آجایئے!"

آنے والا کالج کے وقتوں کا ایک دوست فیاض تھا۔ کبھی دونوں میں خوب گہری چھنتی تھی۔ لیکن آج وہ بہت دنوں بعد آیا تھا۔ رسمی خیر و عافیت کے بعد قدیر نے پوچھا "کیوں جناب! کب تشریف لائے آپ؟"

"بھئی!" فیاض نے ہنسکر کہا: "آئے تو دو چار روز ہو گئے"

"ٹھہرے کہاں؟"

"یہاں میرے ایک عزیز ہیں" فیاض نے جواب دیا "انہی کے پاس ٹھہرا ہوں"

"میں جو یہاں تھا" قدیر نے کہا۔

"مجھے الہام تو ہوتا نہیں" فیاض نے جواب دیا "اور خط کا جواب دینے کی تم نے قسم کھا رکھی ہے"

"ہاں!" قدیر نے کہا "خط تو دو ایک ....."

"دو ایک؟" فیاض نے بات کاٹ کر کہا "یا سات آٹھ؟"

"یاد نہیں" قدیر نے جواب دیا "اچھا معاف کر دو۔ بھول ہو گئی۔ چائے پیو گے؟"

"نہیں!"

"ناراض ہو گیا؟"

"بیشک!"

"معاف نہیں کرو گے؟"

"ایک شرط پر!"

"کیا؟"

"بس تیار ہو جاؤ" فیاض نے کہا "میں آج رات کی گاڑی سے جا رہا ہوں"

قدیر نے کچھ ایسے ہی سر ہلا دیا۔

فیاض بولا "نہ تم گونگے ہو نہ میں بہرا ہوں۔ بولو! تیار ہو"

"چلنے کو دل تو چاہتا ہے لیکن ....."

"لیکن کیا؟" فیاض نے پوچھا۔

اور قدیر نے ایک آہ بھر کر کہا :- ع

"رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!"

فیاض بولا۔ "اگر یہ خواہش ہے تو ابھی تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایسی سرزمین میں لے چلوں گا جس کی ہر چیز تصنع سے پاک اور معصومیت اور سادگی سے لبریز نظر آئیگی۔"

"فیاض!" قدیر کہنے لگا۔ "واقعی گاؤں جہاں تم رہتے ہو ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں تو بھائی تنہائی چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"وجہ ابھی مت پوچھو!"

"بہت اچھا" فیاض بولا۔ "اگر تمہیں تنہائی پسند ہے تو خدا کی قسم! میں تمہیں ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں میں بھی تمہارے پاس نہ رہ سکوں گا۔"

رات کی گاڑی سے دونوں روانہ ہوگئے۔

تمام رات کے سفر کے بعد دونوں ریگستانی علاقہ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اترے۔ سواری کے لئے اونٹ موجود تھے۔ فیاض کا گاؤں اسٹیشن سے کوئی پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اور قدیر آج تک اونٹ پر سوار نہ ہوا تھا۔ لیکن اونٹ کے بغیر اور کوئی سواری بھی نہ تھی۔ اونٹ پر سوار ہوتے ہوتے کوئی دس بار اس نے لاحول پڑھ ڈالی اور فیاض کا یہ حال کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ ساربان بھی مسکرا رہے تھے اور ساتھ کے ساتھ تسلیاں بھی دے رہے تھے۔ "گھبرایئے نہیں!۔ آپ گرینگے نہیں!۔ ایک پاؤں رکاب میں رکھئے اور پاکھڑا پکڑ کر سوار ہو جایئے۔"

خدا خدا کرکے قدیر اونٹ پر بیٹھ تو گیا لیکن جب اونٹ اٹھنے لگا تو اس وقت قدیر کی جو حالت ہوئی اُسے دیکھکر سب لوگ ہنسنے لگے۔

اونٹ کے گلے اور گھٹنوں پر پیتل کے گھنگھرو بندھے تھے۔ اونٹ کے چلنے سے گھنگھروؤں سے جو آواز پیدا ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی رقاصہ رقص کر رہی ہے۔

اسٹیشن سے نکلتے ہی وسعت نگاہ تک ریگستان تھا۔ کہیں ریت کے چھوٹے چھوٹے تودے، کہیں بڑے بڑے ٹیلے، کہیں کف دست میدان۔ سبزے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ جلی سوکھی جھاڑیاں تو پھر بھی کہیں نظر آجاتیں لیکن پیڑ بالکل ناپید۔ دکن کی جانب بے برگ و گیاہ پہاڑ تھے اور ان پر کچھ کہر سی چھائی ہوئی تھی اور فاصلہ پر ریل گاڑی کا دھواں کسی بیکس کی آہوں کی طرح فضا میں پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ قدیر جو اونٹ کی سواری سے پہلے کچھ خوفزدہ سا ہو رہا تھا، اب اطمینان سے بیٹھا ریگستان کی اس سحرانگیز خاموشی میں کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا اور فیاض جو اس کے عقب میں چلا آرہا تھا، اونٹ پر بیٹھا بڑے مزے سے الاپ رہا تھا ؎

کب ساربان اٹھائے　　اب کب مہار دیکھیں
ہم راہ تیری ظالم　　لیل و نہار دیکھیں
شفاف آنسوؤں میں　　روتے نگار دیکھیں
بچھڑوں کو کب ملائے　　پروردگار دیکھیں
راتیں گذر گئی ہیں
تارے شمار کرتے
ہم تم سے پیار کرتے　　تم ہم سے پیار کرتے

"خوب! بہت خوب!" قدیر نے اپنے اونٹ پر سے آواز دی۔

اور فیاض نے اپنا اونٹ برابر لاکر کہا۔ "شکر ہے! تم نے بھی آواز نکالی۔ اب ڈر تو نہیں لگتا؟"

"مرے یار!" قدیر نے ہنسکر کہا۔ "گرے بھی تو ریت پر ہی تو گریں گے۔"

اور ساربان نے ہنسکر کہا۔ "اطمینان رکھئے۔ گریں گے نہیں آپ۔"

نہ کوئی راستہ تھا نہ پگڈنڈی۔ ریت کے ٹیلوں کے نشان پر ہی ساربان اونٹ چلا رہے تھے۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد آبادی کے نشان ملنے لگے۔ یہاں وہاں کوئی اب پیڑ بھی نظر آنیلگا۔ کہیں فضا میں چیل بھی منڈلاتی دکھائی دینے لگی۔ کسی جھاڑی پر بھورے رنگ کا چڑیا کا ایک آدھ جوڑا بھی پھدکتا نظر آجاتا۔ کہیں کہیں ریتیلے میدانوں میں زمینداروں کی کھیتیاں بھی مل جاتیں لیکن امساک باراں سے کشت دہقان کسی فرسودہ ساماں کے دل کی طرح پژمردہ نظر آتی تھی۔ پھر کچھ اور آگے بڑھنے پر مکانات بھی نظر آنے لگے۔

"آگیا گاؤں؟" قدیر نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" ساربان نے جواب دیا۔ "شہر آگیا!"

"شہر یا گاؤں؟" قدیر نے پوچھا۔

اور فیاض اپنا اونٹ برابر لاکر بولا۔ "گاؤں نہیں شہر۔ پانچ

سات ہزار نفوس کی آبادی ہو۔ ایک کمی ہے تو پانی کی۔"

"پانی بہت گہرا نکلتا ہو گا؟" قدیر نے پوچھا۔

"کچھ اتنا گہرا بھی نہیں" فیاض نے جواب دیا۔ "مصیبت یہ ہے کہ پانی کڑوا نکلتا ہے۔"

"تو تم لوگ کڑوا ہی پانی پیتے ہو؟" قدیر نے تعجب سے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں!" فیاض نے ہنسکر کہا۔ "شہر میں چار، پانچ میٹھے پانی کے کنوئیں بھی ہیں۔"

اور ساربان نے کہا۔ "جناب! ہم ریگستان کے رہنے والے تو دس دس کوس سے پینے کا پانی لاتے ہیں۔"

یوں ہی باتیں کرتے کرتے آبادی میں پہونچ گئے۔ اس ریگستان میں واقعی یہ شہر ہی کہلانے کے قابل تھا۔ دو منزلہ سہ منزلہ پختہ مکانات بھی کثرت سے تھے۔ ایک خاصی بڑی مسجد بھی تھی جس کے میناروں کے گنبد سبز رنگ کی چمکدار اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ ایک مندر کا کلس بھی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دو تین سیدھے ٹیڑھے بازار بھی تھے۔ کہیں بہت کشادہ کسی جگہ بالکل ایک گلی سی ہو کر رہ گئے تھے۔ لوہار، موچی، بڑھئی اِن لوگوں کی دکانیں زیادہ تھیں ایک دو جگہ قلعی گر بھی بیٹھے برتن قلعی کر رہے تھے۔ بنیئے بھی توند نکالے ہاتھ میں کھجور کی سوکھی ہوئی شاخ پکڑے آٹا، تیل، وال بیٹھے بیچ رہے تھے۔ مٹھائی والوں کی بھی دو چار دکانیں تھیں۔ لیکن رونق بچوڑوں والے کی ہی دکان پر تھی۔ یہاں چھوٹے بڑے کپاس بکر پچوڑے خرید رہے تھے۔ کہیں پاس سے ہی آٹا پیسنے والی مشین کے انجن کی "بھاؤں بھاؤں" بھی سنائی دے رہی تھی۔

گاؤں والوں کے کچے مکان دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سب صاف اور ستھرے۔ گاؤں کے رہنے والوں کو مکان "لیپ پوت" کر رکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اکثر مکانوں کے دروازے پر اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ گلیوں میں مرغ اور مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ اور ایک آدھ چیل بھی مرغی کے بچوں کی تاک میں سر پر منڈلا رہی تھی۔ گاؤں کے باہر ایک راہٹ چل رہا تھا۔ راہٹ کی آواز میں موسیقی مستور تھی۔ دو چار عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور کتے بے فکری سے اِدھر اُدھر لیٹے یا بیٹھے ہر نووارد کا بھونک بھونک کر استقبال کر رہے تھے اور کچھ مزاج پرسی کرتے ہوئے دس بیس قدم تک ساتھ بھی دیتے تھے۔

شہر یا گاؤں کے مغرب کی جانب جہاں ایک مدرسہ، ڈاکخانہ، ہسپتال اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا بنگلہ تھا، پیپل کا ایک عظیم الشان درخت تھا۔ اس ریگستان میں یہ پیپل ایک اچنبے کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اس پیپل کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور مسجد کے ساتھ ہی میٹھے پانی کا ایک کنواں۔ اسی جگہ مالک فیاض خاں کی عالیشان حویلی تھی۔ حویلی کے نیچے کی منزل بنگلے یا کوٹھی کے طرز پر تھی۔ سب کمرے انگریزی طرز کے سامان سے آراستہ تھے۔ اسی جگہ فیاض خاں نے اپنے دوست قدیر کو ٹھہرایا تھا۔

قدیر کو یہاں آئے پانچ سات روز گذر چکے تھے۔ فیاض نے مہماں نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن قدیر یہاں بھی کچھ خاموش خاموش سا نظر آتا۔ صبح گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ پھر کھانا کھا کر کتاب جو لیکر بیٹھتا تو چائے کے وقت تک بیٹھا رہتا۔ ایک روز فیاض نے پوچھا۔ "یہ جگہ پسند بھی آئی؟"

"نہیں!" قدیر نے جواب دیا۔ "ایک شہر چھوڑا دوسرے میں آ بیٹھا۔"

"تو تمہیں پھر ویرانہ چاہیئے!" فیاض نے ہنسکر پوچھا۔

"جہاں تنہائی ہو" قدیر نے جواب دیا۔

"اور جہاں انسان کا نقش پا بھی نہ ملے" فیاض نے ہنسکر کہا۔

قدیر مسکرا دیا۔

فیاض بولا۔ "یہاں سے کوئی بارہ چودہ کوس پر ایک جگہ تو تمہارے ڈھب کی ہے۔ لیکن وہاں نہ سوسائٹی ہوگی نہ کچھ کھانے کو ملے گا۔ تازہ دودھ مکھن اور ساگ پات پر اگر گذارہ کر سکو تو میں تمہارے چلنے کا کل ہی انتظام کر سکتا ہوں۔"

"مہربانی!"

"لیکن میں تمہارے ساتھ نہ چل سکونگا" فیاض نے کہا۔

"اس کی ضرورت بھی نہیں۔"

"خود غرض تو تم ازلی ہو" فیاض نے ہنسکر کہا۔ "لیکن خیر! کوشش کروں گا کہ کبھی دسویں پانچویں تم سے ملنے آجاؤں۔"

"شکریہ!"

"میری تھوڑی سی اس جگہ ملکیت ہے۔ ایک زمیندار اسکے بچے اور شاید ایک دو اور آدمی وہاں رہتے ہیں۔ ایک کنواں بھی ہے اور تمہارے رہنے کو ایک صاف ستھری کوٹھری بھی مل جائے گی۔ چاہو تو ایک اونٹ بھی وہاں رکھ لو۔ ساربان خدمت بھی کریگا۔"

"ضرورت ہوگی تو منگوا لونگا" قدیر نے جواب دیا۔

"تو کل پکا ارادہ ہے؟" فیاض نے پوچھا۔

"انشاءاللہ!" قدیر نے جواب دیا۔

ادھر قدیر صبح کی نماز سے فارغ ہوا اُدھر اُس کے سفر کے لئے دو اونٹ آگئے۔ ایک تو لادو تھا دوسرے پر خوبصورت کجاوا پڑا ہوا تھا۔ ناشتہ کے بعد قدیر فیاض سے رخصت ہوا۔ صحرا کو مسجد کے پاس سے راستہ جاتا تھا۔ کئی ایک اللہ والے ابھی تک عبادت میں مشغول تھے۔ مسجد کے قریب ہی رہٹ چل رہا تھا اور اس سہانے وقت میں رہٹ کی دلکش آواز طائرانِ سدرہ کی ہمنوا معلوم ہوتی تھی۔ گاؤں والے زندگی کی کشمکش کیلئے ابھی سے تیار ہو رہے تھے۔

اُونٹ جب آبادی سے نکلے تو وسعت نگاہ تک ریت کا ایک خوبصورت میدان تھا۔ لیکن رات کی بزم اُجڑ جانے کے ماتم میں اس کا دامن بھی شبنم کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ہوا میں لطافت تھی اور منظر بے حد سہانا۔ ہر طرف ایک سکوت مسلط تھا جسے رہٹ کی آواز کبھی کبھی برہم کر دیتی۔ لیکن جوں جوں اُونٹ بستی سے دُور ہوتے جاتے تھے یہ آواز بھی ریت کے اس عظیم الشان میدان میں کھوتی جا رہی تھی۔ کہیں کف دست میدان تھا کہیں ریت کے ٹیلے تھے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور کہیں کہیں کوئی درخت عمر رفتہ کے غم میں سوگوار نظر آتا تھا۔ اُونٹوں کا قدم جو سُست اُٹھنے لگتا تو ساربان کی "شی" اُسے پھر تیز رو کر دیتی۔

کوئی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد جب آسمان کے مشرقی کنارے پر نوشتۂ سحر سونے کی قبا پہنے سنہری رتھ میں بیٹھا ہوا نمودار ہوا، تو ریگستان کا ذرہ ذرہ دم زندگی سے آشنا ہو گیا۔ اور شبنم کے آنسو جو کسی جھاڑی کے پتوں نے اپنے سینے میں چھپا رکھے تھے لعل و یاقوت کی طرح چمکنے لگے۔ اس وقت بستی گرد کارواں کی طرح آنکھوں سے اُوجھل ہو رہی تھی۔ قدیر اِن دلکش مناظر میں جو قدرت کے ترجمان معلوم ہوتے تھے، بالکل کھویا ہوا تھا۔ لیکن جب یہاں وہاں آبادی کے نشان نظر آنے لگے تو اُس نے ساربان سے پوچھا۔

"آگئی منزل؟"

"نہیں جناب!" ساربان نے جواب دیا "ابھی تو نصف سفر بھی نہیں کٹا"

***

آفتاب نصف النہار پر پہونچ چکا تھا اور ریگستان دریائے نور کی طرح چمک رہا تھا۔ بستیوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ کوئی ایک بجے کے قریب یہ چھوٹا سا قافلہ منزل پر پہونچا۔

بیری کے دو تین درختوں کے پاس زمیندار کا ایک مکان تھا۔ مکان سے کوئی سو ایک قدم کے فاصلے پر کنواں تھا۔ ایک مینڈا اس کی جورو، دو بچے اور ایک جوان لڑکی، دو چار ڈھور ڈنگر۔ دس پانچ بھیڑیں اور ایک اُونٹ کُل کائنات تھی۔ کنوئیں کے پاس گلاب کا ایک درخت تھا۔ اور ایک سُرخ رنگ کے پھول کو جس کی قسمت میں اس ویرانے کی رونق ہونا لکھا تھا، بادِ صحرا کے جھونکے جھولا جھلا رہے تھے۔ اور وہ جوان لڑکی جو حُسن و جمال میں اس پھول سے بھی زیادہ خوشنما تھی کنوئیں کے جگت پر بیٹھی جھانوے سے پاؤں رگڑ رہی تھی۔ درختوں کے سائے میں دو تین چارپائیاں پڑی تھیں۔

ساربان نے اُونٹ اُسی جگہ بٹھا دیا۔ قدیر اُونٹ سے اُتر کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ قدیر کا سامان ایک کوٹھڑی میں جو دوسری دو کوٹھڑیوں سے ذرا الگ تھی رکھ دیا گیا۔

زمیندار ساربان سے یہ معلوم کر کے کہ یہ نووارد اُن کے ملک کا دوست اور مہمان ہے پاس آ بیٹھا اور پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا "جمالی! اُٹھو خانصاحب کیلئے روٹی لاؤ"

جمالی جھانواں وہیں چھوڑ کر گھر کی طرف چلی گئی اور ایک چنگیری میں مکھن تھوڑی شکر اور دو روٹیاں اور کٹورے میں لسی لیکر آئی۔ اور چنگیری قدیر کے سامنے رکھکر پھر کنوئیں پر جا بیٹھی۔

ساربان اُونٹوں کے آگے بھوسہ ڈال کر زمیندار کے گھر جا بیٹھے۔

***

قدیر کو اس جگہ آئے بہت دن گذر چکے تھے۔ ایک دو بار فیاض بھی پھیرا کر گیا تھا لیکن وہی۔ ع

صبح آئے گئے شام سدھار!

لیکن ریگستان کی زندگی یا فضا قدیر کو خوب راس آئی۔ اسکا وقت کا بہت سا حصہ اس کی آرزو کے عین مطابق کہ ع

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو!

گذر رہا تھا۔ کبھی جو وہ صبح ناشتہ کر کے نکلتا تو شام کو لوٹتا اور کبھی شام کا گیا نصف شب کے قریب واپس آتا۔ جمالی جو اس ویرانے میں اس پھول کی طرح تھی جو اپنے رنگ و بو کی سحر آفرینیوں سے ناآشنا ہو اُس کی خدمت پر مامور تھی۔ لیکن قدیر کے تفکرات نے اُسے کبھی

فرصت ہی نہ دی جو ن کبھی حسنِ قدرت کی اس دلکش اور جیتی جاگتی تصویر کی طرف متوجہ ہو۔ قدیر کو جب واپس آنے میں دیر ہوتی تو جمالی ریت کے کسی ٹیلے پر کھڑی ہو کر اچک اچک کر اُس کی راہ دیکھتی۔ قدیر جو کبھی سرِ شام ہی واپس لوٹ آتا تو عموماً جمالی کو ہاتھ پر گال رکھے، سر ایک طرف کو جھکائے، مغرب کی طرف منہ کئے خاموش بیٹھے دیکھتا۔ لیکن وہ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کر گھر کی طرف چل جاتی۔

ایک روز وہ اسی طرح خاموش سی بیٹھی تھی کہ عقب سے قدیر بھی کہیں آنکلا۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر بولا "جمالی! تمہیں سورج کو ڈوبتے دیکھنے میں بہت لطف آتا ہے؟"

"سورج کے ڈوبنے میں کیا رکھا ہے" جمالی نے جواب دیا۔

"اگر نہیں رکھا" قدیر نے پوچھا "تو پھر تم عموماً یوں بیٹھی کیا دیکھا کرتی ہو؟"

"اس طرف دریا جو ہے" جمالی نے جواب دیا۔

"دریا ہے تو سہی!" قدیر نے جواب دیا "لیکن وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے"

"سُنا ہے" جمالی نے ذرا مسکرا کر کہا "دریا کے پار بڑے بڑے نگر آباد ہیں"

"شہر دیکھنے کو تمہارا دل بھی چاہتا ہے؟" قدیر نے پوچھا۔

"چاہتا بھی ہو تو پھر کیا؟" جمالی نے جواب دیا۔

شفق کی سُرخی کائنات پر پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ دیکھنے میں تو دو لالے کے پھول تھے لیکن دونوں پژمردہ!

رات کا وقت تھا اور بامِ فلک پر نور پاش تاروں نے بزمِ مہتابی جما رکھی تھی۔ قدیر اپنے مسکن سے کچھ فاصلہ پر ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھا اپنی حالت پر غور کر رہا تھا۔ حالات بہت مایوس کن تھے، اور اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ قدیر کہیں کام وغیرہ تلاش کرے۔ یوں بیکار بیٹھے رہنا تو ہمت کی پستی کی دلیل تھی۔ جو چیز سب سے زیادہ سوہانِ رُوح ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی محرمِ راز بھی تو نہ تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکے اور جو جھوٹی سچی تسلی دے سکے۔ آج وہ بہت دیر تک انہی خیالات میں پریشان رہا۔ حتیٰ کہ مہرِ منیر آسمان کے مشرقی محلسرا سے نمودار ہوا۔ ریگستان کا ذرّہ ذرّہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔ ہوا میں اب کافی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ نیچے کی کھائیوں میں دو چار تلور جو انسان کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں، اس وقت ایک دوسرے سے اختلاط کرتے ہوئے اُس کے بالکل قریب آگئے۔ چاندنی میں اس ریگستانی مخلوق کے پروں کی میناکاری کتنی خوبصورت اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ دو نر تھے دو مادہ۔ جدھر مادئیں جاتیں نر پیچھے ہو لیتے۔ کتنا دلکش خرام تھا، اور کیا آزادی کے ساتھ ویرانوں میں گھوم رہے تھے۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ قدیر اب واپس لوٹا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے قدموں کے نشان سے ذرا ہٹ کر کسی اور کے نقشِ پا بھی ہیں، حیران ہو گیا۔ جب وہ اپنے ڈیرے پر پہونچا تو جمالی جس کا حُسن و جمال چاندنی میں کندن کی طرح چمک رہا تھا، ابھی تک جاگ رہی تھی۔ آج رات قدیر کو نیند نہ آئی۔ اس وقت اُسکے خیالوں کی دُنیا جمالی نے آباد کر رکھی تھی۔

کچھ روز اسی طرح گذر گئے۔ قدیر کا دستور تھا جس طرف ایک روز جاتا دوسرے روز اُدھر نہ جاتا۔ بلکہ کوئی اور ہی راستہ اختیار کرتا۔ لیکن اکثر اپنے نقشِ پا کے ساتھ ساتھ واپسی کے وقت کسی اور کے قدموں کے نشان بھی ریت پر نظر آتے۔ قدیر خوب سمجھتا تھا کہ جمالی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو رات کی تنہائی میں اس کی تلاش میں آئے۔ لیکن جمالی تو مٹی کا ایک خوبصورت بت تھی۔ جو بن بلائے بات تک نہ کرتی تھی۔ اور غالباً جمالی کی یہی خاموشی اور سادگی اور شاید ہمدردی یا محبت قدیر کے خیالوں میں بھی ایک تغیر سا پیدا کر رہی تھی۔

لیکن قدیر غریب تھا۔ غریب! لیکن اس غربت کا راز صرف اُس کے سینے میں ہی مستور تھا۔ جمالی حسین تھی، معصوم تھی، اور وہ جبر فضا میں پل کر پروان چڑھی تھی بظاہر اس میں خوش بھی تھی اور قانع بھی۔ اتنی حسین، اتنی سادہ اور معصوم حسینہ کو غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا مردانگی سے بعید تھا لیکن شاید یہ خیال قبل از وقت تھا۔ آہو کو کھلی فضا اور خوبصورت رستے ہی پسند ہوتے ہیں۔ شہروں کی آب و ہوا اسے راس نہیں آتی۔ بن کی چڑیا بن میں ہی خوش رہتی ہے اور پنجرے میں بند ہونا کبھی پسند نہیں کرتی۔ یہ سب استدلال درست تھے۔ لیکن قدیر کا دل اب کچھ اور ہی اُسے مشورہ دے رہا تھا۔ پوچھنے میں تو کچھ حرج نہیں! زیادہ سے زیادہ انکار۔ انکار! لیکن یہ تو بہت تلخ لفظ تھا۔

قدیر کے دل میں اُلجھن بھی تھی اور طبیعت بھی پریشان تھی

وہ صبح سے اپنی کوٹھری میں بند تھا۔ بہت ہوا تو کسی وقت اٹھ کر کنوئیں پر جا بیٹھا۔ کبھی بیری کے نیچے کھڑا ہوا اور کوئی شاخ پکڑ کر ہلانے لگا۔ جمالی زمیندار کے ... بھی بچی چھپ رہی تھی۔ وہ صبح سے ہی آج گھر کے کام دھندے میں مصروف تھی۔ ابھی اسے پانی بھی بھرنا تھا۔ اپنی مرغیوں کو بھی ڈربے میں بند کرنا تھا۔ بھیڑ کا ایک بچہ جو اس سے بہت مانوس تھا اس کی پیڑھی کے پاس کھڑا "بیں بیں" کر رہا تھا۔ جمالی چکی پیستے پیستے کبھی ایک ہاتھ اس کے گلے میں ڈال کر لے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ کتنا خوبصورت ہاتھ اور کتنی گداز کلائی تھی۔ اور پتلی پتلی کانچ کی سرخ چوڑیاں کلائی میں کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔

قدیر بیری کے نیچے کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دن بھر میں وہ اسے دیکھتا تو کئی بار تھا لیکن آج، ع۔

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ظاہر ہے جب دل میں الجھن ہو اور طبیعت پریشان ہو تو انسان تنہائی چاہتا ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی قدیر ریت کے ٹیلوں کی طرف ان ٹیلوں کی طرف جن سے وہ اپنا دکھ درد کہا کرتا تھا۔ اور جو ایک عرصے سے اسکے محرم راز تھے۔ چل دیا۔

ہوا بہت خوشگوار تھی۔ اور شام، شام غریباں کی طرح اداس، فضا بھی اداس، کائنات بھی اداس۔ جب دل اداس ہو تو پھر دنیا بھی اداس ہی نظر آتی ہے۔ قدیر سر جھکائے اور ہولے ہولے قدم اٹھائے چل رہا تھا۔ آج خلاف عادت کبھی پلٹ کر بھی دیکھ لیتا۔ لیکن عقب میں ریت کے میدانوں، ریت کے ٹیلوں اور دو چار ٹنڈ منڈ درختوں کے سوا زمیندار کے گھر کا دھواں تھا جو فضا کو مکدر کر رہا تھا۔ کبھی چلتے چلتے کہیں کوئی لومڑی یا خرگوش ریت پر بیٹھا نظر آ جاتا۔ یہ ویرانوں کے مقیم کتنے بے فکر تھے۔ ان کی زندگی کتنی قابل رشک زندگی تھی۔ نہ فکر فردا نہ حال و ماضی کا خوف! کاش! انسان بھی اسی طرح قید فکر سے آزاد ہوتا۔ نجانے قدرت نے کیوں۔ ع۔

غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

فضا میں تاریکی پھیل چکی تھی۔ اور ستارے آسمان پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ قدیر ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گیا اور بچوں کی طرح ریت سے کھیلنے لگا۔ کبھی وہ ریت پر گل بوٹے بناتا، کبھی پہاڑوں کے نقشے کھینچتا۔ کبھی کوئی شعر لکھتا۔ پھر ان سب کو مٹا کر کبھی انگریزی حروف ... ہاتھ سے مٹا دیتا۔ پھر جو دل میں آئی تو قبلہ رو ہو کر نماز کیلئے کھڑا ہو گیا نماز پڑھ چکنے کے بعد بڑے خشوع کے ساتھ ؎

بھید نرالے بیاروں کے گاہک مندے بازاروں کے
جس نے گلی میں تجھ کو پکارا تیرے آگے ہاتھ پسارا
گیا نہ خالی اس چوکھٹ سے پھرا نہ پیاسا کوئی اس پنگھٹ سے

الاپنے لگا۔

درماندگی اور پریشاں حالی کا تکدر آمیز خیال۔ کلفت اور تھکاوٹ جو صبح سے قدیر محسوس کر رہا تھا خدا کی یاد سے خود بخود دور ہو گئی۔ وہ ٹھنڈی ریت پر لیٹ گیا اور تاروں کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب دوشیزۂ سحر شاہ خاور کی ہمدوش سفر تھی لیکن یہ دیکھ کر کہ اس پر اسی کا کمبل کسی نے ڈال رکھا ہے اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ قدیر کمبل اٹھا کر بستی کی طرف لوٹا۔ گھر کے قریب پہونچا تو سب سے پہلے جو نظر آیا وہ جمالی تھی۔ یہ خوبی ومحبوبی کی پتلی آج صبح صبح اپنی مرغی تلاش کر رہی تھی۔

"جمالی!" قدیر نے آواز دی۔

"جی!"

"کیا تلاش کر رہی ہو؟"

"مرغی!"

"کون لے گیا؟"

"معلوم نہیں!"

"جمالی!" قدیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پوچھا۔ "رات مجھ پر کمبل کون ڈالنے آیا تھا؟"

"میں!"

"کبھی پہلے بھی تم آئی ہو؟"

"کئی بار!"

"کیوں؟"

اس کا جواب جھکی ہوئی نگاہ تھی۔

"تم کمبل ڈالنے کب آئی تھیں؟"

"جب چاند نہیں نکلا تھا"

"تمہیں ان ویرانوں میں راتوں کو گھومتے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"جمالی!"

"جی!"

"جمالی!"

"جی!"

"جمالی!" قدیر نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "تم میری ہوجاؤ!"

"آپ کے ہی دھندے میں تو لگی رہتی ہوں" جمالی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اور جب میں چلا جاؤں گا" قدیر نے پوچھا۔

"آپ چلے جائیں گے!" جمالی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "کیوں؟ کب؟ یہ جگہ آپ کو پسند نہیں؟"

"پسند ہے!"

"پھر جاتے کیوں ہیں"

"کیا کروں گا یہاں"

"کھیتی باڑی کیجئے!"

قدیر ہنسنے لگا۔ اور جمالی تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جمالی!" قدیر نے پوچھا "تم نے کبھی ریل گاڑی دیکھی ہے؟"

"نہیں!"

"موٹر؟"

"نہیں!"

"ریل میں سوار ہوگی؟"

"نہ جانے کہاں لے جائے!"

قدیر کو اس سادگی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

"جمالی! تم میرے ساتھ چلوگی"

"زمیندار سے پوچھ لیجئے!"

"اگر اس نے اجازت دیدی"

"چلوں گی"

"کیا کام کیا کروگی؟"

"روٹی پکا دوں گی، گھر میں جھاڑو دوں گی۔ آپ کے میلے کپڑے دھویا کروں گی"

قدیر نے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ عمر میں پہلی مرتبہ ایک مرد کے سینے سے لگتے ہوئے جمالی کے تنے ہوئے بدن میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ اس کا خوبصورت سینہ جلدی جلدی ابھرنے اور دبنے لگا۔

"جمالی! تم مجھ سے شادی کروگی" قدیر نے اس کی خوبصورت ٹھوڑی پکڑ کر پوچھا۔

جمالی نے شرما کر اپنا خوبصورت سر اس کے سینے پر رکھدیا۔

صبح کے اس سہانے وقت میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا موسم بہار کے دو پھول گلے مل رہے ہیں۔

کوئی بارہ بجے کے قریب اچانک فیاض آنکلا۔ دونوں دوست بیری کے نیچے چارپائی ڈال کر بیٹھ گئے۔ جمالی کنوئیں پر بیٹھی قدیر کا تولیہ دھو رہی تھی۔ ایک بھیڑ کا بچہ اس کے پاس کھڑا "بھیں بھیں" کر رہا تھا اور گلاب کا وہ پودا جس سے اس ویرانے کی زینت تھی پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ کچھ کلیاں تھیں کچھ کھلے ہوئے پھول تھے جو انسان کی آوارہ دلی اور اس کی بے ماٸگی پر خندہ زن تھے۔ مزاج پرسی ہو چکنے کے بعد فیاض نے خاکی رنگ کا ایک لمبا سا لفافہ قدیر کو دیا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" قدیر نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کسی وکیل کے دفتر سے آیا ہے" فیاض نے جوابدیا۔

"کب؟" قدیر نے لفافہ چاک کرتے ہوئے پوچھا۔

"دو تین دن ہوگئے!" فیاض نے جواب دیا "بھیج تو دیتا لیکن چونکہ میرا خود بھی آنے کا ارادہ تھا اس لئے روک رکھا"

قدیر انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک خط پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"خیر تو ہے؟" فیاض نے پوچھا۔

قدیر کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"کچھ کہو تو سہی!" فیاض بولا "ہے کیا؟"

"میرے ماموں کی وصیت اور خط ہے" قدیر نے رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"چل بسے کیا؟" فیاض نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں!"

"کب؟"

"مہینے سے کچھ اوپر روز گذر چکے"

"اور تمہیں آج خبر مل رہی ہے"

"یہ تو ایک وکیل کا خط ہے۔ اور وصیت کی نقل ہے" یہ کہتے ہوئے قدیر کی آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔

"اور یہ دوسرا خط جو اردو میں لکھا ہے" فیاض نے پوچھا۔

"میرے ماموں کا ہے" قدیر یہ کہکر خط پڑھنے لگا۔

عزیز از جان میاں قدیر!

جیتے رہو! تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں سخت بے سروسامانی کی حالت میں تمہارے پاس آیا تھا۔ میرے پھٹے پُرانے کپڑے میری مفلسی اور ناداری دیکھکر مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ صدمہ بھی ہوا تھا۔ خصوصیت سے اس لئے کہ میں ایک طویل مدّت کے بعد تم سے ملا تھا۔ قدیر چودہ سال کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے۔

اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں جب بُرے دن دیکھنے پڑے تو غیرت نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ٹھوکر کھا کر کچھ آنکھیں بھی کھل گئیں۔ کچھ عقل بھی آگئی۔ کہاں کہاں گیا کیا کیا مختصر بیکار باتیں ہیں۔ چودہ برس کے بعد ہندوستان واپس آیا اب خدا کا فضل شامل حال تھا اور دولت کی فراوانی تھی۔ لیکن مجھے تم لوگوں کی محبت کا امتحان کرنا تھا۔ میں وطن پہونچکر سب سے پہلے اپنے بھائی سے ملا۔ اور اسی غریبانہ بھیس میں جس میں میں تمہارے پاس گیا تھا۔ اس کے پاس گیا۔ ارے! کتنی بے مہر ہے دُنیا۔ اس بھلے آدمی نے امداد کرنی تو رہی ایک طرف سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ حالانکہ وہ آسودہ حال تھا۔ بھائی کے برتاؤ سے میرے دل کو جو چرکا لگا وہ میرا ہی دل کچھ خوب جانتا ہے۔ وہاں سے مایوس ہوکر تمہارے پاس آیا۔ تم نے میری طرف تعجب سے تو دیکھا لیکن مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی کہ تم نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ تمہاری آنکھوں میں محبت کے آنسو دیکھکر میرے دل سے تمہارے لئے دُعائیں نکلنے لگیں۔ تمہارے بائیں ہاتھ کی چوتھی اُنگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی تھی اس میں زمرد لگا ہوا تھا۔ تم داہنے ہاتھ سے اس انگوٹھی کو ہلا جُلا رہے تھے۔ میں نے اپنی مفلسی کا کچھ تھوڑا سا ذکر کر کر تم سے کچھ مالی امداد کا اشارہ کیا۔ تم میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے لیکن میں تمہاری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ مالی امداد کے اشارے سے تمہارا چہرہ کچھ اُتر سا گیا جس کا مجھے اُسوقت بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ بھائی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم کافی جائداد کے مالک ہو۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ زمانے نے تم سے بھی فریب ہی کیا۔ خیر! تم مجھ سے یہ کہکر کہ ابھی آتا ہوں اُٹھکر چلے گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد تم آئے اور پانچ پانچ کے پانچ نوٹ تم نے میرے آگے رکھدئے۔ ساتھ ہی میری نگاہ تمہارے ہاتھ پر پڑی۔ تمہاری اُنگلی میں وہ سپید الماس والی سونے کی انگوٹھی نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ تم انگوٹھی فروخت کر کے یہ روپے لائے ہو۔ گو دل میں بہت حیران تھا۔

میاں قدیر! اب میں بستر مرگ پر ہوں۔ لیکن تمہارا احسان اور احسان سے بڑھکر تمہاری محبت ابھی تک نہیں بُھولا۔ تمہاری نیکیاں دُنیا کے ہر مرحلے میں تمہارے کام آئیں گی۔ بیٹا! میں دُنیا میں اکیلا ہوں۔ نہ بیوی نہ کوئی اولاد۔ میں تمہیں اپنی تمام جائداد کا وارث مقرر کرتا ہوں اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ تم اس دنیا میں کڑوی بیل کی طرح پھولو اور پھلو۔

قدیر بیٹا! کبھی اپنے غریب ماموں کو بھی اپنی دُعاؤں میں شامل کر لیا کرنا۔ جیو۔ ہزار برس جیو۔ خدا حافظ ــــ"

قدیر خط پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے کسی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح آنسو گر رہے تھے۔ فیاض سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور جمالی بڑے تعجب سے قدیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"فیاض!" قدیر آنسو خشک کر کے بولا" میں تمہارا احسانمند ہوں تم نے ایسے وقت میں مجھے پناہ دی جب دوسرا کوئی آسرا نظر نہ آتا تھا تم حیران تو ہوگے کہ ایک دولتمند باپ کا اکلوتا بیٹا ہوتے ہوتے میں مفلسی کا شکار کیسے ہوا۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ ایک راز ہے اس لئے میں یہ راز کہہ کر مرنے والے کی رُوح کو پریشان ہرگز نہیں کروں گا۔ تم۔ اب جارہے ہو۔ کل میرے لئے ایک کی بجائے دو اونٹ بھیجدینا!"

"ہاں!" فیاض نے کہا" دو ہی بھیجونگا۔ ایک سواری کا دوسرا لادو"

"نہیں" قدیر نے کہا" سواری کے دو اور ایک لادو"

"دو کیوں؟" فیاض نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے ساتھ جمالی بھی تو جائیگی"

"جمالی" فیاض نے تعجب سے کہا۔

"ہاں! جمالی!" قدیر بولا" جمالی دُکھ درد میں میری شریک تھی اب جب خدا نے مجھے ثروت عطا کی ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے آرام اور اطمینان کے زمانے میں جمالی میری شریک زندگی نہ ہو"

فیاض اپنے دوست کو دہری مبارکباد دیتا ہوا عصر کے بعد گاؤں واپس چلا گیا۔

ایم۔ اسلم

حسرت

جمنا مِل سے پلٹی تو "لین" میں مزدوروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ وہ بھی ذرا دیر کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اسے روٹی پکا کر اپنی اندھی ماں کو کھلانا بھی تھی۔ کامریڈ جی کی تقریر جمنا کی آتما میں سما گئی۔ اور جب وہ لیٹی تو کامریڈ جی اور ان کی باتوں ہی کے دھیان میں سو گئی۔

صبح کو جمنا کی آنکھ کھلی اور چھوٹی سی کوٹھری کے ہیولے سے روشندان میں سے سورج کی کرنیں پھوٹتی دیکھیں تو سوچنے لگی۔

اوہو! آج کا سورج بڑا جگمگ ہے۔ سنسار کو ہنسی کے رنگ میں رنگ رہا ہے! دن نکلتا ہے تو سبھی پر دیا کرتا ہے، سبھی اپنے اپنے دن کا چھوٹا موٹا حصہ ہنسی کھیل میں اُڑاتے ہیں، مگن ہوتے ہیں۔ اکیلی میں ہوں جو مونہہ اندھیرے مِل میں گھس جاتی اور دن ڈوبے نکلتی ہوں، میں اپنے اتنے بڑے دن کی ایک گھڑی بھی اِدھر اُدھر نہیں کر پاتی!

چھٹی کے دن سب "لین" والے ہنستے کھیلتے ہیں، پر مجھے اُس دن بھی باہر بھیتر مزدوری ڈھونڈھنا پڑتی ہے؛ نہیں تو گو برہین کرلاتی ہوں۔ جو یہ نہ کروں تو لہنگا پھریا نصیب نہ ہو، تین آنے میں کپڑا اتنا کیسے آتے؟

پرماتما نے دن بنا دیا کہ جگ کو ہنساتا پھرے۔ پر سورج دیوتا مجھے اپنی ایک کرن بھی نہیں دیتا کہ اس کے کندن کو لٹا کر میں بھی مگن ہو لیتی! جو میں ہنس کھیل پاتی تو دن کا —— کسی کا بھی کیا بگڑ جاتا؟ ہوں ں، جمنا جو تو ہنستی کھیلتی تو سب "لین" والوں کی سارے سنساریوں کی ناک کٹ جاتی —— تجھے اچھال چھکا نام ملتا! ایک اناتھ کنیا کا یہی بھاگ ہے! کون ہے جس کا کسی کو ڈر ہو!

دو دو مراتب میں بالی تھی، بارہ ہی برس کی تو تھی جب پہل پہل مزدوری کو مِل میں گئی —— چار برس بیت گئے! ایک دن کی بھی چھٹی نہ منا پائی۔ پر اَب میں نادان نہیں، آج دوالی کا دن ہے، نیا دن ہے! آج میں چھٹی مناؤں گی —— اپنی پہلی چھٹی! آج کے گھنٹے گھڑیاں سب میرے ہیں، میں انہیں بکھیروں گی، لٹاؤں گی، خوب ہنس کھیل کر مگن ہونگی —— کسی کا اجارہ ہے کیا؟

روز سویرا ہوتا ہے، روز دن کی لمبی گھڑیاں ندی کے پانی کی طرح بہتی چلی جاتی ہیں، جیسے ندی کا پانی دھرتی ماتا کو بھرا پرا بناتا ہوا بہہ جاتا ہے۔ ویسے ہی دن کی گھڑیاں سنسار کو مگن کرتی ہوئی بہہ جاتی ہیں! نہ ندی کا پانی کہیں ٹھہرتا ہے، نہ دن کی گھڑیاں کبھی رُکتی ہیں!

کامریڈ جی کی باتیں سب سچی تھیں، گریب بھی منش ہے، اُن کی بھی جان ہے، اُن کا من بھی ہنس کھیل لینے کو بیکل ہووے ہے! اب میں جانی کہ میں کیوں ہنسنا کھیلنا چاہتی ہوں —— گریب امیر، سب کو مگن ہو لینے کا حق ہے! آج میں جیلوں پھروں گی، ملوں ملاؤں گی، ہنسوں بولوں گی، تو اگلے برس کی کٹھنائیاں جھیلنے جوگ ہو جاؤں گی۔ کامریڈ جی یہی تو کہہ رہے تھے!

پر جمنا جو آج کے دن تے تیرے ساتھ بھل منساہت نہ برتی تو؟ تو پھر بیتے برس کا دُکھ درد جیسے میں رات کو کامریڈ جی کی میٹنگ میں بھلا آئی ہوں، سویرے میرا بھاگ ہوگا! بس اور کیا ہوگا؟

ہے رام! اسی سنسار میں راجہ رئیس بھی ہیں اور دھنوان جمندار بھی۔ مل مالک بھی ہیں اور ساہوکار بھی، انہیں نہ محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے اور نہ ناگہ اور چھٹا بیٹنے کی چنتا —— اُن کے پاس سب کچھ ہے؛ وہ جب چاہیں دن کو رات کر لیں اور جب چاہیں رات کو دن بنا لیں!

ہمارا مل مالک ہے تو بڈھا کھوسٹ پر بیاہ کے نئی نویلی کو لایا ہے! سیٹھانی جی گہنے پاتے سے ایسی لدی رہویں ہیں جیسے گوندنی کا پیڑ! کوٹھی میں کنچن برسے ہے! موٹریں گاڑیاں ہیں، نوکر نوکرانیاں ہیں، رانی بنی بیٹھتی اور ہر دخت مگن رہتی ہیں! ہوں ں!

پرماتما گریبوں کو جنم دیکے بھول جاتا ہے، امیروں کو نہیں بھولتا! میرے باپ کا کیا دوس تھا کہ اُسے مزدور بنا دیا؟ میری ماں نے کون سا انیائے کیا تھا جو اُسے اندھا کر دیا؟ اور میرا کیا پاپ تھا کہ میرے مزدور باپ کو بھی چھین لیا؟ کامریڈ جی کہتے تھے کہ کرم اور پرالبدھ کا پرچار دھوکا ہے؛ زور بل والے گریبوں پر انیائے کریں، دھن دولت والے گریبوں کا کھون چوسیں، اُتنا ہی پھلیں پھولیں! گریب دکھی محنت کر کر کے بھی بھوکوں مریں، مر مر کے جیئیں، یہ کرم

اور یہ انیائے نہیں، یہ پونجی کا انیائے ہے! اس ظلم کو روکنا ہے اور محنتی مزدور ہی اُسے روکیں گے!

پر جمنا سب امیر بھی تو برابر کے سکھی ہیں؛ کسی کو ذرا چھینک آئی اور دکھ ہوا، بید ڈاکٹر دوڑنے لگے! اور سب گریب بھی برابر کے دکھی نہیں، وہ بھی گھنٹہ دو گھنٹے ہنس کھیل لیویں ہیں ـــــ پریمی ہی ڈھونڈھ نکالیں ہیں!

بکوا ہی کو دیکھو۔ جب سے بیاہ کیا ہے کانی کھدری ہی میں مگن ہے ـــــ گھر سے نکلنا بھول گیا ہے۔ میتو کے پاس بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ میتو وچار رہی تھی کہ اس سے میری سگائی کرے گی، رام پیاری تو ہنسی کرتے پہنے آئی ہے۔ میتو مجھے و بیچ میں کیا دیتی! بارہ آنے پاوے ہے، رانی بنا کے رکھے ہے! دونوں کے من میں بسنت کھِل رہوے ہے! سنسار میں اندھیرا ہو اُن کے دلوں میں سورج چمک جگا رہے ہے!

اب اٹھوں، بدن کیسا دُکھے ہے! دن بھر اِٹیاں تارتے تارتے کمر رہ جاتے ہے۔ پہلے سلام کے بہانے سیٹھانی کو دیکھونگی، کون ساجوڑا پہنا ہے، کون کون سے گہنے سجے ہیں ـــــ پر نہیں جمنا، آج تو وہ پرساد بانٹیں گی۔ سب لین والیاں چھٹانک بھر مٹھائی کے لئے دوڑی جائیں گی: کامریڈ جی کہتے تھے کہ پونجی پتی پرجا کے نام سے بہت سے بھگل کا نٹھا کرے ہے! میں تو ایسی بھیک لینے جانے کی نہیں!

بکوا کی بہو کے پاس ہو آؤں گی۔ پر وہ تو ایتری ہے، ایک ایک چیز نکال کے دکھائے گی ـــــ بکوا میرے لئے یہ لایا، بکوا میرے لئے یہ لایا ـــــ اور بڑی اتراتے گی! میری میلی ساڑی کو گرمی نجروں سے دیکھے گی۔ میں نے ساری رنگ لی ہوتی تو اچھا تھا۔ پر ایک تو پیسہ ہی تھا، رنگ لیاتی تو دوالی کا دیا نہ جل پاتا! نہیں میں بکوا کے بھی نہ جاؤں گی!

تو پھر اور کہاں جاتے گی جمنا؟ "لین" والے تو لچے ہیں، جب دیکھو ٹھٹھول کرتے ہیں۔ ہاں بزار گھوم آؤں گی۔ آج دکانوں کی سجاوٹ بڑی سندر ہوگی۔ رات کی وُدرروٹیاں ہیں، میتو کو کھلا دوں گی ـــــ ٹکڑا لیکے میں بھی کلیو کر لونگی۔ میتو آج جاگی نہیں۔ وہ تو بڑے سویرے اُٹھ جاوے ہے۔

"میتو! میتو!"

میتو تو سوتی رہی ہے!

اُٹھتی ہے۔ ماں کو جگاتی ہے۔ نہ معلوم رات میں کس وقت مر چکی ہے۔ جمنا کو احساس ہوتا ہے تو چیخ مار کر ماں کی لاش پر گر جاتی ہے اور روتی رہتی ہے۔

دُنیا آج دوالی کا تہوار منا رہی ہے، ہر جگہ لکشمی کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور مزدور "لین" والے جمنا کی ماں کو پھونکنے کے لئے پیسہ پیسہ اکٹھا کر رہے ہیں۔

آج جمنا کی چھٹی کا پہلا دن ہے!

ل۔ احمد:

ٹوٹے ہوئے تارے

رات کی تھکن سے اُس کے شانے ابھی تک بوجھل تھے۔ آنکھیں خمارآلود اور لبوں پر ٹریٹ کے ڈاک بنگلے کی بیئر کا کسیلا ذائقہ، وہ بار بار اپنی زبان کو ہونٹوں پر پھیر کر اُس پھیکے اور بے لذت سے ذائقے کو دُور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو اُس کی آنکھیں مُندی ہوئی سی تھیں لیکن پہاڑوں کے موڑ اُسے اس طرح یاد تھے جیسے الف بے کی پہلی سطر۔ اور وہ نہایت چابکدستی سے اپنی موٹر کو جس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے (ایک آدمی اور غالباً ایک عورت) اُن خطرناک موڑوں پر گھمائے لے جا رہا تھا۔ کہیں کہیں تو یہ موڑ بہت خطرناک ہو جاتے، ایک طرف عمودی چٹانیں، دوسری طرف کھائی، جس کی تہہ میں جہلم کے نیلے پانی اور سفید جھاگ کی ایک ٹیڑھی سی لکیر نظر آجاتی۔ انہیں موڑوں پر سے تو کار کو تیز چلانے میں لطف حاصل ہوتا تھا، سارے جسم میں ایک پُھریری سی آجاتی تھی۔ صبح کی ہوا ابھی برفیلی اور خوشگوار تھی۔ اس میں اونچی چوٹیوں کی اوروں اور گھاٹیوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں کے جنگن کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ کیسی انوکھی مہک تھی، عجیب، بے نام سی، تر و تازہ نہالو کے لبوں کی طرح۔ وہ اپنی نیم وا آنکھوں کی پلکوں کے سائے میں پچھلی رات کے بیتے ہوئے طربناک لمحوں کو واپس بلانے لگا.... بیئر کی رنگت میں ڈوبتے ہوئے سورج کا سونا گھلا ہوا تھا۔ ...اُس کے کسیلے میں ایک عجیب سی لطافت تھی.... رات کی بھیگی ہوئی خاموشیوں میں دُور کہیں ایک بلبل نغمہ ریز تھی... بلبل نے اپنے نغمے میں خاموشی اور آواز کو یوں ملا دیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے تھے، اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ خاموشی کہاں ختم ہوتی ہے اور یہ موسیقی کہاں شروع ہوتی ہے... ...چاندنی رات میں یہ سیب کے پھول نہیں رہے تھے۔ اور نہالو کے لب مسکرا رہے تھے.... وہ لب جو بار بار چومے جانے پر بھی معصوم دکھائی دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز بھی انہیں نہیں چھو سکتی، کیسا عجیب احساس تھا۔ اور اب تو وہ ڈاک بنگلہ بھی میلوں کے پیچھے رہ گیا تھا.... رات کی تنہائیوں میں نہالو کا حسن غیر فانی اور غیر زمینی معلوم ہوتا تھا... اس کے لب، اسکی آنکھوں کی نرمی، اُس کے بال سیاہ گھنے اور ملائم، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی، اور پھر اُن بالوں میں سیب کے چند چٹکتے ہوئے غنچے، جیسے رات کی بھیگی ہوئی خاموشی میں بلبل کے میٹھے نغمے، اور وہ یہ معلوم نہ کر سکا کہ خاموشی کہاں شروع ہوتی ہے۔ اور یہ موسیقی کہاں ختم ہوتی ہے... لیکن اب تو وہ ڈاک بنگلہ بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور اس وقت کسی پرستانی قلعے کی طرح معلوم ہو رہا تھا، موڑوں کے اُلجھاؤ میں کار گھومتی ہوئی جا رہی تھی، اور اس کے تخیل میں نہالو کے لب اور جنگن کی مہک اور بلبل کا نغمہ اور بیئر کا سنہرا رنگ چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی سڑک پر اُلجھتے گئے، نیچے جہلم کا پانی وحشی راگ گانے لگا، اور فضا میں سیب کے لاکھوں پھول آنکھیں کھول کر چہچہانے لگے، اور اُس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنی موٹر کو اسی کھائی کی وسیع خلا پر ایک بے فکر پرندے کی طرح اُڑا کر لے جائے، یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی اور اس کی نیم وا آنکھیں کھل گئیں۔

راستے میں ایک چشمے کے کنارے اُس نے اپنی کار ٹھہرائی۔ اور دیر تک ہاتھ پاؤں دھوتا رہا، آنکھوں کو چھینٹے دیتا رہا، ایک پہاڑی گیت گنگناتا رہا اور پانی لیکر کلیاں کرتا رہا، آہستہ آہستہ اسکی آنکھوں میں رچا ہوا خمار دور ہو گیا۔ اور بیئر کا کسیلا ذائقہ بھی جاتا رہا، اب لب سوکھے تھے، آنکھوں میں جلن سی محسوس ہونے لگی۔ پیاس اور اشتہا بھی، اُس نے بوتل کھول کر گرم چائے انڈیل لی۔ اور سرد توس پر مکھن لگا کر کھانے لگا، بدن میں گرمی اور قوت آ رہی تھی۔ شانوں کی تھکن معدوم ہونے لگی۔ اب وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں، موٹروں اور لاریوں کو غور اور دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس وادی میں بیکانیر کے مارواڑی اپنی بھاری بھرکم بیویوں کو پہلگام کی سیر کرانے لے جا رہے تھے، اس کار میں ایک یورپین مرد ایک ہاتھ سے کار چلا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی بیوی کی کمر پر تھا۔ جو اپنے لبوں پر سُرخی لگانے میں مصروف تھی، اس لاری میں بیمار کلرک اور اُن کی ادھ موئی بیویاں بیٹھی تھیں، اور اُن کے بے شمار بچے لاری کی کھڑکیوں پر کھڑے غل مچا رہے تھے.... اس لاری میں سکھ ڈرائیور کی پگڑی ڈھیلی ہو چکی تھی اور وہ اونگھتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اُسے خیال آیا کہ چند میل آگے جا کر یہ سکھ ڈرائیور اپنی لاری کو کھائی کی وسیع خلا پر اُڑا لے جانے کی کوشش کریگا،

اور پھر دوسرے دن وہ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھ لے گا "مری کشمیر روڈ پر ایک حادثہ۔ لاری جہلم میں جا گری۔ سب مسافر جہلم میں غرق ہو گئے۔ ڈرائیور بال بال بچ گیا"۔۔۔ لاری موڑ پر سے گذر گئی۔

لاری میں بیٹھے ہوئے لوگ جن میں پنجاب کے چند پہلوان بھی شامل تھے، بہت خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔ اس خوشی میں غالباً کشمیر کی ناشپاتیوں اور عورتوں کی نرمی اور گداز پن کا بہت حصہ تھا۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ چند منٹوں پر جا کر انہیں موت سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنی پہلوانی کا ثبوت دینا پڑیگا، اور یہ کہ تھوڑی دیر ہی میں وہ عورتوں کی طرح چیخیں مارتے اور کھائی پر ناشپاتیوں کی طرح لڑھکتے دکھائی دیں گے۔۔۔۔ اس لاری میں چند ریشمیں برقعے سرسرا رہے تھے، لیکن کئیوں نے نقاب الٹ دئے تھے۔ ایک بدصورت عورت نے جو ایک نہایت خوبصورت برقعہ پہنے تھی زور سے پان کی پیک سڑک پر پھینکی اور چند چھینٹیں اڑ کر چشمے کے قریب آ پڑیں اور وہ پرے سرک گیا، تین ہاتھ، اپنے گھٹے ہوئے سروں پر تنگ ٹوپیاں پہنے اور کاندھوں پر نمک کے بڑے بڑے ڈلے اٹھائے گزر رہے تھے۔ انکے نتھنے پھولے ہوئے تھے، اور گال سرخ، اور چپٹے پاؤں میں پیال کی چپلیں تھیں۔ اُسے وہ ضرب المثل یاد آئی "کشمیر میں جا کے ہم نے دیکھی ایک عجیب بات، عورتیں ہیں مثل پری، آدمی جن ذات۔۔" دو گوجریاں، جوان، سانولی سلونی، گدرائی ہوئیں۔ جیسے رسیلے جامن، تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے گزر گئیں۔ ایک ڈرائیور نے اپنی لاری کا چشمے کے کنارے ٹھہرائی اور انجن اور پہیئے ٹھنڈے کرنے لگا۔ لاری میں ایک موٹے سیٹھ کا موٹا کتا اس کی طرف دیکھ کر بھونکنے لگا "ٹامی شٹ اپ، ٹامی شٹ اپ" موٹے سیٹھ نے کئی بار کہا لیکن کتا نہ رکا اور لاری کے موڑ پر گزر جانے تک بھونکتا رہا۔

اب سورج صبح اور دوپہر کے درمیانی وقفے میں آ گیا تھا، اور اس نے چلنے کی ٹھانی۔ اس نے سوچا کہ آج رات وہ چومیل کے ڈاک بنگلے میں قیام کریگا۔ گڑھی تو وہ آج رات کسی طرح نہ پہونچ سکتا تھا، اس نے اپنی اوک میں چشمے کا صاف و شفاف پانی پینے کے لئے بھرا اور پھر رک گیا، خاموش قدموں سے ایک عورت اس کے قریب آ گئی تھی۔ نوجوان سی اور کچھ کچھ فربہ اندام۔ اس نے نیلے پھول والی سوسی کی ایک بھاری شلوار پہن رکھی تھی، اور لمبے سیاہ قمیص پر اسکی ابھری ہوئی چھاتیوں کے گول خم نظر آئے، اور چشمے کا صاف و شفاف پانی اس کی اوک سے باہر چھلکنے لگا، اور کچھ عرصے کے بعد اس کی اوک خالی ہو گئی۔ اور اس نے اس سے پوچھا "پانی پینا چاہتی ہو؟" لیکن اس کے نیلے پیاسے سرخ لبوں کی طرف دیکھ کر اسے اپنا سوال بے معنی سا معلوم ہوا۔ عورت چشمے میں سے اوک بھر بھر کر اپنی پیاس بجھاتی رہی اور اس کی پیاس تیز ہوتی گئی۔۔۔۔ عورت کے لب اور گال گیلے ہو گئے۔ اور کانوں کے قریب بل کھائی ہوئی زلف بھی، اور پھر یکایک دونوں کی نگاہیں ملیں، عورت نے مسکرا کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔

اس نے پوچھا "تم کہاں جا رہی ہو؟"

عورت نے کہا "میں نگر میں اپنے میکے گئی تھی۔ اب بلند کوٹ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں"

"بلند کوٹ کدھر ہے؟"

عورت نے کہا "یہاں سے سات آٹھ کوس تک تو میں اسی سڑک پر چلوں گی، پھر آگے جنگل سے ایک راستہ اوپر پہاڑ کی طرف چڑھتا ہے۔ وہ راستہ ہمارے بلند کوٹ کی طرف جاتا ہے۔ بہت اونچی اور سرد جگہ ہے"

"تو پھر تم وہاں کیوں رہتی ہو۔ یہاں دیکھو کتنا خوشگوار موسم ہے اور اس چشمے کا پانی کتنا ٹھنڈا اور میٹھا ہے"

عورت نے ہنس کر کہا "ہم بکر وال لوگ ہیں، ہم بھیڑوں، بکریوں، بھینسوں کے گلّے کے گلّے پالتے ہیں۔ آج کل ان اونچے علاقوں پر بہت عمدہ ہری ہری گھاس ہوتی ہے۔ جو برف کے گھل جانے پر پھوٹتی ہے۔ اس باریک، نرم اور ہری دوب کو ہمارے مویشی بہت شوق سے کھاتے ہیں، اور چشمے تو وہاں اس سے بھی زیادہ ٹھنڈے اور میٹھے ہیں"

اس نے بات کا رخ بدل کر کہا "کیا تم نے کبھی موٹر کی سواری کی ہے؟"

"ہاں ایک بار لاری میں بیٹھی تھی جب میری شادی ہوئی تھی"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"دو سال"

وہ اپنا رخت سفر باندھنے لگا، عورت کی ناک پر پانی کی دو بوندیں ابھی تک اٹک رہی تھیں، اور گیلی زلف داہنے گال سے چپک گئی تھی۔ اس نے کہا "تمہاری ناک پر پانی کی دو بوندیں ہیں" اور پھر وہ یکایک دونوں ہنسنے لگے۔ دو بوندیں، دو سال، دو گولائیاں، اور اس نے آہستہ سے کہا "آؤ، تم میری کار میں بیٹھ جاؤ، کم از کم سات

آٹھ کوس تک تو میں تمہیں ساتھ لے جا سکتا ہوں ۔"

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عورت ہچکچائی۔ لیکن موٹر کا دروازہ کھلا تھا، اور اُس نے اُسے اندر دھکیل دیا، اور پھر کیا یہ موٹر بھی دو آدمیوں کے سفر کے لئے نہ بنائی گئی تھی: ایک مرد اور غالباً ایک عورت، اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنا ایک ہاتھ اُس کی کمر پر رکھ دیا، عورت کے جسم میں ایک خفیف سی جھرجھری پیدا ہوئی۔ جیسے سوتے ہوتے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں۔ موٹر بھاگ گئی، اور اُس کا ہر نفس آتشیں ہوتا گیا۔ آگ، اور سمندر، جن میں بلند کوٹ کی رفعتیں غرق ہو جاتی ہیں! درو قت مٹ جاتا ہے ۔ . . . . .

جب وہ چومیل کے ڈاک بنگلے پر پہونچا، تو ہر طرف شام کی اُداسی چھا رہی تھی، سامنے کا سیاہ پہاڑ کسی وسیع قلعے کی دیوار معلوم ہو رہا تھا، اور درختوں کی چوٹیاں پہرے دار کی بندوقیں۔ اب وہ پھر اکیلا تھا، اُسے اپنے آپ سے، قلعے کی دیوار سے پہرے داروں کی بندوقوں سے، فضا کی تنہائی سے ڈر محسوس ہوا۔ اپنے آپ سے ڈر، اُس تیرگی سے ڈر، جو اُس کی رُوح پر چھائی ہوئی تھی، رات کے گہرے سایوں کی طرح، جیسے وہ اسی افسردگی کے دلدل میں اندر ہی اندر دھنسا جا رہا ہو، اُس نے ڈاک بنگلے کے بیرے کو آواز دیکر کہا: "ایک وائٹ ہارس" کھول دو" اور پھر اُس نے دس روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جانِ عزیز کے مقابلے میں دس روپے کے نوٹ کی کیا اہمیت تھی۔ کاغذ کا حقیر ٹکڑا۔ بوتل اپنے سامنے دیکھکر اُس نے سوچا، اب میں بچ جاؤں گا، اب اس دلدل میں نہیں دھنسوں گا۔ اور اُس نے بوتل کو زور سے گردن سے پکڑ لیا، شاید کہیں وہ اس کا دامن چھڑا کر نہ بھاگ جائے، اُس نے بیرے کو آواز دی۔

"جی سرکار"

"ایک مُرغی بھون لو، دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو"

"بہت اچھا سرکار"

"اور ہاں دیکھو" اُس نے بیرے کے ہاتھ میں پانچ کا نوٹ دے کر کہا: "ایک ـــــــ لے آؤ، دیکھو دُبلی پتلی نہ ہو۔ تمہیں بھی انعام ملے گا"

بیرے کی باچھیں کھل گئیں، آنکھیں چمک اُٹھیں، گردن کی رگیں ایک قصاب کی طرح تن گئیں، اُس نے خوش ہو کر کہا: "حضور بے فکر رہیں، ایسا عمدہ چوزہ ملاؤں گا کہ . . . . ."

"جاؤ، جاؤ" اُس نے جلدی سے کہا۔ اور بوتل کو گلاس میں اُنڈیلنا شروع کیا۔

ڈاک بنگلے کے باغ میں جنیئے اور رُونے باری باری بول رہے تھے، جنیئے کہتے، ہیں ہیں ہیں۔ رُونے کہتے ٹری ری ری۔ پھر دونوں چُپ ہو جاتے، اور یکایک کوئی نظر نہ آنے والا پرندہ کسی درخت پر اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتا۔ پھر رُونے بول اُٹھتے ٹری ری ری ری۔ اور جنیئے کہتے ہیں، ہیں، ہیں۔ پی، پی، پی۔ اور وہ پیتا گیا، اور اس کے دل کی اُداسی بڑھتی گئی، ڈاک بنگلے میں اُس وقت کوئی نہ تھا۔ اور اُس نے سوچا کہ وہ اسی وقت گیرج میں جا کر اپنی موٹر سے لپٹ جائے اور آنسو بہا بہا کر کہے: "میں اکیلا ہوں، میری جان، میں اکیلا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے"۔ . . . ٹری ری ری . . . جی . . . جی . . . جی . . . پی . . . پی . . . پی۔ کیا وہ جیتے یا پیتے . . . . بوتل خالی ہو گئی، اور وہ میز پر سر ٹیک کر جُھک جانے کو تھا کہ یکایک کسی نے اس کے شانے کو ہلایا۔ بیرا اُس کے پاس کھڑا تھا، اور اُس کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔

"تم کون ہو؟" اُس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام زبیدہ ہے" عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کرسی کا سہارا لیکر اُٹھا۔ اور کمرے کے اندر جانے کیلئے مُڑا۔ بیرے نے اُسے سہارا دینا چاہا، لیکن اُس نے اسے جھڑک کر کہا: "ہٹ جاؤ، میں کمرے میں خود چلا جاؤں گا" وہ اُس وقت اس جری سیاح کی طرح محسوس کر رہا تھا، جو کسی دُشوار گزار برفستان میں سفر کر رہا تھا۔ ایک سیاہ کھائی سی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، صرف کمرے میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا لیمپ جل رہا تھا، روشنی، چاروں طرف تاریکی کا سمندر اور بیچ میں روشنی کا مینار، . . . . وہ اُس روشنی کی طرف بڑھتا چلا گیا، شاید وہ اب بھی بچ جائیگا۔ یکایک اُس نے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی، اور وہ رُک گیا۔ بیرے نے عورت کو اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ عورت دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ . . . آؤ . . ." اُس نے عورت کی طرف ہاتھ ہلا کر جھومتے ہوئے کہا: "ادھر آؤ۔ روشنی ادھر ہے"

عورت ہولے ہولے قدموں سے قریب آگئی تھی۔ اُس کے بالوں میں عین درمیان سے ایک سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی، چاندی کے تار کی طرح۔ اور اُس نے دونوں طرف بالوں میں پر [illegible]

میں سجھا لگا یا ہوا تھا۔ سنتھے کا موم بالوں پر لیمپ کی روشنی کے انعکاس سے بار بار چمک اٹھتا تھا، اس کے کانوں میں چاندی کی ایک ایک بالی لٹک رہی تھی

اُس نے عورت کے شانے پر جھک کر رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

"کیوں؟ تم اُداس ہو...... تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیدہ" اس نے بے جان سے لہجہ میں کہا۔

"شبیدہ... شبیدہ..." اُس نے ہنس کر کہا "شبیدہ... ہوں... کیا خوب....." اُس نے اس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہے.... شبیدہ.... پیاری ش... ش... شبیدہ..."

"یہ ستھا ہے۔ یہ موم اور جنگل کے جگین سے بنتا ہے۔ اس سے بال خوبصورت......"

"خوب شورت؟... خوب شورت شبیدآ... آ... آ..."

اُس نے ہنسی اور ہچکی کے بیچ کے لہجہ میں کہا "تم بہت خوبشورت ہو شبیدہ....." اُس نے زبیدہ کے صاف اور گلابی رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انگلی سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "تم.... تم.... شبیدہ ہو...؟ ...نہیں... تم میری ماں ہو! ہی ہی ہی"

اور وہ اُس کے قریب گیا۔

عورت نے یکایک اُس کے بازوؤں کو جھٹک دیا، جیسے اُسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

"ہاں... ہاں..." وہ چلا کر بولا "ش۔ش۔ شبیدہ ماں ہے... شبیدہ میری بہن ہے... ش ش شبیدہ میں گناہگار ہوں۔ شبیدہ تم یہاں کیوں آئیں... آخ... ہیں؟"

"میں غریب ہوں" زبیدہ نے آہستہ سے کہا۔

"غریب؟ ہی ہی ہی"

"میرا بچہ بیمار ہے؟ جرا۔ میرا ننھا سا جرا، ڈاگ دار (ڈاکٹر) نے کہا ہے اُسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ چار روپے فیس مانگتا ہے۔ تیرے نے مجھے صرف تین روپے دئے ہیں، خدا کے لئے مجھے ایک روپیہ اور دیدو"

"نمونیا؟ ہی ہی ہی... اُسے خ... خ... خیراتی ہسپتال لیجاؤ نا... نمونیا... ننھا جرا..."

"یہاں ایک ہی تو ہسپتال ہے" عورت نے اداس لہجہ میں کہا "اور وہ بھی خیراتی.... میرے اللہ... میں کیا کروں.... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں... خدا کے لئے مجھے ایک روپیہ اور دیدینا ...صرف ایک روپیہ"

"بش.... بش.... فکر نہ کرو... نہ... نہ... ننھی شبیدہ"

وہ اُس کی گردن میں لپٹ کر کہنے لگا "میں تم پر مرتا ہوں، خوبشورت شبیدہ.... میں اکیلا ہوں.... میں اکیلا ہوں.... مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے بچاؤ۔ شبیدہ...." اُس نے اُس کے شانے پر سر رکھدیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ سویا پڑا تھا، عورت کے گلے میں اس کے بازو حمائل تھے، جیسے "وائٹ ہارس" کی بوتل پر اُس کی انگلیاں۔ لیمپ کی مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ کالی رات کے سناٹے میں نظر نہ آنے والے بنیے اور ڈروتے ابھی تک بحث کئے جاتے تھے.... جی... جی.... جی... پی... پی... پی... لیکن انہیں سننے والا وہاں موجود نہ تھا۔ کھائی اُس کے سر پر ہموار ہو چکی تھی۔

جب وہ جاگا، تو خمار اتر چکا تھا، روشنی بجھ گئی تھی۔ سائے غائب ہو چکے تھے، بنیے اور ڈروتے خاموش تھے، صبح کا ہلکا سا پرتو چاروں طرف چھن رہا تھا، وہ ابھی تک اُس کی آغوش میں مدہوش پڑی تھی۔ برہنہ، سنتھے سے آراستہ کئے ہوئے بال پریشان تھے۔ اور سپید گردن کے ان حصّوں پر سُرخ سُرخ نشان تھے جنہیں وہ بار بار چومتا رہا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا، سڈول، گداز، سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، وہ آہستہ سے اُس کے بندشے پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ عورت کے سارے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی، جیسے سوئے ہوئے سمندر کی لہریں بیدار ہو جائیں — اُس کے رخساروں پر گری ہوئی پلکیں کانپیں۔ اُس کے لبوں سے اک آہ سی نکلی، اور اس نے آہستہ سے اسی مدہوشی کے عالم میں کہا۔ "جرے.... پیارے ننھے جرے...." اور پھر اُس کے نیم وا لب اسی طرح آپس میں ملے، جیسے ماں اپنے پیارے بیٹے کو چوم رہی ہو.... ننھا جرا؟... یکایک وہ چونک پڑا، گزری ہوئی رات کے موہوم سے سائے اُس کی آنکھوں کے آگے آتے گئے... ننھا جرا... نمونیا... ڈاگ ڈار... وہ کانپنے لگا... تین روپے... چار روپے.... صرف ایک روپیہ۔ اُس نے فوراً اپنے بازو اُس کی گردن سے ہٹا لئے۔

نتھا جرا . . . اور اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں سے زنا کر رہا ہو . . . .

اور وہ یکلخت بستر سے اچھل کر زمین پر کھڑا ہو گیا، اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس عورت کی طرف تکنے لگا، جو اَب جاگ گئی تھی، اور برہنہ تھی اور ساری رات اسکی آغوش میں رہی تھی۔

وہ چیخ کر کہنے لگا "چھپا لو۔ چھپا لو۔ اپنے آپ کو اس کمبل میں . . . دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے . . . کیوں اس طرح پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو . . . سنتی نہیں ہو کیا؟ . . . میں کہتا ہوں اٹھو اٹھو . . . میرے بستر سے . . . یہ لو . . . یہ لو . . . ایک روپیہ۔ دو روپے۔ تین روپے۔ چار روپے۔ یہ سب لے لو۔ بھاگو یہاں سے۔ بھاگو! بھاگو!! بھاگو!!!"

اور اُس نے اس عورت کو کمبل اڑھا کر اُس کے کپڑے اُس کے ہاتھ میں دیکر اُسے کمرے سے باہر نکال دیا۔

بہت دیر تک وہ بستر پر سر پکڑے بیٹھا رہا، دل و دماغ پر ایک مبہم سی الجھن ایک مکڑی کے جالے کی طرح تنی ہوئی تھی۔ جو اسے بار بار پریشان کر رہی تھی اور وہ کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ بار بار اپنے الجھے ہوئے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس مکڑی کے جالے کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا، آخر جب بیرے نے آکر اُس سے کہا "صاحب غسلخانہ میں گرم پانی دھرا ہے۔ تو وہ بیدلی سے اُٹھا اور پوٹاشیم پرمینگنیٹ کی پچکاری اُٹھا کر غسلخانے میں گھس گیا، طبیعت بے مزہ سی ہو گئی تھی۔ اور مُنہ کا کڑوا کسیلا ذائقہ ہوش آنے پر بھی دُور نہ ہوا تھا۔ شانے بوجھل سے تھے۔ نہا کر وہ برآمدے میں میز پر کہنیاں ٹیک کر ناشتے کا انتظار کرتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ ہوشیار بیرے نے ناشتے پر بیئر کی بوتل حاضر کردی۔ بیئر کے خوش رنگ سیال نے آہستہ آہستہ اُسکے خیالات کی رو کو بدل دیا۔ اس کی طبیعت مفرح ہوتی گئی۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا، اور سیڈیاں بجانے لگا، بیتی ہوئی راتوں کے لمحے خوشگوار اور دلکش بنتے چلے گئے [illegible] سے چمکتے ہوئے بال، . . . . سیاہ قمیص پر چھاتیوں کے اُبھرے ہوئے خم . . . نہالو کا غیر فانی حسن، بلبل کا نغمہ، پپیے کی پی، پی" اور سیب کے پھول چاندنی میں ہنستے ہوئے، یکایک کسی راستے میں چمکتے ہوئے چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اُس کی آنکھوں کے سامنے خوشی سے اُچھلنے اور اُبلنے لگا اور ابل ابل کر قہقہہ لگانے لگا، اور اسے اپنی کار کی یاد آئی جو گیرج میں پڑی اسکی راہ تک رہی تھی۔ اور وہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے بیرے کو انعام دیکر پوچھا "گڑھی کا ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنے میل دُور ہوگا؟"

"ایک سو دس میل سرکار۔"

"ہاں، بیرے کا کیا نام ہے؟"

"خادم شاہ، حضور۔"

"ہُم۔"

"بہت اچھا آدمی ہے۔" بیرے نے کہا "صاحب لوگوں کا پرانا خادم ہے، حضور . . . ."

ڈاک بنگلے کے قریب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اُسے ایک نیلے رنگ کی کار مل گئی۔ جو ڈاک بنگلے کی طرف آرہی تھی۔ ایک بھاری جسم اور دوہری ٹھوڑی والا آدمی جس نے سیاہ پھندنے والی رومی ٹوپی پہن رکھی تھی، کار چلا رہا تھا، اُس کی بغل میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی، نیلی سوسی کی شلوار، سیاہ قمیص پہ چھاتیوں کے ابھرے ہوئے خم، اور آنکھوں میں عادی مجرموں کی سی بے بیان اداسی، اور وہ دل ہی دل میں مسکرایا، محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز . . . . غریب عورتوں نے اپنی خیالی عصمت کی خاطر پہاڑوں پہ بلند کوٹ بنائے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی، کہ اُنکے میکے اور سسرال ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک اور ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک محدود تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں خداوند لایزال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ان لوگوں کو غریب بنا کر اُس کے لئے دلکش راتیں مہیا کی تھیں۔ زبیدہ، وائٹ ہارس، اور بھنا ہوا مرغ . . . الٰہی کیسی کیسی نعمتیں تو نے بنائی ہیں . . . . اس کے تخیل میں گڑھی کا ڈاک بنگلہ ایک پرستانی قلعہ نظر آنے لگا۔ اور اُس نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔

موٹر کے آگے اور پیچھے، چیڑھ اور دیودار کے گھنے اور سبز جنگلوں کے درمیان چاندی کے تار کی طرح چمکتی ہوئی وہ پکی سڑک پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک میٹھے چشمے سے دوسرے میٹھے چشمے تک، ایک ڈاک بنگلے سے دوسرے ڈاک بنگلے تک، ایک امیر کی جیب سے دوسرے امیر کی جیب تک، یہ وہی نقرئی تار ہے۔ جس نے انسانوں کے دل تاریک کر دیے ہیں۔ عورتوں کی عصمتیں ویران کر ڈالی ہیں اور سماج کی روح کو آتشک کے جہنم میں جھلسا دیا ہے!

کرشن چندر

رومان کی تلاش

جوانوں کو، بالخصوص بیکار جوانوں کو، رومان کی بڑی حسرت رہتی ہے جو نکلتی بہت کم ہے۔ سبب یہ ہے کہ رومان آسمان سے کم ٹپکا کرتا ہے۔ زیادہ تر یہ افتادِ مزاج سے متعلق ہوتا ہے۔ بعض طبائع میں رومانیت فطرتاً موجود ہوتی ہے اور ادنیٰ تحریک سے یوں نکل پڑتی ہے جیسے پتھر کی چوٹ سے شرارے، اور بعض فطری ماٹھوس "جوان صالح" رومان پروف ہوتے ہیں جن کو کوئی تحریک متحرک نہیں کرتی۔ کوئی کسی کو اٹھا کر رومان کی گود میں ڈال نہیں سکتا۔

آج رومانوں میں میرے خود مبتلا ہونے کے دن تو گذر گئے مگر اب بھی سفر میں مجھے رومان دیکھ اور سن لینے کا موقع اکثر مل جاتا ہے اور دو گھڑی کو روحانیت سے نکل کر رومانیت کے دور میں واپس چلا جاتا ہوں۔

میں کانگریسی ہوں نہ لیگی۔ دونوں کا تماشہ بیں۔ ایک طرف رامگڈھ کانگریس کا تربیتِ تماشہ دیکھا، تو دوسری طرف لاہور لیگ کا رنگین منظر۔ ماہ میں کئی جگہ قطع سفر کرتا ہوا دہلی سے چلا تو ایک خوش پوشاک، خوش طبع، تعلیم یافتہ نوجوان ہمسفر تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مانوس ہوگئے۔ علی گڈھ میں یکبارگی تین لڑکیاں اور ایک نوجوان ہمارے ڈبے میں داخل ہوگئے۔ ان میں مسافر صرف ایک لڑکی تھی باقی مشائع۔ جب سیٹی بجی تو دو لڑکیاں تو مسافر لڑکی سے مل کر باہر نکل گئیں۔ رہا نوجوان، وہ کھڑا ہو کر "پہونچتے ہی تار دینا" "مفصل خط لکھنا" "میں بھی لکھا کروں گا" "بھول تو نہ جاؤگی؟" وغیرہ رخصتی کلمات بولتا رہا۔ گاڑی چل پڑی تو دروازہ کھول کر پائیدان پر کھڑا کھڑا سرگوشی کرتا رہا۔ دفعتاً میرے ہمسفر نے ہاتھ پکڑ کر زور سے اُسے اندر کھینچ لیا۔

رفتار تیز ہو چکی پلیٹ فارم تمام ہوگیا۔

"نہیں نہیں۔ میں ابھی کودا جاتا ہوں"

ہمسفر نے پھر ہاتھ پکڑ لیا "آپ ایسا نہیں کرسکتے۔ رومان، رومان ہی تک اچھا معلوم ہوتا ہے، اُسے حادثہ نہ بننا چاہیئے۔ اکثر رومان اور حادثہ میں انچ آدھ انچ کا فرق رہ جاتا ہے"

"آپ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں پرانا کھلاڑی ہوں اور اس سے زیادہ تیز رفتار میں ٹرین سے بآسانی کود سکتا تھا آپ نے میرا سخت نقصان کر دیا۔ آج ہی شام کو ٹینس ٹورنمنٹ میچ ہے۔ ہماری ٹیم کی فتح مجھ پر موقوف ہے۔ ہماری چیمپین شپ کو داغ لگا"

"حضرت آپ نرے نظم معرّا یا منشی ذکاء اللہ کی نثر ہیں۔ ابھی اپنی لطیفہ دوست کی جدائی میں کیسی بے چینی دکھا رہے تھے۔ اب یک گھنٹے سے زیادہ ملاقات کا اور موقع ہاتھ آگیا تو میچ کا دکھڑا سنانے لگے۔ ابھی گر جاتے تو میچ کون کھیلتا اور ان مس صاحبہ کا کیا حال ہوتا۔ مگر آپ کو ان سے زیادہ عزیز میچ کی ناموری ہے"

مس صاحبہ نے مسکرا کر نوجوان کی طرف دیکھا، گویا آنکھیں پوچھ رہی تھیں کہو اب کیا کہتے ہو؟ نوجوان جھینپ سا گیا۔

میرے ہمسفر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور رومان جس کے پیچھے ڈھنڈا لئے آپ یہاں تک تشریف لاتے ہیں یوں نہیں ہاتھ آیا کرتا۔ ہاں اب، کہ آپ بے ارادہ، خلاف توقع، بے ٹکٹ ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں اور مس صاحبہ کے کندھے یا دل پر مفت احسان لادے ہیں، رومان جھلکنے لگا ہے"

نوجوان: "خیر صاحب، کچھ ہی ہو، آپ ہیں دلچسپ جنٹلمین۔ معلوم ہوتا ہے آپ، رومانوں کے بڑے کار آزمودہ کھلاڑی ہیں۔ رومان رومان کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اچھا اب بتایئے آپ رومان کسے کہتے ہیں اور اسکا کیا تجربہ رکھتے ہیں؟"

ہمسفر: "یوں تو آپ ہاتھرس میں اتر جاتے اور ایک گھنٹہ کے بعد دوسری ٹرین سے علیگڈھ لوٹ سکتے اور شاید میچ کی دُم بھی پکڑ سکتے۔ اگر میں رومان شروع کروں گا تو ٹونڈلے سے اِدھر تمام نہ ہوگا۔ یہ منظور ہو تو سناؤں۔ ورنہ آدھی کہانی سننے سے بہرہ قوال کا سامعہ خراش کارڈ یا ریڈیو کے بھجن سننا بہتر ہے"

نوجوان: "بیشک۔ مگر میرا پروگرام اب آپکے رومان کی نوعیت پر موقوف ہوگا۔ چاہے مجھے ابھی چلتی ریل سے کدا دے، چاہے ٹونڈلا کیا کانپور، الہ آباد، پٹنہ پہونچا دے"

ہمسفر: "تو اب آپ کے روکنے کا ذمہ دار میں نہ ہونگا، بلکہ آپ کا شوقِ رومان"

نوجوان: "بجا ہے"

رفیق سفر کا رومان

ہمارے رفیق سفر نے بے نقاب ہمسفر لڑکی کی طرف دیکھکر یوں تقریر شروع کی:۔

"بھئی میں پردے یا نقاب وقاب کا قائل نہیں، نہ اپنے ہاں یہ روا رکھا جاتا ہے۔ برقعہ پوش مخلوق سے مجھے بچپن سے ہیبت اور اب وحشت ہوتی ہے، نفرت، بیزاری، اختلاج قلب مگر ہم مسلمانوں کا رومان انہیں کمبخت پردوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہ چیز برقعہ میں ہی لپٹی ہوئی ملی۔"

"ہیبت، وحشت، نفرت، بیزاری اور رومان!" نوجوان نے ٹوکا "ایک بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"رومان، میاں تم جوڑ ڈھونڈتے ہو، یہی رومان کا بے جوڑ تخیل ہے۔ رومان کیا ہے؟ کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ تشریح کر سکتا ہوں۔ اچھا تو میری سُن لو پھر رائے قائم کرنا۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ برقعہ سے میری چڑ کیوں ہے؟۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ کالج ہوسٹل کی زندگی، وہ بھی پوسٹ گریجویٹ کی، کتنی مسرفانہ ہوتی ہے۔ جو کچھ چھ سال نواب زادوں کی سی زندگی کا خوگر رہ چکا ہو، یک بیک اس کا وظیفہ بند ہو جائے اور جیب خرچ کیلئے ایک پیسہ میسّر نہ آئے اس کی زندگی کیا ہوگی؟ ایم۔ اے کے امتحان سے چھ ماہ پیشتر والد صاحب کی ملازمت تمام ہوگئی۔ وہ میری فیس کا انتظام کرکے اور پنشن سے پیشگی رقم وصول کرکے حج کو چلے گئے۔ اور شاید یہ سمجھکر کہ کالج سے نکلنے کے بعد گویا کھانے کے سوا میری کوئی اور ضروریاتِ زندگی باقی نہ رہے گی، جیب خرچ کا کوئی سامان نہ کر گئے۔ معاشیات میں ایم۔ اے کی دوسرے درجے کی ڈگری حاصل کرکے میں عجیب مصیبت میں مبتلا رہا۔ اولاً میرے سوٹ ب ملنے ملانے کے قابل نہ رہے تھے، نئے سوٹ بوٹ درکنار، کالر ٹائی، موزے رومال بلکہ بوٹ پالش اور ریلیڈ بلیڈ لیمنٹ کے پیسے نہ تھے۔ دوسرے کانگریسی ارباب حکومت اس لباس سے یوں بھڑکتے تھے جیسے سُرخ کپڑوں سے بھینس۔ میری زندگی کا پہلا رومان تو یہ تھا کہ میں نے چشم زدن میں کھدر پوش ہو کر ایسی جون بدل لی کہ احباب مشکل سے پہچانتے تھے۔ گاندھی کیپ، کھدر کا کرتا اور فتوحی پہن کر دھوتی کے سوا باقی حصّوں سے خاصہ جواہر لال نہرو بن گیا، اور نوکری کے لئے کانگریسی وزیروں اور پارلیمنٹری ممبروں کے آستانوں کا صبح شام طواف شروع کر دیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ میری طرح سینکڑوں اُمیدوار یہی بھیس دھارے اسی گھات میں لگے ہیں۔ اس عمومیت اور طوفان بے تمیزی کا نتیجہ یہ تھا کہ کانگریسی ارباب حکومت کی نگاہ میں سوٹ پوشوں کی قدر کھدر پوشوں سے زیادہ ہوگئی۔ ہمیشہ اول الذکر کی باریابی پہلے اور زیادہ آسانی سے ہوتی۔ وزیر تعلیمات کو بچوں اور بچیوں سے زیادہ بوڑھے جاہلوں اور ہل چلانے والوں کی تعلیم کی دُھن تھی۔ میں نے بھی اس تحریک جہالت میں نمایاں حصہ لینا شروع کیا۔ اخباروں میں اس کی حمایت میں مسلسل مضامین شائع کئے جن کو اڈیٹروں نے بہت پسند کیا۔ سالانہ نمائش میں نقرئی تمغہ ملا۔ مگر حصولِ ملازمت میں کوئی مدد نہ ملی۔ بیسیوں جائز ناجائز سبیلیں سوچیں کوئی کارگر نہ ہوتی۔

مجھے رشک آتا تھا اُن خوش نصیبوں پر جن کو کوئی رومان ہاتھ آجاتا یا دوسرے لفظوں میں خوش بختی چھت پھاڑ کر گود میں آگرتی۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن میں نے ایک رومان پڑھا تھا جس میں ہیرو کو میرے ہی سی حالات میں راہ چلتے کسی نے رحم کھاکر موٹر میں اُٹھالیا۔ راہ میں ایک جنگل میں بدمعاشوں کا ایک جتھا ملا جو ایک دوشیزہ کو کھینچے لئے جاتا تھا۔ موٹر رُکی۔ بدمعاشوں سے مقابلہ ہوا، ہیرو نے بڑی بہادری سے زخم کھاکر جتھے کو بھگا دیا۔ لڑکی بچ گئی۔ وہ موٹر کے مالک کی رشتہ کی بھانجی نکلی۔ کہا تا پیتا گھر تھا۔ آخر دونوں کی شادی ہوگئی ـــ

غیر شہر تھا۔ شام کا وقت۔ میں اپنا دستی تھیلا ہاتھ میں لئے حسب معمول تلاشِ مقصود میں ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ دماغ میں افسانہ چکر کھا رہا تھا اور پاؤں شل۔ سوچ رہا تھا ایسا کوئی موقع مجھے کیوں نہیں ہاتھ آجاتا؟ یہ بھی قسمت کی بات ہے۔ پیچھے سے ہارن کی آواز آئی۔ مڑکر دیکھتا ہوں تو ایک نئی چمکدار چاکلیٹ رنگ کی موٹر، سامنے دیکھتا ہوں تو ایک تانگہ تیزی سے آرہے تھے۔ دائیں ہاتھ ہٹ جانے کی کافی جگہ تھی اور وقت۔ کوئی گھبرانے کی بات نہ تھی۔ مگر ٹانگوں میں ٹھنڈ کا اثر تھا، یا تحت الشعور میں افسانہ کچھ کام کر رہا تھا یا بدحواسی؟ بیچ سڑک پر جیسے میرا پاؤں پھسل گیا اور چت گر گیا۔ مجھ سے دو چار گز پیچھے موٹر رک گئی۔ تانگہ بائیں سے نکل گیا، موٹر سے ایک لڑکی نکلی، بال ترشے، ساری پر جمپر پہنے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے

پوچھا: "آپ کے کچھ چوٹ تو نہیں آئی؟"

وہ بہت خوبصورت تھی یا مجھے معلوم ہوئی۔ چند سکنڈ میں کسی خیال میں غرق رہا۔ وہ سمجھی میں جسمانی تکلیف سے چپ ہوں۔ ہمدردی سے یا گرد جھاڑنے کو میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور پھر پوچھا: "کیا چوٹ زیادہ آگئی کہاں آئی؟"

میں نے رُکتے ہوئے کہا: "نہیں، کوئی اندیشہ کی بات نہیں، البتہ دوسرے لمحہ میں، میں نہ ہوتا، جب بھی کیا بُرا تھا۔ نہ کوئی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔ خیر آپ اس کا خیال نہ کریں"

گویا میں نے جتایا کہ چوٹ تو آگئی مگر آپ کی خاطر پروا نہیں اور میں جینے سے بیزار ہوں۔ حالانکہ قطعاً کہیں کوئی چوٹ تھی نہ دردبجز دل کے۔ یہاں سخت جانی کا یہ عالم کہ ؎

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

دماغ کے کسی حصہ میں دن کا افسانہ ضرور کام کر رہا تھا۔ رومان کا منتظر تھا اور وہ رونما نہ ہوتا تھا۔ اس نے دردمندی سے میرا نام پوچھا شغل پوچھا، دُکھ درد پوچھا، میں نے موقع کے موافق موثر انداز میں عرض حال کیا۔ اُس نے خود کو لاہور کے زنانہ کالج کی ایک طالبہ کی حیثیت سے روشناس کیا۔ سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولی: "بالکل ٹھیک ہے۔ بس یہی ڈیل، یہی قدوقامت۔ آپ ہی کا کام ہے۔ کیجئے گا؟ نہیں تو نہ کیجئے گا؟"

میں حیران کہ الہٰی یہ مجھے نمائش کا گھوڑا یا سانڈ جانچنے کی نظر سے دیکھ رہی ہے، یا مضبوط قُلی یا سپاہی؟ یہ کالج کی لڑکیاں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ پوچھا: "آپ چاہتی کیا ہیں؟"

وہ ہنسی اور موتی سے ہموار دانتوں سے بجلی گرا دی۔

"واقعی یہ میرا بے تکا پن تھا کہ کسی تمہید یا تشریح کے بغیر ایسا عجیب سوال کر بیٹھی۔ تو سمجھ لیجئے، میرا نام ثریا بیگم ہے"

میں: "خوب نام ہے، مجھے بھی خیال ہو چلا تھا آپ میری تقدیر کا کوئی ستارہ ہی بن کر نمودار ہوئی ہیں۔ خیر گذری کہ دُمدار ستارہ نہ ثابت ہوئیں جس کے اندیشے سے ابتک دل دھڑک رہا ہے۔ اچھا تو ضوفشانی فرمائیے"

وہ: "میں کرسمس کی تعطیل میں وطن آئی ہوں۔ میرے ابا خان بہادر اختر مرزا ہیں اور بھائی کوکب مرزا ہیں۔ وہ بھی کالج کے طالب علم ہیں — !"

میں: "غرض پورے آسمان پر آپ کا خاندان محیط ہے۔ خیر، یہ رہا شجرۂ خاندانِ ذکور۔ شاخ اناث ارشاد ہو"

وہ: "آپ میں کالج کی شرارتیں ابھی پوری پوری باقی ہیں"

میں: "بہتر ہے مجھے 'تم' کہو"

وہ: "ہمارا خاندان مختصر ہے۔ ماں کا انتقال میرے بچپن میں ہوگیا۔ گھر میں میرے سوا کوئی عورت نہیں۔ میری ایک کالج کی ہم جماعت سہیلی خالدہ خانم آج صبح ہمارے ہاں آنے والی تھی۔ نہ آئی۔ بھائی نے کہا نہ آئیگی۔ میں نے کہا ضرور آئے گی، ایک ایک سو کی شرط بدی گئی۔ ابھی میں پھر اسٹیشن سے لوٹ کر آرہی ہوں وہ نہ آئی"

میں: "چلو اچھا ہوا تم ایک فضول بوجھ سے سبکدوش ہوئیں"

وہ: "نہیں، میں شرط ہارنا نہیں چاہتی۔ عورت کی کمزوری ثابت نہ ہونے دونگی۔ کسی خالدہ خانم کی تلاش میں ہوں"

میں: "کیا معنی؟"

وہ: "سمجھ لو۔ کوئی خالدہ خانم۔ خالدہ نہ ملی مل گئے تم۔ تو بس خالدہ خانم بننا ہوگا"

میں: "میں؟ خالدہ خانم؟ واللہ خالص رومان، پورے اسّی تولے باون رتی۔ مگر کس طرح؟"

وہ: "بس ایک ہفتہ میرے گھر میری مہمان سہیلی بنکر رہنا۔ وہ پردہ نشیں ہے پردہ میں رہنا ہوگا اور اس بند و قید کے عوض پچاس روپے روزانہ قبول کرو"

میں نے مشکل سے اپنے آپ کو اچھلنے سے تو روکا مگر مُنہ یوں کُھلا کا کُھلا رہ گیا جیسے پنٹو کا بڑا سا رس گولا نگلنے والا ہوں۔

میں: "میں خاصہ تندرست گداز جسم، اوسط قد کا مرد ہوں۔ عورت کا جُثّہ اور قد کہاں سے لاؤنگا؟"

وہ: "تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ میں نے پہلی ہی نگاہ میں بھانپ لیا ہے۔ خالدہ راولپنڈی کی پٹھانی لڑکی ہے پوربی نہیں۔ بس تمہارا ہی قد اور ڈیل ہے"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ گمشدہ رومان پوری شدت سے آرہا تھا: "منظور۔ لاؤ ہاتھ"

میں نے ہاتھ دبایا اُس نے فوراً کھینچ لیا۔ نفسیات جنسی کا تجزیہ میں نہ کرونگا۔ ایک منٹ میں خاموش رہا اور وہ بھی۔ آخر میں نے طلسمِ خاموشی توڑا: "تم چپکی کیوں ہوگئیں؟"

وہ: "ارے توبہ! یہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا کہ اس کام کے لئے پورا زنانہ

بھیس بھی تمہارے لئے مہیا کرنا ہے۔ اس کھدر کی ٹوپی، کرتے، پاجامے، اور کھدر ہی جیسی مونچھوں سمیت تم کو لے جاکر بھائی جان اور نوکروں سے یہ کہنے سے رہی کہ یہ ہیں میری سہیلی خالدہ خانم۔ میرا لباس تو تمہارے آئیگا نہیں۔ پہلے چلو آوٹ فٹر کے ہاں۔"

ہم موٹر میں بیٹھنے لگے تو میرے پاؤں کی طرف دیکھکر بولی "تمہارے پاؤں بہت بڑے ہیں۔ کوئی زنانہ ساٹن شو یا پمپ شو نہیں آ سکتا" پھر کچھ سوچکر بول اٹھی "توبہ میں بعض وقت کیسی کودن ہو جاتی ہوں۔ اب تو چپل کا فیشن ہے۔ چھوٹے بڑے کا سوال ہی نہیں رہتا"

دو گھنٹے میں سازش کے یہ سارے مرحلے طے ہوگئے۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب موٹر "اختر منزل" کی برساتی میں رکی۔ ثریا بیگم کے ساتھ ساتھ میں — خالدہ خانم — برقعہ میں لپٹی لپٹائی آہستہ آہستہ اُتری۔ برآمدے میں ایک خوش وضع نوجوان ملا۔ میں نے فوراً پہچان لیا ثریا کا بھائی تھا۔ دیکھتے ہی بولا "ثریا تمہاری سہیلی آگئیں۔؟ تسلیم مس —— "

ثریا: "خالدہ خانم۔ میرے بھائی کوکب مرزا"

قریب تھا کہ میں حسب عادت مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادوں اور مزاج پوچھوں۔ فوراً اپنی ہیئت یاد آگئی اور چپکا رہ گیا۔

ثریا بولی "بھائی جان میں جیت گئی۔ ان کو ان کے کمرے میں پہونچاکر آتی ہوں اور بازی کے روپے وصول کرتی ہوں"

ثریا نے ایک سجے سجائے خوبصورت دلکشا کمرے میں چھوڑتے ہوئے مجھے متنبہ کر دیا کہ میں بے ضرورت کوئی آواز نہ نکالوں۔ سوالات کے جواب حتی الامکان اُسی پر چھوڑ دیا کروں اور دروازہ اندر سے بند رکھوں۔

کمرے میں سب سامان تیار تھے۔ شاید وہ کوکب مرزا کا کمرہ تھا۔ میں نے شیو کیا، گرم غسل کیا اور اخبار اُٹھاکر آرام کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی کے چلتے چلتے رُک جانے کی آہٹ ملی۔ میں برقعہ پہنے ہی تھا، نقاب ڈال لی۔ مجھے شبہ ہوا کوئی کنجی کے سوراخ سے جھانک رہا ہے۔ میں نے اٹھکر ایک دم دروازہ کھول دیا۔ واقعی کوکب کھڑا تھا۔

پہلے تو مجھے دیکھکر جھجک گیا۔ پھر۔

کوکب: "اُف! ہائے! آہ!"

میں: "اوئی! ہا! ہا!"

کوکب: (اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر) "کیا ستم ہے"

میں: (ٹھنڈی سانس لیکر) "اوہ!"

اتنے میں پہلو کا کمرہ کھلا اور ثریا ایک نفیس بنارسی کریب پر فراک ڈالے بال کھولے تر و تازہ نکل پڑی۔

ثریا: (تیوری چڑھاکر) یہاں کیا کر رہے ہو بھائی جان؟

کوکب: (سر کھجاتے ہوئے) میں سمجھا تھا تم اسی کمرے میں ہو۔ کہنے آیا تھا کہ میں سنیما جا رہا ہوں کھانے پر انتظار نہ کرنا"

ثریا: "پھر ایسی غلطی نہ کرنا۔ میں بتا چکی ہوں خالدہ کا خاندان سخت پردے کا پابند ہے"

کوکب: "مجھے افسوس ہے" کہتا ہوا ٹل گیا۔

ثریا نے مجھ سے پوچھا "کیا باتیں ہوئیں؟"

میں: "اف ہائے! آہ! اوہ!"

ثریا: "کیا بکواس ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

میں: "آہ ستم! اوہ ظلم۔ ہائے ہوئے!"

ثریا: "خیر تو یہ ہائے ہوئے پھر نہ ہونے پائے سمجھیں خالدہ۔ وہ تم سے عشقبازی نہ کرنے پائیں"

میں: "کرنے بھی دو عشقبازی تو رومان کا عروج ہے۔ وہ مجھ سے کریں میں تم سے کروں"

ثریا: "کیا کہا؟ عشقبازی؟ تم؟ مجھ سے؟"

میں: "اور کیا؟ پھر میں کوکب سے؟ بس محض پارٹ کی تکمیل۔ مثلاً۔"

برقعہ سمیت ہاتھ بڑھاکر میں نے اُسے کھینچ لیا۔ وہ غصہ میں سُرخ بیر بہوٹی۔ اتنے میں آدھمکا خانساماں، شاید یہ کہنے کہ کھانا چنا ہوا ہے۔ ثریا دانت پیسکر غصہ پی گئی۔ خانساماں کیا سمجھا ہوگا؟ یہی کہ آجکل کالج کی لڑکیاں آپس میں یوں ہی ملا کرتی ہیں۔ شاگرد پیشوں میں لون مرچ لگاکر چٹپٹی گپ مارنے کا ایک تازہ مسالہ مل گیا ہوگا۔ خیر خدا اس کا بھلا کرے، اُس کی موجودگی میں ثریا غصہ گھونٹ کر نمائشی مسکراہٹ کے ساتھ میرے گلے لگ گئی اور گھسیٹتی ہوئی مجھے کھانے کے کمرے میں لے گئی۔ اب وہ برس ہی تو پڑی۔

"تم نرے گدھے ہو، احمق ہو، شیطان ہو، کمینے ہو۔ تم نے ایک نازک موقع سے ذلیل فائدہ اُٹھاکر میری توہین کی۔ غصہ میں شوربہ اس کے حلق میں اُچھو ہوگیا۔ کھانسنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے جھٹ اپنا رومال اُس کے منہ پر رکھدیا۔ "پیاری ثریا رو نہیں۔ مجھے تو عورت کی کمزوری کھلنے کی بڑی شرم اور آن ہے، پھر یہ کیا؟ اس میں ہوا ہی کیا؟ آج کی رات مجھے الف لیلہ

کے ابوالحسن کی سفہ شاہی یا گانگریس شاہی کا پارٹ کر لینے دو۔ اور یہ رومان پورا ہو جانے دو۔

سحر ہوتے ہی ہم کہاں، تم کہاں
یہ صحبت فقط رات کی رات ہے

ہم دونوں کالج کی جدید الف لیلہ کے آخری اڈیشن ہیں۔ توہین، عزت، آبرو، حیا، عفت، دقیانوسی جذبات ہیں۔ تمہارے ڈرامے میں میرا بھی تو پارٹ ہے اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟"

وہ طناز میرے طنز سے متاثر ہو کر کچھ ٹھنڈی ہوئی۔ اُسکی بقیہ گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ آگ سے کھیلنا چاہتی تھی بے جلے جلائے۔ مگر اب یہ کھیل خطرناک سمجھکر اس سے جلد دست بردار ہو جانا چاہتی ہے۔ لیکن اب میں تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار اور وہ مجبور۔ نہ اپنا بھانڈا آپ پھوڑ سکتی تھی نہ مجھکو نکال سکتی تھی۔

"لیجئے ٹونڈلہ قریب آگیا، کہئے کہاں تک چلئے گا؟"

نوجوان "آپ کہے جائیے میں کلکتہ تک جا سکتا ہوں"

"نہیں میں آپ کو زیادہ نہ ستاؤنگا۔ قصہ مختصر کئے دیتا ہوں۔

ایک ہفتہ گذرتے گذرتے وہ بھی مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی۔ اُس نے مجھ سے اپنی درسی کتابیں حل کیں، دنیا جہان کے مباحث پر تفریحی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی، جنگی، خاکساری، مذہبی، سنجیدہ، غیر سنجیدہ گفتگو رہی۔ روز بروز میری اندرونی شرافت کا نقش اسکے دل پر اور اس کی پاکبازانہ فطرت کا مجھ پر گہرا ہوتا گیا۔ میں دو ہفتے رہ گیا مگر یہ زہرہ گداز امتحان کے دن تھے۔ ہم دونوں اس آتشیں کھیل کی آنچ میں کُھن رہے تھے۔ آخر رخصت ہوا تو اس قرارداد کے ساتھ کہ اسکے ایسٹر میں امتحان کے بعد خالدہ کے بھائی کی حیثیت سے وہ مجھے پھر اس مکان میں مہمان لائے۔

ایسٹر کے اندر اندر ثریا نے باپ اور بھائی کو خالدہ کی بھائی یعنی میری تعریفوں کے طومار سے صرف ہموار نہیں بلکہ نادیدہ مشتاق بنا رکھا تھا۔ میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا۔ المختصر ثریا سے میری شادی ہو گئی اور اُسی مہینے معاشیات کی پروفیسری میں کامیاب۔

ٹونڈلا آگیا۔ اسٹیشن کے شور و شغب میں نہ اب کچھ سنائی دیتا تھا نہ سننے کی ضرورت۔ کہانی بھی ختم ہو چکی تھی۔ نوجوان نے ہم سب سے ہاتھ ملایا" مجھے آپکے روک لینے اور ریچ کے کھونے کا غم نہیں، خوشی ہوئی۔ یہ لیجئے میرا کارڈ اپنا پتہ دیجئے۔ شاید میں کبھی کبھی آپ کو اپنا زیر تعمیر رومان اتمام کے بعد سنا سکوں۔ خدا حافظ نعیمہ۔ ان کی عافیت کا خیال رکھئے گا۔ السلام علیکم۔ علیکم السلام۔ گڈ لک!"

محمد مسلم

سچّے فرشتے

ایک آدمی انتہا سے زیادہ عابد و پرہیزگار تھا اور عرصہ سے یادِ خدا میں مشغول رہتا تھا حتیٰ کہ اُس کے زہد و عبادت کا غلغلہ زمین سے اُٹھ آسمان تک پہونچا۔ اور فرشتوں نے آپس میں ایک دوسرے سے اس عابد و زاہد کی تعریف کی۔ اس عابد کو عبادت کرتے عرصہ گذر گیا۔

اُسکے پڑوس میں ایک آدمی آکر رہا۔ اس آدمی کی خوبصورت لڑکی کی آواز نے عابد کے یادِ الٰہی میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ جھنجلا کر اُسنے کہا: "یہ قطامہ غُل مچاتی ہے"

اور تھوڑے دن میں اُس کی آواز میں شیرینی سی پیدا ہوتی معلوم ہوئی۔ جس کو عابد نے محسوس کیا۔ مگر اُس نے خدا کی طرف دھیان لگایا۔

اور اُسکی آواز میں زیادہ شیرینی پیدا ہوتی گئی "اُسکی صورت کیسی ہوگی!" عابد کے دل میں خیال آیا اور چلا گیا۔

مگر اس کی آواز ایک بے کلی اور بےچینی پیدا کرتی رہی۔ "اُسکی صورت شکل کیسی ہوگی!" زاہد نے دل میں سوچا۔ اور اب دل سے یہ خیال نہیں گیا۔

پھر ایک روز اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے مونڈھے پر کھڑے ہوکر دیوار پر سے جھانکا۔ جھانکا تو وہ چُھپ کر مگر ہوا سے اس کی ڈاڑھی اُڑکر دیوار پر آ آئی۔ لڑکی کا باپ بیٹھا حقّہ پیتا تھا اور ماں اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ ماں نے دیکھکر کہا: "دوئی۔ یہ مینا کو دیکھو کیسی جھپاک سے اُڑ گئی"

"کدھر؟"

"اے تم نے دیکھا نہیں... اے... وہ دیکھو وہ..." اور ڈاڑھی اُڑکر پھر اس طرف آ آئی اور جنبش سے چلی گئی۔

"مینا!... اندھی ہو تم تو..."

"دوئی! یہ تو مُلّا کی ڈاڑھی ہے... اے جھانک رہا ہے موا... اے تمہیں خدا کی قسم، لو اور سُنو...."

"اور ہٹتی بھی نہیں ہو... چل کمبخت... بدمعاش... ٹھہر تو جا"

اندر بیوی نے قیامت مچا دی اور باہر میاں نے محلّہ سر پر اُٹھا لیا۔ اور لوگ دوڑے آئے۔ اور لٹھ لیکر لڑکی کا باپ آیا اور بولا "سر پھاڑ دونگا۔ تم کیسے جھانکتے ہو"

عابد نے کہا: "غلط ہے۔ میں نے ہرگز ایسا نہیں کیا"

ایک اور آدمی نے گواہی دی: "ہم نے تمہاری ڈاڑھی دیوار پر تو دیکھی"

ایک دوسرے آدمی نے کہا: "ہم نے تمہاری ڈاڑھی ہوا میں منڈیر پر ہلتی دیکھی تھی"

اور زاہد نے خدا کی قسم کھائی کہ میں نہیں جھانکا۔ آدمی جمع ہوگئے تھے۔ انہوں نے قصہ سُنا۔ حیرت میں تھے۔ یہی کہا کہ دھوکا ہوا ہوگا جانے دو۔ اور عابد نے جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑائی۔

آسمان پر غلغلہ مچا! فرشتوں میں ہلچل! خدا کی پناہ! فرشتوں نے کہا: "ہم جس کو اپنے لئے قابلِ تقلید سمجھتے تھے وہ ایسا جھوٹ بولا"

دوسرے فرشتے نے اس پر لعنت بھیجی کہ "یہ انسان اسفل السافلین ہے۔ ہم اس کے دھوکے میں رہے جو اسکی تعریف کرتے رہے"

اور ایک تیسرا بولا کہ "اس انسان نے جھوٹ بول کر زمین سے لیکر عرش تک کی فضا کو ایک کثافت سے معمور کر دیا ہے"

اور دو پُرجوش فرشتے بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوکر عرض گذار ہوئے کہ "اے خداوندا تو اس جھوٹے انسان پر بجلی گرا کر اس کو جہنم میں ڈالدے تاکہ یہ ابد تک جلتا رہے"

خداوند تعالیٰ نے سُنا اور کچھ نہ کہا۔ فرشتوں نے پھر عرض کی اور پھر خداوند تعالیٰ نے سُنا اور کچھ ارشاد نہ فرمایا۔

اور کئی روز بعد خداوند تعالیٰ نے اپنے اس پیارے بندے کی عبادت و ریاضت کو نہ صرف قبولیت کا درجہ بخشا بلکہ اُس کو مدارج عطا فرمائے۔

فرشتے پُرزور احتجاج سے چیخ پڑے۔ اپنے بال نوچے اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوکر عرض گزار ہوئے کہ "الٰہی اس جھوٹے شخص کی عبادت مت قبول فرما اور اس کو جہنم میں ڈال تاکہ عبرت ہو—!"

خدا نے فرشتوں کی بات سُن کر اس دفعہ بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اُن میں سے دو جو پیش پیش تھے اُن سے بلا کر کہا "دیکھو جھوٹ مت بولنا۔ جاؤ دُنیا میں انسان کے بھیس میں میں نے

تم کو بھیجا۔ مگر جھوٹ سے بچنا۔"

فرشتے سجدے میں گرے۔ اور بولے "خدایا ہم بھلا کیوں جھوٹ بولیں گے۔" اور مارے خوشی کے فرشتے پھولے نہ سماتے۔ آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے اور کہنے لگے کہ "خداوند تعالیٰ کی یہ مرضی معلوم ہوتی ہے کہ نبیوں کو شرمندہ کرے۔ اور اُن کو دکھائے کہ دیکھو فرشتے کیسا اچھا کام کرتے ہیں اور تم سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اور دونوں فرشتے بولے کہ "ہمارے کارنامے نبیوں سے بڑھ جائیں گے اور ہم دُنیا کو خدا کے نور سے روشن کر دینگے اسکی توحید اور صداقت کا ڈنکا بجا دینگے۔"

ایک اور فرشتہ بولا کہ "معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دریائے رحمت جوش میں آگیا۔ اور باری تعالیٰ نے طے فرما لیا کہ جھوٹ کو دُنیا کے پردے سے نابود کر دے۔ اور یہ دونوں فرشتے بولے کہ ضرور ایسا ہی ہے اور خداوند تعالیٰ کی مرضی معلوم ہوتی ہے کہ نبیوں کو بتا دے کہ دیکھو تم جھوٹ کی لعنت کو پردۂ دُنیا سے نہ مٹا سکے۔ جس کو اب میں مٹاتا ہوں۔

اور یہ دونوں فرشتے خوش خوش زمین پر نازل ہوئے۔

(۲)

دونوں فرشتے خوش خوش سیدھے اُس شہر میں داخل ہوئے جس میں وہ زاہد رہتا تھا۔ ایک پولیس والے نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اُسلئے سیدھے سوالات کئے۔

اب چاروں طرف فرشتے دیکھتے ہیں کہ یکسر لوگ خدا سے غافل دُنیا کے لہو و لعب میں پڑے ہیں۔ اور دُنیا کیا تماشہ ہے۔ ہر شخص فسق و فجور میں گرفتار ہے۔ خدا کے وجود کی طرف سے یکسر غافل۔ اور جھوٹ کی لعنت میں گرفتار ہے۔ فرشتوں نے آپس میں رائے قائم کی۔ یہ شہر تو اس قابل ہے کہ فوراً اس پر خدا کا عذاب نازل ہو۔ اس کا تختہ لوٹا جانا چاہیئے! یہ شہر قائم ہی کیسے ہے۔

اتنے میں ایک غنڈے نے ایک فرشتے کے چانٹا دیا اور دھکیل کر بولا؟ اندھا ہے بے! دیکھ کے بھی چلتا ہے! ابھی کچل دیا ہوتا۔"

دوسرا فرشتہ موٹر سے بچ گیا ہوتا!

اور دونوں بازاروں میں ہونقوں کی طرح رہ گئے! ایک ہوٹل میں پہونچے۔ جہاں شہر کے لفنگے مزے اڑا رہے تھے۔ کچھ کھایا پیا۔ ایک غنڈے سے تبادلہ خیالات ہوا۔ کچھ اختلاف آرا ہوا۔ اور انہوں نے کہا "تم خدا سے یکسر غافل ہو۔

غنڈے نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "یار ہم تم کو جان گئے۔ تم کون ہو؟"

اور فرشتوں نے سمجھا کہ یہ کوئی مقبول بارگاہِ خداوندی تو نہیں جو اس کو معلوم ہو گیا کہ ہم فرشتے ہیں! اور وہ ذرا بیکل ہوئے۔

اُس نے پھر کہا "ہم جان گئے۔"

فرشتے نے کہا "کیا جان گئے۔"

"جان گئے!... بتائیں پھر...!"

"بتاؤ۔"

غنڈے نے قورمہ کا ہاتھ بڑھا کر کہا "یار! ہم جان گئے۔ تم سندھ کی طرف عورتیں فرار کراتے ہو۔ کو کیں...! (سر ہلا کر) نہ کہنا... کہدوں پولیس میں...!"

اور جب فرشتوں نے قسمیں کھائیں اور یقین دلایا تو غنڈے نے ہنسکر کہا "تم اول نمبر کے جھوٹے ہو۔"

اور فرشتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ کیسی دُنیا ہے۔ ہمیں یہ شخص مفت خدا جھوٹا کہتا ہے! ہمیں جلد اس جھوٹ کی لعنت کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔

اور فرشتے وہاں سے نکلے تو دیکھتے ہیں کہ خلقت ہے کہ ایک طرف اُڑی جاتی ہے۔ ایک پولیس مین نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "ہٹو... لاٹ صاحب آ رہے ہیں۔"

اور لاٹ صاحب ایک رئیس کے یہاں دعوت میں آ رہے تھے۔ بڑا انتظام تھا۔ اور ان کو دو آدمی ملے۔ انہوں نے کہا "چلو ہم تم کو دکھائیں۔"

اور گھوم کر یہ لوگ ایک باغ کو طے کر کے پہونچے کہ ایک چپراسی نے ٹوکا اور منع کیا۔ اور کہا کہ ہرگز اُدھر نہ جانا۔ یہ لوٹ آئے۔

مگر پھر آنکھ بچا کر دونوں آدمی اور یہ گھاس پر ہوتے ہوئے نکل گئے۔ فرشتوں نے آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا خدا کے احکام تھوڑی ہیں کہ اُدھر نہ جاؤ۔ یہ انسان کے احکام ہیں۔ خود آدمؑ نے احکامِ خداوندی نہیں مانے۔

آگے جا کر چاروں پکڑے گئے۔ اُن دونوں آدمیوں نے فرشتوں کو مشورہ دیا کہ کہدینا کہ "ہم بیگار میں پکڑے آئے تھے سو محل پر سے آتے ہیں۔"

فرشتوں نے کہا "ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

وہ دونوں آدمی چھوٹ گئے پر یہ سچ بولے۔ چپراسی بھی وہ آگیا جس نے منع کیا تھا۔ یہ ایک موٹے سے جمعدار کے روبرو پیش کیے

اُس نے پوچھا "جب تم کو منع کر دیا تھا تو کیوں نہ مانے۔ دیکھتے نہیں اُس طرف زنانہ ہے"

ایک چپراسی بولا کہ "یہ پرانی عورتوں کو تکنے آئے تھے"

"تکنے کیوں تھے؟ حکم کیوں نہیں مانا؟ سوال تو یہ ہے"

اور فرشتوں نے کہا "لوگ خدا کا ہی حکم نہیں مانتے تم کون چیستہ ہو"

جمعدار نے کہا "انکے کان کھینچو"

سپاہی نے کان کھینچے اور بولا "یہ تو نمبر دس کے بدمعاش معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے مُرتے ہیں انکو پولیس میں دیدوں؟"

جمعدار نے کہا "نہیں اب پولیس میں کہاں دیتے پھروگے۔ انکے ایک دو لاتیں مارو اور نکالدو" چنانچہ یہی کیا گیا۔

اور فرشتے لاتیں کھا کر حیران و پریشان اب پتہ لگاتے اُس عابد کے گھر کی طرف چلے۔

راستہ میں ایک مجمع کثیر ملا۔ سخت مذہبی مباحثہ ہو رہا تھا۔ تالیاں بج رہی تھیں۔ جب مقرر جوش میں تقریر کرتا تھا۔ ایک دہریہ ایک مولوی صاحب سے مناظرہ کرتا تھا اور اُس نے مولوی کو اپنی کج بحثی سے پست کر دیا تھا۔ اور فرشتے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اُچک اُچک کر سننے لگے! اور جو کچھ سنا اُس کو سُنکر لرز گئے۔ یہ مقرر خدا کے وجود سے منکر تھا یکسر منکر۔ اور سینکڑوں آدمی اُسکے ہمخیال!

خدا کی پناہ! فرشتوں نے آسمان کی طرف دیکھا کہ قہرِ خداوندی اس مقرر پر اب نازل ہوتا ہے! اُفوہ! فرشتوں نے کانوں میں اُنگلیاں دی لیں۔ خدا کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ اُسکے وجود کا تمسخر۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر کوئی بجلی نہ گری! کوئی قہر نازل نہ ہوا۔ اور جوش میں مقرر نے انتہا سے زیادہ سخت باتیں کہیں اور دلیل لایا کہ جس کو کسی نے نہیں دیکھا اُس کو کیسے مانیں۔ کسی نے خدا کو دیکھا ہوتا اور وہ کہتا تو البستہ یقین مان لیتا۔ اور فرشتوں نے سوچا کہ یہ موقع ہے۔ اپنا کام یہیں سے شروع کر دیں۔ اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوگا۔ ہم خدا کے وجود کے چشمدید گواہ ہیں۔ کیوں نہ اس کو قائل کر کے اس کی آنکھیں کھولدیں۔ ہم پر فرض ہوگیا کہ خدا کے وجود پر گواہی دیں۔ اور دونوں بلند آواز سے خدا کی حمد گاتے آگے بڑھے اور پکار کر کہا کہ ہم سے پوچھو۔ ہم موجود ہیں۔ مت بکواس کرو۔ ہم نے خدا کو دیکھا ہے۔

مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور یہ دونوں پلیٹ فارم پر پہونچے۔ کے وجود پر شہادت اور دلیل لاتے۔ اور سینہ ٹھونک کر کہا۔

"ہم گواہی دیتے ہیں اس جبار و قہار کے وجود کی۔ اور ہم نے اُسے دیکھا ہے:

ایک قہقہہ زور سے بلند ہوا۔ تالیاں بجنے لگیں۔ اور تمسخر آمیز آوازے کسے جانے لگے۔ لوگوں نے خدا کا حلیہ پوچھا۔ کوئی منہ، کوئی ہاتھ کوئی ناک اور کوئی کان کو پوچھتا۔ اور کسی نے کہا کہ ان کی صورت تو دیکھو حوتق جیسے۔ کسی نے کہا پنڈ ہیں۔ کسی نے اُلو بتایا اور کوئی بولا کہ ٹھگے ہیں۔ اوّل نمبر کے جھوٹے۔ جھوٹے بھی کیا احمق۔ ایک اور بولا "پاگل ہیں"

اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ لوگ ٹھوکا دیکر ہنس ہنسکر پوچھنے لگے۔

کسی منچلے نے سر پر دھول رسید کی اور بہتیرا مقرر اور صاحب صدر نے روکا پر لوگوں نے پیٹوں پر دھر لیا۔ اور فرشتے ایسا بوکھلائے کہ مجمع سے بھاگے۔ بمشکل سر سلامت لیکر نکلے۔ بمشکل گلی کے چھوکروں کو سے بچے۔ اور بھاگے وہاں سے۔ سخت حیرت میں کہ یہ لوگ کیسے ہیں! اور اب پوچھتے پوچھتے اس عابد کے گھر پہونچے، اور کہا کہ "ہم آپ سے فیض حاصل کرنے آئے ہیں"

عابد نے اُن کو اخلاق کے ساتھ ٹھہرایا۔ آرام سے رکھا اور بڑی نرمی سے کہا "بھائی آرام سے رہو لیکن تم دونوں جوان ہو سامنے کی دیوار کی طرف نہ جانا۔ ادھر زنانہ ہے۔ اور نہ دیکھو اندر نہ جھانکنا اسی میں شرافت ہے"

—— ۳ ——

فرشتوں کو یہ تو علم تھا کہ عابد جھانکا اور جھوٹ بولا۔ مگر یہ پتہ بھی نہ تھا کیوں جھانکا۔ لیکن بہت جلد اس خوبصورت لڑکی کی دلکش آواز نے ان فرشتوں کو بھی عابد کی طرح بیکل کر نا شروع کیا۔

چنانچہ ایک دن جبکہ عابد دوسری طرف مشغول تھا، انہوں نے مشورہ کیا کہ آخر کیا مضائقہ ہے۔ عابد نے منع کیا ہے۔ خداوند تعالےٰ نے منع تھوڑی کیا ہے۔ عابد کا حکم انسانی کیا وقعت رکھتا ہے جبکہ آدم نے خود حکمِ خداوندی نہیں مانا۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ اور دونوں مونڈھے پر کھڑے ہو کر اس طرف جھانکے۔

عورتوں نے غل مچایا۔ اس لئے کہ عابد کی طرح ترکیب اور ہوشیاری سے نہیں جھانک رہے تھے اور چشم زدن میں لڑکی کا بھائی اور باپ نکل آئے اور انہوں نے دیکھا کہ دو جوان آدمی جھانک رہے ہیں۔

ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ اور غل مچاتے عابد کے گھر پر چڑھ آئے۔

اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ عابد حیران و پریشان کہ یہ کیا غضب ہوا۔ فرشتوں سے اُس نے کہا: "یہ کیا غضب کیا۔ منع کیا پر نہ مانے۔"

فرشتے بولے: "خود آدم حکمِ خداوندی نہ مانے۔ تمہارا حکم ہم کس طرح مانے جا سکتا ہے؟"

عابد نے کہا: "خیر جو ہوا سو ہوا۔ پر اب اس شر کو مٹاؤ۔"

"وہ کیسے؟"

عابد نے کہا: "کہہ دینا کہ ہم نہیں جانتے۔ یا کہہ دینا ہمیں نہیں معلوم تھا۔"

اور فرشتوں نے برافروختہ ہو کر کہا: "تم ہمیں جھوٹ کی ترغیب دیتے ہو۔ لعنت ہے تمہارے اوپر۔ ہم تو جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ہمیں خوب معلوم ہے ہم کیوں جھانکے۔ ہم یہ بھی نہیں کہیں گے۔"

اور جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے سچ سچ کہہ دیا کہ ہاں ہم جھانکے تھے۔ وجہ پوچھی تو وہ بھی بتا دی کہ لڑکی کی آواز کی کشش کے سبب جھانکے تھے۔

اور منہ سے یہ نکلنا تھا کہ لڑکی کا باپ اور بھائی جھپٹ پڑے اور دوسرے لوگ بھی۔ اور ان کو بری طرح مارنا شروع کیا۔ ان کی دیدہ دلیری کے سبب سب ہی غصہ میں تھے۔ اور ان کو خوب مارا اور پھر پولیس میں پکڑا کر دے گئے۔

کسی نے کہا: "بڑھیا کو بھی یہی فرار کرا لے گئے۔"

بڑھیا ایک بہشتی کی لڑکی تھی جو لاپتہ تھی۔ پولیس مصروفِ تفتیش تھی پر سراغ نہ ملتا تھا۔

۴

پولس کے تھانہ میں پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک زبردست آدمی، چہرے سے غصہ عیاں، بیٹھا ہے اور اُس نے خونی نظریں ڈالکر ان کو دیکھا۔

اور ایک کانسٹبل نے بڑھکر کہا: "حضور یہ وہی مشکوک آدمی ہیں جن کی رپورٹ فدوی کر چکا ہے۔"

کاغذ نکالا گیا۔ اس میں رپورٹ درج تھی کہ آج دو آدمی مشکوک آوارہ منش داخلِ شہر ہوئے ہیں۔ حلقہ کانسٹبل مطلع کیا جاوے اور یہ دونوں حلقہ کانسٹبل کے زیرِ نظر تھے۔

حلقہ کانسٹبل نے بتایا کہ کس طرح اس کا ان پر شبہ تھا۔

تھانیدار نے ان کو قریب بلایا اور منشی کو حکم دیا کہ انکے بیان لکھتا جاوے۔ ان سے تھانیدار نے ان دونوں کا نام پوچھا۔

اور ان دونوں نے اپنے نام بتائے۔

تھانیدار نے ہنسکر کہا: "کس احمق نے تمہارے نام رکھے ہیں؟"

اور فرشتے لرز گئے۔ سمجھے اب عذابِ خدا اس گستاخ پر نازل ہوتا ہے۔ خدا کی پناہ! مارے خوف کے اُن کے چہرے اتر گئے۔ یہ نام تو اُن کو بارگاہِ خداوندی سے ملے ہیں۔ اُن کے نام تو خداوند تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ کوئی قہر نازل نہ ہوا۔

"اور باپ کا نام؟"

فرشتے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انکے نہ ماں تھی نہ باپ، وہ کیا بتلاتے۔

کہاں سے آئے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کبھی دفعہ دس میں چالان تو نہیں ہوا؟ زیرِ نگرانی پولیس تو نہیں؟ کبھی سزا تو نہیں ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور فرشتے کیا جواب دیتے۔ انہوں نے صرف یہ جواب دیا کہ "حمدِ خدا کرتے ہیں اور یہی پہلے کرتے تھے اور حکمِ رب بجا لاتے ہیں۔ دفعہ دس میں چالان نہیں ہوا بلکہ جانتے ہی نہیں دفعہ دس کیا ہے۔ سزا کبھی نہیں پائی۔ الامان۔ خدا کی پناہ! کبھی رب العزت کی نافرمانی نہیں کی اور کوئی سزا بھی نہیں پائی۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔"

"اور باقی سوالات کے جواب؟"

فرشتے کچھ نہ بولے۔ دم بخود۔ اور جب زیادہ پوچھا تو کہا: "ہم نہیں بتاتے۔"

"نہیں بتاتے!" دھاڑ کر تھانیدار نے کہا: "میرا حکم نہیں مانتے۔"

اور فرشتوں نے نرمی سے کہا: "ہم سے اور سوالات نہ پوچھو۔ ہم نہیں بتاتے۔ اب رہا تمہارا حکم تو وہ کوئی چیز نہیں۔ تم خود آدم کی اولاد ہو، جس نے خدا کا حکم نہ مانا۔ ہم پر سوائے خدا کے کسی کا بھی حکم ماننا لازم نہیں۔"

"اچھا..." تھانیدار نے کہا: "آپ صرف خدا کا حکم مانیں گے... میرا حکم نہیں مانیں گے۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ میرا حکم کیا ہے..."

اور یہ کہکر پکارا: "ارے جمن..."

اور ایک زبردست کانسٹبل دوڑا آیا: "جی حضور!"

"ذرا انکے ہوش تو درست کر دو۔ یہ حکم نہیں مانیں گے۔"

اور جمن جو گالیاں دیتا مارنے پر پلا ہے تو مارتے مارتے اُس نے ان کا حلیہ دُرست کر دیا۔ اور مارنے کی پہلی قسط ختم کر کے ذرا دم لینے کو ان کو حوالات میں ڈالدیا۔

حوالات میں زاہد بھی بند تھا۔ اُس نے ان سے کہا: "خدا تم کو نیک ہدایت دے۔ تم نے کیا قیامت برپا کی۔ اور میرا کہنا نہ مانا۔ اے کاش کہ تم میرا کہنا مانتے۔"

اور فرشتے خفا ہوئے کہ تم نے ہم کو جھوٹ کا مشورہ دیا تھا۔

زاہد نے کہا: "درست ہے۔ تمہارا کہنا تو سچ ہے، پر کیوں سچ کو بدنام کرتے ہو۔ تم نے کیسا شر اُٹھایا۔ لڑکی کی منگنی چھوٹ گئی۔ محلے میں قیامت بپا ہوئی۔ لڑکی کے گھر قیامت ہے۔ اب اس کی دوسری جگہ شادی دُشوار کر دی۔ اور مجھ غریب کو بڑھیا کے سلسلہ میں گرفتار کرا دیا ہے۔ اور پھر بھی نہیں مانتے۔"

فرشتوں نے کہا: "ہم نہیں مانیں گے۔ تم جھوٹے ہو ہمیں بھی جھوٹ سکھاتے ہو۔"

زاہد نے کہا: "اے میرے دوستو۔ تم حقیقت سے بہت دُور ہو۔ ایک دفعہ مجھ سے بھی یہی لغزش ہوئی تھی۔ عمر میں پہلی دفعہ۔ اور میں نے بھی تمہاری طرح لڑکی کو جھانک کر دیکھا۔"

"اور جھوٹ بول گئے۔" حقارت سے فرشتہ بولا۔

"ہاں۔ میں نے جھوٹ بولنے کے گناہ کی پاداش میں دوزخ میں جانا منظور کیا بہ نسبت اس کے کہ وقتی لغزش سے وہ کچھ کر دوں جو تم نے کر دیا۔ اور سوچو کہ میرے بہت سے مُریدین کو میری ہدایت سے راہ راست حاصل ہو رہی تھی، اُن کا کیا حال ہوتا۔ اور سب کچھ صرف میری ذرا سی وقتی لغزش سے۔ چنانچہ میں نے جھوٹ بول کر بڑے بھاری فتنے کا سدباب کر دیا۔"

"تو کیا ہم بھی جھوٹ بولیں۔"

"تم جانو، مگر میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس فتنہ کو فرو کرو۔ اب تم یہ کرو کہ پولیس والوں سے حقیقت نہ چھپاؤ۔ بھلا پولیس والوں سے اصلیت کب چھپے گی۔"

اور فرشتے چونکے! "کیا پولیس والے ولی اللہ ہیں۔ کیا یہ تھانیدار مقبول بارگاہِ خداوندی ہے!"

اور زاہد ہنسکر بولا: "اُن سے بھی بڑھکر۔"

فرشتوں نے کہا: "ہم تو یقین نہیں کرتے۔" اور زاہد نے خیال کیا کہ ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ اور پھر مشورہ دیا کہ چھپانا ہے تو خیر تم جانو، پر کچھ تو غلط سلط بتا دو۔ باپ کا فرضی نام، جگہ کا فرضی نام۔ اور اسی طرح کچھ تو بتا دو۔ پر فرشتوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ اور اُنہوں نے کہا کہ ہم جھوٹ نہیں بولیں گے۔

فرشتے تیسرے پہر کو پھر تھانیدار کے روبرو پیش ہوئے اور اپنی بات پر قائم۔ اور تھانیدار نے اُن سے کہا کہ "اب تم سچ سچ بتاؤ کہ بڑھیا کہاں ہے؟"

فرشتوں نے قسمیں کھائیں۔ کانوں پر ہاتھ دھرے اور لاعلمی ظاہر کی۔

ایک کانسٹبل نے کہا: "ہو نہ ہو تم ہی نے بڑھیا کو چھپایا ہے۔"

دوسرا بولا: "اور ابھی ان کو بتانا پڑیگا۔"

ایک اور بولا کہ "صورت دیکھو اوّل نمبر کے بدمعاش و جھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔"

ایک اور بولا: "جب ہی تو باپ کا نام نہیں بتلاتے اور اتہ پتہ نہیں دیتے۔"

ایک اور بولا: "دیں کیسے؟ پکڑے نہ جائیں اصل جرم میں۔ ارے یہ اور کوئی جُرم کر کے بھاگے ہیں۔"

"اور مجھ سے اصلیت کب چھپے گی!" تھانیدار گرجکر بولا: "اپنی اصلیت کب تک چھپائیں گے۔"

اور پھر فرشتے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے کہ یہ تھانیدار مقبول بارگاہِ خداوندی تو نہیں جو رموز سے آگاہ ہے! مگر نہیں!۔

اور تھانیدار نے آخری موقعہ دیا کہ "دیکھو بڑھیا کا پتہ دو اور بتاؤ کہ تم کون ہو۔" اور جب یہ نہ مانے تو اُس نے جمن کو تعینات کر کے ان کو حکم دیا کہ مُرغا بنائیں جائیں۔

اور یہ دونوں مُرغا بنائے گئے۔ جمن نے کہا ذرا پیٹھ نیچی کی نہیں کہ مارونگا۔ اور اِدھر ذرا پیٹھ جھکی کہ تڑاتڑ اق سے ہنٹر۔

"ٹانگیں اور پھیلاؤ۔" تھانیدار بولا۔ اور اُن کی ٹانگیں اور پھیلائی گئیں۔ "اور پھیلاؤ" پڑا ایک ہنٹر۔ اور پھیلائیں۔ اتنی کہ گنجائش نہ رہی۔

اور فرشتے سخت تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ یہ تو نئے قسم کا عذاب تھا جو دوزخ میں بھی رائج نہیں۔ اس میں تو سخت تکلیف ہوتی تھی۔

اور جب زدوکوب میں سختی کی گئی اور ان کو سخت تکلیف ہوئی تو گھبرا اُٹھے۔ سوچے کیا کریں۔ تھانیدار سے انہوں نے علیحدہ حقیقت بتانے کا ارادہ کیا۔ ایک دوسرے سے مشورہ کر لیں۔ اور تھانیدار نے اجازت دیدی۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہا مضائقہ ہے اس جا بیہد

قاہر شخص کو نیک راہ پر ڈال دیں۔ بتا دیں کہ ہم کون ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے منع تو نہیں کیا کہ اصلیت نہ بتانا۔ کیا عجب ہے جب یہ راہ راست پر آجائے اور خلق خدا اس کے ظلم و جبر سے چھٹکارا پائے۔ اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

اور دونوں نے تھانیدار سے کہا کہ اب پوچھو ہم سچ سچ بتادیں گے۔ جمن کو ہٹا دیا گیا اور انہوں نے تھانیدار کو خدا کے غضب سے ڈرنے کی تلقین کی۔

تھانیدار نے کہا" جب تک بڑھیا نہیں ملتی اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ میں سپرنٹنڈنٹ کے غضب سے اور تم میرے غضب سے ڈرو۔ خدا کے غضب سے فرصت میں ڈرتے ڈراتے رہنا۔ مقدمہ اہم اور سنگین ہے اور سپرنٹنڈنٹ کی تاکید سخت!"

اور فرشتے پھر خوف خدا سے لرز گئے اور نرمی سے بولے کہ ہم تمہارے اوپر رموزِ خداوندی روشن کئے دیتے ہیں تم ہم سے پوچھو

"تم رموزِ خداوندی روشن کرو گے!"

"ہاں"

"مع بڑھیا کے پتہ کے؟"

اور جب فرشتوں نے بڑھیا سے لاعلمی ظاہر کی تو تھانیدار بگڑ کھڑا ہوا۔ مگر انہوں نے سمجھایا کہ جب ہم رموزِ خداوندی بتا دیں گے تو پھر تم خود ہی بڑھیا کو تلاش کر لوگے۔

تھانیدار نے کہا" مجھے رموزِ خداوندی سے زیادہ بڑھیا کی ضرورت ہے اور تم جانو یا نہ جانو پر میں تم سے اگلوا لوں گا مگر ہاں تم سچ بولنے کو کہتے ہو تو بتاؤ۔ اور سچ بتاؤ"

فرشتے حیرت میں رہ گئے کہ یہ کیسا انسان ہے جس کو رموزِ خداوندی سے زیادہ بڑھیا کی ضرورت ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا "ہم سچ سچ کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی باپ نہیں۔ ہم آسمان پر رہتے ہیں خدا کے خادم اور فرشتے ہیں۔ ہم سزا یافتہ نہیں ہیں۔ کبھی خداوند تعالیٰ کے احکام کی ہم نے نافرمانی نہیں کی۔ اور کوئی سزا نہیں پائی۔ ہم خدا کی حمد کرتے ہیں اور کوئی چوری ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ تم آنکھیں کھولو اور پہچانو ہم کون ہیں"

اور اب فرشتے منتظر ہوئے کہ تھانیدار راہِ راست پر آیا۔ مگر اس نے سنتے ہی زور سے قہقہہ لگایا۔ اور ان کی صورت دیکھی اور ہنستے ہوئے بولا" تم فرشتے ہو؟ آسمان سے آئے ہو؟ خیر... کہیں سے آئے ہو— تم نے تو رموزِ خداوندی بتا دئے، اور اب میں تم کو رموزِ خداوندی بتاتا ہوں۔ یاد کرو گے کبھی کسی انسان سے پالا پڑا تھا"

اور اس نے جمن کو بلا کر سخت پٹوا کر مرغا بنا دیا اور کہا۔

"ٹانگیں پھیلاؤ"

اور فرشتوں نے ٹانگیں پھیلائیں۔ "اور! اور!" حتیٰ کہ مارے تکلیف کے مرے جانے لگے۔ حواس زائل ہو گئے۔ اوپر سے مار! اور حکم یہ کہ ٹانگیں اور پھیلاؤ۔

"خدایا یہ کیسی دنیا ہے!" فرشتوں نے حیران ہو کر کہا۔

اور تھانیدار نے کہا" بڑھیا کو بتاؤ، ٹانگیں اور پھیلاؤ۔ اور کشادہ کرو"

اور فرشتوں کی ٹانگیں چری جانے لگیں۔ اور وہ حیران ہو کر بولے" خدایا تو خوب جانتا ہے کہ ہم بڑھیا کو نہیں جانتے اور یہ شخص نہیں مانتا"

اور تھانیدار خود ہنٹر لیکر پل پڑا اور کہا" ٹانگیں اور چیرو"

اور فرشتے نالاں ہوئے کہ اے رب العزت تو خوب جانتا ہے آدم کو تو نے بنایا تو ٹانگوں میں گنجائش محدود رکھی اور یہ آدمی خود بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ ٹانگیں کس قدر پھیل سکتی ہیں۔ لیکن نہیں مانتا۔ اے رب العزت اپنی مصلحت تو خوب جانتا ہے لیکن ٹانگوں میں تو انسان کے زیادہ گنجائش رکھنا تھی"

اور تھانیدار نے ہنٹر مار کر غضبناک ہو کر کہا" پھیلاؤ ٹانگیں!"

فرشتوں نے کہا کہ" ہم ذرا سی مہلت ایک دعا کے لئے مانگتے ہیں——"

اس نے پوچھا" وہ کیا؟"

فرشتوں نے کہا" تم ہم کو تھوڑی سی مہلت دو جو ہم خدا سے دعا مانگیں کہ وہ ہماری ٹانگوں میں زیادہ وسعت پیدا کرے"

اور تھانیدار نے قہقہہ لگایا اور کہا" یہ کیسے ہو سکتا ہے"

فرشتوں نے کہا" خدا چاہے تو ابھی ابھی ہماری ٹانگوں میں ستر ہزار فرسخ کی گنجائش پیدا کر دے۔ تم ہمیں دعا مانگنے کی اجازت دے دو"

تھانیدار نے قہقہہ لگایا۔ ان کی زندہ دلی کی داد دی اور کہا کہ" بالفرض تمہاری دعا قبول ہو گئی اور ستر ہزار فرسخ کی گنجائش ہو گئی تب بھی بیکار"

"کیوں؟" فرشتے بولے۔

تھانیدار نے کہا کہ" پھر میں اکہتر ہزار فرسخ کا حکم دوں گا"

(بقیہ صفحہ ۴۰)

ہندوستاں

الٰہی مسکنِ بے آبرو ہے آشیاں میرا
فلاکت کا جہنّم ہے کہ ہے ہندوستاں میرا
یہ خطہ وہ نمونہ ہے فلک کی ظلم رانی کا
کہ جھونکا تک نہیں آتا نسیمِ شادمانی کا
یہاں انسان محکومی سے رشتہ جوڑ لیتا ہے
یہاں اقبال فرطِ غیظ سے منہ موڑ لیتا ہے
یہاں کی زندگی آغوشِ مجبوری میں پلتی ہے
یہاں چلتی ہے جب موجِ نفس رُک رُک کے چلتی ہے
تحیّر میں ہوں آخر کیا کہوں اس نکتہ دانی کو
یہاں کے رہنے والے موت کہتے ہیں جوانی کو

یہاں افلاس کے مارے ہوئے انسان رہتے ہیں
یہ وہ ہیں جو سرودِ زندگی کو نالہ کہتے ہیں
حسیں چہرے یہاں کے فرطِ غم سے زرد پاتا ہوں
یہ وہ آئینے ہیں جن پر غبار و گرد پاتا ہوں
جسے دیکھو نظر آتا ہے شاکی ناتوانی کا
تخیّل تک یہاں معدوم ہے زورِ جوانی کا
یہاں قحطِ علوئے عزم و ہمّت ہے جوانوں میں
زمینوں کے خصائل دیکھتا ہوں آسمانوں میں
یہاں کے بیکس و مجبور عالم کی ہیں تصویریں
وہ انساں ہمتیں جنکی ہیں زنگ آلودہ شمشیریں
یہاں کی صحتیں بیماریوں کا رنگ رکھتی ہیں
یہاں کی آبروئیں اعتبارِ ننگ رکھتی ہیں
یہاں کی صبح ہمرنگِ شبِ دیجور ہوتی ہے
یہاں کی ظلمتوں سے روشنی کافور ہوتی ہے
جو دیکھی ہے یہاں وہ خانماں سوزی نہیں دیکھی
زمانے میں کہیں ایسی سیہ روزی نہیں دیکھی
یہاں ہے آدمی کا آدمی دشمن ارے توبہ
جنوں ہے اپنے ہی خرمن میں آتش زن ارے توبہ
عداوت ہیں یہاں کی سرزمیں ہے آسماں یارب
محبت ہے کہاں یارب مروّت ہے کہاں یارب
یہ رُسوائی کہانتک ملّت و مشرب کے پردے میں
رہینگی تابکے خونباریاں مذہب کے پردے میں
کہاں تک خونِ انسانی سے رنگیں تیغ کیں ہوگی
کہانتک رزم گاہِ کفر و ایماں یہ زمیں ہوگی
کہانتک یہ ستم آرائیاں ایذا پسندوں کی
کہانتک پیروی کی جائے یارب ان درندوں کی
کہانتک نالۂ پیہم شعارِ آدمیّت کا
کہانتک خم رہے کا سر وقارِ آدمیّت کا
کہانتک جذبۂ پیکار جوش اپنا دکھائیگا
کہانتک آدمی کو آدمی سے خوف آئیگا!
کہانتک یہ عداوت کی ہوائے گرم آئیگی
کہانتک شیوۂ اہلِ وطن پر شرم آئے گی

کہاں تک اپنے ہاتھوں آپ تدبیریں غلامی کی
کہاں تک پائے آزادی میں زنجیریں غلامی کی

کہاں تک رنگِ محکومی شعارِ زندگی اپنا
کہاں تک اس روش پر کاروبارِ زندگی اپنا

کہاں تک مایۂ عشرت تباہی دین و ایماں کی
کہاں تک ہند میں سوداگری ناموسِ انساں کی

کہاں تک مشقِ صلح و جنگ غیروں کے اشارے پر
کہاں تک زندگی بیگانہ خوئیوں کے سہارے پر

رہیگا اِن کڑکتی بجلیوں میں آشیاں کبتک
یہی ہندوستاں ٹھہرا، تو پھر ہندوستاں کبتک

الٰہی کامرانِ زندگی کر مُردَہ جانوں کو
بدل دے نغمۂ عیشِ بہاراں سے خزانوں کو

سوادِ شب کو رنگِ صبحِ نورانی عطا فرما
اندھیری بستیوں کو جلوہ ارزانی عطا فرما

جہنّم زار کو غیرت دہِ باغِ جناں کر دے
بہاریں جس قدر ہوں قسمتِ ہندوستاں کر دے

عطا کر دولتِ احساسِ بیداری خیالوں کو
جگا دے سونیوالوں کو، جگا دے سونیوالوں کو

یہ خطّہ نغمہ خوانِ عظمتِ آدم نظر آئے
نئے ہندوستاں میں اک نیا عالم نظر آئے

ہر اک دل میں ہو محشر آفریں ارماں ترقی کا
اُٹھا یارب دیارِ ہند سے طوفاں ترقی کا

عبارت زندگانی جس سے ہو وہ آگ پیدا کر
وطن کے ساز سے حُبِّ وطن کا راگ پیدا کر

پھر اِن اُفتادہ ذرّوں کو مذاقِ ارجمندی دے
الٰہی سربلندی دے، الٰہی سربلندی دے

مٹا دے اِس زمیں سے کاوشِ دیر و حرم یارب
ہم آغوشِ ہمالہ کر محبّت کا علم یارب

وطن میں جذبۂ اہلِ وطن کا نام ہو جائے
محبّت عام ہو جائے، محبّت عام ہو جائے

اُٹھائے فطرتِ انساں ستم کیونکر غلامی کا
جُھکا دے سر غلامی کا، جُھکا دے سر غلامی کا

شکستہ ہمتوں میں ہوں نئی پھر ہمّتیں پیدا
تپشِ خوردہ بیابانوں سے کر دے جنّتیں پیدا

ہو ارضِ ہند جولانگاہ عظمت ان جوانوں کی
زمیں پر رہ کے جو ہستی نہ سمجھیں آسمانوں کی

جواں جو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھیں تختِ شاہی کو
گدائی جن کی شرمائے غرورِ کجکلاہی کو

جواں جو اپنی عشرت گاہ ہر دشت و جبل سمجھیں
جواں جو اک تمسخر سے بھی کم زعمِ اجل سمجھیں

جواں جو خوابِ عظمت سے جگا دیں خاکِ مشرق کو
جواں جو ارضِ بیداری بنا دیں خاکِ مشرق کو

ہم آہنگِ جہنّم تا بکے یارب جہانِ ما
جوابِ نغمۂ فردوس کُن ہندوستانِ ما

نہالؔ سیوہاروی

شمعِ انجمن

تقدیر کا دیوتا

اے کاتبِ قسمت! یہ نوشتہ میرا!
دستور نہیں کیا نظرِ ثانی کا؟

زاہدِ شب گذار کی طرح، بوڑھے آسمان نے ایک ضرب لگائی فضا میں نعرۂ حق گونجا، اور جیسے کسی پاک باطن کا قلب انوارِ رحمت سے جگمگا اٹھے، فلک کبرو کے سینے سے نکلی ہوئی تنویرِ الٰہی سے آن کی آن میں سارا سنسار منور ہو گیا: بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک، گویا دیدارِ محبوب کی جھلک اور دلِ مجروح کی آہ و بکا تھی۔ ایلو! افسانہ نگار کا تخیل ایکا ایکی دھندلا پڑ گیا اور اس کی نظریں، آخرِ شب سیب کے سہمے ہوئے شگوفوں کی مانند سقفِ رفعت پسند کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے تصور کی آنکھ نے دیکھا کہ دور، بہت دور، کالے کالے بادلوں کی چٹانوں پر ایک عظیم و پُرشکوہ تخت رکھا ہوا ہے اور اس کی مسند سے ٹیک لگائے ایک عجیب الخلقت ہستی متمکن ہے۔ اس کا ڈیل ڈول، اس کے کس بل، اس کا قد و قامت، المختصر اس کی ساری ہیئت ہم انسانوں سے بالکل جدا ہے اور اپنے آثار و رعب داب کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کا آقا، حاکم بلکہ قادرِ مطلق معلوم ہوتا ہے۔ اسکے تن و توش کو قطعی قرار نہیں، کسی کل چین نہیں۔ اس کا ہر عضو تھرکے جاتا ہے۔ قہقہے اس کے رونگٹوں رونگٹوں سے پھوٹے پڑتے ہیں۔ اس کے کانوں تک پھیلے ہوئے دہانے پر دوسرے کو تباہ و برباد ہوتے دیکھکر پیدا ہونیوالی خوشی اور ایذا رساں ہنسی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی ہے، ایسی شرارت جو اپنے سے کمزور کا مذاق اڑانے کے لئے ہر وقت مچلتی ہو۔ اس کا بے ہنگم پیٹ اس کی موٹی موٹی رانوں سے آگے نکلا ہوا ہے۔ اسکی پتھریلی کلائیاں گھٹنوں پر ٹکی ہوئی ہیں اور ہاتھوں میں دو کٹھ پتلیاں ہیں۔ شاید ان دونوں کے نچانے سے اب اس کا جی نہیں بہلتا۔ اسی لئے اس نے ان کو ایک طرف پھینکا اور جھک کر تخت کے نیچے نظر دوڑائی۔ پایوں کے ارد گرد بے شمار گڑیاں اور گڈے بے جان لاشوں اور بے کار مورتیوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان کو لاپروائی سے دیکھا اور ٹٹولا، جیسے کوئی تاریک حمام میں سے کھوئی ہوئی انگوٹھی ڈھونڈ نکالے، اس نے گڑیوں کے انبار میں سے ایک کامنی مورت نکالی، بیچ میں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اس کی تیوری پر ذرا سا بل نمودار ہوا اور —— اور —— یہ کیا؟ گڑیا کی پیشانی پر خط کھنچتے چلے گئے اور وہ ——

تقدیر کا دیوتا! —— ان خطوں پر اپنی موٹی موٹی بھدی انگلیاں رکھے ہوئے دم بدم تیز ہونے والے قہقہے لگانے لگا اور اسکی آنکھوں میں پتلیاں اور شرارت، شعلۂ جوالا کی طرح ناچنے لگیں۔

نغمہ و رقص

فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں شعلے
کوئی عاشق بنایا جا رہا ہے

اژدہام اتنا کہ پناہ بخدا، سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، لیکن تماشبین اس کثرت سے، اس لئے نہیں آتے تھے کہ ان کے ٹکٹوں کے دام خیرات میں دئے جائیں گے اور اس بہانے سینکڑوں یتیموں اور بیواؤں کی مدد ہو جائے گی، بلکہ وہ تو اس وقت وہاں دیا لو صرف اس لئے بنے تھے کہ آج رات بے شمار خوبصورت لڑکیوں کے علاوہ کنول بھی، جس کے حسن و کمال سے ہر شخص اپنے ذوقِ بصارت کی تسکین کرنا چاہتا تھا، فنِ رقاصی کے جوہر دکھانیوالی تھی۔

یکے بعد دیگرے کئی ایک لڑکیاں —— کالجوں کی طالبات، چہیتے والدین کی لاڈلیاں، موسیقی کی دلدادہ اور نمائشِ حسن کی شوقین —— اپنے اپنے رقص دمرود سے منچلے مردوں کو محظوظ کر کے چلی گئیں۔ آخر کار تماشے کا سب سے اہم منظر پیش ہوا۔ اسٹیج پر جا بجا چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی قمقمے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ دائیں بائیں، بیل بوٹوں اور ہری ہری ٹہنیوں سے سجی ہوئی دیواریں کھڑی تھیں۔ پشت کے زرد پردے پر ہندو صنمیات کے نقش و نگار تھے۔ الٹے ہاتھ کو، ترچھی سمت، چھوٹے پیمانے پر ایک خوبصورت پیتل کا چمکدار مندر بنا ہوا تھا جس میں پتھر کے سیاہ کرشن مراری ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ آڑی رکھے ہوئے، کھڑے کھڑے بانسری کی لے پر گوپیوں اور گایوں کو بلا رہے تھے۔ غرض ساری فضا میں کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی گویا گوکل میں شام ہو رہی ہے۔ ہال میں سکوت طاری تھا، بس اسٹیج اور طرفین کے پیچھے سے بانسری کی ہلکی ہلکی آواز اور گھنگروؤں کی مدھم سی باج سنائی دے رہی

تھی۔ تھوڑی دیر اسٹیج یوں ہی خالی رہا اور پایل کی جھانجھ اور مُرلی کی لے لمبے لمبے پَر ہوئے ہوئے سُروں میں گونجتی رہی۔ لوگوں کا اشتیاق دم بہ دم بڑھ رہا تھا لیکن اُن کی آنکھیں بجز سیاہی مائل نیلے بُت کی سفید بڑی بڑی آنکھوں کے وہاں کچھ نہ پاتی تھیں۔ پھر یکایک گویا کنارا سا جوالا مکھی کھل گیا ہو، دائیں طرف کی دیواروں سے وہ ہے کرشن کی دیو داسی ۔۔۔ چھم چھم کرتی نمودار ہوئی۔ اس کے قدم ایک خاص انداز میں۔ کبھی پہلے ایڑی کبھی پہلے پنجہ، بہت آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے اور اس پُر احتیاط جنبش سے پازیب کی وہ دلنواز موسیقی پیدا ہو رہی تھی جو صرف کلاسیکل رقص میں دیو داسیوں کے زیریں جھٹکوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کا لباس قدیم وضع کا تھا۔ ساڑھی کی بندش دلفریب مگر ایسی مضبوط تھی کہ جب وہ پربھو کو خوش کرنے کے لئے بیخود ہو کر بے پناہ رقص کرے تو اُس وقت بھی ساڑھی ڈھیلی یا کہیں سے کھل نہ جائے۔ اوپر کا پلّو دائیں شانے پر سے نیچے لا کر کمر سے لپٹا ہوا تھا اور نیچے کے حصّے کو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں سے لانگ کے طور پر پیچھے لے جا کر پیٹی میں اُڑس رکھا تھا۔ سر پر وہ ایک مختصر سا تاج پہنے ہوئے تھی، جیسا آپ نے اکثر تصویر میں سری کرشن کے سر پر دیکھا ہوگا۔ اُس کے بال بنگالنوں کی مانند گھنے [illegible] کی طرح [illegible] اور شمالی ہند کی دوشیزاؤں جیسے لانبے تھے لیکن اس وقت ان کی چوٹی نہیں گُندھی ہوتی تھی بلکہ جوڑا بندھا ہوا تھا جس میں موگرے کے پھول سلیقے سے آراستہ کئے گئے تھے۔ اس کی رنگت گیروا تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی کسی ایسے چشمے میں نہا کر آئی ہے جس میں صبح کا نور اور شفق کی لالی مل کر بہتی ہے۔ اس کی فراخ پیشانی پر سُرخ گلاب کی چھوٹی سی گول کتری ہوئی پنکھڑی، بندی کے بجائے، چسپاں تھی۔ نرگسی آنکھوں میں دنبالے دار کاجل تھا۔ ناک میں ہیرے کی ننّھی سی کیل جگمگا رہی تھی۔ شہابی رُخساروں پر جوانی کا غازہ تھا اور کبھی اس کے لب یاقوتی لعلیں وا ہوتے تو اُسکے خوبصورت دانت یوں نظر آتے جیسے دستِ حنائی پر سچے موتیوں کی لڑی ہو۔ صراحی دار گردن میں چھوٹے چھوٹے انمول جواہر کا ایک سُندر ہار تھا۔ گویا ننھے ننھے چمکدار ستارے چاند کا طواف کر رہے ہیں۔ انگیا میں سے سینے کا بالائی حصّہ ذرا ذرا سا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی چوری چھُپے واں کسی کی تاک جھانک میں لگا ہو۔ اس کی ساڑھی سیاہ رنگ کی تھی جس کے کناروں پر سُنہری ترنج اور باقی سارے حصّے میں لال سبز ستارے ٹکے ہوئے تھے، اور جب وہ ناچتے ناچتے مختلف رنگ کی روشنیوں میں سے گذرتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نئی سہاگن نے پوتر گنگا کے کنارے سے چراغاں کر رکھا ہے۔ اس کی باہیں اور ساقہائے سیمیں پیچھے کے رُخ ننگی تھیں جن پر بار بار نظریں جمتیں پر طبیعت سیراب نہ ہوتی تھی۔ المختصر، اس کے سارے جسم سے شعریت، موسیقی اور حُسن کی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں اور وہ مجسّم نغمہ و رقص بنی ہوئی شعلوں کی لپک کی طرح دست و پا اور پشت و سینہ کے ترقص میں مصروف تھی ...... مگر نہیں، یہ سب سراپا نامکمل بیان ہوا۔ افسانہ نگار اس دیو داسی کے روپ سروپ کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے جو اس وقت گیندے کے زرد پھولوں کو روندتی ہوئی، دنیا و مافیہا سے غافل، مُرلی والے کے سامنے ناچے جا رہی تھی اور اس کنول کی مانند معلوم ہوتی تھی جو بلّوریں تالاب کے بیچوں بیچ، نسیمِ صبحگاہی کے دوش پر اٹھلا رہا ہو۔

اُس نے بھگوان کے چرنوں میں سے تھالی اُٹھائی جس میں سات دیئے روشن تھے اور مائل بہ سکون ہوتے ہوتے رسان رسان آرتی کرنے لگی۔ دُور سے ایک پروانہ دوڑا آیا اور چاہتا تھا کہ شعلے سے ہم آغوش ہو جائے کہ عین اسی لمحے دئیے کی لَو لہرا کر پیچھے ہو گئی اور پروانہ غریب وہیں پرے کے پرے چکر کاٹنے لگا ۔۔۔۔ کنول لغزیدہ قدموں سے پیچھے ہٹی اور اُس نے ایکا ایکی دزدیدہ نگاہوں سے تماشبینوں کو دیکھا ...... ارے، یہ کون؟ سامنے مسٹر مکیش چندر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کی مشتاق نگاہیں اسے اُن کے دل کا پیغام پہونچا رہی تھیں۔ آخر اُس نے اس پیام کو پڑھ لیا اور روح دامیں چھاتی آ گئے اور بایاں کولھا پیچھے نکالے ہوئے سُبک روی سے آناً فاناً پسِ پردہ چلی گئی۔

ناچ ختم ہو گیا مگر جو دھڑکن اس سے کنول اور مکیش کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی وہ چنگاری کی طرح سُلگنے لگی اور جب دمِ رخصت غلام گردش کی اوٹ میں شہ نشیں کے سرے پر، یاسمین کی بیلوں کے سائے میں مکیش نے سرگوشی میں کہا: "کنول! تم اس وقت بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو!" تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے اور آنسوؤں کی دو بوندوں کو ہونٹوں میں چھپائے وہ وہاں سے چلی گئی۔

اب آپ ان دونوں کی کہانی کیا سنیئے گا، حُسن و محبت کی یہ داستان آپنے بار بار سُنی ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ جب کنول اور مکیش جیون ساگر میں پریم کی نیّا کھیتے کھیتے بہت دُور نکل گئے ہیں تو انہیں محبت کے عام دستور کے مطابق محسوس ہوا کہ انہوں نے غلط راہ اختیار کر لی ہے۔ وہ دونوں تو کبھی ایک دوسرے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ کنول کی

سگائی جو ہو چکی ہے! ـــــ اور جب کنول کا گونا ہوا تو دونوں کی آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ کمیش نے گویا ایک سپنا دیکھا تھا جس کے ختم ہونے پر وہ دل مسوس کر رہ گیا ہے۔ اس نے چاہا کہ اُلفت کے اس نقشِ اولیں کو جیسے بھی ہو سطحِ ذہن سے مٹادے، لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ آخر اس نے کچھ عرصے کے لئے وہ شہر چھوڑ دیا جہاں ان دونوں کی محبت پروان چڑھی تھی، اور بیرسٹری کرنے کے خیال سے ولایت چلا گیا۔ مگر کنول کیا کرے؟ وہ عورت ذات، بیاہ کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ اپنا جی بہلائے اور دل پر میل نہ آنے دے۔

مہندر سے شادی ہوئے تین سال بیت گئے مگر اس عرصے میں کمیش کی یاد کنول کے دل سے قطعی محو کبھی نہیں ہوئی۔ جیسے برسات کی بھیگی ہوئی تیرہ و تاریک رات میں کہیں میلوں پرے، کسی جوگی کی کٹیا میں دیا جل رہا ہو، اس کے دل میں کمیش کا موہوم سا خیال ہر وقت موجود رہتا۔ اور یہ اتنا ضبط، یہ اس قدر اخفاءِ محبت بھی اس لئے ہو سکا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی، بڑے گھرانے کی بیٹی اور کالج کی آزادی پسند طالبِ علم تھی۔ سیر و تفریح کی دلچسپیوں اور بے فکر لمحات کی خوش فعلیوں نے اُس کے دل پر سے وہ غبار دھو دیا جو کمیش کے یکلخت نظروں سے اوجھل ہو جانے پر پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ہر وقت کی آزادی اُس کی ازدواجی زندگی کے لئے مُضر ثابت ہوئی۔ کیونکہ اسکی مصروفیات مہندر کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ پھر ان دونوں کی حیثیت میں بھی اب بڑا فرق ہو گیا تھا۔ وہ ایک دولتمند باپ کی بیٹی تھی، گویا دہکتا ہوا آہن، اور مہندر ایک غریب ماں کا بیٹا تھا جیسے بھیگی ہوئی مٹی۔ لیکن یہ انقلاب بعد میں ہوا، بچپن میں نہیں، جب وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب کئے گئے تھے۔ شادی ہو جانے کے بعد مُفلسی نے ڈیرے ڈالنے شروع کئے، یہاں تک کہ اس کا باپ سرگباش ہو گیا اور صرف ماں تن تنہا اپنے بیٹے کو کبھی نہ کبھی خوش بخت و مسرور دیکھنے کی آرزو میں جیتی رہی۔

مہندر کو اپنی خودداری پر بڑا ناز تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے غرورِ نفس پر تقدیر کی ٹھوکر کھا کر بھی اعترافِ شکست کر لے۔ لیکن یہ امر اس کے لئے انتہائی اذیت رساں تھا، کہ کنول، جو پہلے بھی اس کی طرف کچھ زیادہ مائل نہیں تھی، اس کے اچھے دنوں کے پھر جانے کے بعد سے اور بھی فرنٹ ہو گئی ہے۔ وہ کسی طرح اس کے سمجھائے نہیں سمجھتی۔ کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔ وہ اپنی دلبستگی کا سامان ہمیشہ گھر سے باہر ڈھونڈتی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر سہیلیوں، سیر تماشوں، اور رقص و سرود کی محفلوں میں مصروف رہتی ہے۔ اس نے اسے بہتیرا روکا، خوشامد کی، خفا تک ہوا مگر کنول نے ہر بات سنی ان سُنی ایک کر دی۔ پر اس سے زیادہ وہ کر کیا سکتا تھا؟ اونچے گھرانے کی بیٹی۔ یا ہتّنت تو یہی ہوتا ہے! کنول کے ماں باپ سمجھتے کہ گھر داماد ملا ہے۔ گویا بے دا موں کا غلام جسے اپنی مالکن کے رکھ رکھاؤ اور کاموں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ بھی کرتا تو اُسے فوراً محسوس ہوتا کہ کنول کے ایک چھوڑ کئی کئی حمایتی موجود ہیں اور خود وہ کیا کچھ کم، یا ذلیل ہے۔ آخر اُس نے اپنے خیالات اور کنول سے تعلقات کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ وہی کمزور ہے۔ اسی کی طرف پانی مرتا ہے۔ کنول سے وہ نہیں ٹکرا سکتا۔ بلکہ اس سے اُلجھنا اپنی ہی تذلیل اور مزید ناخوشگواری پیدا کرنا ہے۔ اور پھر اس کی اس قدر بڑھتی ہوئی آزادی کا وہ خود بھی تو ذمہ دار ہے! شادی کے کافی عرصے کے بعد تک وہ نئی دلہن کے چونچلے جو نگھارتا رہا! اس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کو اُس نے سر آنکھوں پر رکھا اور زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے کو روشن خیالی جانا۔ بلکہ اکثر خود اس نے اصرار کیا کہ موسیقی میں جو اُسے کمال حاصل ہے اُنکا مظاہرہ وہ زنانہ جلسوں اور خیراتی تماشوں میں کیا کرے۔ اور بعض تحت الشعور، اس کے اس طرح مقبول اور محبوبِ خلائق ہونے سے وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ پھر وہ کس منہ سے کنول کو مجرم قرار دے؟ مغرب پرستی اور فیشن کے شوق میں خود اسی نے تو حرم کی چلمنوں کی تیلیاں توڑی تھیں، اب وہ کیونکر اُسے منع کرے کہ یوں بے پردہ اور آزاد پھرنا ہم مشرقیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ اور پھر یہ کنول پر ظلم بھی تو ہوگا! وہ رسوئی کے دھوئیں اور جھاڑو کی دھول سے متنفر ہے۔ گھر کے کام کاج کو ہاتھ لگانا اس کی شان کے خلاف ہے۔ میاں کی خدمت اسکے بس کی بات نہیں۔ پھر وہ نازوں کی پالی، جسے ہر اچھے برے فعل کی ماں باپ محض اس لئے شہ دیتے رہتے ہیں کہ وہ خوش رہے، کیسے مسلمان بیبیوں کی مانند گھر کی چار دیواری میں مقید ہو جاتے؟ اس کی آنکھیں سنیما کے محبت بھرے فلموں، بازاروں کی چہل پہل، دکانوں کی رونق، دوست احباب کے تابناک چہروں، تفریح گاہوں کے دلچسپ مناظر اور مسجد و مندر کی نورانی برجیوں اور سنہری کلس دیکھنے کی جو عادی ہیں! اس کے کان ہر دم ساز و وطن کے شیریں نغموں، ہر وقت طرب ناک باتوں، ہر گھڑی اپنے کمال کی مسرور کن داد اور ہر لحظہ اقبال مندی کے جو منتظر رہتے ہیں!

بیشک وہ کچھ نہیں کرسکتا اور اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بے روزگار ہے۔ اس کا تمام اثاثہ ختم ہوچکا ہے۔ شادی کے تین چار ہی سال کے الٹ پھیر میں وہ امیر سے غریب بن گیا ہے۔ اس لئے کنول پر اس کا زور رہتا رہا ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ اگر اُس نے زیادہ سختی کی تو وہ برہم ہوجائے گی۔ کیا خبر وہ اُسے مفلس اور قلاش ہونے کا طعنہ دیدے اور کہے "تم ہو کس باغ کے بتھوے؟ جاؤ میرا تمہارے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا!" پھر کیا ہوگا؟ وہ اُسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتا۔ اُسے اُس سے بید محبت ہے، اُسے دیکھکر اس کا چلّوؤں خون بڑھتا ہے..... آخر اُس کی سمجھ میں یہ تجویز آئی کہ وہ عارضی طور پر کہیں باہر چلا جائے اور وہاں پتھر کا لاپروا اور بے اثر دل رکھنے والی دیوی کو خوش کرنے کیلئے دولت جمع کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے اس طرح دُور رہنے سے کنول ضرور رحیم ہوجائیگی اور پھر وہ روپے کے زور سے، اس روپے سے جو خود اُس کا پیدا کیا ہوا ہوگا، کنول کے والدین کا نہیں، وہ اس کا مُنہ کیل سکتا ہے۔ پھر اُسے دبنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

سو سو جتن کرنے کے بعد اُسے کلکتے میں ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت ملی اور وہ اپنی ضعیف ماں کو لیکر وہاں چلا گیا۔ کنول حسب توقع ساتھ نہیں گئی۔ والدین کی لاڈلی کہلاتی بھی کیوں؟ ڈیڑھ سو روپلّی میں ہوتا کیا ہے؟ تنخواہ معقول ہوجاتے تو بیشک وہ اسکے ساتھ رہنے کے متعلق سوچے گی۔ ابھی تو تیل کی دھار دیکھنی باقی ہے!۔

——— لیکن افسانہ نگار یہ خشک باتیں کیا لے بیٹھا؟ افسانے کی دلکش فضا میں وہ نثر کے ان غیر دلچسپ ٹکڑوں کو کیوں سمو رہا ہے!

مَیں ہاری!

راتوں کو تصورِ اُنکا ہے اور چُپکے چُپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے! تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

طائرِ خیال پھر ٹھٹکا! اور افسانہ نگار کا ذہن ایک بار اور اُسی شب کا جائزہ لینے لگا جب اُس خیالستان کی اپسرا، نازک بدن کنول نے دیوداسی کے رُوپ میں رقص و موسیقی کے کمالات دکھائے۔

گھر پہونچکر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج اُس پر ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہورہی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی کہ اُسے کیا ہوگیا ہے۔ مکیش کے الفاظ میں جانے کیا تاثیر تھی کہ اُسے یہ خیال بار بار ستاتے جارہا ہے کہ وہ دُنیا کی حسین ترین عورت ہے۔ حالانکہ اِس سے پیشتر کبھی بھول کر بھی اس کے دل میں ایسی کمزور بات نہیں آئی۔ قدآدم آئینے میں اُس نے اپنا سراپا دیکھا اور..... اور، مکیش نے تو واقعی اُس میں ایک فتنہ جگا دیا ہے۔ یہ لانبے بال، نرم رُخسار، احمریں لب، سڈول باہیں، اُبھرا ہوا سینہ، چھریرا بدن، جوان رانیں، بھری بھری پنڈلیاں، یہ سب قیامت نہیں تو کیا ہے! اُسے ایسا محسوس ہوا کہ غرورِ حُسن اُسکی رگ رگ میں آہستہ آہستہ سر اُٹھا رہا ہے۔ وہ ایکا ایکی گھوم گئی، کمرے کی ہر شے اُسے حسین معلوم ہو رہی تھی۔ دریچے میں سے باہر کے ہرے ہرے درخت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کیا اُن پر بھی وجد طاری ہوگیا ہے؟۔ وہ کھڑکی کے پاس آگئی اور خیالات کی تیز رَو نے اُس کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا۔ وہ یقیناً حُسن کی دیوی ہے، دیوی! اور دیوی کے بے شمار پُجاری ہوتے ہیں! لیکن وہ ہر پُجاری پر مہربان نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہِ انتخاب صرف ایک بھگت پر پڑتی ہے جو سب سے زیادہ پُرجوش ہو۔ تو پھر اس کا پُجاری کون ہے؟ کہاں ہے؟ وہ پُجاری، جو اپنے جذبات کے طوفان میں تمام بندھنوں کو توڑ پھینکے، تمام رُکاوٹوں کو کُچلتا چلے اور اپنی بھگتی سے دیوی کو مجبور کردے کہ وہ اپنے استھان سے اُتر کر خود اس کے پاس چلی آئے اور کہے "مانگ، پجاری، مانگ! تیری ہر مُراد پوری کی جائیگی۔ تو میرا ہے"! ہاں تو وہ پجاری کون ہے؟ مہندر! نہیں، نہیں، وہ پجاری نہیں ہے۔ وہ تو مندر کا منتری ہے جسے پوجا پاٹ مجبوراً کرنی پڑتی ہے۔ دیوی کے چرنوں میں وہ از خود تھوڑی آیا ہے۔ اُس نے تو اپنے ماں باپ کی مرضی پوری کی ہے۔ مکیش؟ اس کے کان گنگ ہونے لگے۔ یہ نام کس نے لیا؟ کیوں لیا؟۔

باہر شیشم کے درخت پر کوئل کہے جارہی تھی "مکیش! مکیش!! مکیش!!!"

یہ سچ ہے کہ اس سے گھر میں نہیں ٹکا جاتا تھا اور وہ ہر وقت، میموں کی طرح، محض تفریحِ طبع کو مقصدِ حیات سمجھتی تھی، لیکن مشرقی خون اپنا رنگ بالکل تھوڑی بدل دیتا ہے——— اس میں ایک کمزوری (؟) تھی جو اُس کے طور طریق دیکھتے ہوئے اس کے خیالات کا، گویا ضد تھی۔ اور یہ کمزوری تھی اس کی نسوانیت کی، یعنی کبھی کبھی اسکے دل میں مامتا کا جذبہ بے اختیار پیدا ہوجاتا اور وہ تمنا کرتی، کاش اُس کا کوئی بچہ ہوتا! اُسکی گود بھری پُری ہوتی! اُس کا منّا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسکے چہرے اور چھاتیوں کو ٹٹولتا۔ اس کے پیٹ اور رانوں پر اپنی چھوٹی

چھوٹی لائیں چلاتا۔ یہ معصوم چوٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی! اگر اس کا بچّہ ہوتا اور وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتی تو کیسا اچھا لگتا! اور جب وہ ممتا کے جوش میں اُسے طرح طرح کے بے معنی ناموں سے پکارتی، وہ روٹھتا یہ مناتی، وہ بھوک سے روتا یہ دودھ پلاتی، وہ کپڑے خراب کئے جاتا، یہ خوشی خوشی بدلے جاتی، وہ اپنا مُنہ سانتا، یہ دُھلاتی اور اس کے بھولے مکھڑے کو ان گنت پیاروں سے لبریز کر دیتی تو نہ جانے اُسے کیسی بے پناہ لذت محسوس ہوتی!

—— لیکن، وہ تو اس نعمت سے محروم ہے۔ یہ بیش بہا دولت تو اُسے عطا ہی نہیں کی گئی۔ شادی کو چار سال ہو جائیں گے مگر پرماتما نے اُسکے دل کے اندر کی آواز نہیں سُنی یا سُنی تو وہ اُسے زندگی کا یہ سب سے بڑا تحفہ کیوں نہ دے سکا؟

آخر اس کے اس مادرانہ جذبے کا اظہار مکیش کے طوطے کو پالنے میں ہوا۔ جو مکیش نے اُسے گذشتہ ماہ تحفتًا پیش کیا تھا۔ وہ اس کے لئے خود بازار سے ایک سُنہرا پنجرا خرید کر لائی اور اسکے دانے پانی کے لئے تحفہ کے شایانِ شان، اس نے اس میں خوبصورت کٹوریاں رکھیں اور جب سے یہ ہیرامن اس کے گھر آیا تھا کنول کا باہر آنا جانا کم ہو گیا۔ اب اسکا زیادہ تر وقت اس کی دیکھ بھال، اس کو دانہ کھلانے، پانی پلانے، اسکی اچھی اچھی باتیں سننے، اور ایک نیا لفظ سکھانے میں صرف ہوتا۔ ہر روز صبح وہ اُسے پڑھاتی اور میاں مٹھو ایک ضدی فلسفی کی طرح اُسکے لفظوں کو پہلے غور سے سُنتے کہ وہ سُننے کے لائق بھی ہے یا نہیں، اور پھر دُہرانے کی کوشش کرتے، لیکن ان کی زبان لڑکھڑا جاتی اور وہ، گویا خفا ہو کر گردن پھیر لیتے۔ مگر کنول ہمت نہ ہارتی۔ آخر مٹھو نے یہ لفظ سیکھ لئے اور جب وہ لہک کر کہتے "میرا مُنّا!" تو کنول پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

رات آدھی جا چکی تھی۔ آسمان پر کہکشاں سہاگن کی مانگ کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ جابجا ستاروں کے جھمکے چمک رہے تھے اور برسات کا بھیگا ہوا چاند اپنی پوری تابانی سے ضوفشاں تھا۔ صاف وشفاف تالابوں کی سطح پر کنول کے چوڑے چوڑے سبز پتے تیر رہے تھے۔ گھاس کی لمبوتری پتیاں، بارش کے آخری قطروں کے بوجھ سے برکھا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں اس طرح جھوم رہی تھیں جیسے دوشیزگانِ بہار مینا بدوش کسی مغل شہزادے کے عشرتکدے میں رقص کرنے چلی ہیں۔ اور آموں کے درختوں میں پپیہے پیہو پیہو کی رٹ لگاتے جا رہے تھے۔ کنول سُرخاب کی بچھڑی ہوئی مادہ کی مانند مضطرب و غمگین اپنی خوابگاہ میں ٹہل رہی تھی۔ کئی کئی راتوں سے اسکا یہی حال تھا گویا ابتدائے شب سے لیکر سحر کے طلوع ہونے تک، فراق کی صعوبتیں اُسے آتشِ زیرپا رکھتیں۔ اور آج تو برشگال کی ہنگامہ خیزیوں نے اُس کے جذبات خفتہ بیدار ہی کر دئے اور اُس کے دل میں رہ رہ کر یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ کاش، اس سمے جبکہ ساری کائنات ایک نغمۂ نوربنی ہوئی ہے، کہیں سے وہ جانِ تمنا مکیش آجائے! اسی لئے اُس کی نیند اُڑی ہوئی تھی اور وہ بے بس و مجبور، دیوانہ وار کبھی یہاں بیٹھتی، کبھی وہاں، کبھی ٹہلتی، کبھی دریچے میں سے جھانکتی.... ارے! یہ، یہ —— کون؟ پائیں باغ میں چوروں کی طرح کون چلا آتا ہے؟

جیسے شکسپیر کے تخیّل میں رومیو اپنی جولیت کے فراق میں جری فرنڈر بنکر چلا آیا تھا، یا جس طرح کسی الف لیلوی داستان میں کوئی حوصلہ مند شہزادہ حصول محبوب میں حرم کے مستور سے مستور حجلے میں داخل ہونے کی سعی کرے، مکیش بے خوف و خطر، کسی خیالی افسانے کے بہادر ہیرو کی طرح دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ جب وہ دریچے تک پہونچا تو کنول نے فورًا اپنے ہاتھ پھیلا دئے، اور وہ اُن کے سہارے، دبے پاؤں، اندر آگیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور کنول کے لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ آگئی، جیسی اس شیرخوار بچّے کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے جو ایکا ایکی خواب سے بیدار ہوتا ہے مگر اپنے آپ کو ماں کی آغوش میں محفوظ پا کر پھر اطمینان سے سو جاتا ہے۔ وہ اُس کے اور قریب آگیا اور اُس کی چشمہائے سُرمگیں اُسے ایسی معلوم ہوئیں جیسے وہ دو چھوٹے چشمے ہیں جن میں جل پریاں غسل کر کے اکتسابِ حُسن کرتی ہیں۔

کنول کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، گویا اس کے جذبات کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے۔ کچھ دیر وہ دونوں نیچی نظریں کئے خاموش بیٹھے رہے۔

—— دوسرے لمحے افسانہ نگار نے ایک نیا منظر دیکھا۔ مکیش اُس کے نرم و نازک جسم کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا اور کنول کی نرگسی آنکھیں محبت کی شدت سے جھپک رہی تھیں، جس نے اُسے غمِ دُنیا سے آزاد کر کے گویا خواب کے جزیرے میں پہونچا دیا جہاں کسی کی پروا نہیں، کسی کا ڈر نہیں، کوئی پابندی نہیں، کوئی ممانعت نہیں، مکیش نے اس کی آنکھوں کو اپنے لبوں سے بند کر دیا، پھر اُس کی پیشانی، بال، گردن، ہاتھ، انگلیاں اور ....، اس کے لب چُومے۔ جیسے طوفانی دریا کا بند ٹوٹ جائے، ان کے جذبات نے ان کو مغلوب کر دیا اور وہ دونوں اسکے تیز بہاؤ میں بہے چلے گئے۔ وہ شکستہ سانسوں میں کہتا رہا "کنول! میری کنول! آخر تم مجھے مل گئیں! تم میری ہو! میری ہو، ہو نا؟"

۔۔۔ لیکن یکایک گھنٹے نے چار بجائے جس سے وہ چونک پڑی۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ دیوانی سی کیوں ہوئی جا رہی ہے؟ وہ تو بیاہتا ہے، کیا وہ اپنے شوہر کا اعتماد یوں پاش پاش کر دے گی؟ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی اور جب بھی وہ ملکیش کے بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرتی، وہ اُسے اور بھی قریب کھینچ لیتا۔ وہ کیوں نہ اُسے اپنے دل سے لگا لے؟ وہ سمجھتا ہے کہ اس عورت کی رُوح ازل ہی سے اس کی رُوح کی رفیقہ ہے اور ان دونوں کی رُوحیں اب اس طرح آپس میں متحد ہو گئی ہیں جیسے دو ندیاں سنگم پر مل جاتی ہیں اور پھر کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ کوئی بتا دے، محبت کیا ہے؟ گناہ یا ایک قدسی صفت؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو بے شک وہ دونوں قابلِ تعزیر ہیں، لیکن اگر محبت انسانی عروج کا منتہا ہے تو کیا پھر بھی وہ اُس کی پکار کو نہ سنیں؟ کیا آپ کا سماج اور رواج مبنی ہے یعنی انسانی قانون پر؟ خدائی پر نہیں! اگر وہ ایک دوسرے کو چھوڑ دیں تو کیا وہ زندگی کے تانے بانے میں سے محبت کے سنہرے تار کو ضائع کر دینے کے مجرم نہ ہونگے؟

کنول کے جذبات کی روانی یکایک رُک گئی۔ اس کا خیال ٹھٹک گیا اور وہ دریچے میں سے چاند کو دیکھنے لگی جو اپنی گولائی چھوڑ کر دوسری ہیئت اختیار کر رہا تھا۔ اے لو، وہ قلب کی صورت میں ڈھل گیا، گویا رُخِ فلک پر خود محبت متشکل ہو کر نمودار ہوئی ہے! ملکیش نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور گویا خواب سے چونک کر وہ اس کے محبت سے مملو چہرے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں اشتیاق کے ساتھ ساتھ التجا بھی تھی۔ گویا وہ کہہ رہی ہے "مجھے چھوڑ دو!" لیکن ملکیش نے اس التجا کو نہیں سُنا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں، ایک دوسرے میں سما جائیں، اور کم از کم اس لمحے ان کے درمیان کسی قسم کی غیریت حائل نہ ہو۔ اس کے لگاتار لمس سے کنول کے تن من میں ہیجان بپا ہو گیا اور اس پر شراب کی سی مستی چھا گئی۔ اب ان نگاہوں میں کشمکش نہیں تھی، گویا وہ ہار مان چکی ہے۔

لیکن ملکیش کی آنکھوں میں شعلے کیوں بھڑک رہے ہیں؟ ان دونوں نے پردوں سے گھری ہوئی مسہری میں کیوں پناہ لی ہے؟ کیا اس وقت وہ ارضی پابندیوں کو توڑ کر محبت کے قصر میں پہونچ گئے ہیں جہاں ہر طرح عشرت و امان ہے۔

کس قدر شیریں تھا یہ مختصر عرصہ! ۔۔۔ جب اس پر فتح پالی گئی اور جذبۂ محبت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُسے، اس کے محبت کے دامن سے وابستہ کر دیا! ۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ندامت اور دُکھ، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، دبے پاؤں، ہولے ہولے، اُسکی طرف بڑھتے آتے!۔

الوداع

آج وہ بھی بجھ گیا، لو ہو گیا قصہ تمام
ٹمٹماتا رہ گیا تھا، جو چراغِ آرزو

مہندر کے گھر سے ملواں، کریم بخش کا مکان تھا۔ یہ مسلمانوں کے کوئی بڑے مولوی تھے۔ گُھٹا ہوا سر، کتری ہوئی لبیں، مٹھی بھر داڑھی، موٹے تازے، توند نکلی ہوئی، لباس بھی مولویانہ، نیچا کُرتہ، اونچا پجامہ گویا چلتی پھرتی حدیث و شرع! عوام میں ان کی بہت عزت تھی۔ بڑے بڑے تجار اُن کے ہاتھوں کو سنجانے کیوں چومتے اور آنکھوں سے لگاتے تھے اور جس پر وہ کہیں مہربان ہوتے، وہ تو سمجھتا کہ اُس کی قسمت پھر گئی ہے، لیکن اُن کے زنانخانے میں، جو کھڑکی میں سے صاف نظر آتا تھا، آتے دن ایک عجیب تماشہ ہوتا، جسے دیکھکر مہندر کے تعجب کی انتہا نہ رہتی۔ مولوی صاحب کو کسی کل چین نہیں تھا، وہ اپنی بیوی پر ہر طرح کا ظلم روا سمجھتے بلکہ ہاتھ تک اٹھانے سے نہیں چُوکتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر اُن کی تیوریاں چڑھ جاتیں اور بیوی کا خون خشک ہو جاتا، سہم کے مارے مُنہ سے بات نہ نکلتی اور اُن کی ایسی ایسی جھڑکیاں سُنتی کہ میم ہو تو مُنہ نوچ لے، مگر مولوی صاحب کے اس ننگِ انسانیت طرزِ عمل کے باوجود بھی، وہ بچاری ہر دم اُن کی خوشنودی کی متمنی اور ساعی رہتی اور کوئی دقیقہ ایسا نہ گذرتا جب وہ میاں کی خدمت اور فرمانبرداری کر جی چُراتی ہو۔ مزید برآں، میاں ذرا سیدھے مُنہ بات کر لیں یا اس کی خوش نصیبی سے ذرا ہنس بول لیں تو گویا اُسے جنت مل گئی، خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی ۔۔۔۔ مہندر کے خیالات کو مہمیز لگی۔ تمام اگلی پچھلی باتیں آناً فاناً اُس کی نظروں کے سامنے پھر گئیں۔ دُنیا کے ہجوم میں وہ کہاں کھڑا ہے؟ اپنے ساتھی پر اُسے کیوں اختیار نہیں؟ ہوتے ہوتے وہ اپنے اور کنول کے تعلقات پر، دل ہی دل میں بحث کرنے لگا وہ خوبصورت اور نا شکری ہے۔ اس نے اِس کی محبت اور درگذر کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا۔ اس کے دل میں اس کی کوئی عزت اور محبت نہیں۔ اسی لئے نا کہ اس نے ہمیشہ شرافت برتی؟ کیا وہ بھی انہیں مولوی صاحب کی طرح اُسے دبا کر رکھے؟ سر اُٹھانے کی نوبت ہی نہ آنے دے؟ اُسے اپنی حالت پر سخت رنج ہوا کہ وہ اب تک اس قدر کمزور کیوں رہا۔ آخر کو تو وہ مرد ہے، کنول کا شوہر! غلام نہیں۔ اُسے مہندر کی مرضی کے مطابق چلنا چاہئے۔

پھر غصّے سے اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ کنول اُس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ کیوں اُٹھا رہی ہے؟ بس، اب وہ اُسے یوں کُھلے بندوں نہیں چھوڑ سکتا۔ اگلے مہینے رُخصت لیکر وہ کنول کو زبردستی اپنے پاس گھسیٹ لائے گا۔ بڑے بوڑھوں کی کہاوت غلط تھوڑی ہے۔ کھلائے سونے کا نوالہ، دیکھے شیر کی نگاہ! ان عورتوں کو ہمیشہ قابو میں رکھنا چاہیئے، ورنہ وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ بیشک عورت تیتری ہے جس کے پر شیطان کے اور جسم فرشتوں کا ہے۔ پر دن کو آزاد چھوڑ دو اور وہ اپنے آپ کو ان کے بل پر اُڑاتے اُڑاتے مرد کی قبضہ سے نکل جائے گی ... لیکن کیا وہ سچ مچ کنول کو گھسیٹ کر لا سکتا ہے؟ اس میں اتنی ہمّت ہے؟ وہ اپنی مردانگی کا ثبوت دے سکتا ہے؟ اس کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ اس کو یوں بیدردی سے گھسیٹ لائے گا۔ اُس کی صرف ایک سرد اور گھورتی ہوئی نگاہ، اس کا تمام زور اور عزم پگھلا کر رکھدیگی۔ وہ گھبرا گیا "یہ ہے اس زمانے کی تعلیمیافتہ عورت!" اُس نے خشمناک آواز میں کہا "مجھے شروع ہی سے اس کو یہ ڈول نہیں ڈالنے دینے چاہیئے تھے —— لیکن اب وہ مجھ پر حکومت نہیں کر سکتی۔ وہ میری بیوی ہے، میری دست نگر! عورتوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کرنا چاہیے جس سے انہیں مرد کی برتری اور اپنی محکومیت کا احساس ہوتا رہے۔ عورت اور مرد کی مساوات؟ کیسا لغو خیال ہے! انہیں قابو میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ضرورت سے زیادہ للّو چپّو کر کے ان کو سر پر نہ چڑھا لیا جائے!"

. . . .

تقدیر نے ایک نیا گل کھلایا۔ ڈیڑھ سو روپے کا کلرک سوا پانسو کا ڈپٹی ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ مہندر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، لیکن اس خوشی میں استہزا کی بھی ایک جھلک تھی۔ اب تو سسرال میں کوئی اس پر انگلی نہ اُٹھا سکے گا! وہ ہر طرح کنول کے شایانِ شان ہے! سوسائٹی کی نظر میں اُس کے شوہر کا درجہ کتنا بلند ہے! اب اس کے ماں باپ کو بھی اسکو بھیجنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ روپے کی جھنکار میں خدا نے کتنی دلکشی پنہاں کی ہے! —— وہ اُسی روز کنول کو لانے کیلئے روانہ ہو گیا۔

مکیش کو کنول کی یکایک تبدیلی پر تعجب ہے۔ آخر وہ اس سے اب کیوں نہیں ملتی؟ ڈھائی تین ماہ ہونے کو آئے، اس شبِ ماہ کے بعد جب اُن دونوں نے ایک دوسرے کی آغوش میں وہ سُنہری ساعتیں گذاریں، باوجود کوشش، مکیش کو کنول کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ وہ ہمیشہ ٹال دیتی ہے، کوئی نہ کوئی عذر نکل آتا۔ پھر آج اُس نے اُسے کیوں بلایا ہے؟ کیا اس کی قسمت جاگنے والی ہے؟

وہ پہر ڈھلے، پچھلے دروازے سے، اُسی دیوار کے سہارے اندر آ گیا۔ رات اپنی روایتی تاریکی اور ساٹے کے جلو میں زمین و آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ مسہری کے سرہانے ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا اور کنول گلِ پژمردہ کی مانند، دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے، بےآرام بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی سسکیوں سے دُور دُور تک چھائے ہوئے سکوت میں ذرا سا خلل ہو جاتا تھا، جیسے ساکن پانی میں ایک کنکر سے ننھی ننھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مکیش اس کے قریب خاموش بیٹھ گیا اور اسکے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے آہستگی سے کہا "کنول! تمہیں ہوا کیا ہے —— !"

"کچھ نہیں" اُس نے ساڑھی کے پلو سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اور کھنکتی دبی زبان سے جواب دیا "میں کلکتے جا رہی ہوں ...."

"کلکتے؟" اُس کے منہ سے استعجاب میں نکلا "کب؟ کیوں؟ کس کے ساتھ!"

"کل صبح مہندر آ رہے ہیں، مجھے اُن کے ساتھ جانا چاہیئے۔ آہ، اب تک میں نادان بنی رہی اور اُن کے ساتھ میرا طرزِ عمل بہت ہی نازیبا رہا!"

"—— لیکن تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں۔ اس سے تو زبردستی ...."

اُس نے اس کی بات کاٹ دی "بھاگ کے لکھے کو کس نے مٹایا ہے؟ خیر، جانے دو اِن باتوں کو۔ آؤ ہم ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ لیں کہ آج ہم تم جدا ہوتے ہیں —— ہمیشہ کے لئے!"

"ہمیشہ کے لئے!" مکیش کا کلیجہ دھک سے ہو گیا، جیسے چکور کو یقین ہو جائے کہ وہ چاند تک نہیں پہنچ سکتی "آخر کیوں؟ کیا اب ہم کبھی نہیں ملیں گے؟"

"نہیں مکیش —— ہم دونوں کی جدائی کا وقت آن پہونچا ہے .... لیکن تمہاری یادگار ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہے گی!" اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بےاختیار اس کا دایاں ہاتھ اس کے دل پر چلا گیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے —— !

مکیش نہیں سمجھا شاید وہ مٹھو کو کہہ رہی ہے!۔

وہ اپنی رُوحانی بےچینی اور گریہ مسلسل کو ضبط کرنے کیلئے

اُٹھ کھڑی ہوئی، اور دونوں آہستہ آہستہ دریچے تک آ گئے ۔۔۔ سامنے اس نیم کے اندھیارے درخت کے نیچے سے سنگ مرمر کے حوض والی روش دو مخالف سمتوں میں تقسیم ہو گئی تھی، گویا انگشت قسمت نے ان دونوں کے لئے الگ الگ راہیں تجویز کر دی ہیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اِن پگڈنڈیوں کو دیکھا اور پھر معنی خیز نظریں ایک دوسرے پر ڈالیں۔

اُس کی گردن کے ایک جانب ڈھلکنے سے وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اور باچشمِ گریاں آہستگی سے نیچے اترا، اور وہ اُسے دُور تک دائیں پگڈنڈی پر جاتا ہوا دیکھتی رہی ۔۔۔ بائیں ہاتھ والی روش کلکتے کی سمت جاتی تھی!

جیسے اُس کی رُوح، جسم کی تاریک کوٹھڑی سے آزاد ہو جانے کے لئے گھبرا رہی ہو، اس کا تنفّس یکلخت تیز ہو گیا، اور جب اُس نے بے اختیار ایک بار پھر ٹھنڈا سانس لیکر "میرے محبوب کی یادگار!" دُہرایا تو صحن میں لٹکے ہوئے مٹھو کے پھڑپھڑانے اور زور زور سے چیخنے کی آواز آئی "میرا مُنّا!"

صادق الخیری

سچّے فرشتے

(بسلسلہ صفحہ ۳۰)

اور یہ کہکر دُعا مانگنے کے مذاق کو ختم کر کے پھر شدت کی۔

اب حد ہو گئی۔ بلبلا کر فرشتوں نے کہا "اے خدا ہم باز آئے اِس دُنیا سے۔ اس دُنیا میں تو ٹانگوں کی لامحدود گنجائش لغیر لمکنا دو بھر ہے" اور انہوں نے دُعا مانگی کہ "اے خدا تو ہماری ٹانگوں میں لامحدود گنجائش پیدا کر" لیکن یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ اوپر سے بڑی مار سخت اور تقاضہ کہ ٹانگیں اور چیرو۔ فرشتے چیخ پڑے کہ "اے رب العزت ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے، ہم تیری پناہ مانگتے ہیں"

اور جیسے ہی خدا سے اُنہوں نے پناہ مانگی ہے خدا نے پناہ دیدی۔

ایک تڑاق ہوا زور سے۔ روشنی ہوئی اور چمک اور زور کی گرج۔ تھانیدار بیہوش ہو کر گرا۔ فرشتے آسمان پر پہونچے اور خدا کے سامنے سجدے میں گر کر گڑگڑا کر کہنے لگے:۔

"اے معبود، اپنے رموز تو ہی جانے ہم خطا دار ہیں ہماری خطا معاف کر"

اور اِدھر سب دور کر آئے۔ تھانیدار ہوش میں آیا "ملزمان کہاں گئے؟ او ہو! دیوار پھاند کر بھاگ گئے۔ دوڑو!"

اور فوراً روزنامچہ میں اس حادثہ کا اُس نے اندراج کیا۔

"ملزمان جرائم پیشہ، مجھ فدوی پر بم کا گولہ مار کر بھاگ گئے۔ فدوی مامور بہ تفتیش ہوا"

عظیم بیگ چغتائی۔

ایوالانش

جب میں کچھ پریشان سا ہوتا ہوں، جب مجھے اپنا دل ایک ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے دبتا اور بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو اس وقت میں اخبار بینی کرتا ہوں، یہ میرا شغل ہے۔

اخبار میں سکون کو تلاش کرنا ایک بعید الفہم بات ہے۔ لیکن یہ تو درست ہے کہ اس میں قتل، اغوا اور اسی قسم کی بیہودہ سی باتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کی کمزوریاں اور مصیبتیں پڑھ کر دل پر سے ایک بوجھ سا اتر جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میرے ہاتھ سے کسی نے کوئی میگنی فائنگ گلاس چھین لیا ہو..... اور پھر کبھی کبھی ہر کہیں میں سے اقتباسات ہوتے ہیں۔

عجیب عجیب ناموں پر مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ مثلاً اس خبر میں۔

"سنگورینی کلائریز (دکن)۔ ۱۵ دسمبر۔ کوئلے کی کان میں سخت دھماکا ہونے سے ایک شخص مسمی گورو ناتھ وینکاٹا رآمیہ کی موت واقع ہوگئی، متوفی.... "

اس وقت میرے پاؤں میں سے سلیپر اتر جاتے ہیں۔ میں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک معمر آدمی ہوں۔ چائے جو کہ میں نے ابھی ابھی پی ہے اسی کے چند قطرے میری ڈاڑھی میں اڑے ہوتے ہیں۔ گورو ناتھ وینکاٹا رآمیہ! .... خدا کی قسم، کیسا عجیب نام ہے ہا ہا ہا!!... شیلا... رقو...

شیلا، رقو اور میری بیوی جمنا تینوں بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔

"کیسا دلچسپ نام ہے، تم نے دیکھا؟... تم نے دیکھا؟..."

گورو ناتھ وینا... کا... ٹا... رآمیہ... ہا ہا ہی ہی، اور ہم سب بھول جاتے ہیں کہ اس بیچارے کی موت حادثہ سے واقع ہوئی، ایک نہایت ہی دردناک حادثہ سے، اور متوفی کی شادی ہوتے ابھی صرف تین ماہ ہی ہوتے تھے۔ جمنا، میری حساس بیوی سوچتی ہے، کس طرح بیچاری بیوہ کی سرخ چوڑیاں توڑ دی گئی ہونگی۔ بھولی! نہیں جانتی دکن میں عورتیں سرخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ اگر وہ سوچے کس طرح بیچاری کی مانگ کا سیندور پونچھ دیا گیا ہوگا تو شاید کچھ بات بھی بنے۔ جمنا آنچل سے اپنی نمناک آنکھوں کو صاف کرتی ہے۔ شیلا اور رقو کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ تینوں پاگل ہیں۔ انہیں گورو ناتھ کی موت سے

مطلب؟ ایک سانس کے ساتھ دنیا میں سینکڑوں انسان مر جاتے ہیں۔ اور پھر ان سے کہیں زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے... لیکن میرا دل دبا ہوا ہے۔ اور... اخبار بینی میرا شغل ہے۔

"نندہ دیوی کے قریب ایک چوٹی کو سر کرنے کیلئے بین الاقوامی افراد پر مشتمل ایک پارٹی آرہی ہے۔ چونکہ آجکل سردی ہے پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہوگی اس لئے پارٹی کے تمام افراد عنقریب ہی چڑھائی شروع کر دینگے۔ ان افراد میں دو روسی ہیں، ایک اطالوی اور ایک جرمن عورت ہے۔ نام الیکسی نکولائی، کوراپکن، ساسوز نکولو سیگنینی اور جرمن عورت کا نام فراؤ کرب...؟... ہی ہی... ہی!!"

***

"موضع ہنڈال میں ایک معزز کھتری خاندان کے ہاں برات آئی۔ لڑکی والوں نے جہیز میں چھبیس تولے سونا، ایک ہزار روپیہ نقد، فرنیچر، بھینسیں اور بہت کچھ مال و دولت دی۔ پھیرے کے بعد لڑکے نے اپنی سسرال سے کار مانگی..."

پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد میرا دل کانپنے لگتا ہے۔ ٹانگیں ڈگمگانے لگتی ہیں۔ آنکھوں پر سے عینک گر پڑتی ہے۔ اخبار چھوٹ جاتا ہے، میں اسی طرح بے تحاشا آوازیں دیتا ہوں۔ شیلا، رقو، جمنا — ادھر آنا... کوئی نہیں آتا۔ یہ لوگ میری دیوانی عادتوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ گویا وہ مجھے میرے اخبار کے آخری کالم اور میری زندگی کے آخری سانس تک اکیلا چھوڑ دینگے، تن تنہا، بے یار و مددگار، دیوانہ.....

کیا کوئی کسی کا ہے؟.... بیوی اور بچے.... رقو آجاتی ہے۔ اس کی آنکھیں اسی طرح نمناک ہوتی ہیں۔ وہ اخبار کو پڑھتی ہے، اور پھر آہستہ سے میرے کندھے کو چھوتے ہوئے کہتی ہے۔

"پتاجی... آپنے آگے بھی پڑھا؟"

"نہیں تو بیٹی"

14.79 Avalanche

"پڑھیے .. یہاں سے — انکار کر دیا اور آ گے ... ہاں ہاں،
یہ یہ"

اور رقو کی چنچل سطر کے ساتھ ساتھ دوڑتی جاتی ہے۔ سطر کے الفاظ گم ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہیں کہیں اعراب ناچنے لگتے ہیں، ضرورت سے زیادہ لمبے ہو جاتے ہیں۔

'لڑکے نے اپنے سسرال سے کار مانگی۔ لڑکی والوں نے اسے اپنی توہین سمجھتے ہوئے انکار کر دیا۔ اور ڈولی روک لی۔ برات کو ناکام واپس لوٹنا پڑا اور ندامت سے اپنے تئیں بچانے کیلئے دولھا والوں کو نوشہ کی ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں ایک لنگڑے، جاہل، دیہاتی لڑکی سے شادی کرنی پڑی؛

— اُس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بڑا راجہ — بہت بڑا فرعون، استبدادی، جس کے ہاتھوں کسی کی بھی عزت محفوظ نہیں، اُس کی رعایا نے اس کے جور و استبداد سے تنگ آ کر ہتھیار اُٹھائے ہیں — لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں، ہتوڑے ..... بہت ہی اچھا کیا، میں کہتا ہوں، لڑکی والوں نے بہت ہی اچھا کیا!

میرے مکان کی گھنٹی بجی۔ میں جانتا تھا صاحب رام آئے ہی ہوں گے۔ کپور ڈھائی گھر میں بڑی اونچی ذات ہے۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے چھجے پر سے جھانک لیا۔ یونہی — وہی تھے — کپور، امرتسری طرز کی سیدھی سی کشتی نما پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ کالا، بند گلے کا کوٹ اور راریب پاجامہ، شانے پر شال رکھی تھی۔

میں نے جمنا کو بلایا اور پوچھا۔

"گدّے تبدیل کئے ہیں جمنا؟"

"گدّے؟ ہاں تو، کئے ہیں ... نہیں کئے، صرف اُن کے غلاف ..."

"پھولدان؟"

اس دفعہ رقو آگے آئی۔ وہ جانتی ہے ناکہ میں اُس کی ماں سے خواہ مخواہ کھنچا رہتا ہوں۔ کسی کی بات کا غصہ اس پر نکالتا ہوں ... شاید اس لئے کہ میں اُس سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس سے بہت کچھ متوقع ہوں۔

رقو بولی: "رکھ دئے ہیں پھولدان ... اور اپنے کاڑھے ہوئے میز پوش بچھا دئے ہیں"

اُس وقت نہ جانے مجھے اپنی بیٹی میں کیا دکھائی دیا۔ میں نے آسے اپنے پاس بلا لیا۔ ایک دیوانے کے آشیرواد کے ہاتھ رقو کے سر پر چھا گئے۔ رقو نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گویا آنکھوں کے راستے سے وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُترنا ہی چاہتی ہے۔ اری بھولی لڑکی! کیا یہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُترنے کا وقت ہے؟ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو تم تینوں میں سے میرے پاس کوئی نہیں آتا، کوئی بھی میرے جذبات کے ساتھ نہیں کھیلتا، میری پرواز کے ساتھ نہیں اُڑتا ... تم سب مجھے سطحی سمجھتے ہو اور یہی تمہاری بھول ہے ..... باہر کپور کھڑے ہیں، بازاروں میں سوئے ہوئے ہیں ... میں نے رقو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم سب اپنے کمرے میں چلے جاؤ ... جاؤ ..."

صاحب رام آئے۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ نتھنے ضرورت سے زیادہ فراخ تھے۔ بھویں زیادہ گھنی تھیں اور کانوں پر لمبے لمبے سخت سے بال اُگ کر پگڑی سے باہر دکھائی دے رہے تھے۔ ماتھا اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ بس بالکل کال روپ تھے۔ بار بار شال کو سنبھالتے تھے گویا اس کا مظاہرہ کرنا کوئی بہت ضروری بات تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر رقو کے ہاتھ کے کڑھے ہوئے 'سواگتم' 'خوش آمدید' وغیرہ کو دیکھتے رہے۔ پھر تصویروں پر نظر دوڑائی اور نہایت احتیاط سے کرسی کو میرے قریب سرکاتے ہوئے بولے۔

"سب سے پہلے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں"

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے کہا "معافی؟ .. آپ کا غلام ہوں۔ دیکھئے نا، دست بستہ غلام، آپ ہمارے صاحب ہیں، یہ رشتہ ہی کچھ ..."

صاحب رام مسکرائے، جیسے کپور مسکراتے ہیں۔ اور بولے "میں نے سنا ہے۔ آپ کی رقو کی دو مرتبہ سگائی ہوئی تھی"

اُس وقت میں نے دروازے کے پیچھے جمنا کی انگلی ملتی دیکھی۔ وہ مجھے اثبات میں جواب دینے سے منع کر رہی تھی۔ دھیمی دھیمی آواز سنائی دینے لگی۔ جیسے تھیٹر میں ایک پرامپٹر ... لیکن پرامپٹر کا ہنر اسی بات میں ہے کہ حاضرین کو اُس کے ... نہ چلے اور صاحب رام سب کچھ سن رہے تھے۔ میں حقیقتاً جلدی انکار نہ کر سکا۔

میں نے کہا "جی ہاں"

صاحب رام بڑے مؤدبانہ انداز سے بولے "کیا میں ... کہ سگائی ٹوٹ کیوں گئی؟"

اُس وقت میرے مُنہ میں لعاب خشک ہوگیا... رقّو نے گلدان اچھی طرح رکھا اور پھول سلیقہ سے گاڑ رہے تھے... میں نے اپنی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے بتایا — "وہ اس وجہ سے چھوٹ گئی کہ میں ایک غریب واش لائن انسپکٹر ہوں۔ رقّو کو میں نے پڑھایا ہے لکھایا ہے، اچھی تعلیم دی ہے۔ آپ ایک غریب واش لائن انسپکٹر سے کیا متوقع ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ اپنی بیٹی کو تعلیم کے لئے آکسفورڈ بھیج دیگا؟ معاف رکھئے... باقی رہی دلانے کی بات، میں نے رقّو کو استطاعت سے زیادہ دینے کے لئے خاکروبوں، جمعداروں، سب ماتحتوں کے منہ سے نوالے چھینے ہیں۔ میں نے غنی محلہ میں نالیاں بنانے کا ٹھیکہ مہتاب سنگھ کو دلوا کر اس سے ایک کافی بڑی رقم اینٹھی ہے اور اب اس کا پتہ چل چکا ہے۔ میرے بیان ہو چکے ہیں۔ میری نوکری، میری، میرے بچوں کی، میرے دو یتیم بھتیجوں کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور چونکہ میں جہیز میں زیادہ دینے کے اہل نہیں تھا... وہ رشتے ٹوٹ گئے، ٹوٹ گئے اُسن آپنے!"

صاحب رام نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اُن سُرخ ڈوروں سے بھری ہوئی نگاہوں میں ایک رعشہ پیدا کر دینے والے معانی نظر آئے۔ گویا وہ میری رقّو کو مشکوک چال چلن کی سمجھتا ہو... رقّو... میری بیٹی رقّو۔ کیا ایسی بھی ہو سکتی ہے؟ میرے ہاتھ میں ریوالور ہو تو میں صاحب رام کا دماغ پاش پاش کر دوں۔

صاحب رام بولے "سردار صاحب، دیکھئے، میں کل بینک میں لڑکے سے ملا تھا۔ وہ اس بات پر بضد ہے کہ ایک ہزار روپیہ بدائیگی میں رکھا جائے، فرنیچر سب کا سب ساگوانی ہو۔ ریڈیو اور اگر ایک ریفریجریٹر......"

باقی کا میں نے نہیں سنا۔ صرف آخری الفاظ صاحب رام کے چلے جانے کے بہت عرصہ بعد تک میرے کانوں میں گونجتے رہے — "اجی، بارِ روزگار لڑکے آج کل ملتے کہاں ہیں؟"... مجھے یاد آیا، میری نوکری، میری زندگی — چھ زندگیاں خطرے میں ہیں۔ اور شاید ایک دفعہ ایک راجہ کے جور و استبداد سے متاثر ہو کر رعایا نے بغاوت کی تھی، اور محل کے نیچے لاٹھیاں، گنڈاسے، درانتیاں، ہتھ... اچھا کیا... اچھا کیا!!

برسات کے دنوں میں دیوار کی لکڑی کے مسام پھیل جاتے ہیں۔ اور دروازے دہلیزوں کے ساتھ چپٹ جاتے ہیں۔ میں نے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازے کے پیچھے رقّو اُسکو پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازہ پٹ سے کھلا اور رقّو کی پیشانی کے ساتھ ٹکرایا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں رقّو کی خوب لاتوں، گھونسوں سے مرمت کردوں، خوب ماروں اُسے۔

لیکن ایک اور ہی جذبہ میرے دل میں عود کر آیا۔ انسان اپنے دل اور کردار کے متعلق خود نہیں جانتا کہ فلاں وقت میں کونسا جذبہ، کونسا عمل سب سے اوپر جگہ پائے گا۔ میں نے رقّو کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا "رقّا، میری بچی... زیادہ تو نہیں آئی — چوٹ؟"

میں نے دیکھا رقّو کو چوٹ کا ذرا بھی خیال نہ تھا وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی یا وہ کسی اور ہی چوٹ کو سہلا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بدستور فرش پر گاڑے ہوئے پوچھا "وہ کیا کہتے تھے؟" اور پھر وہ کچھ شرما سی گئی۔

— ایک پیرامیٹر کے تغیر میں نے سب کچھ چھپالیا۔ میں نے کہا میں رقّو کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ کوئی تعجب نہیں کہ رقّو خود ہی دروازے کے پیچھے سُنتی رہی ہو۔ لیکن میں رقّو کو کیوں بتاؤں؟ اُس کی وہی جھنگلی ایک دن بردوان کی ایک خبر پڑھ رہی تھی۔ اخبار میں لکھا تھا... اپنے باپ کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے ایک لڑکی نے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگالی۔ میں نے رقّو کو بالکل بچہ سمجھتے ہوئے گودی میں اٹھالیا۔ پہلے تو وہ شرمادی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر میرے دل کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔

میں نے کہا "وہ کہتے تھے لڑکی تو بہت سوشل دکھائی دیتی ہے... پوچھتے تھے۔ یہ پھول اسی نے گاڑے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ کہنے لگے کیا خوب ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ پھر بولے "رقّن بہت اچھے اخلاق اور اطوار کی سنی جاتی ہے... میں نے کہا..."

اور اس سے زیادہ میں نے کچھ نہ کہا۔ میں کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ جانے مجھے کسی نے زور سے گلے سے پکڑ لیا ہو — کچھ دیر بعد اپنے اصل کو چھپانے کے لئے میں نے رقّو کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا "جاؤ... رقّو جاؤ... جب میں اکیلا ہوتا ہوں۔ تو تم میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں آتا۔ کوئی بھی میرے دل کی گہرائیوں پر نہیں اترتا۔ کوئی بھی میری پرواز کے ساتھ... کیا میں سطحی ہوں، بے وقوف... اور جب میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ تو تم سب میرے پاس آجاؤ گے۔ جاؤ، مجھے اپنے اخبار کا آخری کالم اطمینان سے پڑھنے دو... ہاں! جمنا سے کہدینا ایک انگیٹھی میں بہت سے کوئلے ڈال کر بھیجدے۔ حرامزادی کو میری ذرا پروا نہیں۔ میں اُسے جان سے مار ڈالونگا۔

آج مجھے بہت سردی لگ رہی ہے ... ہو ہو ہو ... مرا جاتا ہوں مارے سردی کے ...۔"

رتو میری عادت سے واقف تھی۔ چپ چاپ چلی گئی۔ آپ ہی انگیٹھی لے آئی۔ میں نے اخبار کو اٹھایا۔ وہ بین الاقوامی افراد پر مشتمل پارٹی کنچن جنگا یا نندہ دیوی کے قریب کسی چوٹی کی بلندیوں کو سر کر رہی تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ یکایک برف کا ایک تودہ پھسلا۔ اس بڑی سی ایوالانش نے انہیں آلیا۔ پارٹی کے سب ممبر، چند تبتی مزدور، خچر، سب دب گئے۔ شاید مر بھی گئے ہوں گے۔

جب ایوالانش آتی ہے تو بڑے بڑے درختوں، چھوٹے چھوٹے پودوں، ہر نخل و ثمر کو بہالے جاتی ہے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے ہیں۔ انسان، مویشی، پرند مر جاتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں — قحط سالی ہوتی ہے ...۔

اس وقت ان افراد کے نام پڑھ کر میں نے ہنسنے کی کوشش کی — الیکسی نکولائی کورانیکن۔ سانتو نکولو پیگینی، اور جرمن عورت فراؤ کرپ، لی ٹن شانگ ... اور پھر سب کے بعد وینکاٹا رامیہ — گورو ناتھ، لیکن مجھے ہنسی نہ آئی، شاید انسان کا انسان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔

اسکے دو تین دن بعد بہت سردی پڑی۔ میرا دل بیٹھ جا رہا تھا۔ مجھے نوکری سے برطرف کر دیا گیا تھا — رشوت لینے کی وجہ سے ...۔ رتو شادی کی انسٹی ٹیوشن کو بڑی طنزیہ نگاہ سے دیکھنے لگی۔ مجھے تو اس کی عادتوں میں بے اعتدالی دکھائی دینے لگی۔ مجھے اس کے چلن پر بھی شبہ ہونے لگا ... جمنا، میری دو بیٹیوں، تین بھتیجیوں کی زندگی خطرے میں تھی ... اسی دن رتو دوڑی دوڑی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ وہ بولی: "کیا آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں"... اس نے ایک کالم میری آنکھوں کے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔ ایک ہوائی کموڈر کے تحت میں ایک ریسکیو پارٹی نے ایوالانش کی زد میں آئے ہوئے سب آدمیوں کو بچا لیا۔

میں نے تسکین کا ایک گہرا سانس لیتے اور اس برفانی سخت سردی میں اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو سینک سینک کر دل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کوئی ریسکیو پارٹی آ بیگی؟ ... رتو! ... کیا وہ ہمیشہ آتی ہے؟"

راجندر سنگھ بیدی

جھوٹے فسانے

رشید طوفان کی طرح مراد کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر ایک طرف پھینک دی۔

"جانتے ہو اُس نے کیا لکھا ہے — کیا لکھا ہے اس نے۔ اُس نے، اُس نے لکھا ہے، آپ یہاں ہوتے تو میری بھی عید ہو جاتی۔

— تم نہیں سمجھ سکتے میرے دوست، وہ مجھ سے بہت، بہت ہی محبت کرتی ہے، اور، اور تم جانتے ہو کہ محبت کیا ہے، محبت! — میں بتاؤں تمہیں محبت، محب........"

"کیا لغویت ہے جی یہ، آخر تمہیں کس دن شعور آئے گا، معلوم ہوتا ہے انسانیت اور تہذیب تمہیں چھو تک نہیں گئی ہے، کوئی کسی عالم میں ہو کچھ ہی کر رہا ہو آپ کو اپنی محبت کے راگ الاپنے سے غرض، جہنم میں جاؤ تم، اور تمہاری محبت۔ سمجھے!"

"لیکن، لیکن آج تو عید ہے، کیا آج بھی....."

"ہاں نہیں، میرے پاس محبت جیسی خرافات میں پڑنے کے لئے وقت نہیں۔"

"اچھا، تو بہتر ہے، لیکن دیکھو تو......"

اور اُس نے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب میں سے ایک رنگین لفافہ نکالتے ہوئے مراد کی طرف بڑھایا اور پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر اس میں سے اسی رنگ کا ایک خط نکال لیتے ہوئے اس کے چہرے کے سامنے پھیلا دیا۔ بھینی بھینی خوشبو نے اُس کی آنکھیں کھول دیں۔ اسکی نظروں کے سامنے الفاظ تیرنے لگے۔

— آپ یہاں ہوتے تو میری بھی عید ہو جاتی۔

آپ کی آپ سے دُور

رضیہ

"تو پھر؟" اُس نے آپ ہی آپ سوال کیا اور اُس کے دماغ کے گوشوں میں ایک استفہامیہ نشان پھیلتا چلا گیا۔

"ہوں، معلوم ہوتا ہے، آج تمہارے دماغ پر معمول سے زیادہ خشکی چڑھ گئی ہے۔ ہے نا یہی بات، اچھا تو خدا حافظ — اور ہاں شام کو ہم لوگ سنیما جا رہے ہیں اگر چلنا چاہو تو چھ بجے میرے کمرے پہونچ جانا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ عشقیہ کہانی ہے۔ اور تم...."

دروازہ ایک شدید دھماکے کے ساتھ بند ہوا اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی وزنی چٹان دفعتاً اُس کے اوپر آ رہی ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ریزے ریزے ہو گیا ہے۔

"آپ یہاں ہوتے تو میری بھی عید ہو جاتی۔"

سوتے اُونچے پانی کی اندرونی تہوں سے نکل سطح آب پر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی جد و جہد ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی جد و جہد سے کس قدر مشابہ تھی۔

— بحر روم کی آب و ہوا میں پھل — جاڑوں میں بارش —

آپ کی آپ سے دُور —'

اُس نے کتاب پھینک دی۔ اُف! یہ جغرافیے کی خشکیاں!!

چائے کی تین پیالیاں پی چکنے کے بعد اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ لیکن اسے یکایک خیال آیا کہ وہ سر کے بل چل رہا ہے۔ کتنے تھک گئے تھے اُس کے پاؤں، وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر میز کے سہارے بیٹھ گیا۔

سامنے اُن لوگوں کا گروپ رکھا تھا اور رشید اسکی طرف جھک کر مسکرا رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔

"آج تمہارے دماغ پر معمول سے زیادہ خشکی چڑھ گئی ہے۔"

سامنے صراحی خالی پڑی تھی۔ ان نوکروں کو ردٹیاں لگ جاتی ہیں۔ پانی بھی تو نہیں بھرتے کمبخت صراحی میں، چاہے کسی کے دماغ پر معمول سے زیادہ ہی کیوں نہ خشکی چڑھ جائے۔

وہ پانچ بجے ہی رشید کے کمرے پر پہونچ گیا لیکن وہ شیروانی پہنے کہیں باہر جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"تم بیٹھو، میں ابھی آیا۔ میل کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ میں یہ خط ڈال آؤں، اسٹیشن پر۔ وہ مجھ سے دُور ہو نا' بیچاری رضیہ! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے — اور لوگ بھی آتے ہی ہونگے۔"

موٹر سائیکل ایک شور کے ساتھ اسٹیشن کی طرف چل دی اور وہ اُس کا تعاقب کرتا رہا۔ حتیٰ کہ دھڑام سے زمین پر آ رہا

عزیز نے ایک بے ہنگم سا طویل قہقہہ لگایا۔

"سالے، تم بھی کیا مرد ہو؟ ایک ہی ٹھوکے میں ز[illegible]

— خیر بیٹھو — ہاں ایک چیز دکھائیں تمہیں — یہ دیکھو، رضیہ کا فوٹو — میں نے رشید کی جیب سے نکال لیا آج۔ اس کا خط سنانے آیا تھا مجھے۔"

"رضیہ کتنی خوبصورت ہے!" کسی نے اس کے سینے میں انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

***

عزیز اور سلیمہ کی باتوں کی وجہ سے کہیں خاک بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی، کچھ اسی قسم کا قصہ تھا۔ لیکن ان لوگوں کی باتیں ختم ہوتیں تو وہ کچھ سن بھی سکتا۔

جب وہ سینما ہال سے باہر نکلے ہیں تو عزیز کے کالر کا پھول سلیمہ کے جوڑے میں لگا ہوا تھا۔ نہ معلوم وہاں کیسے پہونچ گیا، وہ سرخ سرخ گلاب کا پھول!

رومیو اور جولیٹ کتنی المناک ٹریجیڈی ہے، اس نے کتاب ختم کرتے ہوئے سوچا۔ کل شیکسپیئر کا یہ ڈرامہ بھی کلاس میں ختم کرا دیا جائے گا۔

ریاض از حد مغموم تھا، وہ اپنی ماموں زاد بہن سے محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُسے اپنی رفیقۂ حیات بنالے۔ لیکن اس کے ماموں کسی طرح تیار ہی نہ ہوتے تھے، وہ اپنی بیٹی بیاہنے کے لئے کم از کم ایک ڈپٹی کلکٹر کی تلاش میں تھے۔ ریاض اگر چاہتا تو ڈپٹی کلکٹر کیا کلکٹر بن سکتا تھا۔ اس لئے کہ امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے کے گر سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن اس کا ضمیر یہ کسی طرح گوارا نہ کرتا تھا۔ وہ اشتراکی خیالات کا نوجوان تھا اور سامراجی مشین کا پرزہ بننے کو کسی قیمت پر تیار نہ تھا۔

***

وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جلتی دھوپ میں سائیکل پر اسٹیشن پہونچ گیا اور پلیٹ فارم پر اسی سرعت سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا جس طرح عموماً گاڑی کے وقت مسافر ٹہلا کرتے ہیں۔ اس وقت پلیٹ فارم پر نسبتاً خاموشی چھائی ہوئی تھی، لیکن تھوڑی ہی دیر میں گاڑی آنے پر اس نے محسوس کیا گویا اس کے دل کی دنیا، اس کے دل سے نکل کر پلیٹ فارم پر آگئی ہے۔ کیسا ہنگامہ تھا! اور وہ اس ہنگامے میں اسی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹہل رہا تھا۔ اس وقت جس نے بھی اُسے دیکھا ہوگا یہی خیال کیا ہوگا کہ وہ گاڑی کے ڈبوں میں کسی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے، یکایک "ریفرشمنٹ روم" کے سامنے اس کے پیر ایکدم سے رک گئے۔ اس کے قریب ہی ایک عیسائی نوجوان نے ایک عیسائی دوشیزہ کو ایک طویل بوسے کے ساتھ الوداع کہا۔ اس نے دیکھا، اس لڑکی کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کی آنکھ کے ایک گوشے میں تھرتھرا کر اس کے رخسار پر ڈھلک گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ نوجوان اُسے اس طرح دیکھ رہا تھا گویا کچھ بھی نہیں دیکھ رہا۔ انجن نے سیٹی دی اور اس نے چونک کر جلدی سے اُسے ریل کے ڈبے میں سوار کرا دیا۔ وہ اپنی جگہ اسی طرح ساکت و صامت کھڑا رہا۔ دو رومال دیر تک ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر لہراتے رہے، رفتہ رفتہ یہ فاصلہ بڑھتا گیا اور دیکھتے دیکھتے دونوں رومال غائب ہوگئے۔ نوجوان نے خالی خالی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھا اور اپنے سر کو ایک شدید جھٹکا دیکر رسٹورنٹ میں گھس گیا۔

چائے پیتے میں مراد نے دیکھا کہ اس نوجوان کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے ہیں، مراد کے وہاں پہونچنے سے قبل رسٹورنٹ کی تنہائی میں شاید اس نے بھی خاموشی سے دو چار آنسو بہائے تھے۔

تیسرے پہر کو جب وہ اپنے کمرے میں ایک کوچ میں دھنسا ہوا تھا، دور، بہت دور ہوا میں دو رومال ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر لہراتے رہے، رفتہ رفتہ یہ فاصلہ بڑھتا گیا اور پھر ——— اور پھر بھیگی ہوئی پلکیں، لرزتے ہوئے ہونٹ، آنسوؤں کے قطرے اور تاریکی ——— !

— نوکر نے بجلی کا بٹن دبا دیا اور وہ تاریکی سے ایک بار پھر اجالے میں آگیا۔ صحن چمن میں مشتاق گا رہا تھا ؎

چاندنی رات میں تو اور بھی دوست
کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے

انوار نے اس سے کہا، ایسی چاندنی رات میں تو جی چاہتا ہے کہ کوئی ساتھ ہو، تنہائی ہو، ایسی تنہائی کہ دو دلوں کی دھڑکنوں کے علاوہ کچھ سنائی نہ دے ——— اور پھر اس نے تیرھویں رات کے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں نہ تاج محل چلا جائے۔"

سرو کے درختوں کے سایوں میں مراد نے سوچا جس شخص نے محبت نہیں کی اس کی زندگی ایک ایسی ندی کے مانند ہے جس کے سوتے خشک ہوگئے ہوں۔

جمنا کی ریت پر کالج کے چند لڑکے اور لڑکیاں بے تحاشہ بھاگ

رہے تھے۔ ایک لڑکی بھاگتے بھاگتے ریت پر اس طرح گری جیسے آندھی میں کوئی لدا پھندا لگتا پیڑ زمین پر آ رہے۔ اُس کا ساتھی شاید یہ برداشت نہ کر سکا اور اُس نے اُسے ریت سے اپنی آغوش میں لے لیا۔ "وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ اتنی تیز رفتاری بھی کس کام کی۔ لیکن جوانی ——— گرم خون ——— دُور آسمان پر سے ایک تارا ٹوٹ کر جمنا میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔

اُس دن "کافی ہاؤس" میں اُس کے قریب والی میز پر ایک دوشیزہ چند نوجوانوں کے ساتھ آکر بیٹھی۔ اُس نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ مجمع پر ڈالی اور پھر سب سے بے نیاز ہو کر اپنے ہمراہیوں سے باتیں کرنے لگی۔ اس کی ساڑھی کا آنچل ہوا سے سرک کر اُس کے شانوں پر آ رہا تھا اور اُسے اس کے سیاہ اور دراز گیسو دکھائی دے رہے تھے کتنی حسین تھیں اُس کی گوری گوری بانہیں! تھوڑی تھوڑی دیر میں کنکھیوں سے وہ اس کی طرف دیکھ لیتا۔ شاید اس نے اُس کی یہ حرکت سامنے دیوار پر آویزاں آئینے میں دیکھ لی۔ اور پھر ایک بار مُڑ کر اُس نے اُسے پوری نظر سے دیکھا اور مسکرا دی۔ گویا کہہ رہی ہو، جی، میں نے آپ کی چوری پکڑ لی۔ لیکن مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ ہاں، ہاں، دیکھئے! جی بھر کر دیکھئے مجھے!! یہ تِل تو دیکھئے، میرے رخسار کا سیاہ تِل۔ دیکھتے نہیں، میں نے اسے کس خوبی سے اُبھارا ہے۔ اُس نے تِل کے قریب اپنی چھنگلیا رکھ دی اور شاید آپ نے ابھی تک میرے ناخن نہیں دیکھے، میں نے آج ہی رنگا ہے انہیں۔ دیکھئے تو کیسے سُرخ ہو رہے ہیں یہ!

اُس نے سوچا، کاش وہ اپنے دل کے خون کے چند قطروں سے اُس کے ناخن رنگ سکتا۔ کتنی آب آ جاتی ان میں تب اور پھر وہ اپنا ایک پورا اپنے خون میں ڈبو کر اُس کے ماتھے پر سُرخ ٹیکا لگا دیتا۔ اور وہ ہزاروں برس پہلے کے رومانی ہند میں سانس لینے لگا جب بہادر اور خودداراریہ اپنی محبوبہ کے لئے اپنی جان کی بازی لگا کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ فتحمند اپنے رقیب کے خون میں ایک پورا ڈبو کر اپنی محبوبہ کے ماتھے پر ٹیکا لگا دیتا ——— زندگی کیا سے کیا ہو گئی ہے! اُس نے کتابِ حیات کے بہت سے ورق اُلٹ کر کافی ہاؤس کے بڑھتے ہوئے مجمع پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

- - - - - - - - - - -

"اُف! میرے ہونٹ دُکھنے لگے .... چھوڑیئے! چھوڑیئے،

نہیں تو میں چلی جاؤں گی"

"اوں ہوں، نہیں جانے دیں گے ہم نہیں، دیکھیں تم کیسے جاتی ہو؟"

"اچھا، یہ بات ہے .... تو لیجئے"

. . . .

چائے دانی فرش پر گر کر ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ انڈے لڑھک کر مسہری کے نیچے چلے گئے، مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ جغرافیے کی کتاب سے چپکے ہوئے تھے اور ساری شکر اس کے بستر پر بکھر چکی تھی۔ نوکر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔ مردود کہیں کے!!!"

اُس کی آنکھوں کے سامنے دیر تک تارے ناچا کئے۔ اُس نے سوچا معبود! یہ دُنیا محض خوابوں ہی کی دُنیا کیوں نہ ہوئی!

گرمی کی چھٹیوں میں گھر پر اس کا ذرا دیر کو جی نہ لگا۔ وہ اکثر سوچتا کہ آخر اسے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا۔ آٹھویں ہی دن وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے ہاں آ گیا۔ شبابِ رَیحانہ کے نقوش میں ایک تیکھا پن پیدا کر دیا تھا، کیسی کامنی ہو گئی تھی وہ اب!

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دو ہی دن میں اپنی رُوح کی ساری بے چینی اُس کے سامنے پیش کر دی۔ وہ کتنی ہمدرد ہے، اُس نے سوچا، جب رَیحانہ نے ایک صبح چائے پر اُسے مخمور نظروں سے دیکھا۔ بارہ دن کے مختصر عرصے میں وہ اس کے کس قدر قریب آ گئی تھی۔ گویا وہ دونوں برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوں۔ لیکن پھر سعید ——— رَیحانہ کا چچازاد بھائی ——— اُن لوگوں کے راستے میں آ کر حائل ہو گیا۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا اور علیگڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے رَیحانہ اُس سے دُور ہوتی گئی اور سعید سے قریب۔ اور ایک دن اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اُس سے اب بے اعتنائی برت رہی ہے۔ وہ اس تبدیلی کا تحمل نہ ہو سکا اور اپنے گھر واپس آ گیا۔

مئی جون کی گرمیوں میں وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پڑھتا رہا اور دو ہی مہینے کے مختصر عرصے میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور موپساں کو گھول کر پی گیا۔

کالج کھلنے پر رشید اس کے کمرے پر آیا اور اُسے خوشخبری سنائی کہ رقیہ سے اس کی شادی ہو گئی ہے۔ لیکن تمام باتیں اس قدر جلد طے ہوئیں کہ وہ اپنے کسی دوست کو بھی نہ بلا سکا۔ . . . . . .

مراد خاموشی سے رشید کی باتیں سنتا رہا۔

"کیوں، تم چپ کیوں ہو، تمہیں خوشی نہیں ہوئی کیا میری شادی کی خبر سن کر؟"

"نہیں نہیں، کیوں نہیں —— لیکن تمہاری رومانی زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دروازہ بند ہو گیا۔ شادی دو محبت کرنے والوں کی خودکشی سے کم نہیں، یہ میرا ایمان ہے۔ اور میں اس نتیجے پر بہت سوچ بچار کے بعد پہونچا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں شادی نہیں کرتا، حالانکہ ایک عرصے سے متعلقین میرے پیچھے پڑے ہوتے ہیں کہ میں ریحانہ سے شادی کر لوں۔ لیکن میں اس کے لئے کسی طرح تیار نہیں۔ کیسے تیار ہو جاؤں۔ آنکھیں ہوتے ہوئے کنوئیں میں کود پڑوں، جس فردوس میں میں گذشتہ پانچ برس سے رہ رہا ہوں اُسے چھوڑ کر کس طرح جہنم میں داخل ہو جاؤں، نا، بھائی نا، شادی کا خیال ہی میرے لئے سخت اذیت رساں ہے۔"

"لیکن آج تو تم نئے ہی رنگ میں نظر آ رہے ہو۔ محبت اور تم! کیا واسطہ!!! اب تم ایک شادی شدہ انسان کو اتنا تو نہ گراؤ کہ اُس کو بیوقوف بنانے کے لئے پیچھے پڑ جاؤ، چھوڑو بھی یار۔"

"خیر، میں تو کچھ بھی نہیں کہتا، لیکن میں تمہاری طرح اپنی داستان الفت ہر ایرے غیرے کو سناتا نہیں پھرتا، اور میں تو اس حد تک محتاط ہوں کہ اپنوں کو بھی کبھی اپنی محبت کا راز دار نہیں بنایا۔ محبت کے ساتھ ساتھ رشک کا جذبہ بھی تو بڑھتا جاتا ہے —— اب بات آ گئی ہے تو کہتا ہوں۔ ریحانہ میری دور کی خلیری بہن ہے۔ پانچ سال قبل میں نے اُسے پہلی بار دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ اگر اس کی تعلیم و تربیت صحیح طور پر ہو تو وہ بہت جلد میری آورشی دوشیزہ بن جائیگی، اس لئے کہ وہ اس قسم کی ساری اہلیتوں کی حامل تھی، چنانچہ میں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی اور اُس کی تعلیم کا انتظام کرایا۔ میرے خالو مجھے بہت مانتے ہیں اس لئے اس کام میں وہ ہمیشہ میرے معاون ثابت ہوئے۔ اور اب کی چھٹیوں میں میں اپنی پنجسالہ محنت کا ثمر دیکھکر آیا ہوں۔ سینکڑوں رعنائیاں جمع ہو گئی ہیں اس میں اب —— کاش تم بھی اُسے دیکھ سکتے! لیکن یہ کیسے ممکن ہے —— ہم لوگوں کی محبت اس نقطہ تک پہونچ چکی ہے جہاں دو دلوں کو کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی، —— اور، اور مجھے تو ہنسی آتی ہے بعض حضرات کی طفلانہ حرکات پر۔

انہیں چھٹیوں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا —— ریحانہ کا چچیرا بھائی سعید جو علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، ریحانہ کے یہاں آیا۔ میں تو وہاں تھا ہی۔ وہ ریحانہ کو دیکھکر کچھ اس طرح ریجھا کہ بچارے کو اپنی کچھ سدھ بدھ نہ رہی۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح وہ اس کی طرف مائل ہو جائے۔ لیکن میں نے اُسے اتنی بلندیوں پر پہونچا دیا ہے کہ وہ ایسے ویسوں سے تو التفات بھی نہیں کرتی، اور ان حضرات کی اُن بلندیوں تک پہونچ ممکن ہی نہیں —— بہر صورت مجھے سعید کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے۔ جس دن وہ ریحانہ سے رخصت ہوا ہے، اُس کا منہ اترا ہوا تھا۔ وہ بیحد مغموم معلوم ہوتا تھا۔ خدا جانے کس طرح بیچارے نے باقی ماندہ چھٹیاں گذاری ہونگی اپنے گھر پر . . . . . ."

"بھئی، تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ ارے ہم سب تو تمہیں نہایت ہی خشک آدمی سمجھتے تھے، ہمیں کیا پتہ تھا کہ اس خشکی کے نیچے صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے —— تو یہ کہو کہ ابتک کی تمہاری زندگی محض 'ایکٹنگ' تھی۔ او ہو، ہو، بھئی کیا، تم بھی عجیب و غریب انسان ہو۔ اس قدر گہرے!!!"

"ہاں، کیوں نہیں۔ وہ تو تم نے سنا ہی ہو گا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔"

مشتاق نے اُس سے نوجوان لڑکیوں کی نفسیات پر کچھ معلومات حاصل کرنا چاہی۔ اختر نے شادی اور محبت کے مسئلہ پر بحث کی۔ صدیق اپنی رومانی نظمیں شائع کرانے سے قبل ایک بار اُسے ضرور دکھا دیتا۔ وہ اکثر سوچتا، کیا میں واقعی اپنے احباب کا رومانی ہیرو ہوں؟۔

اور اکثر رات کی تنہائیوں میں وہ محسوس کرتا کہ اُس کے سینے کے اندر ایک وسیع اور عریض صحرا ہے۔ جس پر ہیبت ناک ویرانی چھائی ہوئی ہے۔

محرم کی چھٹیوں میں چند خانگی جھگڑوں کی وجہ سے اُسے اپنے گھر جانا پڑا۔ پڑوس کی ایک نوجوان لڑکی اُن دنوں اُس کے یہاں پڑھنے آتی تھی۔ وہ جوان تھی اور بس —— لیکن اسکی جوانی اُس کے شباب کا سہارا لینے کو بیتاب ہو گئی۔ وہ بیچاری ڈرتی ڈرتی سہمی سہمی اُس کی ساری خواہشات کو پورا کرتی رہی۔ لیکن وہ سوچتا تھا۔

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور وہ زمانے والوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نظر انداز کرتا ہوا ساری منزلیں صرف ایک ہی جست میں پار کر لینا چاہتا تھا۔ اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتا ـــ کہ اُس کی بہن نے، جو اُن دنوں سسرال والوں سے لڑ کر میکے آئی ہوئی تھی، اُسے اُس کی آغوش میں دیکھ لیا ـــ وہ وہاں سے چلا آیا۔

اُس کے دوستوں نے اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ ریحانہ یکایک دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے مر گئی۔ وہ غم کے اتھاہ سمندروں میں ڈوب گیا۔ اس کی حالت کس قدر قابل رحم تھی کہ اس کی موجودگی میں اُس کی محبوبہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھین لی گئی۔

سب نے اُسے سمجھایا کہ موت اور زیست انسان کے بس میں نہیں اور وہ صبر کرے، اور کتابوں کو اپنا رفیق بنالے۔ کیونکہ امتحان قریب آرہا تھا۔

ـــ امتحان قریب آرہا تھا، ور اُس کے احباب اپنی اپنی رومانی زندگیوں کو طاق پر رکھکر کتابوں سے دست و گریباں ہو گئے۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی اور اُسے بیحد سکون نصیب ہوا! ریحانہ کی موت کے ساتھ میرے سینے کا بوجھ کس قدر ہلکا ہو گیا، اُس نے بڑھتے پڑھتے سوچا۔

جھُوٹ! بالکل جھوٹ!!

اُس کے دل کے کھنڈروں سے آوازِ بازگشت آئی۔

ـــــ٭٭٭ـــــ

ایک دن شام کو اختر اُس کے کمرے آیا۔ اُس کا مُنہ اُترا ہوا تھا۔ اُس نے جب خیریت پوچھی تو وہ تکیوں میں مُنہ دبا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ آج اس کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ سلیمہ اس سے محض کھیل رہی تھی۔ اس سے زیادہ اُسے اختر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مراد نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کے دل کو تسلی نہ ہوتی۔ آج اُس کا جی اُمڈا آتا تھا۔ اُسے بڑا رحم آیا اس ناکام محبت پر۔

"ارے بھئی، تم کیسے آدمی ہو۔ اتنے معمولی واقعہ پر روتے چلے جاتے ہو، نہ معلوم تم نے رومانی زندگی کو اس قدر آسان کیوں سمجھ لیا ہے۔ یہ راہ تو سخت دُشوار ہے، سُنو، میں تمہیں اپنی زندگی کا ایک اسی قسم کا واقعہ سُناؤں۔

اس واقعہ کو کئی سال ہو گئے۔ میں اُس زمانے میں اسکول میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنی پھوپی کے ساتھ دہلی میں رہتا تھا۔

ہمارے پڑوس میں ایک اور صاحب رہتے تھے جو کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے اُن کی ایک لڑکی تھی شاہدہ۔ میری پھپھیری بہن سے اُس کی بیحد دوستی تھی اور وہ اکثر ہمارے ہاں آتی رہتی، وہ نئی نئی جوان ہوئی تھی اسلئے شروع شروع میں تو کچھ دنوں تک مجھ سے حجاب کیا لیکن رفتہ رفتہ یہ حجاب ایک گہرے لگاؤ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی صورت کچھ ایسی بھولی بھالی اور اُس کے عادات واطوار کچھ اس قدر دلکش تھے کہ مجھے اُس سے بہت جلد اُنسیت ہو گئی اور مَیں اُسے بالکل اپنی پھپیری بہن کی طرح عزیز رکھنے لگا، اُدھر وہ مجھ میں بیحد دلچسپی لے رہی تھی، آئے دن وہ مجھے طرح طرح کے رومال، میز پوش اور تکیوں کے غلاف کاڑھ کاڑھ کر دیتی رہتی۔ اُس کی اِن عنایتوں کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی اُسے چند تحفے پیش کئے جو اُس نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کر لئے۔ ہماری محبت خدا جانے کہاں تک پہونچتی کہ ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ امتحان کا قرب تھا اور میری پھپیری بہن کی ایک ہم جماعت ہمارے ہاں مجھ سے اپنے امتحان کے سلسلہ میں کچھ مدد لینے کے لئے آنے لگیں۔ وہ دوپہر کو آجاتیں اور مجھے تیسرے پہر تک اُن کو پڑھانا پڑتا۔ ایک دن جب کہ میں اُن کو پڑھا رہا تھا شاہدہ بھی آگئی اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھی ہوئی ہم لوگوں کو دیکھتی رہی۔ انگریزی کے سبق کا ایک حصّہ میں اُن کو کئی بار سمجھا چکا تھا لیکن اُن کی کسی طرح سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ اور جب میں اُن سے دُہراتا تو وہ ہر بار اُس میں کوئی نئی غلطی کر جاتیں، اور مجھے بے اختیار اُن پر ہنسی آجاتی۔ میری ہنسی پر وہ خود بھی ہنسنے لگتیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ شاہدہ کچھ بے چین سی ہو رہی ہے۔ اور وہ واقعی جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اُسے روکا بھی لیکن وہ نہ ٹھہری۔ اور تمہیں یہ سُنکر تعجب ہوگا کہ اُس دوپہر کے بعد اُس نے مجھ سے پھر کبھی کلام نہیں کیا۔

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سلیمہ کو بھی تمہاری طرف سے کچھ اسی قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہوں گی۔ اس کا قطعی امکان ہے۔ تم سے خدا جانے کتنی لڑکیاں تمہاری کوٹھی پر پڑھنے آتی ہیں۔ غالبًا تمہاری بہن کی کوئی بھی سہیلی ایسی نہیں جس کو تم نے کبھی نہ کبھی نہ پڑھایا ہو۔ ایم۔ اے، بی۔ ٹی کے بعد بیکاری کا تم نے یہ اچھا مصرف نکالا ہے۔

اختر چپ چاپ بیٹھا اُس کی باتیں سُنا کیا اور پھر سر لٹکائے خاموشی سے اُٹھکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مراد کے دل میں ایک بے پناہ خواہش پیدا ہوئی کہ کمرے کی کسی دیوار سے ٹکرا کر وہ اپنا سر پھوڑ لے۔ جو کچھ اُس نے بیان کیا، کاش! وہ تمیں

کچھ بھی صداقت ہوتی۔

مراد [illegible] بیٹھا یا تھا اور وہ دونوں باہر لان پر بیٹھے چائے [illegible] سرے پہر کی ڈاک سے ڈاکیہ اُسے ایک خط دے گیا [illegible] کیا۔ اُس کی ہمشیرہ کا خط تھا۔ خانگی جھگڑوں کی [illegible] زیادتیوں کا دکھڑا رو یا تھا اور لکھا تھا کہ پہلی گاڑی [illegible] واندر کے پاس گھر پہونچا دے۔ خط کو پڑھکر وہ اپنی بہن اور [illegible] کی زندگیوں پر غور کرنے لگا۔ شادی سے قبل وہ ایک دوسرے کو کس بُری طرح چاہتے تھے۔ لیکن اب تین ہی سال میں ایسا کیا تغیر ہوگیا کہ وہ ایک دوسرے میں کیڑے ڈالنے لگے۔ وہ انہیں باتوں پر غور کر رہا تھا کہ عزیز نے پوچھا: "کس کا خط ہے؟"

وہ چونک سا پڑا۔ لیکن پھر فوراً ہی سنبھلا۔

"کچھ نہیں، یونہی ایک خط ہے"

"آخر بتا دینے میں کیا ہرج ہے، کس کا ہے؟"

"ایک صاحبہ ہیں، میری رشتہ دار۔ انٹرنس تک پڑھی ہوئی ہیں"

"اچھا تو کیا لکھا ہے؟"

"کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں"

"پھر بھی"

"اس بات کی شکایت لکھی ہے کہ میں اُنکے ساتھ سخت بیوفائی کر رہا ہوں۔ چند سال پیشتر تو خوب منظور نظر بنایا اور اب بالکل نظرانداز کئے دے رہا ہوں"

"اوہو، تو یہ کہو، کیا تم پر اُن کی خاص نظرِ عنایت رہتی ہے، ایں؟"

"ہاں، بات تو یہی ہے، لیکن یہ کیسے ممکن ہے، میری اکیلی جان اور کتنی کتنی لڑکیاں، اماں ایک آدھ ہو تو خیر، کوئی مضائقہ بھی نہیں — بھئی ہماری لڑکیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ اوّل تو وہ نوجوانوں سے ملتی ہی نہیں اور ملتی ہیں تو پہلے دن سے اُن کی یہی کوشش شروع ہو جاتی ہے کہ وہ اس نوجوان پر شوہر کی مُہر ثبت کر کے اُسے اپنی ملکیت بنا لیں۔ ملکیت کا یہ احساس ہمارے فطری جذبات کے راستے میں بھی حائل ہو گیا ہے"

عزیز نے ایک لمحہ کے لئے مراد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُسے فوراً خیال آیا۔ کہیں وہ پڑھنے کے لئے اُس سے خط نہ مانگ بیٹھے۔

اُس نے جلدی سے باتوں کا رُخ کالج کی سیاسیات کی طرف پھیر دیا۔ اور خط کو آہستہ سے تہ کر کے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اتنے میں اُس کے چند اور دوست آگئے اور وہ سب سنیما چلے گئے۔

دوسرے دن صبح وہ ابھی سو ہی رہا تھا کہ انوار نے اُسے جھنجوڑ کر اُٹھا دیا۔ وہ بوکھلا کر اُٹھا تو دیکھتا ہے کہ انوار، ریاض، مشتاق، صدیق، اختر اور رشید سب ہی موجود ہیں۔

عزیز نے کہا کہ سب نے پکنک پر جانے کی ٹھیرائی ہے۔ اور وہ بھی فوراً تیار ہو کر اُن کے ساتھ ہولے۔

اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

"لیکن میں ابھی تو نہیں چل سکتا، اتنی صبح صبح یہ کیسے ممکن ہے۔ اور آج مجھے بہت سے کام بھی کرنا ہیں، آپ لوگ مجھے تو معاف ہی کیجئے آج"

"ہاں، ہاں، آپ کیوں چلنے لگے، میں بھولا، آپکو تو آج اُس لونڈیا کو بھی خط لکھنا ہوگا جس کا کل خط آیا تھا، بھلا کیوں چلنے لگے آپ ہم لوگوں کے ساتھ" عزیز نے غصہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی، یہ بات نہیں عزیز، تم تو خواہ مخواہ جلتے ہو۔ اور نہیں تو؟" مراد نے جواب دیا۔

"آخر وہ ایسی کون ہیں جن کو آپ کو خط لکھنا ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتے!" انوار نے سوال کیا۔

"کوئی صاحبزادی ہیں۔ ان کی عزیز۔ انٹرنس پاس ہیں —— کیا چھچورا لڑکا ہے یہ بھی، خط کا جواب دینے کے لئے بیقرار ہوا جا رہا ہے" عزیز نے کہا

"آخر اس خط میں ایسی کون سی بات ہے جس کا جواب لکھنے کیلئے یہ اس قدر بیقرار ہے" اختر نے پوچھا۔

"ارے، وہی محبت کی باتیں اور ہو ہی کیا سکتا ہے" عزیز نے کہا۔

"اور؟" ریاض نے دُہرایا۔

"اور، اور، مجھے کیا معلوم اور، کوئی میں نے اُسے پڑھا تھوڑی ہے جو الف سے لیکر ے تک سُنا دوں" عزیز نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی، ہمیں بھی تو معلوم ہو، آخر وہ کون ہیں تم پہ جان چھڑکنے والی ایسی" مشتاق نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں یار، یہ عزیز تو یونہی باتیں بناتے رہتے ہیں —— میری ایک عزیزہ ہیں، جوان ہیں اور مجھ سے ذرا اُنسیت رکھتی

بیں بہیں ایک عرصے سے اُنکے پاس نہیں گیا ہوں، اس نے بلایا ہو؟"

"تو یہ کہئے، کہ آپ کے لئے محترمہ بیقرار ہو رہی ہیں، کیوں، ہے نا؟"

صدیق نے اپنے خاص لہجے میں الفاظ کو چباتے ہوئے کہا۔

"اماں، بیقرار کون کس کے لئے ہوتا ہے۔ لکھنے کو جو چاہے لکھ یا جائے" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ذرا دکھاؤ تو وہ خط، یہ لڑکیاں بھی خوب ہی ہوتی ہیں" رشید نے خط طلب کرتے ہوئے کہا۔

اُس کی نظریں کوٹ کی جیب پر جا کر جم گئیں۔ اگر انہیں عزیز نے بڑھکر جیب میں سے نکال لیا تو کیا ہوگا۔ لیکن وہ فوراً ہی سنبھلا اور اُس نے کہا کہ وہ خط تو پڑھکر اُس نے پھاڑ بھی ڈالا، کیونکہ اُسے اس قسم کے خطوط جمع کرنے کی عادت نہیں۔

"ایں! پھاڑ ڈالا!! غضب ہی کیا میاں تم نے ـــــ ہاں ٹھیک یاد آیا۔ مجھے بھی اُس کا ایک پُرزہ آج صبح ہی صبح اُڑتا ہوا مل گیا" عزیز نے اپنی جیب سے اس کی بہن کا خط نکالتے ہوئے کہا۔

کمرہ کی دیواریں اور تمام اشیا گھومنے لگیں۔

قہقہوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ لوگ ہنس ہنسا کر، اُسے بُرا بھلا کہہ کر چلے گئے اور وہ نہ جانے کب تک وہیں مسہری پر منہ چھپائے پڑا رہا۔ جب اس کے اوسان ذرا درست ہوئے تو اسکے دماغ میں صرف ایک خیال کروٹیں لے رہا تھا۔

'ایسی زندگی سے تو خودکشی بہتر ہے!'

لیکن خودکشی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

———

اس واقعہ کے بعد اُس نے اپنے پُرانے دوستوں سے یکلخت قطع تعلق کر لیا اور اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ لیکن اُسے اس طرح بھی سکون نہ ملا، دُنیا والوں سے قطع تعلق شاید اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

ایک دن وہ رشید کے کمرے گیا، وہ موجود نہ تھا، اُس کے ہاتھ غیر اختیاری طور پر رشید کا البم کھولنے لگے۔ اور اُس نے جلدی سے رضیہ کے سارے فوٹو نکال کر اپنی اندر کی جیب میں رکھ لئے اور چپکے سے اُسکے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایم۔ اے (فائنل) کے امتحان کے بعد جب وہ اپنے گھر پہونچا تو اُس نے اپنے محلے کے اُن لڑکوں سے بھی ملنا شروع کر دیا جن سے اب تک ملنا وہ اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ اُسکی باتیں نہایت شوق سے سنتے اور وہ اُن میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً رضیہ کے وہ فوٹو دکھاتا۔ اور وہ کہتے:۔

"بھیا۔ آپ کی مہر وا تو بڑی کھوبصورت ہے"

"بیوقوف کہیں کے، مہروا نہیں، محبوبہ۔ سمجھے، محبوبہ!"

اور وہ سمجھنے کی کوشش شروع کر دیتے۔ ـــــ

ـــــ لیکن وہ نہ سمجھ سکے۔ اور ادھر گرمی کی زیادتی نے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ نینی تال روانہ ہو گیا۔ کاٹھگودام سے موٹر میں اس کا ایک نوجوان انگریز عورت کا ساتھ ہو گیا۔ اور نینی تال پہونچتے پہونچتے وہ ایک دوسرے سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ اُس کا شوہر اِن دنوں فوج کے ساتھ سرحد کے علاقے گیا ہوا تھا اور وہ تنہا تھی۔ پہاڑ پر گرمیاں گزارنے کے ارادے سے وہ وہاں آئی تھی۔

وہ دونوں ایک ہی ہوٹل میں برابر برابر والے کمروں میں ٹھیرے اور رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے بہت بے تکلف ہو گئے۔ صبح سویرے وہ دونوں ٹہلنے کے لئے نکل جاتے اور دوپہر تک اِدھر اُدھر پہاڑیوں پر گھومتے پھرتے۔ تیسرے پہر کو وہ جھیل کی طرف چلے جاتے اور رات گئے واپس آتے، وہ اُس کے ساتھ ایک مہینہ نینی تال میں رہ کر شملہ چلی گئی۔ لیکن اس ایک ہی مہینے میں اُس نے اس کے تھکے ہوئے جسم میں ازسرِنو جان ڈالدی۔ کس ہمدردی اور فراخدلی سے اُس نے زندگی کے ایک تھکے ہوئے مسافر کو اپنی آغوش میں جگہ دی تھی، یہ شاید وہ کبھی بھی نہ بھول سکے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی مُردہ دلی، ذہنی انتشار، اور دائمی کوفت دُور ہوتی گئی اور اُس نے اپنے جسم میں ایک نئی روح کو بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

اور اب ـــــ کہ اُس کی زندگی میں عورت داخل ہو چکی ہے، جب کبھی وہ اپنی سابقہ زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے بے اختیار ہنسی آجاتی ہے ـــــ ایک ایسی ہنسی جس میں اب بھی کہیں درد چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

شاہد لطیف

اگر یہ محبت نہیں تو کیا ہے؟

ارے میاں محبت کی اوٹ میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ کئی لوگ صرف اس لئے محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی میں کھو کر اپنا آپ بُھلا دیں۔ یا کسی کی بیوفائی کے پردے میں مر جانے کی آرزو کر سکیں۔ ایسے بھی ہیں جو کسی سے انتقام لینے کے لئے اُسے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ اکثر تو محبت سے محبت کرتے ہیں محبوب سے نہیں۔ مثلاً تم میرے دوست ہو ہے نا؟" زاہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن تم مجھے اس قدر پیارے نہیں۔ میرا مطلب ہے مجھے دوستی زیادہ پیاری ہے۔ تم نہیں ـــــ بُرا نہ ماننا ویسے بات کر رہا ہوں۔"

اگر میں زاہد کی باتوں کو بُرا مانتا تو یہ کہانی لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ میرا ایمان ہے کہ اس کی باتوں کو ماننا یا بُرا ماننا اپنے آپ سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ وہ تو ایک ایسا کتابی آدمی ہے جو کتاب ہی میں جیتا ہو۔ زندگی سے وہ قطعی بے بہرہ ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتا کہ محبت ایک عجیب سی کیفیت ہے جو وقت اور وجہ سے آزاد ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پہلی نظر میں محبت ہو جانا ناممکن ہے۔ خیر چھوڑیے زاہد کی باتوں کو۔ فضول باتیں۔

اس وقت میں اور زاہد دفتر سے آ رہے تھے۔ راہ میں مسٹر جناح کے متعلق بات چھڑ گئی تھی۔ پھر خدا جانے وہ بولتے بولتے پردے اور محبت تک کیسے پہونچ گیا تھا۔ وہ خدا جانے کیا کیا کہتا رہا اور میں کیا کیا سوچتا رہا۔ تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی باتونی آدمی کی باتوں کو شوق تعجب یا بے اعتباری سے نہیں سننا چاہئے۔ ورنہ آپ ہمیشہ کے لئے اس کے تختۂ مشق بن جائیں گے۔ ہم موڑ پر پہونچ چکے تھے۔ "اچھا تو میں کھانا وانا کھا کر آؤنگا" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اور چلا گیا۔

اُن دنوں اُس کا میرے پاس آنا میرے لئے چنداں خوشگوار نہ تھا۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ وہ فلسفہ چھانٹنے کے سوا اور کس لئے آئیگا۔ یہ تھا میرا دوست رازداں۔ جو میری سُننے کے بجائے اپنی کہنے کا دیوانہ تھا۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

گھر پہونچکر میں کرسی میں دھم سے بیٹھ گیا۔ چائے بنانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ میز پر گلدان کے قریب وہ نیا ناول پڑا تھا جو میں نے اُن دنوں پڑھنے کے لئے خریدا تھا۔ "انتقام" کیسا بیہودہ سا نام تھا۔ اور سرورق پر کیسا بھدا سا چہرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں ـــ دروازے کے قریب ایک لفافہ پڑا تھا۔ میں نے اٹھکر وہ لفافہ اٹھا لیا اور پتے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ ہاں وہ خط نزہت کا تھا۔ شاید اسلئے کہ یہ میری عادت ہے کہ جب میں پتے سے سمجھ لوں کہ خط کس کا ہے تو مجھے اُسے کھول کر پڑھنے کا چنداں شوق نہیں رہتا۔ یا شاید اس لئے کہ نزہت کے خط میرے لئے ناخوشگوار تھے۔ میں نے کھولے بغیر اسے میز پر رکھ دیا۔ میں خوب جانتا تھا کہ خط میں کیا لکھا ہے "اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے" اور بس۔ گذشتہ تین سال سے ہفتہ وار وہ مجھے اسی مضمون کا خط لکھتی ہے اور اب تو میں اُس کے خط پڑھ پڑھ کر جل چکا ہوں۔ شاید میں یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے خط میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوں جن سے یہ ظاہر ہو کہ وہاں بالکل خیریت نہیں، یا کم از کم اسے رات بھر نیند نہیں آتی یا وہ پاگل ہوئی پھرتی ہے۔ مگر خیریت . . . . .

خدا کی قسم میرا جی چاہتا تھا کہ میز پر پڑا ہوا گلدان اُٹھا کر زمین پر دے ماروں۔ لیکن غصے میں بھی میں اتنا بھی نہیں بھول سکتا کہ وہ گلدان میں نے چودہ آنے کو خریدا تھا۔ اور چودہ۔ دس جمع چار آنے ہوتے ہیں۔ خدا کی قسم مجھے یہ آرزو ہے کہ میں احمق ہوتا۔ میں اس عقل سے تنگ آ چکا ہوں۔

میں نے اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لئے کتاب اُٹھا کر میز پر دے ماری۔ "ایک اُمید جلانے کے لئے ایک آنہ ضائع کر دینا۔ کیسی حماقت تھی۔ فضول دکھلاوا۔ میری خیریت کے متعلق اتنا ہی فکر ہے تو میرے پاس کیوں نہیں آ جاتی۔ ضدی عورت۔ وہ مجھے نہیں سمجھی۔ میں۔ خدا کی قسم میں بالکل خوش ہوں۔ ہاں بالکل۔ کون کہتا ہے میں خوش نہیں؟"

کتاب کا سرورق پھسل کر زمین پر گر گیا تھا اور زمین سے گھسر گھسر کر سر سر کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ "سرا سر" کہہ رہا ہو۔ اور ورق پر وہ بھدا سا چہرہ میرا منہ چڑا رہا ہو۔ پھر چھت میں بیٹھی ہوئی چڑیا چیخنے لگی۔ "چڑ چڑ۔ چڑ چڑ" یہ کمبخت نے میرے سر پر گھونسلا بنا رکھا تھا۔ مجھے اس چڑیا سے نفرت تھی۔ وہ ہمیشہ بے موقع چیختی۔ جیسے مجھے چھیڑ رہی

ہو۔ اس کے علاوہ اُس کے گھونسلے کی وجہ سے میرا گھر اور بھی ویران نظر آتا تھا۔ اور اُس کی چڑچڑاہٹ سے میرے گھر کی ویرانی اور بھی واضح ہوتی تھی۔

نزہت کا خط دیکھکر میں اکثر پہروں گم سم بیٹھ رہتا ہوں۔ اور میری اس بظاہر خموشی میں ایک ہنگامہ چھپا ہوتا ہے۔ میرا دل کئی ایک حصّوں میں بٹ جاتا ہے اور وہ چھوٹے موٹے حصے آپس میں یوں لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے دفعتاً کسی مکھیوں کے چھتے میں احساس برادری مفقود ہوگیا ہو۔ قصہ یہ ہے کہ مجھے نزہت سے محبت ہے اور محبت میں جو جو دل پر گزرتی ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ زاہد کے آ جانے سے میں بالکل ہی خاموش ہوگیا۔ اور میرا دلی اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔ خدا جانے کتنی دیر تک ہم یوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

پانچ سال ہوئے نزہت میری خالہ زاد بہن تھی۔ اُن دنوں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اسی سلسلہ میں نکھٹو اپنی خالہ کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُن دنوں میں ناول پڑھنے پڑھانے اور سونے میں وقت بسر کرتا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بیکار نوجوان وقت کاٹنے کے لئے ایک خیالی دُنیا قائم کر لیتے ہیں تاکہ اس خیالی دنیا میں جی کر اپنی آرزو پوری کر سکیں۔ میں بھی پڑے پڑے یہ تصور کر لیتا کہ میں ڈپٹی کمشنر کا سٹینو ہو گیا ہوں۔ میری ٹائپ ٹک ٹک چل رہی ہے اور تمام دفتر کے لوگ باگ حیرانی سے میری انگلیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یہ بات کبھی نہ سوجھی تھی کہ مجھے دیوار کی گھڑی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو میری خیالی ٹائپ کو چلانے میں مدد دے رہی ہے۔ یہ ٹائپ کا شغل میں نے شاید اس لئے ایجاد کیا تھا کہ خالہ کے گھر میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خالو تو اکثر باہر دورے پر رہتے تھے۔ خالہ صبح و شام مصلے پر بیٹھی رہتیں باقی رہی نزہت چونکہ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ دن بھر کھانے پکانے میں لگی رہتی۔

خیر کھانے پکانے کی بات چھوڑیے چونکہ مجھے ایسی لڑکیاں قطعی پسند نہیں جو ناخن پالش کرنے اور آئینہ دیکھنے میں لگی رہتی ہیں۔ بات یہ تھی کہ نزہت کے چلنے پھرنے اور بات کرنے کا کچھ ایسا انداز تھا کہ اُسے دیکھکر خواہ مخواہ غصّہ آتا تھا۔

تناسب کے لحاظ سے شاید اس کے نقش خوبصورت ہی ہوں۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ۔ سادہ آنکھیں۔ نوکیلی ناک اور سانولا رنگ۔ مجھے تناسب اعضا کی تمیز نہیں۔ میں تو متکلم اعضا سے متاثر ہوتا ہوں۔ میرا مطلب ہے ایسے اعضا جو جذبات کا اظہار کر سکیں جو کبھی دو آنکھیں ہوں، تو کبھی متبسم اور گاہے غصّے کی جھلک دکھا سکیں۔ لیکن اس لحاظ سے اس کا چہرہ قطعی گونگا تھا۔ جذباتی مد و جزر سے وہ یوں بیگانہ تھا۔ جیسے کسی نے مکھن لگا کر استری کر دی ہو۔ جوانی کے باوجود اس میں ایک کرختگی سی تھی جیسے "کھوٹے والی" میں ہوتی ہے جو گلی کوچوں میں پیسہ پیسہ بکتی ہے اور جس میں کھویا قطعی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اسکے گلے میں کومل سر ہی گویا تھی ہی نہیں اور بات کرتی ہوئی یوں سُنائی دیتی جیسے کوئی اک تارا بجا رہا ہو۔ یوں گردن اُٹھا کر چلتی کہ یہ ظاہر ہوتا کہ ارد گرد کی چیزوں سے اُسے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور وہ کسی اور ہی دُنیا میں رہتی ہے۔ یعنی انجم کے مقابلے میں تو وہ بالکل ہی بدصورت تھی۔

انجم میری منگیتر تھی۔ چھٹپنے ہی میں ہماری منگنی ہوگئی تھی۔ برادری بھر میں کوئی لڑکی انجم سی خوبصورت نہ تھی۔ جب وہ بولتی تو اُس کے گلے میں گھنگرو بجتے۔ چاہے وہ سی رہی ہو یا پکار رہی ہو اُسکے گالوں میں گڑھے سے پڑ جاتے اور ہونٹ یوں کھلے رہتے گویا ابھی کوئی لطیفہ سُن کر بیٹھی ہو۔ اور اگر وہ بیٹھی ہو اور اتفاقاً میں جا نکلوں تو اس کا دوپٹہ لینا ―――― وہ حیا اور نمائش کی تکرار جیسے کالی بدلیوں میں چاند جھول رہا ہو اور وادی کے اُس پار کوئی آساوری الاپ رہا ہو۔

نزہت چاہے کیسی تھی، آخر تھی تو میری خالہ زاد بہن۔ میں نے دو ایک دفعہ اُس سے کوئی بات چھیڑنے کی کوشش کی۔ مگر اُس کے جواب اس قدر مختصر ہوتے جیسے وہ "شارٹ ہینڈ" میں بولتی ہو۔ ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ کوئی ایسی بات سُناؤں کہ حیرانی سے اُسکا مُنہ کھلا کا کھلا رہ جائے۔ میں نے کہا "سُنا آپنے خالہ جی۔ ایک سائنسدان نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے کہ ہمارے خط دو دن کے بجائے دو گھنٹے میں دہلی پہونچ جائیں گے۔ ساری ڈاک کو توپ کے گولے میں بند کر دیا جائے گا پھر اُسے توپ میں رکھکر چلا دینگے۔ پندرہ منٹ میں وہ دہلی جا گریگا۔ اور ڈاک نکالکر تقسیم کر دینگے۔"

"کیا کہا دو گھنٹے میں دہلی" ―― خالہ کے ہاتھ سے تسبیح چھٹکر مصلے پر جا پڑی۔ "سُنا تم نے نزہت" وہ بولیں۔

نزہت اس وقت آلو چھیل رہی تھی۔ خشک سی آواز میں کہنے لگی "جی سُن لیا ہے۔ اماں وہ نیا چاقو کہاں ہے مجھے تو نہیں ملتا" اور پھر آلو چھیلنے میں مصروف ہوگئی۔ مجھے اُس کی بات پر بےحد

غصہ آیا اور میں اٹھکر اپنے کمرے میں جا بیٹھا اور ریپنے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ٹائپ چلانے میں مصروف ہو گیا مگر رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ کیسی بیہودہ سی لڑکی ہے وہ، بد تہذیب۔ بات سننے کی بھی تمیز نہیں، میری بات کو یوں ٹرا دیا جیسے اس کے باپ دادا ہمیشہ سے اپنی ڈاک توپ کے گولے میں بند کر کے بھیجا کرتے تھے۔ اس دن سے اُسے دیکھکر مجھے خواہ مخواہ غصہ آجاتا۔ "دیکھو تو کیسا بنتی ہے۔" "چلتی یوں ہے جیسے اس دُنیا سے کوئی تعلق ہی نہو۔" "بڑی آئی ہے کہیں سے۔" "کھوتے والی" جیسے کی دُو دُو۔ اونہہ"

اس واقعہ سے چند ایک دن بعد بدقسمتی سے میں ایک نیا ناول خرید لایا۔ خدا جانے کیا نام تھا اس کا۔ میں نے تو پوری طرح سے اُسے پڑھا بھی نہیں۔ اس میں بار بار "گلیڈ آئی" کا ذکر آتا تھا۔ میں نے ڈکشنری دیکھی مگر مجھے اچھی طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ گلیڈ آئی کیسی ہوگی۔ تو جب مجھے پڑھنے اور ٹائپ چلانے سے فرصت ہوتی تو میں بیٹھا گلیڈ آئی کی مشق کیا کرتا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مشق کچھ چنداں حوصلہ افزا نہیں ہوتا۔ اڑوس پڑوس میں کوئی لڑکی بھی نہ تھی۔ البتہ میرے کمرے کی کھڑکی کے مقابل پڑوسیوں کی کھڑکی تھی، شمیم کا گھر تھا۔ شمیم نزہت کی پیاری سہیلی تھی۔ مگر شمیم کی کھڑکی بہت دُور تھی، اتنی دُور سے گلیڈ آئی چمکانا۔ اور میں ایک مبتدی۔ پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آیا کہ نزہت ــــــ

میرا یہ مطلب نہ تھا کہ نزہت سے آنکھیں لڑاؤں یا کچھ اور۔ یہ تو ایک سرسری خیال تھا ورنہ میں تو اس کے جمود اور بے نیازی پر غصہ محسوس کیا کرتا تھا۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کیا کرے۔ میری گپیں تعجب یا دلچسپی سے سُنا کرے، مجھے بار بار بھائی جان بھائی جان کہکر بلائے اور اپنی سہیلیوں سے کہے، "یہ ہیں ہمارے بھائی جان۔" جیسے میری چھوٹی بہن رضو کہا کرتی تھی، "ہمارے بھائی جان! ــــ بے حد مزیدار باتیں کیا کرتے ہیں وہ۔" "بھائی جان گھر میں آجائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کا بھونچال آگیا۔ بیحد شور مچاتے ہیں۔" "ہمارے بھائی جان ــــ" یا کم از کم مجھے دیکھکر انجم کی طرح شرما شرما جاتی۔ اور میری باتیں سُنکر ہنسی روکنے کے لئے مُنہ میں پلّہ ٹھونستی پھرتی۔ مگر اس کے برعکس اُسے تو میری موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا گویا وہ میرے وجود ہی سے منکر تھی۔

مجھے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ دُنیا سے اکتائی اکتائی سی کیوں رہتی ہے، چونکہ اگر وہ اکتائی ہوئی رہتی تو یقیناً اس کے انداز میں کچھ عجز کچھ نیاز اور اُداسی کی جھلک ہوتی۔ اُداس حُسن مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ حُسن کی بے نیازی اور اُداسی کا نیاز۔ مصیبت یہ تھی کہ اُسے دیکھکر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ہماری دُنیا سے اکتائی ہوئی ہو۔ اپنی دُنیا سے نہیں۔ جیسے وہ کسی برتر دُنیا میں جیتی ہو اور کبھی کبھار حقارت سے مُسکرانے کیلئے ہماری دُنیا پر نظر ڈالتی ہو۔

یقین کیجئے مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ سوجھا تھا کہ اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔ یا وہ عورت ہے۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ میری خالہ زاد بہن ہے اور بس۔ البتہ میں یہ چاہتا تھا کہ اگر وہ مجھے ایک دلچسپ اور رنگیلا بھائی نہیں سمجھتی تو کم از کم ایک حسین لڑکی کا منگیتر ہی سمجھے اور نہیں تو ایک ہٹا کٹا نوجوان ہی سہی۔ مگر ایک جیتے جاگتے دلچسپ نوجوان کے وجود ہی سے منکر رہنا کیسی بے عزتی تھی۔ گلیڈ آئی کے عشق کے لئے میں نے جو اُسے نشانہ بنا لیا صرف اسی خیال سے کہ جب وہ مجھے یوں احمقانہ طور پر آنکھیں چمکاتے ہوئے دیکھے گی تو مسکرا دے گی مختصر یہ کہ میں اپنی کامیابی اسی بات میں سمجھتا تھا کہ اُسے ایک بار ہنسا دوں اور بس۔ میرا خیال تھا کہ اُسکے ہنس دینے سے میری گذشتہ بے عزتی دھل جائیگی۔

تو کئی ایک دن بڑی محنت سے متبسم آنکھیں بنا بنا کر میں اسکی طرف دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ میرے سر میں درد رہنے لگا مگر اُس اللہ کی بندی نے آنکھ اُٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ اگر کبھی وہ میری طرف دیکھتی بھی تو ایسے ناموزوں موقع پر دیکھتی جبکہ میری آنکھیں بالکل صاف ہوتیں۔ اور جب تک میں اپنی آنکھوں کو متبسم بناتا اُس سے پہلے ہی وہ اپنے اور کسی کام میں لگ جاتی۔ ایک دن مجھے اس قدر غصہ آیا کہ میں نے اس کی طرف مُنہ بنا کر زبان نکالدی۔ اتفاق سے عین اُسی وقت اُس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اُس کی ناک حقارت سے یوں سکڑی جیسے وہ کراہت محسوس کر رہی ہو۔ بہرصورت میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اگلے دن جب ہم دونوں باورچی خانے میں بیٹھے تھے، مجھے ایک نئی بات سوجھی۔ خیال آیا کہ اُس کی پیاری سہیلی شمیم کے متعلق کوئی ایسی بات بناؤں کہ سُنکر جل ہی جائے۔ میں نے نہایت معصوم انداز سے کہا: "نزہت یہ جو پڑوس میں تمہاری سہیلی رہتی ہے اس کا کیا نام ہے؟"

"شمیم"۔ اس نے بے پروائی سے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا: "بھئی شمیم نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے جب تک وہ مجھے نہ دیکھ لے اُسے روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ ہر وقت بن سنور کر کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔ کیا مصیبت ہے۔"

وہ روٹیاں پکانے میں لگی رہی اور میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے تنگ آکر پھر پوچھا "بتاؤ نا۔ اب میں کیا کروں۔ ہیں"

"مجھے کیا خبر" وہ بولی۔

سوائے اس کے کہ میں کمرے میں جاکر ڈپٹی کمشنر کے غمزے کو اپنی انگلیوں کی تیزی سے حیران کرتا میرے لئے اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ ناول تو میرے دل سے اتر گیا تھا "گلیڈ آئی" کیا بکواس تھی۔ لچر۔

ایک روز شمیم، نزہت سے ملنے کیلئے آئی۔ دیر تک دونوں سر جوڑ کر بیٹھی رہیں۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا آخر شمیم میں ایسی کون سی بات ہے کہ نزہت کا اس کے دیکھے بنا دم نکلتا ہے۔ جب شمیم واپس چلی گئی تو میں اندر جا بیٹھا۔ نزہت بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا "نزہت لو بھئی آج تمہاری شمیم سے بات بھی کرلی ہم نے۔ جب وہ میرے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑی تھی میں نے اس سے کہا۔ بڑی شریر ہو تم۔ میری بات سنکر وہ ٹھٹک کر مسکرا کر باہر نکل گئی اور گھر جاکر سیدھی کھڑکی میں جا پہونچی۔ اب وہ وہاں کھڑی خدا جانے کیا کیا کر رہی ہے۔ کبھی آنکھیں مٹکاتی ہے اور کبھی خواہ مخواہ ہنسے جاتی ہے"

نزہت کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن پڑگئی۔ وہ یوں دانتوں سے تاگہ توڑ رہی تھی جیسے اس کے دانتوں تلے تاگے کی بجائے کسی کا سر ہو۔ بہرحال اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔

میں نے اسے جلانے کے لئے کہا "بس دیکھ لیا تمہاری شمیم کو۔ بیچاری"

آخر اس سے نہ رہا گیا بولی "اگر میں ہوتی تو ——" پھر وہ دفعتاً رک گئی۔

"تم ہوتیں تو ——" میں نے دہرایا "کیا کرتیں تم ؟"

اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں "میں ہوتی تو تھپڑ دیتی ایک" اس نے کہا۔

ویسے بظاہر وہ سینے میں لگی رہی۔ مگر میں نے ایسا محسوس کیا گویا اس نے واقعی میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ بے خبری میں میرا ہاتھ اپنے گال پر جا ٹکا۔

اس کے بعد کئی ایک دن مجھے نزہت سے بات کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ البتہ جب کبھی میں اس کے سامنے جاتا تو اسے چڑانے کے لئے اپنا ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیتا۔

اس کے بعد وہ دن آگیا —— صبح سویرے میں کوٹھے پر چڑھ گیا۔ دیکھتا ہوں کہ نزہت پردے کے پاس کھڑی دور ریت کے ٹیلوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے دھیان میں اس قدر محو تھی کہ میرے پاؤں کی چاپ بھی نہ سنی۔ میں دبے پاؤں اس کے قریب جا کھڑا ہوا میرا خیال ہے اس وقت مجھے رضو یاد آگئی ہوگی۔ جب کبھی رضو کو میں یوں بے خبر کھڑے دیکھ لیتا تو میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور رضو میرے ہاتھ ٹٹولتی اور آپ ہی آپ کہتی "اف اتنے بڑے بڑے اوہ میں سمجھی —— بھینس" اور وہ شریر لڑکی ہنس ہنس کر لوٹ لوٹ جاتی —— نزہت کے قریب جاکر مجھے اس کی آنکھیں بند کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس لئے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ اس کے بالوں کی خوشبو سے میرا دماغ بھر گیا —— پھر مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیا ہوا۔ تمام چیزیں میری نظر میں دھندلی پڑگئیں۔ میرا سر ہوا میں جھکنے لگا۔ آنکھیں یوں اکڑ گئیں جیسے پھٹی جارہی ہوں۔ میری دونوں باہیں اٹھیں اور۔ اور اسکے جسم کے اردگرد لپٹ گئیں۔ اور میرے ہونٹ اسکے بالوں پر جا ٹکے۔

وہ تڑپ کر مڑی۔ خدا جانے اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا یا نہیں۔ "اس کا مطلب" اس نے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ایک ساعت کے لئے تو میں خود اپنے کئے پر حیران کھڑا رہا۔ پھر میں نے آنکھ اٹھاکر اس کی طرف دیکھا —— میں نے بڑھکر اس کے ہاتھ پکڑ لئے "مجھے تم سے محبت ہے نزہت۔ خدا کے لئے۔ تمہارے بغیر میری زندگی ویران رہے گی ——"

خدا جانے میں نے کیا کیا کہدیا۔ چونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو چکی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اکثر مرتبہ ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ کسی جوان لڑکی کے قریب ایک عرصے تک رہیں۔ مگر آپ کو یہ شبہ بھی نہیں پڑتا کہ کسی روز جب آپ جاگیں گے اور ایک نظر اسے دیکھیئے تو آپ یوں محسوس کریں گے گویا آپ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کس قدر حسین خاتون ہے۔ عین اسی وقت سے آپ کو اس سے محبت ہو جائیگی اور پھر آپ محسوس کریں گے "اف آج تک میں کس قدر اندھا تھا"

میں نے یہ تمام واقعہ زاہد کو سنایا تھا۔ میرا ہمراز جو تھا وہ مگر آپ جانتے ہیں کتابی آدمیوں کی باتیں ہی الٹی ہوتی ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ میں نے بدنامی سے بچنے کے لئے محبت ایجاد کرلی۔ کیسا بیہودہ خیال ہے۔ وہ کہتا تھا کہ جب کسی نوجوان لڑکی کے بالوں کی خوشبو سے دماغ

بھر جائے اور اُس کی باہیں پکڑ لی جائیں تو اُس سے محبت جتانے کے علاوہ کچھ اور کہنا قطعی ناممکن ہو جاتا ہے۔ دیکھئے نا زاہد کے خیالات کیسے پراگندہ ہیں۔ آنکھوں کا اندھا اور نام چراغ دین۔ مگر آپ تو سمجھتے ہیں نا۔

اُس شریف آدمی سے کوئی پوچھے کہ بھلے میاں اگر وہ محبت نہیں تھی تو اس واقعہ کے بعد میری حالت ایسی کیوں ہو گئی تھی۔ میں دن بھر پڑا رہتا۔ آہیں بھرتا، گاتا۔ رات بھر جاگ کر کاٹتا اور مرنے کی آرزو کرتا۔ وہ ٹک ٹک کرنے والی ٹائپ مجھے بالکل بھول گئی۔ میری خوشی کا انحصار صرف اسی بات پر تھا کہ میں دن بھر اُداس نگاہوں سے نزہت کی طرف دیکھتا رہوں اور کبھی کبھار مجھے دیکھکر اُس کے ہونٹ ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کریں۔ عجیب مسکراہٹ تھی اُسکی "مانولیزا" کی سی مسکراہٹ۔ جب تک میں اُس کی مسکراہٹ دیکھ نہ لیتا مجھے چین نہ پڑتا۔

اب میں نے جانا کہ جسے میں جمود اور بے نیازی سمجھتا تھا وہ درحقیقت ایک عجیب وقار اور تمکنت تھی۔ کس قدر اندھا تھا میں۔ اپنے گذشتہ کفر کو محسوس کر کے میری جبیں میں اور بھی سجدے تڑپ اُٹھے۔ حتیٰ کہ میری دُنیا ہی بدل گئی۔ اور میں نزہت میں کھو گیا۔ زاہد کا خیال تھا کہ میں اپنے کہے ہوتے الفاظ کو پال رہا ہوں اور اپنے آپ کو بھی فریب دے رہا ہوں۔ اصل میں زاہد کا دماغ ٹھیک نہیں۔ شاید اس لئے کہ اُسے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ اُسے یہ معلوم نہیں کہ دل اور دماغ دو مختلف دُنیا ہیں۔ اور جو جو باتیں دماغ میں چمکتی ہیں دل میں آکر ماند پڑ جاتی ہیں۔ خیر، زاہد کی باتیں بس سُن لیا کیجئے۔ دو ایک منٹ دلچسپی میں کٹ جاتے ہیں اور بس۔

برادریوں کے معاملے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ جب ماں اپنے بیٹے کے لئے ایک حسین لڑکی منتخب کر لے۔ میرا مطلب جسے وہ حسین سمجھتی ہو۔ اور ایسے دھوم دھڑاکے سے منگنی کی رسم ادا کرے تاکہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ کتنی اُونچی ناک والی ہے اور گھر والے اُس ہونے والی حسین بہو پر ناز کریں کہ ہم وہ ہیں جنہوں نے محلے میں سب سے بڑے گھر کی لڑکی کو اپنی بہو بنایا ہے۔ تو اُس منگنی کو توڑنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔

جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نزہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو انہوں نے کیا کیا نہ کیا۔ تمام دُنیا کے بیٹوں کو بے نقط سنائیں۔ اولاد کی بے وفائی پر آنسو بہائے۔ اور بالآخر گاؤں چھوڑ کر ہمشیرہ کے پاس چلی گئیں۔ خدا جانے کس محنت سے انہوں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اب زندگی میں اُن کے لئے رونے آہیں بھرنے اور تقدیر کو بُرا بھلا کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ مگر اسکے باوجود وہ نزہت کے خلاف ایک حرف بھی نہ کہہ سکیں۔ آخر وہ اُنکی سگی بہن کی لڑکی تھی۔ مختصر یہ کہ جب میں نوکر ہو گیا تو میری اور نزہت کی شادی ہو گئی۔

ہماری شادی پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں۔ بے شمار باتیں نکلیں — "اتنی خوبصورت لڑکی کو چھوڑ کر اس مٹی کی مورت کو بیاہ لیا —"

"لڑکے کا دوش نہیں لڑکی والوں نے تعویذ کرائے تھے۔"

"لڑکے کا دماغ صحیح نہیں۔"

اور خدا جانے کیا کیا۔ لوگ مجھے یوں گھورتے تھے جیسے میں کوئی دیوانہ ہوں۔ آخر بات دب گئی۔ خیر۔

شادی کے بعد میں اور نزہت دو سال اکٹھے رہے۔ ان دنوں میں نہایت خوش تھا اور نزہت کی محبت اُسی طرح میرے دل میں موجزن تھی۔ دل میں میٹھا میٹھا اضطراب سا رہتا۔ حالانکہ مضطرب رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایک اچھی اسامی مل گئی تھی۔ ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے۔ البتہ دفتر والے حیرانی سے میری انگلیوں کی طرف نہیں دیکھتے تھے اور صاحب کو تو اکثر میری انگلیوں سے گلہ رہتا کہ وہ اتنی تیز نہیں چلتیں اور ٹائپ چلاتے میں راحت کے بجائے کوفت سی ہوتی۔ کمر میں درد رہتا مگر یہ باتیں تو ہوا ہی کرتی ہیں۔

ساٹھ روپے ہم دونوں کے لئے بہت تھے۔ گھر کا کام کرنے میں نزہت کو کمال حاصل تھا۔ ساڑھے چار بجے جب میں دفتر سے آتا تو میز پر چائے لگی ہوتی۔ کھانا وقت پر ملتا۔ اور میرے سلیپر عین مناسب جگہ پر پڑے ہوتے۔ اس کے علاوہ میری قمیصوں کے بٹن پورے ہوتے گویا دھوبی انہیں دھوتا ہی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارا گھر ٹک ٹک کرتے بنیر گھڑی کی طرح چلتا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو ٹک ٹک سے مجھے نفرت سی ہو چکی تھی۔ نزہت اُسی طرح نیم سوئی نیم جاگی چلتی پھرتی یا بیٹھ رہتی۔ اُسے دیکھکر میں یوں محسوس کرتا گویا وہ مجھ سے کوسوں دور ہو۔ کئی دفعہ اُسے یوں بیٹھے ہوتے دیکھکر مجھے شبہ ہوتا کہ ابھی تک وہ میری خالہ زاد بہن ہی ہے اور اگر میں نے کوئی ایسی ویسی بات کی تو مُنہ پر تھپڑ مار دیگی۔ معاً میں اپنا ہاتھ اپنے گال پر رکھ لیتا۔ اور پھر اپنی اِس حماقت پر آپ ہی آپ ہنستا رہتا۔ شاید اُس کی بظاہر دوری کی وجہ ہی سے میں دل ہی دل میں اضطراب محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتی کہ میں یوں بیٹا باندھے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں تو

اُس کے ہونٹ ہلتے اور وہی مُسکراہٹ دبانے کی کوشش کرتے: "مانولزا" کی سی مُسکراہٹ۔ بس میری انتہائی خوشی یہ تھی کہ وہ مُسکرائے اور میں دیکھتا رہوں۔ اب تو اُس کی آنکھوں نے بھی مُسکرانا سیکھ لیا تھا مگر وہی دبی دبی مُسکراہٹ۔ کبھی کبھار میں یہ محسوس کرتا کہ وہ مُسکراہٹ متاثر ہونے کے بجائے متاثر کرنا ہی جانتی تھی۔ فضول وہم۔ خدا کی قسم یہ عقل اور اُس کے وہم۔ خدا کرے میں قطعی طور پر احمق بن جاؤں۔ مجھے خوشی چاہیے عقل نہیں۔ میں نے زاہد سے اس اضطراب کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ بس یہی کہ:۔ "ارے بھائی محبت تو ایک میٹھا سا سکون ہے۔ بیتابی نہیں۔" احمق اتنا بھی نہیں جانتا کہ سکون کیا ہے۔ سکون موت ہے، محبت کی موت زندگی کی موت۔ آپ تو یہ باتیں جانتے ہی ہیں۔

ایک دن میں دفتر سے واپس لوٹا تو نزہت بیٹھی کچھ بُن رہی تھی برآمدے میں میری میز کرسی لگی ہوئی تھی۔ میز پر چائے تیار رکھی تھی۔ میں دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا میں۔ خدا جانے اُس روز مجھے کیا ہوا میں نے نزہت کی طرف دیکھا جی میں آئی کہ میں کوئی چھیڑ خانی کروں، میں نے تہیہ یہ طور پر ایک لمبی آہ بھری اور کہنے لگا: "وہ بھی کیا دن تھے۔ اب تو زندگی میں کوئی بات ہی نہیں رہی۔" نزہت خاموش بیٹھی بُنتی رہی مگر مجھے معلوم تھا کہ اُس کے کان میری طرف لگے ہوئے ہیں۔ میں نے کہنا شروع کر دیا: "اُن دنوں زندگی میں کیسی کیسی دلچسپیاں تھیں، دفتر سے آتا۔ دیا سلائی ڈھونڈتا پھرتا۔ چائے بنانے کے لئے آگ سلگاتا۔ پھونکیں مار مار کر ہار جاتا۔ اُڑ اُڑ کر راکھ آنکھوں میں پڑتی۔ دھوئیں سے دم رُکتا۔ پھر کہیں جا کر چائے تیار ہوتی۔ اور وہ چائے پینے میں کیسی لذت ہوتی، پیتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا گویا ہندوستانی چائے کا اشتہار پڑھ رہا ہوں لیکن اب ——— یہ بنی بنائی چائے۔ وہ بات ہی نہیں۔ وہ مزا ہی نہیں۔ جیسے بیر کھا لئے۔ بیر۔"

نزہت ویسے ہی خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے پھر کہا: "وہ بھی کیا دن تھے۔" اور ایک اور سرد آہ بھری۔ "اب تو ہماری زندگی اُبلے ہوئے چاولوں کی طرح پھیکی پڑ گئی ہے۔"

معلوم ہوتا ہے میری بات اُسے چبھی ہو گی۔ جھکی جھکی آنکھوں سے کہنے لگی: "مگر اب تو آپ چار دن بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

خدا جانے کیوں لیکن میں نے یہ محسوس کیا جیسے اُس نے میرے مُنہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ دو ایک منٹ تو میں گم سم بیٹھا رہا۔ پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ تمسخر آمیز ہنسی: "یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دیجئے بیگم۔" میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

"آزما کر دیکھ لیجئے۔" وہ بولی۔

میں نے سوچا دیکھیں تو کہاں تک ہمت ہے ان میں۔ اُٹھا لپک کے ٹائم ٹیبل اُٹھا لایا۔ اُسے دیکھ کر کہنے لگا: "تو آپ کی گاڑی چھ بجے جائے گی۔ اماں کو میرا اسلام کہنا۔ چند ایک دن رونق میں رہ آؤ گی۔ ہے نا؟"

میرا خیال تھا کہ وہ ہنس پڑے گی اور کہے گی ہم نہیں جاتے۔ بس بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن ہم دونوں اسٹیشن پر بھی پہونچ گئے۔ گاڑی بھی آ گئی مگر اُس نے کوئی بات نہ کی۔ میرا خیال ہے چونکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے اُس سے محبت ہے اس لئے وہ خاموش رہی۔ سمجھتی ہو گی کہ آخر آپ ہی منت کرے گا۔ گاڑی چلنے لگی تو وہ بولی: "وعدہ کیجئے کہ خط ضرور لکھو گے،" ہیں: وہی مسکراہٹ ہونٹوں پر ادھوری مُسکراہٹ۔

"ہاں لکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اور ———" میرا جی چاہتا تھا کہ اُسے گاڑی سے اتار لاؤں مگر جوں جوں وقت گزرتا تھا۔ میرا یہ کہنا "چلو جانے دو۔ گھر چلو۔" مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اور ——— اور ———" میں نے کہا: "جب بھی میرے پاس آنے کو جی چاہے شوق سے آ جانا۔"

"ضرور آؤں گی۔" اُس نے جواب دیا: "جب آپ بُلائیں گے تب ———"

گاڑی چلی گئی تو میں نے اپنی اس حماقت پر اپنے آپ کو جی بھر کر کوسا۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ یہ ہے محبت کرنے کا نتیجہ۔ ہر وقت کسی کے سامنے سر تسلیم خم رہے۔ وہ جانتی ہے نا کہ آخر میں اُس کے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ وہ جانتی ہے کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔ وہ نہیں آئیگی۔ خدا کی قسم وہ نہیں آئے گی اور۔ اور میں بھی اُسے بُلاؤں گا نہیں ——— چاہے میرے مکان میں چڑیاں ہی چڑیاں کیوں نہ آ بسیں۔

زاہد چپ چاپ بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر دفعتاً بولا: "ارے بھائی یہ سب کیسا جھگڑا ہے؟"

"جھگڑا کیسا؟" میں نے چونک کر کہا۔

"یہ اُلٹی ہوئی کتاب، یہ گرا ہوا سرورق، یہ بند کا بند لفافہ اور یہ تمہارا اضطراب سے ہلتا ہوا پاؤں، یہ سب باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تم اپنے آپ سے جھگڑ رہے ہو۔ اور کیا۔" وہ بولا۔

"اُس سے کون سر کھپائے،" میں نے دل میں کہا۔ پھر نہایت سرسری طور پر جواب دیا: "یہ نزہت کا خط ہے ابھی آیا ہے۔"

"تم اسے کھولتے کیوں نہیں؟"

"اس میں خیریت ہی خیریت ہے اور کیا؟"
"یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ وہاں خیریت نہ ہو۔ ہیں؟"
"اوہ۔ زاہد" میں نے جل کر کہا "تم نہیں جانتے۔ مجھے اُس سے محبت ہے، محبت۔ سمجھے — خاک سمجھے!!"

"میں کہتا ہوں تم اُس بے چاری کی زندگی تلخ کیوں کر رہے ہو۔ محبت اسے نہیں کہتے میرے بھائی۔ محبت تو ایک سکون ہے۔ رنگین میٹھا سا سکون۔ تمہارا یہ اضطراب ظاہر کرتا ہے کہ تم اُسے تسخیر کرنا چاہتے ہو، تم اُس کے محبوب بننا چاہتے ہو۔ تم اُسے نیچا دکھانا چاہتے ہو۔ تم —"

خدا جانے کیا بک رہا تھا وہ — میں اُس کی باتیں سنکر آگ بگولہ ہوگیا "سراسر احمق ہو۔ آخر۔ آخر میں کیوں چاہتا ہوں کہ اُسکے خط میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہوں جن سے ظاہر ہو کہ وہ خیریت سے نہیں۔ اُسے نیند نہیں آتی۔ وہ پاگلوں کی طرح پھرتی ہے۔ تین سال ہو چکے ہیں۔ وہ مجھے صرف ایک فقرہ ہفتہ وار لکھتی ہے "اُمید ہے آپ خیریت سے ہونگے" اور میں مہینے میں صرف ایک بار جواب میں لکھتا ہوں "یہاں بالکل خیریت ہے" اور میرا جی چاہتا ہے کہ بالکل کو "بل کُل" لکھوں تاکہ اور بھی واضح ہو جائے۔ کیوں کیا بالکل بذاتِ خود واضح نہیں ہے۔ تین سال سے میں اماں سے ملنے بھی نہیں گیا۔ یہ سب باتیں محبت کی دلیل نہیں تو کیا ہے۔ تم محبت کو کیا جانو یہی اضطراب یہی کشمکش محبت کا ثبوت ہیں۔

ناول کا سرورق ہوا کے جھونکے سے زمین سے گھسر گھسر کر سر سر کرنے لگا۔ میں نے یوں سُنا جیسے کوئی سراسر کہہ رہا ہو۔ میری نگاہیں اُس کی طرف پھر گئیں۔ سرورق پر وہ بھدا سا چہرہ گویا میرا مُنہ چڑا رہا تھا۔ اُس کے اُوپر سُرخ روشنائی ور جلی قلم میں لکھا تھا "انتقام" کیسا بیہودہ سا سرورق تھا میں نے اپنی نگاہیں ہٹا لیں۔

"ایسا بُرا سرورق بھی نہیں" زاہد نے مجھے مُنہ پھیرتے ہوئے دیکھکر کہا "حقیقت تو تلخ ہی ہوتی ہے"

احمق۔ کتابی جانور۔ میری دل میں زاہد کیلئے نفرت سی کھول رہی تھی "اگر یہ محبت نہیں تو کیا ہے" میں غصّے میں چلایا "جواب دو"

چڑ۔ چڑ۔ چڑ۔ چڑ۔ چڑیا چہچہنے لگی۔

زاہد نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا "سُنا تم نے" اور پھر چھت کی طرف دیکھکر کہنے لگا "تھینک یو"

واقعی پاگل ہے وہ — چھوڑو اُس کی بات کو۔ مگر آپ تو سمجھتے ہیں نا؟

ممتاز مفتی

ناسُور

سرجیت نے جلدی جلدی لکھا۔

"ایشور جی مجھے لے چلو ـــ اسی وقت لے چلو، میری رُوح قفس کی تیلیوں میں ہمیشہ کے لئے مقیّد ہو جانے والے پرندے کی طرح چھٹپٹاتی رہے گی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں تڑپ تڑپ کر کے جلتی رہوں؟ آپ نے مجھے یہ سب کیوں سکھایا؟ ـــ یہ آرٹ، یہ فن، یہ باریک بینی ـــ میری آنکھوں کو اتنی وسعت اور بارکیاں کیوں عطا کی؟ میرے دل کو اتنا حسّاس کیوں بنا دیا؟ میرے دماغ کو........ کیا اس لئے کہ ان تمام جذبات و احساسات کے ساتھ ان اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے (جو آپ کے قول کے مطابق، خاص طور پر تصویر کشی کے لئے بنی ہیں۔) میں لوہے کی سلاخوں پر رنگ کیا کروں.....؟"

ـــ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسوؤں کے ایک دو قطرے کاغذ پر گر کر پھیل گئے۔ حلق میں کچھ گولا سا آکر اٹک گیا۔ اور دل کی کپکپی سے کلائیوں کی چوڑیاں قدرے جھنجھنا اٹھیں، اور پیشانی کے سُنہری چاند کا عکس سامنے سنگار کی میز کے آئینہ میں پڑ کر کمرے کو منوّر کرتا ہوا فضا میں کھو گیا۔

قریب ہی رسوئی خانے سے گویا بے شمار پلیٹوں کے دھو کر رکھے جانے کی آواز آرہی تھی، لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو ماحول کے ذرّے ذرّے میں بسی جا رہی تھی۔ نوکروں اور منتظموں کی چل پوں کے مارے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ بڑے ہال کمرے میں بارات کے بیٹھنے کا انتظام کرنے والے لوگوں میں ایشور کا کوئی قہقہہ گیلری میں سے گذر کر وہاں آپہونچتا تھا۔ اور اوپر برساتی میں بچیاں گا رہی تھیں۔ بالو اپنے چن (چاند) سے کہتی ہے۔

کوئی مصری دی ڈلی او ڈھل
کل اساں مُڑ جانا ں پھر ڈھونڈیں گا گلی او گلی

سرجیت جھکی جھکی لکھ رہی تھی۔ خوبصورت بنارسی ساڑھی اور بیش قیمت زیوروں میں ملبوس، اُس کے حُسن کو چار چاند لگے ہوئے تھے۔ لیکن یہ چاند موسم سرما کے شکل کہکشاں کی چاندنی راتوں کے چاند تھے۔ جنکی چاندنی صبح کے دھندلکے میں ماند پڑ چکی تھی۔

سیدھی کھڑی ہو کر، ساڑھی کے دامن سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اُس نے خط پڑھا۔ ہال کمرے سے ایشور کا قہقہہ پھر گیلری میں سے گذرتا ہوا آیا ـــ

خط کو فوراً بند کر کے اُس نے نوکر کو آواز دی۔

رسوئی کے دروازے پر اُسکے بابا کھڑے تھے۔ ان کے چہرے کی رگ رگ سے مسرّت پھوٹ رہی تھی۔ ان کی زندگی میں، جیسے اس سے بڑا خوشی کا دن پھر نہ آئے گا ـــ ان کے گال پھولے ہوئے تھے، آنکھیں روشن تھیں، اور ڈاڑھی کے سفید بال گویا اندرونی مسرّت کی وجہ سے چمک رہے تھے۔

سرجیت کُرسی میں دھنس گئی۔ خط اُسکے ہاتھوں میں تڑمڑ گیا اور پھر پُرزے پُرزے ہو گیا

اُسی وقت نوکر نے آکر پوچھا: "کہئے بی بی جی؟"

"ایشور جی سے کہو۔ اتنے اُونچے نہ ہنسیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

نوکر لمحہ بھر کیلئے حیران کھڑا رہا۔ اور پھر چلا گیا۔

اور سرجیت نے سوچا آج یہ کتنے اونچے۔ اور اتنا زیادہ کیوں ہنس رہے ہیں۔ پہلے تو کبھی اس طرح نہیں ہنسے۔

پانچ مہینے پہلے ـــ

آغازِ بہار کی ایک دوپہر میں ایک دُبلا پتلا خوبصورت نوجوان دہم کناٹ سرکس کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ گلے میں سلک کی قمیص، اس پر اچکن۔ کمر میں چوڑی دار پائجامہ، پاؤں میں کامدار جوتا۔ اور سر پر احتیاط سے بندھی ہوئی دستار۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ لیکن طور و اطوار اور پوشش سے وہ ہنسمکھ حسین صورت نوجوان معلوم ہوتا تھا بے پروائی کا کوئی نشان اُس میں نظر نہ آتا تھا ـــ اچکن کے بٹن ضرور کھُلے تھے۔ قمیص کے گلے کا بٹن بھی کھُلا تھا۔ اور گلے کا خوبصورت خم صاف دکھائی دیتا تھا ـــ لیکن اتنی سی بے پروائی تو فیشن میں شامل سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی ہے۔

سیڑھیوں کے پاس آکر وہ کچھ رُکا۔ باہر دھوپ تیز تھی۔ اور اسکی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جھلک آئی تھیں۔ جیب سے ایک رومال

جیسا سفید، نہ کیا ہوا۔ رومال نکال کر اُس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا، سُکھ کی ایک لمبی سانس لی اور پھر ان کشادہ سیڑھیوں کی چوڑی دیواروں پر اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے غیر ارادی طور پر نظر نہ آنے والی تصویریں بناتا ہوا آہستہ آہستہ اُوپر چڑھنے لگا۔

چند لمحے بعد جس کمرے میں وہ داخل ہوا، وہ ایک آرٹسٹ کا کمرہ تھا۔ ویسے اُسے ڈرائنگ روم بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کمرے میں اہم چیزیں قیمتی کوچ اور ان پر پڑے ہوئے ریشمی گدے، صاف و شفاف دری اور اُس پر کے خوبصورت غالیچے، درمیان میں رکھا ہوا اخروٹ کی لکڑی کا چوکور میز اور اس پر کا گلدان۔ کھڑکیوں یا دروازوں کے بھاری بھاری پردے نہ تھے، بلکہ دیواروں پہ ٹنگے ہوئے مصوری کے بہترین نمونے، انگیٹھی کے پتھرے کی گلکاری، اس پر رکھی ہوئی ایک پیتل کی بڑی اور خوبصورت مورتی۔ ایک کونے میں رکھا ایزل، اس پر فٹ کیا ہوا سکرین۔ پاس ہی رکھے ہوئے سٹول پر بڑی ٹرے اور اس میں احتیاط سے سجا ہوا پیلٹ، رنگ کا ڈبہ اور قیمتی برش تھے۔

کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ نوجوان نے نہایت میٹھی آواز میں پکارا ۔۔۔ ”سرجیت!“

کمرہ خالی تھا۔ آواز پھر آئی ا۔

”سرجیت!“

پھر دروازے پر پیار بھری ایک ٹِک اور پھر کواڑ کھول کر پائدان پر پاؤں پونچھتا ہوا نوجوان اندر داخل ہوا۔

لمحہ بھر کے لئے اُس نے اِدھر اُدھر ٹنگی تصاویر پر ایک نگاہ ڈالی، پھر وہ سکرین کے پاس گیا۔ چارکول کا کچھ سکیچ سا بنا تھا۔ اُس نے ٹرے میں سے چارکول اُٹھا کر ایک دو لکیریں بناتے ہوئے پھر آواز دی ”سرجیت!“

ایک چھوٹے سے نوکر نے اندر سے کہا ”ابھی آتی ہیں بابوجی“ اور ایک پلیٹ میں مٹھائی لا کر میز پر رکھ دی اور پوچھا ”سوڈا پیئیں گے یا ....“

”پانی“ اور پھر کہا ... ”نہیں، کچھ بھی نہیں ...“

نوکر چلا گیا۔

نوجوان نے مٹھائی کا ایک ننھا سا ٹکڑا مُنہ میں رکھ لیا۔ اور وہ برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سامنے فٹ پاتھ پر اُگے ہوئے جامن کے درخت نو عمری کے باعث اُونچے اور گھنے نہیں تھے۔ اور مستی میں جھوم رہے تھے۔ تارکول کی وسیع، چوڑی سڑک پر ایک تانگہ جا رہا تھا، اس میں ایک حسینہ گویا اپنی ہی دُنیا میں محو بیٹھی تھی۔ نیچے دُکان کے سامنے ایک موٹر رُکی اور اس میں سے اُتر کر بٹوا ہاتھ میں لئے ایک تیز تیز چلتی ہوئی ساڑھی دُکان میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ایک سوٹ سگار کا دھواں چھوڑتا ہوا چلا۔ پاس سے سُرخ سُرخ گالوں والے دو بچے لمبے لمبے کالروں کی قمیصیں اور نیلی نکریں پہنے بائسکلوں پر گویا اُڑتے ہوئے چلے گئے .....

نوجوان نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ مڑا، اندر سے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ اور اُسے تصویر کا فریم دکھائی دیا۔

”زندگی بھی کیا دل کا عکس نہیں سرجیت؟ ...“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

لیکن جسے وہ سرجیت سمجھا تھا وہ سرجیت کے بابا نکلے۔

تصویر ہاتھوں میں لئے اور اسے دیکھتے ہوئے وہ آ رہے تھے۔ دہلیز کی ٹھوکر لگنے سے وہ گرتے گرتے بچے۔ اِنکے گالوں سے خوشی جھلکتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے مسرت کی کرنیں نکل رہی تھیں۔

نوجوان نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ سفید ڈاڑھی، بھولا چہرہ، مُسکراتے ہوئے ہونٹ، سردار بہادر سردار گوردیال سنگھ کو دیکھتے ہی اُسکی آنکھوں سے پدرانہ عقیدتمندی پھوٹ آئی تھی۔

”سرجیت آج نہ آئیگی؟“ اس نے پوچھا۔

بوڑھے بابا ذرا نزدیک آئے۔ اور رازدارانہ انداز میں بولے ”جالندھر میں ٹاٹا کے ایجنٹ سردار صاحب سردار بلبیر سنگھ ہیں نا۔ اور ان کے لڑکے ہیں مہندر سنگھ ... ایم۔ اے ہیں اور تعلیم حاصل کرکے مری نگر میں اپنی برانچ کے کام کی نگرانی کرتے ہیں۔ وہ آج سرجیت کو دیکھنے آئیں گے۔ اُن کی دو کوٹھیاں جالندھر میں ہیں اور لاہور میں اور کشمیر میں .....“ اور انہوں نے پوچھا ”دیکھو اس تصویر کو تم نے سرجیت کی سب سے اچھی تصویر کہا تھا۔ اور اسکی تعریف سردار سوبھا سنگھ اور چغتائی نے بھی کی ہے۔ اسے اس جگہ کیوں نہ لٹکایا جائے؟“

طنزیہ مُسکراہٹ کے ساتھ نوجوان نے پوچھا ”تو وہ بھی آرٹسٹ ہیں ۔۔۔؟“

بابا نے ہنستے ہوئے کہا ”نہیں ... مگر ...“

”ہاں! ہاں لگا دیجئے۔ اور ابنیندر ناتھ، نندلال بوس، کنو ڈیسائی اور چغتائی کی تصویروں کی جگہ بھی سرجیت کی بنائی ہوئی دھاری تصویریں لگا دیجئے۔ شاید وہ یہ سب تصویریں پسند نہ کریں۔ آپ کو

پتہ ہے نا، چرن سنگھ ..... "

"یہ تم نے ٹھیک کہا" اور بزرگ جلدی جلدی واپس لوٹ گئے۔

پھر ابنیندر ناتھ کے "آزاد ہرن" کی جگہ "دھیان میں محو گورو نانک" نندلال بوس کے "پرکرتی پرش" کی جگہ "دربار صاحب امرتسر" چغتائی کے "پروانے" کی جگہ "گورو تیغ بہادر" اور کنوڈلیسائی کے "باپو" کی جگہ سرجیت کی خود بنائی ہوئی تصویر لگا دی گئی۔

اب کہ وہ مختلف آرٹسٹوں کی نمائش کی جگہ ایک ہی آرٹسٹ کی (دھارمک) تصویروں کی نمائش گاہ بن گیا۔ اور وہ تصویریں جن پر ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصوروں نے نہ جانے کتنے قیمتی دن صرف کئے تھے۔ اور سرجیت نے نہ معلوم کس شوق سے لاہور، شملے، دلی اور کلکتے کی نمائشوں سے خرید کیا تھا۔ اندر چھوٹے سے سٹور روم میں چلی گئیں۔ (جو صرف سرجیت کے مصوری سامان کے لئے مخصوص تھا۔)...

تب بوڑھے بابا ایک اطمینان کی سانس لیکر برآمدے میں جا بیٹھے۔ اور نوجوان کوچ میں دھنس گیا۔ لیکن دھنسنے سے پہلے اس نے اتنا ضرور پوچھا تھا۔ "تو آج میں جاؤں؟" اور جب "نہیں، نہیں... آپ..." کہتے ہوئے بزرگ اٹھنے لگے تھے، تو وہ چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں سرجیت کی تصویر پر چلی گئیں۔ سرجیت کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی تصویر! کوئی دیکھ لے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔ حسن کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے لئے طراوت نور چار سو پھیل رہا تھا۔ اور چشم بینا کو اپنی ضیا سے معمور کئے دیتا تھا۔

سرجیت کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی تصویر.... لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے اس تصویر پر کتنی محنت کی تھی۔ اور اسکے دماغ کی تمام طاقتوں نے کس طرح اس کے نقوش کو ابھارا تھا۔ کیا اس لئے کہ ایک لوہے کا سوداگر اسے دیکھ کر سرجیت کو پسند کر سکے؟

ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ لیکن اس وقت سرجیت کمرے میں داخل ہوئی۔ پنکھڑیوں سے ہونٹ مسکرائے۔ شرم کے بارے دبی تتلی کے پنکھوں سی پلکیں پھڑپھڑا اٹھیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے گویا ہونٹوں میں ہی اس نے کہا "ست سری اکال، ایشور جی!"

"ایشور جی" نوجوان ہنسا اور پھر جیسے میلوں کی مسافت کے بعد وہ کوچ میں دھنسا ہو اور اٹھنے میں اسے تکلیف ہو رہی ہو — بیدلی سے اپنی ہتھیلی کوچ پر رکھکر وہ اٹھا، اور ایزل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ وو دن آئے نہیں؟"

اور وہ تتلی کے پروں سی پلک پھڑپھڑائی۔ نوجوان نے ادھر دیکھا اور مسکرایا۔

"میری یہ تصویر دیکھیے گا، سب تصویروں سے بازی لیجائیگی۔ میں کہتی ہوں ایشور جی۔ میرے دل میں اتنے جذبات ہیں، اتنے خیالات ہیں، کہ اگر مجھے ٹیکنک پر قدرت حاصل ہو جائے، تو جانے کیسی کیسی چیزوں کی تخلیق کروں: "اکٹھے نور تے سب جگ اپجیا"[1] تو آپ نے سنا ہو گا لیکن اس فقرے کی معیاری تشریح (Realistic Interpretation) کا خاکہ بھی ذرا دیکھیے گا۔

"لیکن لوہے کا سوداگر شاید اسے پسند نہ کر سکے" کوئلہ لیکر خاکے کی کچھ لکیروں کو ٹھیک کرتے ہوئے ایشور نے کہا۔

سرجیت کا رنگ کانوں تک سرخ ہو گیا اور اس نے گویا پہلی بار چونکی ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ کیا؟ یہ سب تبدیلی کس نے کی؟" اس تصویر کو دیکھتے ہوئے سرجیت نے کہا۔

"اس لئے کہ لوہے کا سوداگر تمہیں پسند کر لے، جانتی ہو نہ چرن سنگھ کی بات ....."

یہ چرن سنگھ ایک پروبیشنری مجسٹریٹ تھے۔ بہت غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اپنی محنت کی بدولت پی۔سی۔ایس کے امتحان میں اول آئے تھے۔ ایک تصویر کو نسبتاً عریاں دیکھکر اس نے کہا تھا "جو ایسی تصویریں بنا سکتی ہے۔ (یا شاید جو ایسی تصویریں ڈرائنگ روم میں لگا سکتی ہے) وہ ایک گھر کو سکھی نہیں رکھ سکتی۔ پھر وہ خوبصورتی میں چاہے حور ہی کیوں نہ ہو —" ان کی یہ بات ان کے ایک دوست کے ذریعے ایشور تک پہونچی تھی۔ اس وقت تو انہوں نے صرف یہی کہا تھا کہ لڑکی زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ اور انہیں اتنی پڑھی لکھی نہیں چاہیئے —

پانچ سال پہلے —

ایشور اپنے سٹوڈیو میں صرف ایک ریشمین قمیص اور تہمد پہنے اور قلم ہاتھ میں لئے ایک تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ چونکہ تصویر حسب خواہش بن رہی تھی۔ اسی لئے وہ دھیمے سُر میں سیٹی بھی بجاتے جاتا تھا — ایک تشنۂ تکمیل گیت.... زندگی کی شاہراہ پر کسی شام کے دھندلکو

[1] جپ جی صاحب کی ایک سطر۔

میں اُفق کے اُس پار مغرب کے ٹھہرے نیلے بادلوں میں ندیوں کی مانند لکیریں جھلملا اٹھتی ہیں۔ ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ آ ملتے ہیں۔ کچھ اکٹھے چلتے ہیں۔ دلوں کے ساز سے محبت کا راگ نکلتا ہے۔ لیکن ابھی وہ راگ ختم نہیں ہوتا، کہ زندگی کا موڑ آجاتا ہے۔ جہاں سے انہیں الگ الگ ہونا ہے...

...کہ نوکر نے کارڈ دیتے ہوئے کہا: "سردار بہادر سردار گورو پال سنگھ ہے۔"

اُس نے کارڈ وہیں رکھ دیا۔ اور وہ ڈریسنگ گاؤن پہن کر نووارد سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔

نووارد سادہ لوح بوڑھے آدمی تھے۔ گھنی لمبی سفید ڈاڑھی، اور بھاری مونچھوں میں سے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھن چھن کر چہرے کو منور کر رہی تھی۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا" انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میں نے آپ کے فن کی بہت تعریف سنی ہے۔ میری ایک پوتی ہے۔ اور صرف وہی ایک میری مسرتوں کا مرکز ہے۔ میرا لڑکا انجنیئر تھا۔ وہ اور اس کی بیوی بچے سب کوئٹے کے زلزلے میں دب گئے۔ (اور اس واقعہ کی یاد سے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے)... بس ایک یہ لڑکی بچ گئی۔ باپ نے اسے ترس ترس کر پالا تھا۔ اس کے جنم پر باجے بجائے گئے تھے۔ مٹھائی تقسیم کی تھی، لیکن وہ اپنی زندگی میں اُسے اپنے گھر بار دیکھنے کا شوق بھی پورا نہ کر سکا۔"

اور خشک گلے کو زبردستی گیلا کرتے اور رقت کو دباتے ہوئے انہوں نے پھر کہا: "ایف۔ اے میں اپنی جماعت میں اچھے نمبروں پر پاس ہوئی تھی۔ اُسے تصویریں بنانے کا بڑا شوق ہے۔ اگر آپ کچھ وقت دے سکتے تو...."

اِیشور نے بڑی حلیمی سے کہا: "میں ٹیوشن نہیں کرتا"

بزرگ کچھ مایوس ہو گئے۔ تاہم انہوں نے کہا تھا: "میری بڑی بڑی خواہش تھی کہ آپ کچھ نہ کچھ وقت (خواہ ہفتے میں صرف ایک ہی دفعہ) اُسے ضرور دیتے" اور پھر کہا: "اُسے بہت شوق ہے، اس کا ہاتھ بھی کافی چلتا ہے۔ آپ کو بہت تکلیف نہ ہوگی۔ صرف اُسے راستہ بتانے کی ضرورت ہے۔ وہ چل پڑے گی"

بزرگ کی صورت میں جو استدعا، انکے لہجے میں جو انکساری تھی، اُس نے مصور کو تذبذب میں ڈال دیا۔

اور بوڑھے سردار بہادر نے پھر کہا تھا: "پتاجی کی وہ بہت لاڈلی تھی۔ اب جبکہ موت نے اس کے سر سے یہ لاڈ کا ہاتھ اٹھا لیا ہے، میں اس بات کی کمی محسوس نہیں ہونے دونگا۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کروں گا"

—— یہ کہتے کہتے اُس کی گفتگو پُرسوز ہو گئی تھی اور مصور مان گیا تھا۔

دو دن بعد جب وہ بتلائے ہوئے وقت پر اُن کے گھر پہونچا تھا اور دری پر بیٹھی ہوئی اور ایک کاغذ پر کسی چیز کا خاکہ بناتی ہوئی دوشیزہ سے بزرگ نے کہا تھا۔

"سرجیت یہ ہیں تیرے ماسٹر جی"

اور جھکی جھکی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اوپر اٹھی تھیں تو وہ ازخود رفتہ سا ہو گیا تھا۔

پھر وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اُس نے ہفتہ میں صرف ایک دن آنے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن یہ سب پہلے کی باتیں ہیں۔ اُس دن تو صرف اتنا ہی ہوا کہ سٹوڈیو میں پڑے ہوئے ایزل اور اس پر کسے ہوئے سکرین اور اس پر بننے کا انتظار کرتی ہوئی تصویر کو بھول کر وہ اس بیاہ کے لئے کرایہ پر لی ہوئی اس کوٹھی میں سرجیت کے بابا کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ اور نوکروں، حلوائیوں اور دُور دراز سے شادی کے موقع پر آنیوالے مرد، عورتوں اور ان کے بچے بچیوں کے شور و شغب میں اس کے قہقہے گونجتے رہے۔ اور جب وقت آنے پر دولھا صاحب تشریف لائے گیانی جی نے شبد پڑھنے شروع کئے تو سرجیت چپ چاپ گرنتھ صاحب کے سامنے جا بیٹھی ——

اِس کے بعد ایک برس تک سری نگر سے اسکے خطوط آتے رہے، ایک خط میں اُس نے لکھا:

"..... ہر طرف بہار چھائی ہے، پھول کھلے ہیں، بگو گوشوں کے درخت پھلوں سے لدے ہیں، لیکن میرے من کا پھول مرجھا گیا۔ اور پھل شاید اب اُسے کبھی نہ لگے گا...."

پھر ایک چٹھی میں لکھا۔

"یاد ہے نا ایشور جی، تم نے ایک بار کہا تھا۔ میں تمہارے یہاں کبھی ٹیوشن نہ کرتا اگر یہ کہتے کہتے —— پتا کو وہ بہت لاڈلی تھی، اب جبکہ اُس کے سر پر پتا کا ہاتھ نہیں رہا، میں اُسے یہ کمی محسوس نہ ہونے دونگا۔ اُس کی ہر خواہش پوری کروں گا —— تمہارے بابا کی آنکھوں میں

آنسو نہ آجاتے۔ مجھے تمہارے منتر سنے ہوتے اُن کے یہ فقرے بار بار یاد آتے ہیں۔ اُنہوں نے میری تمام آرزوئیں پوری کی ہیں۔ یا میں نے اُن کی ؟"

پھر ایک بار لکھا۔

"ماں باپ لڑکیوں کو سو ناز و نعم سے پالتے ہیں۔ انہیں علیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں۔ انہیں فنون لطیفہ سے آشنا کرتے ہیں۔ کوئی موسیقی میں کمال حاصل کرتی ہے، کوئی شاعرہ بن جاتی ہے، اور کوئی بدنصیب آرٹسٹ! پھر ماں باپ بیاہ کر دیتے ہیں۔ میری ایک سہیلی ہے، اس کی آواز میں لوچ تھا، لیکن اُس کے سازوں پر اب دھول پڑی رہتی ہے۔ ان کے ڈھکنے کھولنے میں بھی اُسے ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ ایک دوسری سہیلی اچھی شاعرہ اور افسانہ نگار بن رہی تھی۔ اس کے پتا اُسے دیکھنے کے لئے آنے والوں کو بڑے فخر کے ساتھ اُس کی لکھی ہوئی نظمیں اور کہانیاں دکھایا کرتے تھے۔ لیکن اب ـــــــ اب اُسے اخبار تک دیکھے ہفتوں گذر جاتے ہیں۔ ایک تیسری بدبخت تھی، سرجیت، بڑی مصور بننے جا رہی تھی لیکن اب ....

مگر چھوڑو۔ باہر صبح کا سورج کب سے نکل آیا ہے۔ کھڑکی کے سنبتوں میں سے پہاڑ کی برفانی چوٹیوں کو دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ روح اُسے باہر جا کر پہاڑیوں میں طلوع ہوتے ہوئے دیکھنے کیلئے تڑپ رہی ہے۔ لیکن وہ تو پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ اور دس بجے تک لیتے رہیں گے ...."

ــــــ یہ خطوط کبھی پندرہ دن، کبھی مہینہ اور کبھی دو مہینے کے بعد آتے رہے لیکن آخر ان کا سلسلہ قطعی بند ہو گیا۔

پانچ سال بعد ـــــ

آغاز بہار کی ایک دوپہر تھی، ایشور ہ م، کناٹ سرکس کی کی طرف جلدی جلدی بڑھا جا رہا تھا۔ سر پر دستار بھی تھی لیکن ہم اُسے احتیاط سے سجائی ہوئی نہیں کہہ سکتے۔ گلے میں سلک کی قمیص اور اُس پر اچکن لیکن دونوں کا رنگ ذرا میلا تھا۔ اُوپر کی جیب کا رومال اب دائیں جیب میں پڑا تھا اور اب وہ تہ کیا ہوا بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ دودھ ایسا سفید تھا۔ کمر میں چوڑی دار پاجامہ تھا۔ اور پاؤں میں چپل، کچھ ایسی بے پروائی اس پر مستولی تھی جسے فیشن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

آسمان پر سفید، مٹیالے، نیلے، کالے بادلوں کے ٹکڑے بکھرے تھے جیسے ہوش کی اس وسیع سکرین پر کسی مصور نے اپنی قلم سے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے دھبے بنا دئے ہوں۔ سورج پر ایک کالے بادل کا ٹکڑا چھا گیا تھا۔ دور کوٹھیوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرے نہیں تھے اور اگر ہوتے بھی تو انہیں پونچھنے کی پروا نہ کرتا ـــــ آج پانچ برس کے بعد سرجیت آئی تھی۔ اور وہ بھی اپنے بابا کی موت پر بھی اور اُس نے سنا تھا کہ اس پانچ برس کے عرصے میں وہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے۔

سیڑھیوں کی دیواروں پر لکیریں بناتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ اُوپر جانے لگا۔ لیکن ہر ایک سیڑھی کے ساتھ ساتھ اُس کی رفتار مدھم ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اُنکے خاتمہ پر وہ رُک گیا۔

کچھ دیر بعد جس کمرے میں وہ داخل ہوا وہ ایسا ہی تھا، جیسے کوئی کمرہ پانچ سال کے بعد ہو سکتا ہے۔ جسے اس لمبے عرصے میں ایک دفعہ بھی عورت کے ہاتھوں نے نہ چھوا ہو۔ وہی پردے تھے۔ وہی کوچ، وہی میز اور اس پر رکھے ہوئے گلدان، وہی انگیٹھی اور اُس پر وہی مُرقّع، وہی تصویریں جن کو اس غرض سے لگایا گیا تھا، کہ لوہے کا سوداگر انکے خالق کو پسند کرے۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف ایک ہلکی سی اُداسی ان پر چھائی ہوئی تھی۔ کم از کم جب ایشور کمرے میں داخل ہوا اُس نے ایسا ہی محسوس کیا۔

آنے سے پہلے اُس نے آواز دی۔ لیکن سرجیت کہکر نہیں۔ ڈکر کا نام لیکر۔ پھر دروازے پر بیدلی سے ٹک ٹک بھی کی۔ لیکن اسکے نہ کھلنے پر وہ اندر نہیں گیا۔ بلکہ باہر انتظار کرتا رہا۔

تب ایک ننھی بچی نے آکر کہا "آجائیے"

ــــ اور وہ کوچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور حسرت سے اُسی ننھی سی کلی کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں جیسا چھریرہ پتلا جسم، لمبی تیکھی ناک، خوبصورت دلکش چہرہ۔ ویسی ہی پھڑپھڑاتی پلکیں۔ اور پتیوں سے ہونٹ ــــــ اور ہاتھ پکڑ کر اُس نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور بولا "ــ نام کیا ہے تمہارا ؟"

"لاڈلی"

"لاڈلی !" اُس نے دل میں سوچا۔ شاید تمہارے آنے پر ہی سرجیت نے خط لکھنا بند کر دیا تھا۔ لیکن بظاہر اُس نے اُسے گود میں کھینچ لیا اور حسرت آمیز آنکھوں سے وہ اُس کے منہ کو تکنے لگا۔ پھر اُس نے اُسے چوم لیا......

اس وقت سرجیت ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے داخل ہوئی۔ ایشور کے چہرے پر ذرا سیاہی دوڑ گئی۔ جیسے اُسے کسی نے گناہ کرتے پکڑ لیا ہو... اور سرجیت کے بدن میں ایک جھرجھری دوڑ گئی، ایسی جھرجھری کہ پانچ برس کے عرصے میں تین بچوں کی ماں بننے پر بھی نہ دوڑی تھی۔

وہ ایک طرف کونے میں بیٹھ گئی۔ ایشور سب کچھ بھول گیا۔ سرجیت اتنی موٹی نظر آتی تھی کہ وہ حیران تھا کہ یہ وہی سرجیت ہے یا کوئی اور۔

.... آخر اس نے کہا: آپ تو کشمیر جاکر خوب تندرست ہو گئیں!"

[illegible] ہنسی: "ایسے ناسور کیا آپ نے نہیں دیکھے، جو باہر سے اچھے نظر آتے ہیں، لیکن اندر ہی اندر بڑھتے چلے جاتے ہیں؟"

کچھ منٹ تک ایشور بھونچکا سا بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے سرجیت کے بابا اور اُسکی موت کی بات چیت چھیڑ دی۔

.... ایک گھنٹہ بعد جب وہ پھر سیڑھیوں کی دیواروں پر لکیریں بناتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا، تو دل ہی دل میں کہہ رہا تھا: ایسے ناسور بھی تو ہوتے ہیں جو اندر اور باہر دونوں طرف بڑھتے ہیں۔ سرجیت شاید انہیں نہیں جانتی!"

اُپیندر ناتھ اشکؔ

مالن کی لڑکی

وہ مالن کی لڑکی وہ جانِ چمن — وہی ہاں وہی آسمانِ چمن
ہو پھولوں کی جُھرمٹ میں یوں جلوہ گر — ستاروں کے حلقے میں جیسے قمر
چمن کا چمن آج ہنسنے لگا — فلک سے تبسّم برسنے لگا
وہ دوشیزۂ باغ ہنگامِ شام — لئے پھول کی ٹوکری تیز گام
عجب ناز سے مُسکراتی چلی — گلستاں پہ بجلی گراتی چلی
زمانے کو پامال کرتی ہوئی — لڑکپن کی حد سے گذرتی ہوئی
گئی بیچنے ہار بازار میں — پھنسی خود محبت کے آزار میں
کسی نوجواں سے نظر مل گئی — فلک کانپ اُٹھا زمیں ہل گئی
محبّت دلوں میں اثر کر گئی — زمانے کو زیر و زبر کر گئی
چلی بیچکر ہار با چشمِ تر — نہ تھا ہوش گھر کا نہ اپنی خبر
نہ تھی آشنا عشق کے نام سے — نہ واقف تھی اُلفت کے انجام سے
وہی حُسن ہے اور وہی نازنیں — وہ پہلی سی کیوں رُخ پہ رونق نہیں
کبھی ہم نوا آہ و زاری رہی — کبھی مہرباں بیقراری رہی
جوانی بہار اپنی دکھلا گئی — وہ مانندِ گل کھِل کے مُرجھا گئی
بنے تھے جو کل زینتِ گلستاں — وہی پھول ہیں قبر پر نوحہ خواں

نہ گلچیں ہے محسنؔ نہ گلزار ہے
نہ گل ہے نہ گل کا خریدار ہے

محسنؔ اعظم گڑھی

اُس کا پتی

لوگ کہتے تھے کہ نتھو کا سر اس لئے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس بیان میں کافی صداقت ہے، کیونکہ سوچتے وقت نتھو ہمیشہ سر کھجلایا کرتا ہے، اُس کے بال چونکہ بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہوگئے ہیں، اس لئے بار بار کھجلانے سے اُس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے بالکل بے نیاز ہوگیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا مگر میل کی زیادتی کے باعث اسکی حالت بالکل ویسی ہے جو توے کی ہوتی ہے، جس پر ہر روز روٹیاں پکائی جائیں مگر اُسے صاف نہ کیا جائے۔

نتھو، بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو کچی اینٹیں سمجھتا تھا۔ اور کسی پر فوراً ہی ظاہر نہیں کیا کرتا تھا۔ اُس کا یہ اصول تھا کہ خیال کو اچھی طرح پکا کر باہر نکالنا چاہیئے تاکہ جس عمارت میں بھی وہ استعمال ہو، اُس کا ایک مضبوط حصہ بن جائے۔

گاؤں والے اُس کے خیالات کی قدر کرتے تھے اور ہر مشکل بات میں اُس سے مشورہ لیا کرتے تھے، لیکن اس قدر افزائی سے نتھو اپنے آپ کو اہم نہیں سمجھنے لگا تھا۔ جس طرح گاؤں میں شمبھو کا کام ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہنا تھا، اسی طرح اس کا کام ہر وقت دوسروں کو مشورہ دیتے رہنا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص صرف ایک کام کے لئے پیدا ہوتا ہے چنانچہ شمبھو کے بارے میں چوپال پر جب کبھی ذکر چھڑتا تو وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ "کھاد کتنی بدبودار چیزوں سے بنتی ہے، پر کھیتی باڑی اِسکے بنا ہو ہی نہیں سکتی۔ شمبھو کے ہر سانس میں گالیوں کی باس آتی ہے، ٹھیک ہے، پر گاؤں کی چہل پہل اور رونق بھی اُسی کے دم سے قائم ہے —— اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ گالیاں کیا ہوتی ہیں۔ اچھے بول جاننے کے ساتھ ساتھ بُرے بول بھی معلوم ہونے چاہئیں۔"

نتھو بھٹے سے واپس آرہا تھا اور حسبِ معمول سر کھجلاتا گاؤں کے کسی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ لالٹین کے کھمبے کے پاس پہونچکر اُس نے اپنا ہاتھ سر سے علیحدہ کیا جس کی انگلیوں سے وہ بالوں کا ایک میل بھرا گچھا مروڑ رہا تھا اور اپنے جھونپڑے کے تازہ لپے ہوئے چبوترے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ سامنے سے اُسے کسی نے آواز دی۔

نتھو پلٹا اور اپنے سامنے والے جھونپڑے کی طرف بڑھا جہاں مادھو اُسے اب ہاتھ کے اشارے سے بُلا رہا تھا۔

جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو، اُس کا لنگڑا بھائی اور چودھری بیٹھے تھے۔ اُن کی بیٹھک سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے چہرے کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے۔ مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں طاقچے کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی تھی، غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

نتھو نے دُور ہی سے معاملے کی نزاکت محسوس کی اور قدم تیز کرکے اُنکے پاس پہونچ گیا۔

مادھو نے اشارے سے اُسے پاس بیٹھنے کو کہا، نتھو بیٹھ گیا اور اُس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے بالوں کے اُس گچھے کی طرف بڑھ گیا جس کی جڑیں کافی ہل چکی تھیں۔ اب وہ ان لوگوں کی باتیں سننے کے لئے بالکل تیار تھا۔

مادھو اُس کو اپنے پاس بٹھا کر خاموش ہوگیا۔ مگر اسکے کپکپاتے ہوئے ہونٹ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن فوراً ہی نہیں کہہ سکتا۔ مادھو کا لنگڑا بھائی بھی خاموش تھا اور بار بار اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کے آخری ٹُنڈ مُنڈ حصے پر جو گوشت کا ایک بدشکل لوتھڑا سا بنا ہوا تھا ہاتھ پھیر رہا تھا۔ روپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہوئی مُورتی کے مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چودھری اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا تنکے سے زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔

نتھو نے خود ہی بات شروع کی "تو......"

مادھو شروع ہوگیا "نتھو بات یہ ہے کہ... بات یہ ہے کہ .....اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ بات کیا ہے... میں کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا... چودھری، تم ہی جی کڑا کرکے سارا قصہ سنا دو۔"

نتھو نے گردن اُٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا، مگر وہ زمین پر لکیریں بناتا رہا اور کچھ نہ بولا۔

دوپہر کی اداس فضا بالکل خاموش تھی، البتہ کبھی کبھی چیلوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اور جھونپڑے کے داہنے ہاتھ گھورے پر جو مُرغا کوڑا کرید رہا تھا، کبھی کبھی وہ بھی کسی مرغی کو دیکھکر بول اُٹھتا تھا۔

چند لمحات تک جھونپڑے کے چھجے کے نیچے سب خاموش رہے، اور ننھو معاملے کی نزاکت اچھی طرح سمجھ گئے۔

رُوپا کی ماں نے روہانسی آواز میں کہا: "میرے پھوٹے بھاگ! — اُس کو تو جو کچھ اُجڑنا تھا اُجڑ گئی، مجھ ابھاگن کی ساری دنیا برباد ہو گئی ..... کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟"

مادھو نے کندھے ہلا دئے اور ننھو سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا ہو سکتا ہے؟ .... بھئی میں یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگانا نہیں چاہتا — میں نے جب اپنے لالو کی بات رُوپا کے بارے میں پکی کی تھی تو مجھے یہ قصہ معلوم نہیں تھا .... اب تم لوگ خود ہی وچار کرو کہ سب کچھ جانتے ہوئے میں اپنے بیٹے کا بیاہ رُوپا سے کیسے کر سکتا ہوں؟"

یہ سُن کر ننھو کی گردن اُٹھی، وہ شاید یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ لالو کا بیاہ رُوپا سے کیوں نہیں ہو سکتا۔ ابھی کل تک سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ اب اتنی جلدی کیا ہو گیا کہ رُوپا لالو کے قابل نہ رہی۔ وہ رُوپا اور لالو دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور سچ پوچھو تو گاؤں میں ہر شخص ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا ہے، وہ کون سی بات ہے جو اُسے اُن دونوں کے بارے میں معلوم نہ تھی۔ رُوپا اُس کی آنکھوں کے سامنے پھولی پھلی، بڑھی اور جوان ہوئی، ابھی کل کی بات ہے کہ اس نے اُس کے گال پر ایک زور کا دھپا بھی مارا تھا اور اُس کو اتنی مجال نہ ہوئی تھی کہ چوں بھی کرے، حالانکہ گاؤں کے سب چھوکرے چھوکریاں گستاخ تھے اور بڑوں کا بالکل ادب نہ کرتے تھے۔ رُوپا تو بڑی بھولی بھالی لڑکی تھی، باتیں بھی بہت کم کرتی تھی۔ اور اُسکے چہرے پر بھی کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کوئی شرارت کر سکتی ہے۔ پھر آج اُس کی بابت یہ باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔

ننھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اُسکے اندر رہنے والوں کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اُسے معلوم تھا کہ چوہدری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے، گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چُنوا رہا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا اور اُسے ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے — اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ پرسرام اور گنگو کی وُوآ پلو اُن کی بیچ بیچ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی، اور سالگ رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے، حالانکہ ویدجی نے منع کیا تھا کہ اُن کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے .....

ننھو حیران تھا کہ ایسی کون سی بات ہے جو اُسے معلوم نہیں۔ یہ تمام خیالات اس کے دماغ میں ایکدم آئے اور وہ مادھو کاکا سے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر کوئی سوال پوچھنے ہی والا تھا کہ چوہدری نے زمین پر طرطے کی شکل کھینچ

کرتے ہوئے کہا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا — تھوڑے ہی دنوں میں وہ بچے کی ماں بن جائے گی۔"

تو یہ بات تھی۔ ننھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اُڑنے والی ساری چیلیں اُس کے دماغ میں گھس کر چیخنے لگی ہیں۔ اُس نے اپنے بال زیادہ تیزی سے مروڑنے شروع کر دئے۔

مادھو کاکا، ننھو کی طرف جھکا اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں اس سے کہنے لگا: "بیٹا، تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بات رُوپا سے پکی کی تھی۔ اب میں تم سے کیا کہوں — ذرا کان لاؤ اِدھر۔" اُس نے ہولے سے ننھو کے کان میں کچھ کہا اور پھر اُسی لہجے میں کہنے لگا: "کتنی شرم کی بات ہے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا، یہ میرا بڑھاپا اور یہ جان لیوا دکھ اور تو اور لالو کو بتاؤ کیا دکھ ہوا ہوگا — تمہیں انصاف کرو، کیا لالو کی شادی اب اس سے ہو سکتی ہے — لالو کی شادی تو ایک طرف رہی، کیا ایسی لڑکی ہمارے گاؤں میں رہ سکتی ہے — کیا اس کے لئے ہمارے یہاں کوئی جگہ ہے؟"

ننھو نے سارے گاؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اُسے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں رُوپا اپنے پاپ سمیت رہ سکتی تھی۔ البتہ اُس کا ایک جھونپڑا تھا جس میں وہ چاہے کسی کو بھی رکھتا۔ پچھلے برس اس نے کوڑھی کو اُس میں پناہ دی تھی، حالانکہ سارا گاؤں اُسے روک رہا تھا اور اُسے ڈرا رہا تھا کہ دیکھو ننھو یہ بیماری بڑی چھوت ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ تمہیں چمٹ جائے۔ لیکن وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، اُس نے وہی کچھ کیا جو اُس کے من نے اچھا سمجھا۔ کوڑھی اُس کے گھر میں پورے چھ مہینے رہ کر مر گیا۔ لیکن اُسے بیماری ویماری بالکل نہ لگی۔ اگر گاؤں میں رُوپا کے لئے کوئی جگہ نہ رہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ اُسے ماری ماری پھرنے دیا جائے، ہرگز نہیں، ننھو اس بات کا قائل نہیں تھا کہ دکھی پر اور دکھ لاد دئے جائیں۔ اُسکے جھونپڑے میں ہر وقت اُس کیلئے جگہ تھی۔

وہ چھ مہینے تک ایک کوڑھی کی تیمارداری کر سکتا تھا، اور رُوپا کوڑھی تو نہیں تھی — کوڑھی تو نہیں تھی، یہ سوچتے ہوئے ننھو کا دماغ ایک گہری بات سوچنے لگ گیا۔ رُوپا کوڑھی نہیں تھی، اس لئے وہ ہمدردی کی زیادہ مستحق بھی نہیں تھی۔ اُسے کیا روگ تھا؟ — کچھ بھی نہیں، جیسا کہ یہ لوگ کہہ رہے تھے، وہ تھوڑے ہی روز میں بچے کی ماں بننے والی تھی؛ پر یہ بھی کوئی روگ ہے اور ماں بننا کیا کوئی پاپ ہے؟ ہر لڑکی عورت بننا چاہتی ہے اور عورت ماں، اُس کی اپنی استری ماں بننے کے لئے تڑپ رہی تھی اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ وہ

جلدی ماں بن جائے، اِس لحاظ سے بھی رُوپا کا ماں بننا کوئی ایسا جرم نہیں تھا، جس پر اُسے کوئی سزا دی جائے یا پھر اُسے رحم کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ ایک کے بجائے دو بچے جنے، اس میں کسی کا کیا بگڑتا تھا، وہ عورت ہی تو تھی، مندر میں گڑی ہوئی دیوی تو تھی نہیں۔ اور پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے تھے۔ مادھو کاکا کے لڑکے سے اُسکی شادی ہوتی، تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا، اب کون سی آفت آگئی تھی۔ یہ بچہ جو اَب اُس کے پیٹ میں تھا، کہیں سے اُڑ کر تو آ نہیں گیا۔ شادی بیاہ ضرور ہوا ہوگا۔ یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی آپ فیصلہ کر رہے تھے اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا تھا، اُس سے کچھ پوچھتے ہی نہ تھے، گویا بچہ وہ نہیں بلکہ یہ خود جَن رہے ہیں۔ عجیب بات تھی، اور پھر اِن کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی۔ بچے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اُس کا باپ — باپ؟ . . . . اور مزہ دیکھئے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

یہ سوچتے ہوئے نتھو کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُس نے مادھو کاکا سے کہا: "کاکا، جو کچھ تم نے کہا اُس سے مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ پر تم نے یہ کیسے کہدیا کہ رُوپا کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں — ہم سب اپنے اپنے جھونپڑوں کو تالے لگا دیں تو بھی اس کے لئے ایک دروازہ کُھلا رہتا ہے۔"

چوہدری نے زمین پر طوطے کی آنکھ بناتے ہوئے کہا: "توبہ کا!"

نتھو نے جواب دیا: "اُن کے لئے جو پاپی ہوں — رُوپا نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ نردوش ہے!"

چوہدری نے حیرت سے مادھو کاکا کی طرف دیکھا اور کہا: "اِس نے پوری بات نہیں سُنی۔"

مادھو کا لنگڑا بھائی اپنی کٹی ہوئی ٹانگ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

نتھو رُوپا کی ماں سے مخاطب ہوا: "میں سُن لیتا ہوں — رُوپا کہاں ہے؟"

رُوپا کی ماں نے اپنی کُھردری اُنگلیوں سے آنسو پونچھے اور کہا: "اندر بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہے۔"

یہ سُن کر نتھو نے اپنا سر ایک بار زور سے کُھجلایا اور اُٹھ کر جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔

رُوپا اندھیری کوٹھڑی کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُسکے بال بکھرے ہوئے تھے، میلے کچیلے کپڑوں میں اندھیرے کے اندر وہ گیلی مٹی کا ایک ڈھیر سا دکھائی دے رہی تھی۔ جو باتیں باہر ہو رہی تھیں اُن کا ایک ایک لفظ اُس نے سُنا تھا حالانکہ اُس کے کان اُس کے اپنے دل کی باتیں سُننے میں لگے ہوئے تھے جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔ نتھو اندر آنے کے لئے اُٹھا تو وہ دوڑ کر سامنے کٹیا پر جا پڑی اور گدڑی میں اپنا منہ چُھپا لیا۔

نتھو نے جب دیکھا کہ رُوپا چھپ گئی ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ اُس نے پوچھا: "ارے، مجھ سے کیوں چُھپتی ہو؟"

رُوپا رونے لگی اور اپنے آپ کو کپڑے میں اور لپیٹ لیا، وہ بغیر آواز کے رو رہی تھی، مگر نتھو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رُوپا کے آنسو اس کے نیچے بہتے دل پر گر رہے ہیں۔ اُس نے گدڑی کے اس حصہ پر ہاتھ پھیرا جس کے نیچے رُوپا کا سر تھا اور کہا: "تم مجھ سے کیوں چھپتی ہو؟"

رُوپا نے سسکیوں میں جواب دیا: "رُوپا نہیں چھپتی نتھو — وہ اپنے پاپ کو چھپا رہی ہے۔"

نتھو اُس کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "کیسا پاپ . . . تم نے کوئی پاپ نہیں کیا . . . اور اگر کیا بھی ہو تو کیا اُسے چھپانا چاہیئے۔ یہ تو خود ایک پاپ ہے . . . میں تم سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں، مجھے یہ بتا دو کہ کس نے تمہاری سدا ہنستی آنکھوں میں یہ آنسو بھر دیئے ہیں، کس نے اِس بالی عمر میں تمہیں پاپ اور پُن کے جھگڑے میں پھنسا دیا ہے؟"

"میں کیا کہوں؟" رُوپا یہ کہہ کر گدڑی میں اور سمٹ گئی۔ نتھو بولتا تھا اور رُوپا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اُسے اکٹھا کر رہا ہے، اُسے سکیڑ رہا ہے۔

نتھو نے بڑی مشکل سے رُوپا کے منہ سے کپڑا اٹھایا اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ رُوپا نے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپا لیا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس سے نتھو کو بہت دُکھ ہوا۔ ایک تو پہلے اُسے یہ چیز ستا رہی تھی کہ ساری بات اُس کے ذہن میں مکمل طور پر نہیں آتی تھی اور دوسرے رُوپا اُس کے سامنے رو رہی تھی۔ اگر اُسے ساری بات معلوم ہوتی تو وہ اُس کے یہ آنسو روکنے کی کوشش کر سکتا تھا جو میلی گدڑی میں جذب ہو رہے تھے مگر اس کو سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ رُوپا تھوڑے ہی دنوں میں بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس نے پھر اُس سے کہا: "رُوپا تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو — نتھو بھیّا تم سے پوچھ رہا ہے اور وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، جو تم یوں اپنے من کو چھپا رہی ہو . . . . تم روتی کیوں ہو، غلطی ہو ہی جایا کرتی ہے . . . . لالو کی کسی اور سے شادی ہو جائے گی اور تم اپنی جگہ خوش رہو گی — تمہیں دُنیا کا ڈر ہے تو میں کہوں گا کہ تم بالکل بیوقوف ہو، لوگوں کے جو جی میں آئے کہیں، تمہیں اس سے کیا . . . . غلطی کر کے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دینا تو میری سمجھ میں سب سے بڑی غلطی ہے — جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اب تو

ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس کے آگے کیا ہوگا۔۔ تم دوسروں کی بابت نہ سوچو، اپنی فکر کرو، سب سے زیادہ ضروری چیز اس وقت تم ہو اور سچ پوچھو تو اپنی ذات ہی ہمیشہ سب سے ضروری ہوتی ہے۔۔ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا روپا، آنسو بھری آنکھوں سے نہ تم مجھے ہی ٹھیک طور سے دیکھ سکتی ہو اور نہ اپنے آپ کو.... رونا بند کرو اور مجھے ساری بات بتاؤ۔"

روپا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ وہ دل میں سوچتی تھی کہ اب ایسی کون سی بات رہ گئی ہے جو دنیا کو معلوم نہیں۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے نتھو سے کہا: "نتھو بھیا، مجھ سے زیادہ تو دوسروں کو معلوم ہے، میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ جو کچھ میں سوچتی تھی ایک سپنا تھا، یوں تو ہر چیز سپنا ہوتی ہے، پر یہ سپنا بڑا ہی عجیب ہے۔ کیسے شروع ہوا، کیونکر ختم ہوا، اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دن جو میں کبھی خوشی سے گذارتی تھی، آنکھوں میں آنسو بننا شروع ہو گئے ہیں.... میں گھڑا ایک اچھلتی کودتی، گاتی کنوئیں پر پانی بھرنے گئی۔ پانی بھر کر جب واپس آنے لگی تو ٹھوکر لگی اور گھڑا چکنا چور ہو گیا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا، میں نے چاہا کہ اس ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑے اٹھا کر جھولی میں بھر لوں پر لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا، نقصان میرا ہوا، چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے ہمدردی کرتے، پر انہوں نے الٹا مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا، گویا گھڑا ان کا تھا اور اس کو توڑنے والی میں تھی اور اس روڑے کا کوئی قصور ہی نہیں تھا جو راستے میں پڑا تھا، اور جس سے دوسرے بھی ٹھوکر کھا سکتے تھے.... تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو، مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔"

نتھو کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں کا گچھا مروڑنے لگیں۔ اس نے بڑے اضطراب سے کہا: "میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ وہ ہے کون۔۔۔؟"

"کون؟"

"وہی... وہی....." نتھو اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

روپا کے سینے سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی: "وہ پہلے جتنا نزدیک تھا اب اتنا ہی دور رہتا ہے!"

"میں اس کا نام پوچھتا ہوں.... اور جانتی ہو میں تم سے اس کا نام کیوں پوچھتا ہوں؟..... اس لئے کہ وہ تمہارا پتی ہے.... اور تم اس کی پتنی ہو.... تم اس کی ہو اور وہ تمہارا... یہ... یہ..."

نتھو اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ روپا نے دیوانہ وار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لہجے میں کہا: "جھوٹے ہو، جھوٹے بولو نتھو، جھوٹے جھوٹے بولو نہیں وہ.... جو میرے پردے میں نیا جیو ہے، نہ سن لے کہ اس کی ماں پاپن ہے.... نتھو، اسی ڈر کے مارے تو میں زیادہ سوچتی نہیں، زیادہ غم نہیں کرتی کہ اس کو کچھ معلوم نہ ہو.... پر بیٹھے بیٹھے کبھی میرے من میں آتا ہے کہ ڈوب مروں، اپنا گلا گھونٹ لوں، یا زہر کھا کے مر جاؤں...."

نتھو نے اٹھنا شروع کر دیا.... سر چکرا رہا تھا۔ ایک دو سکنڈ غور کرنے کے بعد اس نے کہا: "کبھی نہیں، کبھی نہیں، میں تمہیں کبھی مرنے نہ دوں گا۔ تم کیوں مرو، یوں تو موت سے چھٹکارا نہیں، سب کو ایک دن مرنا ہے، پر سب نے تو جینا بھی ضروری ہے.... میں کچھ لکھا پڑھا نہیں، میں کوئی پنڈت نہیں، پر جو کچھ میں نے کہا ہے ٹھیک ہے، تم مجھے اس کا نام بتاؤ، میں تمہیں اس کے پاس لے چلونگا اور اسے مجبور کرونگا کہ وہ تمہارے ساتھ بیاہ کر لے اور تمہیں اپنے پاس رکھے.... وہی تمہارا پتی ہے!"

نتھو پھر روپا کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "لو میرے کان میں کہہ دو.... وہ کون ہے؟.... روپا کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں تمہارے لئے کچھ کر سکونگا؟"

روپا نے جواب دیا: "تم میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہو نتھو، پر جس آدمی کے پاس تم مجھے لے جانا چاہتے ہو کیا وہ بھی کچھ کرے گا؟.... وہ تو مجھے بھول بھی چکا ہے۔"

نتھو نے کہا: "تمہیں دیکھتے ہی اسے سب کچھ یاد آ جائے گا.... باقی چیزوں کی یاد اسے میں دلا دوں گا.... تم مجھے اس کا نام تو بتاؤ.... یہ ٹھیک ہے کہ استری اپنے پتی کا نام نہیں لیتی، پر ایسے موقع پر تمہیں کوئی لاج نہ آنی چاہیئے۔"

روپا خاموش رہی، اس پر نتھو اور زیادہ مضطرب ہو گیا: "میں تمہیں ایک سیدھی سادی بات سمجھاتا ہوں اور تم سمجھتی ہی نہیں ہو، پگلی، جو تمہارے بچے کا باپ ہے، وہی تمہارا پتی ہے.... اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، تم تو بس آنسو بہائے جاتی ہو۔ کچھ سنتی ہی نہیں ہو۔۔۔ میں پوچھتا ہوں اس کا نام بتلانے میں ہرج ہی کیا ہے.... لو، تم نے تو اور رونا شروع کر دیا۔ اچھا بھی میں زیادہ باتیں نہیں کرتا، تم یہ بتاؤ کہ وہ ہے کون.... تم مان لو میں اس کا کان پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آؤنگا۔"

روپا نے سسکیوں میں کہا: "تم پاپ.... پاپ۔ پتی نہ کہو نتھو۔۔۔ میری جوانی، میری آشا، میری دنیا، کبھی کی ودھوا ہو چکی ہے.... تم میری مانگ میں سیندور ڈالنا چاہتے ہو، اور میں چاہتی ہوں کہ سارے بال ہی نوچ ڈالوں.... نتھو اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔۔۔ میری جھولی کے بیر زمین پر نہیں گرے، سب کے سب موری میں جا پڑے ہیں، اب انہیں باہر نکالنے سے کیا فائدہ.... اس کا نام پوچھ کر تم کیا کرو گے.... لوگ تو اب میرا

نام بھول جانا چاہتے ہیں!"

ننھو تنگ آگیا اور تیز لہجے میں کہنے لگا: "تم... تم بیوقوف ہو.... میں اب تم سے کچھ نہیں پوچھونگا"

وہ اُٹھکر جانے لگا تو رُوپا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا۔

ننھو نے اُسکی گیلی آنکھوں کی طرف دیکھا: "بولو؟"

رُوپا بولی: "ننھو بھیا مجھے مارو، مجھے خوب پیٹو، شاید اس طرح میں اس کا نام بتا دوں ۔۔ تمہیں یاد ہوگا ایک بار میں نے بچپن میں مندر کے ایک پیڑ سے کچے آم توڑے تھے اور تم نے ایک ہی چانٹا مارکر مجھ سے سچ بات کہلوائی تھی ۔۔ آؤ مجھے مارو.... یہ چور جسے میں نے اپنے من میں پناہ دے رکھی ہے بغیر مار کے باہر نہیں نکلے گا ۔۔"

ننھو خاموش رہا۔ ایک لحظے کے لئے اُس نے کچھ سوچا، پھر یکایک اُس نے رُوپا کے پیلے گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ چھت کے چند سوکھے اور گرد سے اٹے ہوئے تنکے دھمک کے مارے نیچے گر پڑے۔ ننھو کی سخت انگلیوں نے رُوپا کے گال پر کئی نہریں کھود دیں۔

ننھو نے گرج کر پوچھا: "بتاؤ وہ کون ہے؟"

جھونپڑے کے باہر مادھو کے لنگڑے بھائی کی آدھی ٹانگ کانپی، چوہدری جس تنکے سے زمین پر طوطے کی شکل بنا رہا تھا، ہاتھ کانپنے کے باعث دُہرا ہوگیا، مادھو کاکا نے کلنگ کی طرح اپنی گردن اونچی کرکے جھونپڑے کے اندر دیکھا۔

اندر سے ننھو کی خشم آلود آواز آرہی تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھو کاکا، چوہدری اور لنگڑے کیشو نے آپس میں کئی باتیں کیں، آخر میں مادھو کاکا کا بھائی بیساکھی ٹیک کر اُٹھا اور جھونپڑے میں جانے ہی والا تھا کہ ننھو باہر نکلا۔ کیشو ایک طرف ہٹ گیا۔ ننھو نے پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور کہا: "آؤ رُوپا" پھر اُس نے رُوپا کی ماں سے کہا: "ماں تم بالکل چنتا نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا، ہم شام تک لوٹ آئیں گے"

کسی نے ننھو سے یہ نہ پوچھا کہ وہ رُوپا کو لیکر کدھر جا رہا ہے۔ مادھو کاکا کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ننھو اور رُوپا دونوں جھونپڑے سے اُتر کر موری کے اُس پار جا چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی مونچھ کے سفید بال نوچنے میں مصروف ہوگیا اور چوہدری نے کبڑے تنکے کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

بھٹے کے مالک لالہ گنیش داس کا لڑکا ستیش جسے بھٹے کے مزدور چھوٹے لالہ جی کہا کرتے تھے اپنے کمرے میں اکیلا چاء پی رہا تھا۔ پاس ہی تپائی پر ایک کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی جسے غالباً وہ پڑھ رہا تھا۔ کتاب کی جلد کی طرح اُس کا چہرہ بھی جذبات سے خالی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسنے اپنے چہرے پر غلاف چڑھا رکھا ہے۔ وہ ہر روز اپنے اندر ایک نیا ستیش پاتا تھا۔ وہ جاڑے اور گرمیوں کے درمیانی موسم کی طرح متغیر تھا۔ وہ گرم اور سرد لہروں کا ایک مجموعہ تھا۔ دوسرے دماغ سے سوچتے تھے لیکن وہ ہاتھوں اور پیروں سے سوچتا تھا وہ اپنی عمر کی اُن منزلوں کو طے کر رہا تھا جہاں ہر شے کھیل نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کو گیند کی مانند اُچھال رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھل کود ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اُس کو مسلنے میں بہت زیادہ مزہ آتا تھا۔ ہر شے کو وہ مسل کر دیکھتا تھا۔

عورتوں کے متعلق اُس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اُس کو عورت جوان ملنی چاہیئے۔ عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا: "زندگی کے ساز کا ہر تار ہر وقت تنا ہوا ہونا چاہیئے، تاکہ ذرا سی جنبش پر بھی وہ لرزنا شروع کر دے"

یہ لرزش، یہ کپکپاہٹ، جس سے ستیش کو اس قدر پیار تھا، دراصل اُسکے گندے خون کے کھولاؤ کا نتیجہ تھی۔ جنسی خواہشات اُس کے اندر اس قدر زیادہ ہوگئی تھیں کہ جوان حیوانوں کو دیکھکر بھی اُسے لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب ایک گھوڑی کے جوان بچے کے کپکپاتے ہوئے بھورے بدن کو دیکھتا تھا تو اُسے ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اسکو دیکھکر کئی بار اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ اپنا بدن اُس کے تروتازہ بدن کے ساتھ گھسے۔

ستیش چاء پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چاء دانی کی تعریف کر رہا تھا جو کہ بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی۔ ستیش کو داغ پسند نہیں تھے، وہ ہر شے میں ہموارگی پسند کرتا تھا، صاف بدن عورتوں کو دیکھکر وہ اکثر کہا کرتا تھا: "میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں ــــ وہ کس قدر ہموار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شفاف پانی کا چھوٹا سا تالاب ہے"

یہ کمرہ جس میں اس وقت ستیش بیٹھا تھا خاص طور پر اس کیلئے بنوایا گیا تھا۔ کمرے کے سامنے ٹینس کورٹ تھا۔ یہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر روز شام کو ٹینس کھیلتا تھا۔ آج اُس نے اپنے دوستوں سے

کہہ دیا تھا کہ وہ ٹینس کھیلنے نہیں آئے گا، کیونکہ ایک اور دلچسپ کھیل اُسے آج کھیلنا تھا۔ بھنگی کی جوان لڑکی جس کے متعلق اُس نے ایک روز اپنے دوست سے یہ کہا تھا: "تم اُسے دیکھو — سچ کہتا ہوں تمہاری نگاہیں اُس کے چہرے پر سے پھسل پھسل جائیں گی۔ میری نگاہیں اُس کو دیکھنے سے پہلے اس کے کھُردرے بانوں کو تھام لیتی ہیں تاکہ پھسل نہ جائیں۔"

— آج ایک مدّت کے بعد ٹینس کورٹ میں اُس سے خفیہ ملاقات کرنے کے لئے آرہی تھی۔

وہ چاء پی رہا تھا اور اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاء میں اُس جوان لڑکی کے سانولے رنگ کا عکس پڑ رہا ہے۔

اُس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ باہر سوکھے پتّے کھڑکے تو ستیش نے پیالی میں سے چاء کا آخری گھونٹ پیا اور اُس کی آمد کا انتظار کرنے لگا —!

ایک لمبا سا سایہ ٹینس کورٹ کے جھاڑو دئے ہوئے سینے پر متحرک ہوا اور لڑکی کے بجائے نتھو نمودار ہوا۔

ستیش نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور پہچان لیا کہ آنے والا بھٹے کا ایک مزدور ہے۔ نتھو اپنے سر کے بالوں کا ایک گچھا انگلیوں سے مروڑ رہا تھا اور ستیش کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ستیش کی کرسی برآمدے میں بچھی تھی۔ پاس پہونچکر نتھو کھڑا ہو گیا اور ستیش کی طرف یوں دیکھنے لگا گویا چھوٹے لالہ جی کو اُس کی آمد کی غرض و غایت اچھی طرح معلوم ہے۔

ستیش نے پوچھا: "کیا ہے؟"

نتھو خاموشی سے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "چھوٹے لالہ جی، میں اُسے لیکر آیا ہوں، اب آپ اُسے اپنے پاس رکھ لیجئے گاؤں والے اُسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔"

ستیش حیران ہو گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نتھو کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے پوچھا: "کیسے؟ — کیسے تنگ کر رہے ہیں؟"

نتھو نے جواب دیا: "آپ — آپ — روپا کو . . . . آپ کی پتنی کو۔"

"میری پتنی؟" ستیش چکرا گیا: "میری پتنی — تیرا دماغ تو نہیں بہک گیا — یہ کیا بک رہا ہے —" یہ کہتے ہی اُس کے اندر — بہت اندر روپا کا خیال پیدا ہوا اور اُسے یاد آیا کہ پچھلے ساون میں وہ ایک موٹی موٹی آنکھوں اور گدرائے ہوئے جسم والی ایک لڑکی سے کچھ دنوں کھیلا تھا۔ وہ دودھ لیکر شہر میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار اُسنے دودھ کی بوندیں اُسکے اُبھرے ہوئے سینے پر ٹپکتی دیکھی تھیں اور . . . . . ہاں ہاں یہ روپا وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں اُس نے ایک بار یہ خیال کیا تھا کہ وہ دودھ سے زیادہ ملائم ہے۔ اُس کو حیرت بھی ہوئی تھی کہ یہ اینٹیں بنانے والے ایسی نرم و نازک لڑکیاں کیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بھنگی کی لڑکی کو بھول سکتا تھا۔ سوشیلا کو فراموش کر سکتا تھا، جو ہر روز اُس کے ساتھ ٹینس کھیلتی تھی، وہ ہسپتال کی نرس کو بھول سکتا تھا جس کے سفید کپڑوں کا وہ بہت معترف تھا، وہ اُس . . . . . لیکن وہ روپا کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ دوسری یا تیسری ملاقات پر جبکہ روپا نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا تھا تو اُس کی ایک بات پر اُسے بہت ہنسی آئی تھی۔ روپا نے اُس سے کہا تھا: "چھوٹے لالہ جی کل سُندری چمارن کہہ رہی تھی: جلدی جلدی بیاہ کرے ری، بڑا مزہ آتا ہے"۔ — اُسے کیا پتہ کہ میں بیاہ کر بھی چکی ہوں"۔ — مگر روپا تھی کہاں؟ ستیش کی حیوانی حِس اُس کا نام سُنتے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ گو ستیش کا دماغ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا مگر اس کا جسم صرف اپنی دلچسپی کی طرف متوجّہ تھا۔

ستیش نے پوچھا: "کہاں ہے روپا؟"

نتھو اُٹھ کھڑا ہوا: "باہر کھڑی ہے — میں ابھی اُسے لاتا ہوں۔"

ستیش نے فوراً ہی رعب دار لہجے میں کہا: "خبردار جو اُسے تو یہاں لایا — جا بھاگ جا یہاں سے۔"

"پر — پر — چھوٹے لالہ جی وہ — وہ آپ کی پتنی ہو چکی ہے — وہ — وہ بچّے کی ماں بننے والی ہے اور بچّہ آپ ہی کا تو ہوگا — آپ ہی کا تو ہوگا" نتھو نے ہتلاتے ہوئے کہا۔

تو روپا حاملہ ہو چکی تھی — ستیش کو قدرت کی یہ ستم کاری سخت ناپسند تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت اور مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ یہ حمل کا سلسلہ کیوں جوڑ دیا گیا ہے۔ مرد جب کسی عورت کی کسی خاص خوبی کا معترف ہوتا ہے تو اُس کی سزا بچّے کی شکل میں کیوں طرفین کو بھگتنا پڑتی ہے — روپا، بچّے کے بغیر کتنی اچھی تھی اور وہ خود اس بچّے کے بغیر کتنے اچھے طریقے پر روپا کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھ سکتا تھا۔ اس سلسلہ تولید کی وجہ ہی سے کئی بار اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ عورت ایک بے کار شے ہے۔ یعنی اس کو ہاتھ لگاؤ اور بچّہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ بچّے کا کیا کرے جو کہ پیدا ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر غور کر کے اُس نے نتھو کو اپنے پاس بٹھایا اور بڑے آرام سے کہا۔

"تم روپا کے کیا ہوتے ہو — خیر چھوڑو اس قصّے کو — دیکھو، یہ بچّے وچّے کی بات مجھے پسند نہیں۔ مفت میں ہم دونوں بدنام

ہوجائیں گے۔ تم ایسا کرو روپا کو یہاں چھوڑ جاؤ — میں اُسے آج ہی کسی ایسی جگہ بھجوا دونگا جہاں یہ بچہ ضائع کر دیا جائے — اور روپا کو میں کچھ روپے دیدوں گا۔ وہ خوش ہو جائے گی — تمہارا انعام بھی تمہیں مل جائے گا — ٹھہرو —"

یہ کہکر ستیش نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور دس روپے کا نوٹ نتھو کے ہاتھ میں دیکر کہا: "یہ رہا تمہارا انعام — جاؤ عیش کرو!"

نتھو چپکے سے اُٹھا، دس روپے کا نوٹ اُس نے اچھی طرح مٹھی میں دبا لیا اور وہاں سے چلدیا۔ ستیش نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو یہ بھی کام ہوگیا۔ اب وہ بھنگی کی لڑکی کی بابت سوچنے لگا کہ اگر اُسے بھی — مگر یہ کیا نتھو روپا کے ساتھ واپس آرہا تھا۔

روپا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے اسے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ ستیش نے سوچا: "یہ بچے پیدا کرنا بھی ایک اچھی خاصی مصیبت معلوم ہوتی ہے!"

نتھو اور روپا دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ستیش نے روپا کی طرف دیکھے بغیر کہا: "دیکھو روپا، میں نے... اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے، تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا — سمجھیں — کیوں بھئی تم نے اِسے سب کچھ بتا دیا؟"

نتھو نے دس روپے کا نوٹ خاموشی سے ستیش کی طرف بڑھایا اور کہا: "چھوٹے لالہ جی۔ کاغذ کے اس ٹکڑے سے آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ میں تو ایک بہت بڑا سودا کرنے آیا تھا!"

ستیش نے سمجھا کہ نتھو شاید دس روپے سے زیادہ مانگتا ہے۔ "کتنے روپے چاہئیں تجھے — میرے پاس اس وقت پچاس ہیں، لینا ہوں، تو لے جاؤ!"

نتھو نے روپا کی طرف دیکھا۔ روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی ہوئی سیڑھیوں پر گر رہے تھے۔ اُس کے دل پر یہ قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔ ستیش کی طرف اُس نے مڑ کر کہا: "چھوٹے لالہ جی، یہ آپ کی پتنی ہے، آپ اس کے بچے کے باپ ہیں — جس طرح کہ بڑے لالہ جی آپ کے پتا ہیں — روپا کے لئے اور کوئی جگہ نہیں ہے، وہ آپ کے پاس رہے گی اور آپ اُسے اپنی پتنی بنا کر رکھیں گے — سب گاؤں والے اُسے دھتکار رہے ہیں، کس لئے — اس لئے کہ وہ آپ کا بچہ اپنے پیٹ میں لئے لئے پھرتی ہے — آپ کو تھامنا پڑے گا اِس لڑکی کا ہاتھ جس نے آپ کو اپنا سب کچھ دیدیا — آپ کا دل پتھر کا نہیں ہے چھوٹے لالہ جی اور اس چھوکری کا دل بھی پتھر کا نہیں ہے — آپ نے اس کو سہارا نہ دیا تو اور کون دے گا۔ یہ آتی نہیں تھی، رو رو کے اپنی جان ہلکان کر رہی تھی پر میں نے اسے سمجھایا سمجھایا اور کہا پگلی تو کیوں روتی ہے، تیرا پتی جیتا ہے، چل میں تجھے اس کے پاس لے چلوں —"

ستیش کے پتی پتنی کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا: "دیکھو بھائی زیادہ بکواس نہ کرو۔ تم یوں ڈرا دھمکا کر مجھ سے زیادہ روپیہ وصول نہیں کر سکتے۔ میں ایک سو روپیہ دینے پر راضی ہوں مگر ساتھ شرط یہ ہے کہ یہ بچہ ضائع کر دیا جائے اور جو تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اِسے اپنے گھر میں بسا لوں تو یہ ناممکن ہے — میں اس کا پتی خواب میں بھی نہیں بناؤں نہ یہ میری کبھی پتنی بنی ہے — تجھے، سو روپیہ لینا ہو تو کل آکے یہاں سے لے جانا، اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ!"

نتھو بھنا گیا۔

"اور — اور — یہ بچہ کیا آسمان سے آگیا ہے؟... اِسکی آنکھوں میں آنسو بھوت پریتوں نے بھر دئے ہیں — میرا دل... میرا دل کون مسل رہا ہے... یہ روپے... یہ سو روپے کیا آپ خیرات کے طور پر دے رہے ہیں — کچھ ہوا ہے تو یہ سب کچھ ہو رہا ہے... کوئی بات ہے تو یہ ہلچل مچ رہی ہے... آپ اس کے بچے کے باپ ہیں تو کیا اِسکے پتی نہیں؟ — میری سمجھ کو کچھ ہوگیا ہے یا آپ کی سمجھ کو —"

ستیش یہ تقریر برداشت نہ کر سکا: "اُلو کے پٹھے تو جاتا ہے کہ نہیں یہاں سے، کھڑا اپنی منطق چھانٹ رہا ہے، جا جو کچھ کرنا ہے کر لے — دیکھوں تو میرا کیا بگاڑے گا!"

نتھو نے ہولے سے کہا: "میں تو سنوارنے آیا تھا چھوٹے لالہ جی — آپ ناحق کیوں بگڑ رہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں اس کا ہاتھ تھام لیتے یہ آپ کی پتنی ہے!"

"پتنی کے بچے، اب تو اپنی بکواس بند کرے گا یا کہ نہیں — بچہ بچہ کیا بک رہا ہے — جا لے جا اپنی اِس ماسی کو، ورنہ یاد رکھ کھال اُدھیڑ دونگا!"

نتھو کے سب پٹھے اکڑ گئے: "بھگوان کی قسم مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ یوں ہاتھوں میں دبا کر تیرا سارا لہو نچوڑ دوں — میری کھال تیرے ان نازک ہاتھوں سے نہیں اُدھڑے گی — میں تیری بوٹی بوٹی نوچ سکتا ہوں — پر میں کچھ نہیں کر سکتا — میں تجھے ہاتھ تک نہیں لگانا چاہتا — تو روپا کے بچے کا باپ ہے، تو روپا کا پتی ہے۔ اگر میں نے تجھ پر ہاتھ اُٹھایا تو مجھے ڈر ہے کہ روپا کے دل کو دھکا پہنچیگا"

—— تو عورتوں سے ملتا جلتا ہے پر تو عورت کا دل نہیں جانتا۔"

ستیش آپے سے باہر ہو گیا، اور چیخنے لگا: "تیری اور تیری روپا کی ایسی کی تیسی —— نکل یہاں سے باہر!"

نتھو بڑھ کر روپا کے آگے کھڑا ہو گیا اور ستیش کے پاس —— بالکل پاس جا کر کہنے لگا: "چھوٹے لالہ جی مجھے معاف کر دو —— میں نے ایسی باتیں کہہ دی ہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھیں —— مجھے معاف کر دیجئے مگر روپا کا ہاتھ تھام لیجئے —— آپ اس کے پتی ہیں، اس کے بھاگ میں آپ کے بنا اور کوئی مرد نہیں لکھا گیا۔ وہ آپ کی ہے —— اب آپ اُسے اپنا بنالیں —— یہ دیکھئے میں آپکے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"کیسے واہیات آدمی سے واسطہ پڑا ہے۔" ستیش نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے کہا: "کہتا ہوں میں روپا دوپا کو نہیں جانتا، مگر یہ خواہ مخواہ اُسے میرے پلے باندھ رہا ہے —— جاؤ جاؤ ہوش کی دوا کرو۔"

کمرے کا صرف ایک دروازہ کھلا تھا جس میں سے ستیش اندر داخل ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے یہ دروازہ بند کر دیا۔ نتھو نے دروازے کی لکڑی کی طرف دیکھا تو اُسے ستیش کے چہرے اور اس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔

نتھو نے اپنے سر کے بال مروڑنے شروع کئے اور جب پلٹ کر اُس نے روپا سے کچھ کہنا چاہا تو دیکھا کہ وہ جا چکی تھی۔ وہ بھاگا کہ اُس کا پیچھا کرے مگر وہ جا چکی تھی۔ باہر نکل کر اُس نے روپا کو بہت دُور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے یہ کہتا ہوا بھاگا: "روپا —— روپا ٹھہر جا —— میں ایک بار پھر اُسے سمجھاؤں گا —— وہی تیرا پتی ہے —— اُس کا گھر ہی تیری اصل جگہ ہے۔"

وہ بہت دیر تک بھاگتا رہا مگر روپا بہت دُور نکل گئی تھی ——

اُس روز سے لیکر آج تک نتھو، روپا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر وہ اُسے نہیں ملتی۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے: "میں روپا کے پتی کو جانتا ہوں —— تم اُسے ڈھونڈ کر لاؤ میں اُسے اُسکے پتی سے ملا دونگا۔"

لوگ یہ سُن کر ہنس دیتے ہیں —— بچے جب بھی نتھو کو دیکھتے ہیں تو اُس سے پوچھتے ہیں: "اس کا پتی کون ہے نتھو بھیا؟" تو نتھو انکو مارنے کے لئے دوڑتا ہے۔

سعادت حسن منٹو

گلزار محل

اُمنگ

ننھا جب پہلے پہل گلزار محل میں آیا تو اُس کی عمر دس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی گھر کے معمولی کاموں کے لئے تین روپے ماہوار پر رکھ لیا گیا۔ اس وقت گلزار محل نہ گلزار تھا نہ محل۔ وہ شہر سے دُور گاؤں کے قریب اُدھر میدانوں میں ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ نواب جمشید حسن خاں نے ایک گلزار نامی طوائف سے شادی کر لی تھی اور اسی کے لئے آبادی سے دُور یہ عمارت بنوائی تھی جو بعد میں گلزار محل کے نام سے موسوم ہو گئی۔ بہت دنوں یہ عمارت ویران پڑی رہی لیکن بعد میں گردشِ روزگار اور اپنی پہلی بیوی کی اولاد کے ہاتھوں تنگ آ کر نواب صاحب نے اس کوٹھی میں گلزار اور اُسکی لڑکی نجمہ کے ساتھ بود و باش اختیار کر لی۔

گھر میں ایک ماما اور دو ملازم اور تھے۔ ننھا کو بہت واجبی ہی سا کام کرنا پڑتا۔ وہ بہت تیز اور ہوشیار لڑکا تھا۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا۔ اپنے خالی وقت میں وہ ایک غلیل لئے کھیتوں اور ویرانوں میں گھوما کرتا یا کوئلہ سے زمین پر تصویریں بناتا۔ یا پھر دوسرے نوکروں کے ساتھ لڑا کرتا۔ ننھا نے گاؤں میں ایک کاشتکار لڑکے سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے اس کے یہاں جاتا اور اس کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ ننھا کے بچپن میں خود اس کا باپ ایک بڑا کاشتکار تھا۔ ننھا اس کے ساتھ کھیتوں پر جایا کرتا اور جو کچھ وہ کرتا اس کی خود بھی نقل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن بعد میں ننھا کا باپ بیدخل کر دیا گیا تھا اور اُس کے کھیت نکل گئے تھے۔ ننھا بچہ ہی تھا لیکن اُس کو اپنے باپ کے کھیت نکل جانے کا بڑا افسوس ہوا تھا۔

ساون کا مہینہ تھا پانی پچھلے زوروں سے برس کر نکل گیا تھا۔ گلزار محل کے میدان خوب تر بتر تھے۔ نہ معلوم ننھا کے دل میں کیا سمائی کہ وہ پھاوڑہ لیکر باورچی خانے کے پیچھے زمین کھودنے لگا۔ زمین بہت نم تھی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک چھوٹی سی کیاری تیار ہو گئی۔ باورچی خانہ سے ایک مُٹھی دھنیا چرا کر ننھا نے کیاری میں چھڑک دیا۔ نجمہ نواب صاحب کی سولہ سترہ سال کی لڑکی جس کو سب پیار سے جگنو بی بی کہتے، آ گئی ننھا نے داد طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ کیاری دیکھکر مُسکرانے لگی۔ یہ کیا ہے؟"

"دھنیا بویا ہے جگنو بی بی" ننھا نے خوش ہو کر کہا۔

شام کو کسی بات پر نواب صاحب کہنے لگے "یہ ننھا کچھ کام نہیں کرتا واہی تباہی گھوما کرتا ہے"

جگنو بی بی نے اُسکی وکالت کی "اس نے ایک کیاری بنائی ہے میاں جان!"

نواب صاحب کی خفگی کم نہ ہوئی "وہ ایسی ہی حرکتیں کیا کرتا ہے فضول!"

ننھا بہت جز بز ہوا اور اس نے اُسی وقت جا کر کیاری بگاڑ دی اور زمین برابر کر دی۔ دوسرے دن جب جگنو بی بی نے وجہ پوچھی تو اُس نے مُنہ بسور کر کہا "یہاں نواب صاحب خفا ہوتے ہیں۔ میں زمین دیکھ آیا ہوں" اُس نے کوٹھی سے سو گز دور اشارہ کیا۔ "اب وہاں جا کر کیاری بناؤنگا" جگنو بی بی ہنسنے لگی اور چلی گئی۔ اسی روز گھر بھر کی آنکھ بچا کر ننھا نے کوٹھی سے تھوڑے فاصلے پر دو تین کیاریاں تیار کر دیں اور الم غلم جو کچھ اس کے ہاتھ لگا انہیں بو ڈالا۔ دھنیا، لہسن، پیاز، ترئی کے بیج اور ایک آدھ جنگلی پھول!

چار پانچ روز بعد ننھا دوڑتا ہوا جگنو بی بی کے پاس آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا "بی بی دھنیا نکل آیا"

"کہاں؟" جگنو بی بی نے تعجب سے پوچھا۔

"چلئے دیکھئے چل کر"

ننھا، جگنو بی بی کو لیکر اپنی کیاریوں پر پہونچا اور نہایت فخر سے دھنیا کی دو چھوٹی چھوٹی برائے نام پتیاں دکھانے لگا۔ اس روز سے جگنو بی بی بھی ننھا کے راز میں شریک ہو گئیں اور اس کو خوش کرنے کیلئے ننھا نے چار پانچ بڑی بڑی کیاریاں بنا ڈالیں اور اپنے گاؤں کے دوست کاشتکار لڑکے کے مشورہ سے ان میں چار پانچ ترکاریاں بو دیں۔ گھر بھر میں ننھا سب سے پیشتر جاگتا اور اُٹھکر سیدھا اپنی کیاریوں پر پہونچتا اور دن بھر میں چار پانچ گھنٹے ان ہی میں کام کرتا، نئی کیاریاں بناتا۔ جگنو بی بی اسکے کام میں بڑی دلچسپی لیتی اور دو تین دفعہ اُسے دیکھنے جاتی۔ وہ شہر گئی تو کئی قسم کے پھولوں کے بیج لے آئی۔ ننھا نے انہیں الگ ایک کیاری

میں بو دیا اور سب سے زیادہ اسی کیاری کا خیال کرتا۔ اسی میں سب سے پہلے پانی ڈالتا اور اسی کی سب سے زیادہ خدمت کرتا۔

ایک روز ہنسی ہنسی میں جمو بی بی نے سارا قصہ نواب صاحب سے بیان کر دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ اسکے ڈر سے کوٹھی کے قریب کیاریاں نہیں بناتا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوتے اور ہنسنے لگے۔ دوسرے دن وہ خود ننھا کی کیاریاں دیکھنے گئے۔ اس کی کارگزاری پر بہت مسرور ہوئے۔ ننھا کی پیٹھ ٹھونکی اور اس کو اجازت دیدی کہ وہ اپنی کیاریاں کوٹھی کے قریب بنا لے۔ ننھا مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اس نے اسی روز کوٹھی کے قریب دو بڑی بڑی کیاریاں بنا ڈالیں۔ اب وہ چھپ کر نہیں بلکہ کھلم کھلا دن بھر اپنی کیاریوں میں جٹا رہتا۔ کبھی ان کو سینچتا کبھی گوڑتا اور کبھی کھاد لاکر ان میں ڈالتا۔ اس نے سمجھ لیا کہ وہ خاص اسی کام کے لئے ملازم ہے۔ دوسرے نوکر اس سے جلتے نواب صاحب ہنستے اور جمو بی بی اس میں دلچسپی لیتی اور اس کا دل بڑھاتی۔

محنت

پانچ چھ سال گذر گئے لیکن ننھا کی مستعدی اور انہماک میں فرق نہ آیا۔ وہ روز بروز اپنے کام میں اور زیادہ پختہ اور مشاق ہوتا جاتا۔ اس نے اپنی محنت اور جانفشانی سے گلزار محل کی اوسر زمین کو لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ایک چپہ زمین پر اس نے دو دو تین تین دفعہ کھاد ڈالی تھی، پانچ پانچ چھ چھ دفعہ گوڑا تھا اور بیسیوں دفعہ سینچا تھا۔ کئی دفعہ وہ اپنے دوست کاشتکار کے بیل مانگ لایا اور ان کی امداد سے اوسر کی ساری زمین کو حلوہ کر ڈالا۔ اس کی خوش قسمتی سے گلزار محل سے دو ہی سو گز پر نہر نکلی تھی۔ اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ننھا اکیلا آدمی تھا لیکن اپنی محنت کے مقابلہ میں کسی چیز کو بھی کچھ نہ سمجھتا۔ اس کی عرق ریزی اور کوہ شکن ہمت کو دیکھکر نواب صاحب دنگ رہ گئے اور جمو بی بی تو فرط مسرت سے ناچی ناچی پھرتی۔ اب گھر میں ننھا کی بڑی قدر تھی۔ ہر شخص اس کی عزت کرتا۔ نواب صاحب نے اسے بہت سے پھل پھول اور باغبانی کا سازو سامان منگا دیا تھا اور اس کی ماتحتی میں ایک دوسرا آدمی بھی مقرر کر دیا تھا۔

ننھا اور جمو بی بی سارا دن اپنے باغیچہ اور باغ میں مصروف رہتے۔ گلزار محل کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار تھا اور اس میں بڑی بڑی کیاریاں تھیں جن میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول لہلہاتے۔ انواع انواع قسم کے گلاب کے تختے کوٹھی کے سامنے ہی تھے۔ برجو کی خوشبودار جھاڑیاں ایک کٹہرے کی صورت میں جمو بی بی کے کمرے کے گرد لگائی گئی تھیں۔ رات کی رانی کی قطار نہر کی سمت تھی اور وہ بل کھاتی ہوئی بہت دور تک چلی جاتی۔ کیاریوں کے درمیان سرو کے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ کوٹھی کی پشت پر تھوڑے فاصلہ سے بانس کی ایک لمبی سی گذرگاہ بنائی گئی تھی اور اس پر رنگ برنگی خوشنما بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سبزہ کے چوڑے چوڑے خطوں کے بیچ میں رنگا رنگ لالہ کی گول کیاریاں تھیں۔ مکان کے دائیں جانب کوئی سو گز کے فاصلہ پر کیلے کے درختوں کے جھنڈ تھے اور ان کی آڑ میں آم، امرود، شریفہ، نارنگی اور طرح طرح کے پھلوں کے درخت نشو و نما پا رہے تھے۔ چمن بندی میں جمو بی بی نے بڑا ملکہ حاصل کیا تھا۔ ترکیب ان کی ہوتی اور محنت ننھا کی۔

ننھا نے گلزار محل کو حقیقت میں گلزار محل بنا دیا تھا۔ معلوم ہوتا جیسے کسی نے جادو کر دیا اور ایک دم سے اوسر بنجر زمین بہشت بریں بن گئی۔ دیکھنے والوں کو اپنی آنکھوں پر شبہ ہوتا۔ وہیں جہاں کل تک خاک اور دھول اڑتی آج سینکڑوں پھول اور پتیاں جھوم رہے تھے۔ وہی کوٹھی جو چند سال پیشتر بالکل ویران اور سنسان دکھائی پڑتی آج نئی دلہن کی طرح پھولوں کی گود میں چمک رہی تھی۔ ننھا کی تعریف کرتے کرتے نواب صاحب کی زبان سوکھی جاتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اس سے اپنی احسانمندی کا اظہار کس طرح کریں۔ ننھا کے مشورہ سے انہوں نے سبزہ کے ارد گرد لوہے کا ایک کٹہرا لگوا دیا اور عین وسط میں چھوٹے چھوٹے فواروں والی ایک بہت دلکش نہر بنوا دی۔

ننھا اور جمو بی بی سویرے سے شام تک ساری دنیا سے بیخبر اپنے ہی کام میں لگے رہتے اور رات کو بھی اسی کے متعلق سوچتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ کچھ اس قسم کی باتیں ہوتیں:-

"بی بی ایک سرو کا درخت یہاں لگنا چاہیئے؟"

"وہ مرسل کی بیل میں پھول نہیں آتے؟"

"شریفہ کے درخت میں پانی ڈالنا ہے!"

"برجو کی پتیاں سوکھ رہی ہیں!"

"گلاب کی قلم ٹھیک نہیں بندھی!"

"یہ نالی بہت خوبصورت ہے!" وغیرہ وغیرہ۔

جدائی

ننھا اپنی زندگی کے راستے پر نہایت خوش اور مگن چلا جا رہا تھا

کہ دفعتاً اُس کو ایک حادثہ پیش آیا ایسا جیسے کہ کوئی شخص جہاں کھڑا ہو وہیں کی زمین یک بیک شق ہو جائے!

ایک روز جموبی بی اپنے معمول کے مطابق سویرے تڑکے باغ میں نہیں آئی۔ ننھا کو بڑی فکر لگ گئی۔ وہ بار بار گلزار محل کی طرف دیکھتا اور اس کا دل کام کرنے میں نہ لگتا تھا۔ قریب دس بجے کے جموبی بی آہستہ آہستہ خاموشی سے آئی اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

"کیسی طبیعت ہے جموبی بی؟" ننھا نے تعجب سے پوچھا۔

"ننھا!"

"بی بی"

"میں جا رہی ہوں!" جموبی بی کے آنسو چھلک آئے۔

"کہاں؟"

"میری شادی ہو جائیگی"

"کب؟" ننھا نے ابھی تک کبھی بھی اس امکان پر غور نہیں کیا تھا۔

"بہت جلد!"

دن سرعت کے ساتھ گذرنے لگے۔ ننھا اور جموبی بی کو معلوم ہوتا جیسے وہ وقت کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں اور وہ سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہا ہو—— دو تین مہینے گذر گئے!

آخر وہ دن بھی آگیا جس کے دوسرے روز جموبی بی گلزار محل سے سدھارنے والی تھی۔ جموبی بی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی لیکن اس روز وہ اور ننھا دن بھر باغ کے گوشے گوشے میں گھوما پھرا کئے اور ایک ایک پھول اور پتی کا جائزہ لیا گیا۔ جموبی بی نے بڑی حسرت سے سب کو الوداع کہا۔ وہ بار بار ننھا سے کہتی "دیکھو یہ درخت یہاں لگا دینا"

ننھا اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتا "بہت اچھا بی بی"

جموبی بی پھر کہتی "دیکھو یہ روش ٹھیک نہیں"

"ٹھیک ہو جائے گی بی بی"

"ابکے چنبیلی خوب پھوٹے گی!"

"جی ہاں بی بی"

شادی کے دن ننھا نے پوری کوٹھی کو پھولوں کی بھرمار سے گلستاں بنا دیا۔ جموبی بی کا اُس نے جو سہرا بنایا تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پورے باغ کی رُوح کھینچکر اُس نے گوندھ دی تھی۔ شادی میں اُس نے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ مختصر سی بارات آئی اور جموبی بی کو لیکر چلی بھی گئی لیکن وہ اپنی کوٹھڑی سے نہ نکلا۔

• • •

گھر

ننھا کا گاؤں گلزار محل سے صرف دو کوس پر تھا۔ وہ اکثر وہاں آتا جاتا رہتا لیکن جب سے اُس کے ماں باپ مر گئے تھے اُس نے آنا جانا بالکل ہی ترک کر دیا تھا۔ اُسے اپنے کام ہی سے فرصت نہ تھی۔ اُس کے دونوں بھائی کبھی کبھار اُس کو آکر دیکھ جاتے اور اُس سے گھر چلنے کے لئے کہتے۔ بہت دنوں سے وہ بھی نہیں آئے تھے۔ جموبی بی کے چلے جانے کے بعد ننھا نے باغ میں دو تین دن کام کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا جی نہ لگتا اور طبیعت بہت گھبراتی۔ اُس نے نواب صاحب سے پندرہ روز کی چھٹی لی اور اپنا کام دوسرے آدمی کے سُپرد کر کے گھر چلا گیا۔ یہ اس کی سب سے پہلی چھٹی تھی ورنہ دس بارہ برس کے زمانہ میں اُس نے کبھی بھی کوئی چھٹی نہ لی تھی۔ گھر جانا ہوتا تو شام کو جاتا اور سویرے لوٹ آتا

ننھا گھر پہونچا تو بھائیوں میں اُس کی طبیعت نہ لگی۔ گاؤں بھر میں وہ ایک اجنبی کی طرح پھرا کیا۔ اس کو اپنا ایک ملاقاتی بھی نہیں ملا۔ وہ ساری دُنیا سے کچھ علیحدہ سا ہو گیا تھا۔ بڑی مصیبت سے اُس نے گھر میں پڑے پڑے دو دن گذارے۔ تیسرے روز وہ سارا دن بھتیجوں کیلئے کیاریاں بنایا کیا، اور چوتھے دن وہ گلزار محل جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بھائیوں نے بہت روکا لیکن وہ ایک نہ مانا۔ اُسے جموبی بی کی ہدایتیں یاد آرہی تھیں۔

نواب صاحب اس کے اتنی جلد واپس آنے پر بہت متعجب ہوئے اور سبب پوچھنے لگے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اُس نے بہت کوشش کی لیکن اس کی طبیعت قابو ہی میں نہ آتی اور کام کرنے میں جی نہ لگتا۔ وہ کئی دن بیکار اپنی کوٹھڑی میں پڑا رہا۔ معلوم ہوتا جیسے اُس کے ہاتھ پیروں میں سکت ہی نہیں۔

ایک دن اُس نے سُن پایا کہ جموبی بی آرہی ہیں۔ ایکدفعہ پھر اس کی ہمت عود کر آئی اور وہ کھرپا لیکر باغ پر تعینات ہو گیا۔ اور دو ہی تین دن میں ایک ہفتہ کی تلافی کر ڈالی۔ جموبی بی آئیں تو ننھا کو دیکھکر بہت خوش ہوئیں اور آنے کے دوسرے ہی دن وہ اپنے پُرانے دستور کے مطابق سویرے تڑکے ہی باغ میں پہونچ گئیں۔ ننھا کی کھوئی ہوئی دلچسپی اُسے واپس مل گئی۔ وہ جموبی بی اور باغ کو دیکھکر کچھ لہرانے لگا۔

ایک دن جموبی بی نے ہنستے ہوئے کہا: "ننھا تم شادی کیوں

نہیں کر لیتے۔

ننھا ہنسنے لگا اور چُپ رہا۔

جموبی بی نے پھر چھیڑا:" تمہارے ماں باپ ہوتے تو کب کی شادی ہو چکی ہوتی۔ اب تم ہی کر لو۔"

" کہاں کروں بی بی!"

"میں کرا دوں؟" جموبی بی نے پوچھا

" کرا دیجئے" ننھا نے جھینپ کر کہا اور پھر بات بنانے لگا:" میری شادی تو اس باغ سے ہو گئی ہے!"

" اچھا۔ اب تم نے کہا ہے!"

جموبی بی نے دو ہی چار دن کی کوشش میں گھر کی ماما کی لڑکی موتیا سے ننھا کی شادی کرا دی اور امرودوں کے جھنڈ کی آڑ میں ننھا کی کوٹھڑی بھی آباد ہو گئی۔

جس طرح گرمیوں میں تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے اور چلا جاتا ہے اسی طرح جموبی بی آئیں اور تین مہینے رہ کر پھر سسرال واپس چلی گئیں اور ننھا کو اُس کے باغ میں تنہا چھوڑ گئیں۔

آرٹ

وقت کتنی جلد گذر جاتا ہے؟ یہ کوئی ننھا سے پوچھتا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے نازک نازک پودے تناور درخت ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بیج پھل اور پھول میں تبدیل ہو گئے۔ اوسر زمین سبزہ زار ہو گئی۔ بنجر میلے پھولوں کے تختے بن گئے۔ گلزار اور نواب صاحب مر گئے۔ ایکے دو بچے ہوئے اور ختم ہو گئے۔ اس کی جوانی کا آفتاب ڈھلنا شروع ہو گیا اور جموبی بی بیوہ ہو گئیں۔ ہر چیز میں تغیر تھا ہر شے میں انقلاب لیکن نہیں تھا تو ننھا کے باغ میں۔ وہ سدا بہار تھا۔

ماں باپ کی موت کے تھوڑے ہی عرصے بعد جموبی بی بیوہ ہو گئیں۔ اپنی سسرال سے واپس آ کر وہ پھر گلزار محل میں رہنے لگیں لیکن شادی کے دس سال نے ان میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ انہیں ہر دم ماں باپ شوہر اور بچوں کا غم کھائے جاتا۔ وہ بہت کم کوٹھی سے باہر نکلتیں اور باغ میں بھی برائے نام ہی دلچسپی لیتیں۔ ننھا کو ان پر بڑا ترس آتا لیکن وہ بیچارا کیا کر سکتا تھا۔ اُن کو خوش کرنے کے لئے وہ باغ کے متعلق طرح طرح کی نئی ترکیبیں سوچتا اور ان سے بیان کرتا لیکن جموبی بی ٹس سے مس نہ ہوتیں۔ اُن کی یہ کیفیت ایک سال تک قائم رہی لیکن پھر دفعتاً اُن کی آتما کی چنگاری چمک اٹھی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ باغ میں دلچسپی لینا شروع کی جیسے کوئی سوتے سوتے جاگ اُٹھے۔ اور پھر بہت جلد اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئیں۔ اب وہ پھر سویرے سے شام تک باغ میں دکھائی پڑتیں۔ ننھا کو اس سے بڑھکر اور کیا خوشی ہو سکتی؟

ننھا نے گلزار محل کے کونے کونے کو پرستان بنا دیا تھا۔ حدِ نظر تک لہلہاتے اور مسکراتے ہوئے پھولوں کی کیاریاں ہی دکھائی پڑتیں۔ دُنیا بھر کے پھول سمیٹ کر ننھا نے اپنے چمن میں لگا رکھے تھے۔ خوشبودار درختوں اور بیلوں کی اُس نے کچھ ایسی ترتیب کی تھی کہ اُنکی خوشبو سے ہر وقت کوٹھی بسی رہتی۔ معلوم ہوتا کہ کوٹھی کیا ہے ایک عطردان ہے۔ ننھا کی فتوحات صرف پھولوں ہی تک محدود نہ تھیں اُس نے پھلوں کو بھی نہ چھوڑا تھا۔ گلزار محل میں آم، انار، انگور، سیب، سنگترہ، لیچی، شریفہ غرضکہ کوئی ایسا پھل نہ تھا جو بہتر سے بہتر موجود نہ ہو۔ گلزار محل کے سیب اور سنگترے تو سارے صوبہ میں مشہور تھے۔ نئے نئے آموں کی ایجاد میں ننھا نے وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ آپ اپنا جواب تھا۔ آموں کی شاید ہی کوئی ایسی قسم ہو جو ننھا کی پروردہ نہ ہو اور جس پر نمائش میں اس کو انعام نہ مل چکا ہو۔

گلزار محل کی وسعتیں روز بروز بڑھتی ہی جاتیں۔ وسیع سبزہ کے اِرد گرد پھلوں اور میووں کے درختوں کے جھنڈ تھے اور پیچھے کی طرف تو یہ جھنڈ اتنی دُور تک چلا گیا تھا کہ بالکل جنگل معلوم ہوتا۔ اتنے بڑے باغ اور باغیچے کی رکھوالی کرنا صرف ننھا ہی کے بس کی بات تھی۔ اگر وہ ایک پتّی کو بھی جھڑا ہوا دیکھ لیتا تو اس کے دل میں کانٹا سا چُبھ جاتا۔ وہ باغ کی ہر ایک چیز نک سک سے دُرست اور نہایت قاعدے اور قرینے سے رکھتا۔ قدرت نے اُسے ایک عدیم المثال آرٹسٹ بنایا تھا۔ باغ کی چمک دمک دیکھکر معلوم ہوتا جیسے ایک ایک پنکھڑی پر پالش کی ہوئی ہے۔ گلزار محل محنت کی عظمت کا ایک درخشاں شاہکار تھا۔

خزاں

ایک دن وہ بھی آیا جب ننھا کے باغ کا سب سے زیادہ حسین اور شاداب پھول بھی کُملا گیا۔ جموبی بی چل بسیں۔ ننھا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔ کئی دن تک اس پر ایسا دورہ پڑا کہ وہ باغ تک بھی نہ جا سکا۔ لیکن پھر وہ اپنے کام میں پہلی ہی مستعدی سے لگ گیا۔ اب اُس کا آرٹ ذاتیات کے مدارج سے بہت دُور آگے نکل چکا تھا۔

جموبی بی اپنی وصیت کے مطابق باغ کے ایک کنج میں دفن کی گئیں۔ اُنکی قبر کے گرد نتھا نے ایک جلیل القدر باغبان کے شایانِ شان پھولوں پتیوں کا ایک بے نظیر مقبرہ تیار کر دیا۔

کوٹھی کے نئے مالک آ گئے لیکن نتھا ان سے غیر متعلق رہا اُسکو اپنے کام سے کام تھا۔ وہ دن رات اسی فکر میں رہتا کہ فلاں درخت کا تھلہ بنانا ہے۔ فلاں کیاری کو گوڑنا ہے۔ فلاں سبزے میں پانی دینا ہے۔ برجو کی بیل سوکھی جا رہی ہے اُس کے بجائے نئی لگانا ہے۔ فلاں نالی ٹھیک نہیں ہے۔ طوطے امرود کھائے جا رہے ہیں کھٹکھٹا باندھنا ہے۔ آم کا بور ٹھیک نہیں آ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے باغ کی وسعت اتنی زیادہ بڑھا رکھی تھی کہ اُسے سانس لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔

چند سال میں نتھا کی بیوی بھی مر گئی۔ اُس نے اُسے امرودوں کے جھرمٹ میں توپ دیا اور اُسکی قبر پر ایک ترئی کی بیل چڑھا دی۔ اب نتھا کا دُنیا میں کوئی نہ تھا — سوائے اُسکے باغ کے۔

وقت

تیس برس گذر گئے! تیس برس!

قانون

دُنیا کی ہر شے بدل گئی۔ ہر چیز میں انقلاب آ گیا۔ لیکن نہیں آیا تو نتھا کے باغ میں۔ وہاں اب بھی نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُسکی بہار خزاں نا آشنا تھی۔ بیچارا نتھا خود بھی بہت بدل گیا۔ ستر برس سے اوپر کا سن تھا۔ کمر خم ہو گئی۔ آنکھیں دُھندلی پڑ گئیں۔ سارے جسم پر جھریوں کا جال بچھ گیا۔ ہاتھ پیر میں رعشہ آ گیا۔ اور اُسکے بوڑھے دماغ میں جموبی بی کی تصویر بھی مٹنے سی لگی۔ لیکن اُس کی ہمت اور محنت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ پڑا۔ وہ اپنے باغ کی جوانی دیکھکر اب بھی اپنی رگوں میں تازہ خون محسوس کرتا۔ وہ اب بھی سویرے اُٹھکر باغ میں نکل جاتا اور ایک ایک پھول اور پتی کو خود دیکھتا۔ اب وہ زیادہ کام خود نہ کر پاتا۔ اُس نے اپنی ماتحتی میں تین آدمی رکھ لئے تھے۔ ان ہی سے دن بھر کام لیا کرتا لیکن وہ ان آدمیوں سے مطمئن نہ ہوتا ہر کام میں خود اپنا ہاتھ ضرور لگاتا۔

کوٹھی میں بہت سے لوگ آئے بھی اور چلے بھی گئے لیکن نتھا کو خبر نہ ہوئی۔ باغ کے معاملہ میں کسی کو نتھا سے بات کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اپنے کام میں دُور دُور تک مشہور تھا۔ سب اُسے نتھا بابا کہتے تھے۔

ایک روز نتھا کو کوٹھی میں بلایا گیا۔ وہ اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے پہونچا۔ کوٹھی کی نئی مالکہ ایک تُند خو بیگم صاحبہ تھیں۔ اُنہوں نے درشتی سے کہا، "نتھا بابا تم اب پنشن لے لو۔"

"پنشن کیا؟" نتھا نے پوچھا۔

"کئی روز ہوئے میں نے مزدوروں سے کہا تھا کہ وہ برجو کی جھاڑیاں صاف کر ڈالیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم منع کرتے ہو اور خفا ہوتے ہو۔ میں روز کہتی ہوں کہ میرے گلدستے میں مرسل کے پھول ضرور ہوں لیکن تمہیں کچھ خیال نہیں۔ اب تم بہت بوڑھے ہو گئے کام کرنے کے لائق نہیں رہے۔"

"پھر یہ کام کون کریگا؟" نتھا نے کہا۔

"کوئی کرے، تمہیں کیا؟ ہم دوسرا آدمی رکھ لیں گے۔"

"نہیں میں باغ چھوڑ کر نہیں جا سکتا!" نتھا نے غصہ سے کہا۔

"باغ ہمارا ہے ہم جو انتظام مناسب سمجھیں گے کرینگے۔ تمہارا انتظام ہمیں پسند نہیں۔"

"باغ میرا ہے۔" نتھا نے غصہ میں آپے سے باہر ہو کر کہا۔ "میں نے ہی باغ کو باغ بنایا ہے۔ میں نے ساٹھ سال اس میں کام کیا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس میں توپ دی ہے۔"

نتھا بڑے زوروں سے کانپ رہا تھا جیسے اُسے جاڑا آ گیا۔

بیگم صاحبہ ایک تلخ ہنسی ہنسیں۔ "بوڑھے بیوقوف! تم باغ میں صرف نوکر تھے۔ تم نے محنت کی تو تمہیں اس کی تنخواہ ملی۔ میں تمہیں موقوف کرتی ہوں۔"

"میں نے ادسر اور بنجر زمین کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ باغ میرا ہے! میرا ہے! جموبی بی یہی کہتیں۔"

"جموبی بی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ باغ ہمارا ہے قانون میں یہی لکھا ہے۔" بیگم صاحبہ نے جھڑک کر کہا اور کمرہ سے نکل گئیں۔

ایکدم سے نتھا کو ساری کوٹھی اور باغ آنکھوں کے سامنے ناچتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے مڑا اور بھاگا — وہ سبزے اور کیاریوں کو روندتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا — جیسے کسی ادسر زمین پر دوڑ رہا ہو۔ گلزار محل کے باہر وہ تھک کر کھڑا ہو گیا اور ہانپنے لگا۔ اسکی زندگی کے ساٹھ سال نکل گئے تھے۔ اب وہ پھر ایک بھولے بچے کی طرح کھڑا تھا، جس کا کہ اس دُنیا میں کوئی نہ تھا — "یہ باغ میرا نہیں ہے۔ قانون ہی لکھا ہے!" وہ بڑبڑایا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

السلام علیکم وعلیکم السلام

گاؤں میں چٹھی لکھ دیتا تو اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی یا گدھا ضرور موجود ہوتا لیکن اوّل تو اُسے خط لکھنے کا وقت ہی نہ ملا تھا، دوسرے وہ اپنی بیوی اور بچے کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اترا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں سے ڈھلی ہوئی گول گول ڈھیریاں اس نے چاروں طرف بکھری ہوئی دیکھیں تو اُس کے کلیجے پر جیسے کسی نے برف سے زیادہ ٹھنڈی انگلی رکھدی!

تین سال اس نے فرانس، میسوپوٹیمیا اور مصر میں گزارے تھے۔ تین سال وہ مورچوں کے دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا۔ کیچڑ سے بھری ہوئی خندقوں میں منہ کے بل لیٹا رہا۔ خار دار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا دبکا رہا۔ جب گولیاں شوکتی ہوئی اُس کے سر پر موت کی ایک گہری لکیر کھینچتی گذر جاتیں۔ اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں کے دہانوں کے عین پہلو میں آکر پھٹتے اور وہ دھوئیں اور دھول سے اَٹی ہوئی فضا میں اپنی بے رونق آنکھیں جھپکاتا ہوا رہ جاتا۔ جب ہوائی جہازوں کی پُراسرار بھنبھناہٹ سنکر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور بم کے گولے ایک تیز "وُووووہ!" کے ساتھ بڑے اولوں کے مانند گرتے۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی اور دھندلی فضا میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور باہیں، کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے نظر آتے تو اُس کے دل کی نظر میں اپنے وطن کی پست قد پہاڑیوں پر جم جاتیں اور پھر اُن کے درمیان زرخیز وادیوں کے کناروں پر پہاڑوں کے دامنوں میں ننھے ننھے گاؤں ـــــ اور ان گاؤں کے بھولے بھالے باشندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں ـــــ کبڈی کے میلے اور بلوے کی تیاریاں ـــــ اس کی خوبصورت بیوی اور اس کا بھدا بچہ ـــــ یہ سب چیزیں رائی کے مرچیں لگا دینے والے پلستر کی طرح اُس کے حافظے پر چمٹ جاتیں۔ اور بندوق میں کارتوس ڈالتے ـــــ دستی بم پھینکتے۔ یا لوہے کے خاردار تاروں پر لکڑی کے تختے یا گلی سڑی لاشیں رکھکر پھلانگتے ہوئے یہ احساس ہر وقت اُس کی ڈھارس بندھائے رکھتا کہ وہ دُنیا میں اکیلا نہیں ـــــ بے یارومددگار نہیں۔ اس کا اپنا وطن ہے۔ اپنا گاؤں ہے۔ اپنا گھر ہے۔ اُس کی اپنی بیوی اور اپنا بچہ ہے۔ اُس کی زندگی کے لئے دُعائیں مانگنے والی اور اُس کی موت پر مدتوں تک سوگ منانے والی دو ہستیاں ایک پُرسکون اور پُرامن جھونپڑی میں موجود ہیں!

محاذ سے لوٹتے وقت جب وہ کسی زخمی کو لاشوں کے انبار کے نیچے کراہتا دیکھتا یا آٹھ دس دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضا پر اُس کی نظریں پڑتیں تو اُس کا دل دھک سے رہجاتا۔ اور وہ محسوس کرتا کہ جیسے اُس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھدیا ہے اور لاش سے کچی بدبو دار اور غلیظ لعاب رسنے لگا ہے! یہ محسوس کرتے ہی وہ کانپ جاتا جیسے بے شمار بموں کے دھماکے سُن کر اُسکے کانوں کے پردے تن کر پھٹ گئے ہیں اور اُس کی چکراتی ہوئی کھوپڑی خاک اور خون کے غیر محسوس ذرّے بنکر کہیں کھو گئی ہو!

اُمید و بیم کے اِن الجھیڑوں سے نکل کر وہ گھر آرہا تھا۔ لیکن ایک احساس رہ رہ کر اُسے ستاتا تھا۔ اُس کی رُوح کے ایک کچے زخم پر سے بار بار پھاہا اتر جاتا تھا۔ قدم قدم پر وہ واقعہ اُسکی نگاہوں کے سامنے تیر جاتا جب اُسے فرانس کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی لیوسی ملی تھی۔ لیوسی نے اُسے دو چار دن ذرا غور سے دیکھا تھا اور ایک روز گلی کے موڑ پر ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اُس نے لیوسی کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ اُسی رات وہ بارک سے کھسک کر لیوسی کے گھر کے قریب پہونچا۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکالے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھکر وہ اس کے پاس آیا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے لیکر ماتھے کی آخری لکیر تک سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی حُسن و نزاکت کی پتلی لیوسی ـــــ بڑی بڑی نیلی آنکھیں مُسکاتی ـــــ لمبی لمبی خمیدہ پلکیں جھپکاتی ـــــ سُنہرے ملائم بال نیلی مہین رگوں کے جال میں پھنسے ہوئے سُرخ و سپید گالوں پر بکھیرتی اور مرمریں گردن میں ایک مبہم سا خم ڈالتی اُسکی طرف بڑھی۔ اور اپنی گوری گوری بھری بھری باہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیں۔ اپنے لب اُس کے لبوں پر کچھ ایسے انداز سے رکھے کہ اُس کا دل پسلیوں سے اُبھر کر اُس کے حلق میں اٹک گیا ـــ اور صبح اُسے لیوسی نے جگا کر کہا: "جاؤ۔ جاؤ۔ دن چڑھ آیا ہے۔ بگل کب کا بج چکا ہے، جاؤ!"

اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ لیوسی کے پاس بلاناغہ آتا رہا۔ اور جب سال کے بعد ہندوستانی فوجیں پھر اُسی گاؤں میں واپس

آئیں تو وہ لیوسی کی تلاش میں سارے گاؤں اور گاؤں سے باہر چراگاہوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اور آخر اُسے ایک بڑھیا کی زبانی یہ سُن کر بے حد افسوس ہوا کہ مس لیوسی اپنا تین ماہ کا بچہ لیکر پیرس چلی گئی ہے اور وہاں اتحادی فوجوں کے لئے صابن بنانے والے کارخانے میں کام کرتی ہے!

لیوسی کا خیال آتے ہی اُس کا دل ایک لمحے کے لئے سُکڑ جاتا! لیکن یہ خیال کر کے اُسے تسلّی ہو جاتی کہ اِس راز کو لیوسی اور اُسکے سوا اور کوئی نہیں جانتا!

اور اب وہ تین سال زندگی اور موت کے کڑے امتحانوں سے گذر کر دو مہینے کی چھٹی پر واپس گھر آ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اُسے گذشتہ تین برس کی تنخواہ مل گئی تھی اور چھ سو روپے یکمشت حاصل کر کے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے انگریزوں نے اپنے سارے خزانوں کی تھیلیاں اُسکی جھولی میں اُلٹ دی ہیں!

اسٹیشن پر اُتر کر اُس نے سنتروں اور کیلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا خریدا۔ ریوڑیوں اور جلیبیوں کی ایک گٹھڑی باندھ لی۔ ایک نیا صندوق خریدا جس پر سبز پھولوں اور سُرخ طوطوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بیوی کے لئے ایک ایسا دوپٹہ خریدا جسے آٹھ بار تہ کر کے بھی کسی چیز پر رکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے۔ اپنے بچے کے لئے ایک قلم خریدا جس کے دوسرے حصے پر پنسل اور پنسل کی دُم میں ربر کا ننھا سا ٹکڑا جڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کی بیوی نے ننھے کو اسکول بھیجنا شروع کر دیا ہوگا۔ کیونکہ وہ اُسے دیکھکر اکثر کہا کرتی تھی "میرا مُنا بدشکل ہے تو کیا ہوا ۔۔۔ یہ تو مدرسے کا منشی بنے گا۔ اور منشی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں!"

بیوی کے لئے سلمے ستارے کی جُوتی اور مُنے کے لئے سفید پھندنے والی سُرخ ٹوپی خرید لی ۔۔۔ اُس نے سوچا کہ تین سال کے بعد اُسکی بیوی اور منّا خدا جانے کن کن نعمتوں کے اُمیدوار بیٹھے ہوں گے!

بستروہیا اسٹیشن پر اپنے ہی گاؤں کے ایک قُلی کے پاس رکھکر اُس نے پھلوں کے ٹوکرے، صندوق اور مٹھائی کی گٹھڑی کو کچھ اس سلیقے سے باندھا کہ سر پر اُٹھاتے ہوئے اُسے کوئی دقّت پیش نہ آئی۔

سُورج غروب ہو چکا تھا اور تارے آہستہ آہستہ آسمان کی گہری نیلی تہوں کے نیچے سے اُبھر رہے تھے۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اس لئے روشنی کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اُسے اپنے علاقے کی ننھی ننھی پگڈنڈیوں کے جال اپنے ذہن پر چاند کی کرنوں کی طرح اُبھرتی محسوس ہوتے۔ اور وہ بے فکر چلتا گیا۔ لیکن شاید دہقانوں نے پگڈنڈیوں کے رُخ بدل ڈالے تھے۔ کئی بار وہ کیاریوں میں گھُس گیا جو کنوئیں کے پانی سے لبریز تھیں۔ کئی مرتبہ گیہوں کے کھیت اُسکی راہ میں حائل ہو گئے۔ کئی بار گول گول پتھروں کی حد بندیوں سے اُس نے ٹھوکریں کھائیں لیکن اُسے اپنے بھٹک جانے میں بھی ایک کیف سا محسوس ہوا۔ گیہوں کے بھیگے ہوئے پودوں کو چھُو کر اُسے اپنی جوانی کے وہ دن یاد آ گئے جب درانتی سے گھاس کاٹتے کاٹتے اُس کے ہاتھوں پر سبز رنگ چڑھ جاتا تھا اور جب گھاس کے گٹھے اُٹھانے میں گاؤں بھر میں وہ اوّل درجے کا توی نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ گول گول پتھر جب اُس کے ٹخنوں سے ٹکرا کر بجتے تو اُسے اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آ جاتیں جب گاتے بکریوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اُس کی پنڈلیاں دُکھنے لگتی تھیں اور کنکر اُڑ اُڑ کر اُس کی ایڑیوں اور ٹخنوں کو زخمی کر دیتے تھے اور جب تھک کر کسی پہاڑ کی کھوہ میں سوکھی لکڑیاں جلا کر وہ ایسے ایسے دوہے گاتا جن کا مطلب خود اُسے معلوم نہ ہوتا تھا! ۔۔۔۔ ان تصورات کے جلو میں لیوسی کا نازک پیکر تند آندھی کی طرح آتا اور اُسے لمحہ بھر کیلئے جھنجوڑ کر چلا جاتا!

جب وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہونچا تو اُسے صرف ایک جگہ اندھی سی روشنی دکھائی دی اور وہ جی ہی جی میں کُڑھنے لگا کہ اُس کی بیوی کو کس کمبخت نے اطلاع دیدی کہ وہ جنگ پر سے واپس آ رہا ہے! اُس نے بہت بڑی گٹھڑی کو ایک تھکے ماندے شانے سے دوسرے تازہ دم شانے پر منتقل کرتے ہوئے اپنے دل سے کہا "سارا مزا کِرکِرا ہو گیا! ساری لذّت ملیامیٹ ہو گئی!" اُس کی آدھی خوشیوں پر بچوں کے اُن نیلے پیلے غباروں کی سی جُھریاں پڑ گئیں جن میں سے تھوڑی سی ہوا نکل گئی ہو!

جب اُس نے اپنے گاؤں کی پہلی گلی میں قدم دھرا تو ایک گول سا پتھر ڈھلان سے لُڑکتا کھٹ پٹ بجتا کھائی میں گر گیا۔ اور پتھر کا شور سُن کر قریب ہی ایک کُتا تڑپ کر اُٹھا اور اس زور سے بھونکا کہ سوتے ہوئے پہاڑ جاگ اُٹھے اور گاؤں کے مشرق سے مغرب تک کے ننھے پلّوں سے لیکر بڑے بوڑھوں تک، سب کتّے بلبلا اُٹھے تو اُس نے سمجھا کہ اُس کا راز فاش ہو گیا ہے! ۔۔۔ اور جیسے مکانوں کی منڈیریں اُس کی طرف سر ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں "ہوں۔ چھُپ چھُپ کر آتے ہو؟ ۔۔۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں ۔۔۔ تم امیر خاں سپاہی ہو۔

تم سنہ چودہ کی لام سے واپس آرہے ہو تمہاری بیوی نے تمہارے لئے سوتیاں پکا رکھی ہیں۔ تمہارا بچہ تمہارا حقہ تازہ کر رہا ہے۔ تمہارے خاندان کی عورتیں چھتوں پر بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم ہم سے چھپتے ہو!۔۔ ہوں"

دیواروں کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا جب وہ مسجد کے قریب سے گذرا تو اُسے یہ دیکھکر بہت افسوس ہوا کہ مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے اور مولوی جی جو اس وقت نماز پڑھا رہے تھے بہت بوڑھے ہوچکے ہیں۔ دیئے کی پیلی روشنی اُن کی سفید براق ڈاڑھی پر پڑ رہی تھی۔ اور جب اُنہوں نے اللہ اکبر کہا تو اُس نے محسوس کیا کہ اُن کی بتیسی بھی جھڑ چکی ہے اور اُن کی سُریلی آواز پرانی سارنگی کی اس بے ہنگم تان میں تبدیل ہوچکی ہے جو اُس کے آخری ڈھیلے ڈھالے تارسے بے خبری میں نکل گئی ہو!

مسجد کا دیا دیکھکر اُس کی خوشیاں پھر نئے شان سے اُبھریں۔ اُن نیلے پیلے غباروں میں پھر کسی نے ہوا بھر دی۔ اُس کا گھر مسجد کے قریب ہی تو تھا۔ اور ایک میل دُور سے اگر اُسے مسجد پر گھر کا دھوکا ہوا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اندھیرے میں نظریں بھٹک ہی جاتی ہیں۔ اور پھر تین سال کا پھیر ہے۔ تین دِنوں کا تو نہیں کہ قیاس حرف بحرف سچ نکلے!"

وہ اپنے گھر کے دروازے سے دو قدم کے فاصلے ہی پر ہوگا کہ ایک شخص اُس کے قریب سے "السلام علیکم" کہتا گذر گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ سلام کا جواب دینے میں چالیس دِنوں کی نماز کا ثواب ہے لیکن وہ صرف اس لئے خاموش رہا کہ اُسے اپنے راز کے فاش ہوجانے کا ڈر تھا۔ جس جذبے کو اپنے سینے میں چھپا کر وہ میسوپوٹیمیا سے روانہ ہوا تھا اُسے ذرا سی آواز نکال کر وہ خاک میں کیونکر ملا دیتا۔

اُس نے اپنے مکان کا ننھا دروازہ بے حد احتیاط سے کھولا۔ خشک لکڑی کا مَس بجلی کی طرح اُس کے قلب کی طرف دوڑا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ گٹھڑی سر سے اُتار کر وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے لپٹ گیا۔۔ اُس کا پُرانا دوست۔۔ مدتوں کا خاموش ساتھی۔۔ جس کی آڑ لیکر شادی سے قبل اُس نے گاؤں کی ہر لڑکی کو آنکھ بھر کے دیکھا تھا اور جس کے پیچھے چُھپ کر اُس نے اپنی بیوی پر چھاچھ کی کلی کردی تھی۔ گٹھڑی ہاتھ میں لٹکا کر اُس نے دروازہ بند کردیا اور آگے بڑھا۔ مکان کے صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ چارپائیوں کے قریب گیا۔ ایک خالی تھی اور دوپہری پر اس کا بچہ سو رہا تھا۔ ایک بار چپکے سے اُس نے سارے صحن کا چکر کاٹا اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کی بیوی کہیں پڑوس میں ہے تو وہ بڑھکر اپنے ننھے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا "میرے بچے، میرے مُنے!" وفورِ مسرت سے اُس کا گلا گھُٹ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آسمان پر ننھے ننھے تارے اس کی خوشیوں سے متاثر ہوکر کروٹیں سی بدلنے لگے۔ اور پڑوس میں کوئی بوڑھی بکری اپنی پھٹی پھٹی آواز میں یوں ممیائی جیسے پکار رہی ہو "امیر خاں۔۔ ہو امیر خاں!"

مُسکرا کر اُس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالی۔ دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے اس کا لڑکا بے شمار صورتیں اختیار کر کے اُسکے تصور پر منڈلانے لگا۔۔ تین سال اور چھ سال کی عمر میں بچے کی شکل وصورت میں جو ذرا ذرا سی تبدیلیاں ہوتی ہیں، سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ کی سلوٹوں میں رینگنے لگیں۔

اور جب دیا سلائی کی رگڑ سے چھر ر ر ر کی آواز پیدا ہوئی تو جیسے اُس کے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا۔۔ تمتماتا چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ۔ لٹکے ہوئے گال۔ چوڑی ناک۔ تنگ ماتھا۔ ذرا سی گردن۔۔ "میرا بچہ!"۔۔ وہ پکار اُٹھا۔ اور جب وہ اُسے چومنے کے لئے اتنی بے شمار پیاری چیزوں میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرنے لگا تو بچے کے دائیں گال پر ناک سے لیکر کان تک اُسے ایک سانولی سی لکیر نظر آئی۔۔ دیا سلائی بجھ گئی اور اُسے وہ دن یاد آگیا جب اُس کی بیوی بیمار تھی اور وہ خود چھُری لیکر شلغم چھیلنے لگا تھا۔ اس کی بیوی یہ برداشت نہ کرسکی۔ کھاٹ سے اُتر کر چھُری اُس سے چھیننا چاہی تو پاس ہی بیٹھا تھا اس کے گال پر جا لگی۔ اور خون کی ایک تیز دھار اُس کے گلے سے ہوتی ہوئی اس کے اُبھرے ہوئے پیٹ، پھولی ہوئی رانوں اور گھٹی ہوئی پنڈلیوں سے گزرتی ایڑی پر پڑنے لگی تھی۔ اُس کی بیوی نے دس سیر سُوجی کے حلوے کی منت مانی تھی۔ اور جب ننھا اچھا ہوگیا تو اُس نے دس سیر سُوجی کا حلوا پکانے کے لئے نمبردار کے گھر سے بڑا دیگچہ منگوایا۔ اور جب فقیر سائیں کی خانقاہ پر جانے کے لئے اُس نے میراسن کو بلوایا اور دیگچہ اُسکے سر پہ دھرا تو وہ مسخری دو ایک بار لڑکھڑائی اور چلا اُٹھی "ہائیں، مجھ نگوڑی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سُوجی کا حلوا بھی کمر توڑ ڈالتا ہے!"

اب اُس نے جھک کر اُسی سانولی لکیر پر اپنے خشک ہونٹ رکھ دیئے۔ اور بچے نے نیند میں انگڑائی لیتے ہوئے اُس کے مُنہ پر

ایک ننھا سا طمانچہ لگا دیا ——! قہقہہ ضبط کرنے کے لئے اُس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ اُٹھ کر سرکنڈے کے چھپّر تلے آ گیا جہاں گٹھڑی پڑی تھی۔ صندوق کا کنڈا کھول کر تین روپلے — سلمہ ستارے والی جوتی، اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو چھوا —— پھلوں کا ٹوکرا اُٹھا کر ایک طرف رکھا۔ مٹھائیوں کی گٹھڑی صندوق پر دھر دی۔ روپوں کی پوٹلی پر ایسے ہی ہاتھ پھیرا اور یوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ نئی دُنیا سے اِس پُرانی دُنیا میں ایسی ایسی چیزیں لیکر آیا ہے جن کا آج تک گاؤں والوں میں سے کسی نے نام تک نہیں سُنا!

صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اُس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اُس کے کان دل کی دھک دھک سُننے لگے اور پھر یہ دھمک صحن میں گھومنے لگی —— اوپر فضا میں اُڑ گئی —— کائنات میں پھیل گئی —— اندھیرے سے چھن کر تاروں پر سا گئی —— زمین و آسمان اُس کے دل کی دھڑکن کے تال پر ناچنے لگے۔ وہ بیقرار ہو کر اُٹھ بیٹھا جیسے اُس کا کوئی بہت بڑا راز فاش ہونے والا ہو!

اچانک بھِنچا ہوا دروازہ چرچرخ سے کھلا اور اس کی بیوی صحن میں داخل ہوئی —— اُس کے دل کی دھک دھک اچانک رُک گئی جیسے گاڑی کا انجن جنگلوں اور پہاڑیوں میں دندناتا ہوا یکایک تھم گیا ہے! — ایک قلابازی کھا کر کوئی چیز اُس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں بیٹھ گیا۔ اُس کا دماغ تپنے لگا! اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے —— رونگٹے اُس کے جسم پر چیونٹیوں کی طرح سرسرانے لگے۔ اُس نے اپنی اُنگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی مگر اُسے درد محسوس نہ ہوا جیسے وہ کسی لکڑی کو چبا رہا ہو!

اُس کی بیوی نے دیوار کے اندر سوراخ میں پڑا ہوا دیا روشن کیا اور ایک لمحہ کے لئے امیر خاں کو ایسا محسوس ہوا کہ بیتے ہوئے دن اور تمام گھڑیاں دئے کی لَو میں ٹمٹمانے لگی ہیں —— بیوی کی آنکھوں کی چمک بھی اس لرزتی ہوئی لَو میں جھلک رہی تھی!

تین برس —— جن کے خدا جانے کتنے دن ہوتے ہیں، اپنے تمام موسموں سمیت اُس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ — تین برس! —— اُسے معلوم نہ تھا کہ ایک برس اتنی موٹی دیوار چُن سکتا ہے!

امیر خاں نے اِن تین برسوں میں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا —— ہائیں! یہ کیا! —— امیر خاں کا ہاتھ گٹھڑی کی طرف بڑھا! — اُس کی بیوی کے انگ پر ریشمی قمیص تھی اور دوپٹہ —— دوپٹہ! —

اس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا! — اس کی بیوی کے تین دوپٹے میں سے اُس کے بالوں کی سیاہی باہر نکل رہی تھی۔ امیر خان کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ بیری کے پتے گھوٹ گھوٹ کر بالوں میں لگایا کرتی تھی اور اس سے کہا کرتی تھی "میرے بال اتنے لمبے ہو جائیں گے کہ بس تم دیکھا کرو گے!" — اور اب امیر خاں اُن بالوں کو دیکھتا رہ گیا کیونکہ اُس کے بال بہت لمبے تھے اور جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھی اس کو بھی اگر آٹھ بار تہ کر کے کسی چیز پر رکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے!

چرچراہٹ ہوئی اور امیر خاں کی آنکھیں جو ابھی تک تین برسوں کے اندر برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں، اپنی بیوی کے پاؤں پر پڑیں —— اُس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف اُٹھ گیا! —— سلمے ستارے کی جوتی اُس کے پاؤں میں تھی اور —— دئے کے اس طرف ایک کھونٹی کے ساتھ ایک سفید پھندنے والی سُرخ ٹوپی لٹک رہی تھی —— وہ آنکھیں بیچ کر جھک گیا اور ہاتھ فرش پر ٹیک دئے — کوئی چیز اُس کی انگلیوں سے مَس ہوئی! یہ سنترے یا کیلے کا ایک چھلکا تھا! — اُس نے وہ سوکھا ہوا چھلکا اُٹھا کر یوں پھینکا جیسے قصائی گوشت پر سے چھیچھڑا اُتار کر اُڑا دیتا ہے! چھلکا اندھیرے میں مٹی کے کسی برتن سے ٹکرایا —— آہٹ ہوئی — اُس کی بیوی ایکدم چونکی! — امیر خاں نے، جو کہ ابھی اس چھلکے کی گرفت اپنی انگلیوں میں محسوس کر رہا تھا، جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپوں کی پوٹلی کو چھوا —— کرموں آہٹ کی جستجو میں بڑھی —— سمٹی! —— اس کے ٹیشے لپے دوپٹے کا ایک کونہ جس میں کچھ بندھا تھا پھسل کر نیچے گرا —— ہلکی سی چھنن کی آواز آئی —— امیر خاں نے جیب میں اپنے روپوں کی پوٹلی پر سے اس وحشت سے انگلیاں اُٹھائیں جیسے اُسے بے شمار سانپوں نے بیک وقت ڈس لیا ہے!

اُس کی بیوی نے جھٹ سے دوپٹے کا وہ کونہ اپنے نیفے میں اُڑس لیا اور کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اور تین برس پھر امیر خاں کی چوڑی چھاتی پر سوار ہو کر ناچنے لگے۔

اُس کی نگاہیں اپنے بچے، اس کے چہرے کی سانولی لکیر — کیلے اور سنتروں کے بکھرے ہوئے چھلکوں اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان تمام چیزوں کا نقش اُس کے دماغ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ برف کے ڈلے پر لکیریں کھینچ رہا ہے!

جماہی کی اونچی آواز آئی۔ امیر خاں نے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منہ کھولے جماہی لے رہا ہے۔ اُس نے تین برسوں کے شور و غل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا ـــ کچھ ـــ ایک پتلی دبی دبی آواز جو کوٹھڑی میں سے آرہی تھی ـــ امیر خاں سارے کا سارا کان بن گیا ـــ آواز آئی "جاؤ۔ جاؤ۔ دن چڑھ آیا ہے، مُرغ کب کے بانگیں دے چکے ـــ جاؤ"

امیر خاں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ امیر خاں کدھر ہے ـــ اور یہ امیر خاں کا گھر ہے یا لیوسی کا مکان اور یہ اس کی بیوی کی آواز ہے یا لیوسی کی ـــ یہ کون ہے اور یہ کسے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ـــ اور وہ کیا سوچ رہا ہے ـــ وہ ـــ کچھ نہیں ـــ کچھ نہیں!

اندر سے پھر ایک آواز تیرتی ہوئی آئی اور اس کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح گھس گئی "اٹھو اٹھو۔ میں دیکھ آئی ہوں۔ نمبردار کا دروازہ بند ہے ـــ اب نکلو بھی یہاں سے ـــ نگوڑا پتہ بھی کھڑکے تو میں اچھل پڑتی ہوں ـــ جاؤ۔ جاؤ بھی۔ پر یاد رہے۔ کل منے کیلئے ریوڑیاں اور جلیبیاں ضرور لیتے آنا ـــ!"

امیر خاں نے روپوں کی پوٹلی نکال کر ریوڑیوں کی گٹھڑی پر دھر دی۔ لیکن ایکدم اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ہاتھ کے دباؤ سے ریوڑیاں کڑ کڑ بولنے لگیں!

اُس کا دماغ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا۔ دیوار سے چمٹتا وہ باہر کھسکنے لگا۔ اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر اُس نے دیکھا کہ کوٹھڑی سے اندھیرے میں ایک بھیگا ہوا آدمی باہر نکلا ہے۔ امیر خاں کی تین برس کے واقعات سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے اُس نے انگڑائی لی اور کہا: "لے آؤں گا ـــ پہلے کبھی انکار کیا ہے کہ اب اتنی تاکید کر رہی ہو!"

مُنے کی طرف دیکھکر وہ مُسکرایا اور زیرِ لب کہنے لگا: "امیر خاں سے اس کی شکل کتنی ملتی ہے"

امیر خاں کی بیوی نے بڑھکر اپنے بچے کی سانولی لکیر پر اپنے لب رکھدئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "امیر خاں سے تیری شکل سچ مچ کتنی ملتی ہے!" ـــ اور امیر خاں نے دئے کی دُھندلی روشنی میں اپنی بیوی کے دائیں گال پر پانی کی ایک پتلی سی سانولی لکیر دیکھی۔ وہ وحشیوں کی طرح لپک کر باہر گلی میں آگیا! گلی کے نکڑ پر اچانک اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ فرانس کے گاؤں کا وہ نکڑ اُسے یاد آگیا جہاں اُس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں لیوسی سے اُسکے گھر کا پتہ پوچھا تھا!

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص اُس کے قریب سے گزرا۔ امیر خاں نے کہا: "السلام علیکم" جانے والا تیورا کر پیچھے ہٹا اور سلام کا جواب دئے بغیر نمبردار کے مکان کے سامنے سے دبے پاؤں گذرتا ایک گلی میں غائب ہو گیا!۔

احمد ندیم قاسمی

قِسمت سے کیو

برماشل کمپنی کی طرف سے ملازمت کے لئے ایک اشتہار چھپا تھا۔ اس جگہ کے لئے میں نے بھی بے شمار پڑھے لکھے بیکاروں کی طرح درخواست دیدی تھی۔ چنانچہ اب اسی سلسلے میں لاہور سے انٹرویو کے لئے دہلی جارہا تھا۔ فرنٹیر میل کے ایک دوسرے درجے کے کمرے میں میرے علاوہ ایک اور صاحب سامنے کی نشست پر بستر جمائے بیٹھے تھے اور اخبار پڑھ رہے تھے بعض آدمیوں سے انسان بلا وجہ نفرت کرتا ہے۔ اور ریل کے ڈبے میں داخل ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی میرے اندر اپنے ہمسفر کے خلاف نفرت کا مادہ بھڑک اُٹھا۔ شاید یہ وجہ تھی کہ چند جسمانی خصوصیات جن کا میں مداح ہوں اُن کی ہستی سے غائب تھیں۔ مثلاً یہ بیحد موٹے تھے۔ ان کے جسم کا ہر ایک حصہ گول تھا یعنی زاویوں سے مبرا۔ چہرہ گول اور پھولا ہوا۔ پیٹ گول۔ ٹانگیں کسی ہاتھی کے بچے کی ٹانگوں کی طرح ٹخنوں سے گھٹنوں تک ایک ہی جیسی موٹی۔ حد یہ کہ اُن کے ہاتھ بھی خمیری روٹی کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ جن کی چار انگلیوں میں موٹے موٹے سونے کے چھلّے دھنسے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ بڑی بڑی مونچھوں سے مزیّن تھا۔ جن کا نچلا حصہ اُوپر کے ہونٹ پر بیل کی طرح پھیل کر مُنہ کے کسی حصہ میں جاکر ختم ہوگیا تھا۔ اور اُن کی بدصورتی کو بڑھانے کے لئے اُنکے اُوپر کے اگلے دانت مُنہ سے باہر نکلے ہوئے تھے اس طرح کہ کوشش کرنے پر بھی یہ اپنے پان اور سالن سے آلودہ دانتوں کو نہ چھپا سکتے تھے۔ نیز ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد یہ کھانستے اور نہایت بے پرواہی سے جس طرف مُنہ کا رُخ ہوتا... آ آ آخ تھو... کردیتے! اب آپ ہی بتائیے بھلا ایسے انسان سے کون محبت کرسکتا ہے۔ میں دُعا مانگ رہا تھا کہ اُوپر کی نشست ٹوٹ کر ان کے سر پر گر پڑے تاکہ یہ کچھ دیر کیلئے بیہوش ہوجائیں۔

گرمی کا موسم تھا۔ پنکھے کی ہوا کے باوجود بھی میرا دل گھبرا رہا تھا۔ سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے وہ خوبصورت انسان مجھ سے بھی زیادہ گھبرا رہے تھے اور ماہیِ بے آب کی حالت یاد دلا رہے تھے گرمی برداشت کرنے کا مادّہ اُن میں مجھ سے کہیں کم تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک وہ بےچینی کی حالت میں اخبار دیکھتے رہے اور میں باوجود کوشش کرنے کے بھی نہ سو سکا۔ اس کے بعد اُنہوں نے اخبار ایک کونے میں پھینکدیا بمشکل اُٹھکر اپنی صُراحی میں سے ایک گلاس پانی بھر کر پیا اور پھر میری طرف رُخ کرکے اپنی نہایت کرخت آواز میں یوں کرمفرما ہوئے۔

"کیوں حضرت کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ "ارادہ تو دہلی جانیکا ہے اگر وہاں پہنچنے سے پہلے ریل گاڑی کا حادثہ نہ ہوجائے"

اس پر وہ نہایت ناراضگی سے اور ایسے یقین سے کہ گویا خدا کے دُنیا میں وہی نمائندے ہوں بولے "حادثہ وادثہ کچھ نہیں۔ تو گویا آپ دہلی جارہے ہیں اور کل صبح وہاں پہونچ جائینگے"

خدا جانتا ہے کہ مجھ کو اُن سے بات چیت کرنے میں ذرا بھی لُطف نہیں آرہا تھا۔ مگر اُن کے خطرناک لہجے نے اشتعال سا دلا دیا۔ اور بحث کرنے کی خاطر میں نے پوچھا "آپ کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تقدیر کے قائل نہیں؟"

جھٹ جواب ملا "ہرگز نہیں۔ تقدیر وقدیر کوئی چیز نہیں۔ ہر ایک انسان اپنی قسمت خود بنا سکتا ہے۔ اور جو لوگ قسمت کو کوستے ہیں وہ محض کاہل الوجود ہیں۔ قِسمت۔ قسمت۔ دُنیا کو دھوکہ دینے کے لئے بیکار آدمیوں نے ڈھکوسلا بنا رکھا ہے"

میں نے تمسخرانہ انداز سے کہا "اگر ایسا ہی تھا تو آپ نے اپنی شکل وصورت کیوں نہ بدل ڈالی۔ یا شاید آپ خود کو خوش شکل سمجھتے ہیں؟"

اب تو وہ آگ بگولا ہوگئے۔ مگر دانشمندانہ طرز سے بولے۔ "مَیں شکل وصورت کا ذکر نہیں کررہا۔ بحث انسان کی زندگی کے متعلق ہے"

میں نے کہا "انسانی زندگی ہی سہی۔ خود میری زندگی ہی لے لیجئے۔ میں نے ہر دفعہ اپنی زندگی میں تقدیر کا پلّہ بھاری پایا اور تدبیر کی کچھ پیش نہ چل سکی۔ ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی میں کامیابی سے اُسی طرح دُور رہا جس طرح ہندوستانی باوجود انگریزی لباس۔ تہذیب، خوراک اور زبان تک اختیار کرنے کے انگریزی کلبوں سے دُور رکھے جاتے ہیں۔ اگر آپ میری رام کہانی سُنیں تو یقیناً تقدیر کے قائل ہوجائیں"

اُنہوں نے ایک سگرٹ سُلگاتے ہوتے کہا "مجھے پوچھنا ک

نہیں!!)" میں تقدیر کا قائل نہیں ہو سکتا۔ مگر چونکہ نیند نہیں آرہی اِسلئے آپ کی رام کہانی سُن لیتا ہوں۔ فرمایئے آپ کن وجوہات کی بنا پر تقدیر کے قائل ہو چکے ہیں؟"

میں نے دل میں سوچا عجیب بدتمیز انسان سے پالا پڑا ہے جسکو میرے احساسات کا بالکل لحاظ نہیں۔ میری زندگی کے حالات محض اِسلئے سُننے کے لئے تیار ہو گئے ہیں کیونکہ اُن کو نیند نہیں آرہی یعنی میری دردناک کہانی سے یہ لوری کا کام لیں گے۔ میں نے جل بھُن کر کہا:

"آپ یقیناً اُن آدمیوں میں سے ہیں جن پر دلائل کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا جو رائے آپ کسی معاملے کے متعلق قائم کر چکے ہیں آپ اُس کو غلط ثابت ہونے پر بھی تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ تاہم میں آپ کو اپنی زندگی کے حالات اس لئے سناتا ہوں کہ وقت گزر جائے، اس لئے نہیں کہ آپ تقدیر کے قائل ہو جائیں۔ سُنیئے:۔

"اگرچہ میں حیدرآبادی ہوں مگر چونکہ میرے بڑے بھائی صاحب کو، جن کے پاس میں رہتا تھا۔ نشانِ انگشت کی شناخت کی ٹریننگ لینے کلکتہ جانا پڑا اس لئے میں بھی کلکتہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے؛ میں شریک ہو گیا۔ اُن دنوں میری زندگی کے صرف دو شغل تھے۔ فلسفہ کی کتابیں پڑھنا اور ٹینس کھیلنا۔ ایک دن اتفاق سے صبح کے وقت بارش ہوئی اور اس لئے شام کو میں ٹینس کھیلنے نہ جا سکا۔ کچھ دیر گھر بیٹھا رہا اور پھر سیر کرنے باہر نکل گیا۔ ایک سُنسان سڑک پر میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ دماغ میں افلاطون، ارسطو اور بوزانکے کے نظریہ چکر لگا رہے تھے۔ معاً مجھ کو رستے کے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے بچا۔ سڑک پر مجھکو چند گلاب کے پھُول پڑے ہوئے نظر آئے۔ سامنے جو نظر اُٹھائی تو ایک لڑکی پھُولوں کا ایک گلدستہ اُٹھائے خراماں خراماں جاتی دکھائی دی۔ مجھ پر راستبازی کا غلبہ چھا گیا۔ پھُول یقیناً اُس کے بے پروا بازوؤں سے گرے ہونگے۔ میں پھُولوں کو اُٹھا کے تیزی سے اُسکی طرف لپکا تاکہ اُس کے پھُول اُسکو دیدوں۔ اس طرح میری ملاقات خوبصورت رورا سے ہوئی۔ قسمت نے اُس شام میری زندگی کا ایک نیا ورق پلٹ دیا تھا . . . .

رورا بنگالن تھی اور کسی ٹریننگ کالج میں ماسٹرنی بننے کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اُس شام کی اتفاقیہ ملاقات کے بعد ہم اکثر ملا کرتے علمی بحث کے لئے۔ شام کی چاء پر، سنیما میں — غرضکہ ہماری واقفیت دوستی اور دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ آپ تو شاید محبت کے بھی قائل نہیں۔ لیکن اگر محبت کسی شے کا نام ہے تو میں رورا سے محبت کرتا تھا اور رورا بھی مجھ سے بظاہر محبت کرتی تھی۔ کیونکہ بارہا اُسکی آنکھوں سے اور مرمریں باہیں میرے گلے میں ڈالے اس بات کا اعتراف کر چکی تھی۔

رورا نے امتحان پاس کر کے کسی اسکول میں ملازمت حاصل کر لی۔ ادھر میں نے بھی ایم۔ اے کا امتحان پاس کر لیا اور نوکری کی تلاش میں کوشاں ہوا۔ باوجود کوششِ بسیار مجھے کلکتہ میں ملازمت نہ مل سکی۔ اُدھر مجھے گھر والوں نے پریشان کر رکھا تھا کہ فوراً گھر واپس چلے آؤ اور یہیں نوکری کرو۔ کلکتہ میں میرا بے روزگار ٹھہرنا محض رورا کی بدنامی کا باعث ہو رہا تھا۔ آخر ایک دن مجھے کلکتہ سے روانہ ہونا پڑا۔ جدائی کا وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رورا نے روتے ہوئے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ شادی کرے گی تو مجھ سے ورنہ کنواری ہی رہے گی۔ میں نے بھی قول دیا کہ جونہی مجھے کوئی ملازمت ملے گی میں اس کو بُلا لوں گا —

قصّہ مختصر میں حیدرآباد واپس آگیا اور نوکری کی تلاش میں اپنے سب جوتے گھس ڈالے۔ آخرکار ایک معمولی سی ملازمت مجھ کو مل گئی مگر اس سے میں اس قابل نہ ہوا تھا کہ رورا کو بلا لیتا۔ میری جان عذاب میں تھی۔ رورا جس سے میں محبت کرتا تھا مجھ سے علیٰحدہ تھی۔ گھر والے الگ تنگ کرتے تھے کہ میں کسی حیدرآبادن سے شادی کر لوں۔ مگر میں نے اُن پر واضح کر دیا تھا کہ اگر شادی کروں گا تو رورا سے ورنہ ایسے ہی زندگی گزار دوں گا۔ انہوں نے مجھے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک بنگالن سے شادی کر کے کبھی خوش نہ رہ سکونگا۔ بنگال تو خیر سے ہندوستان کا ایک حصّہ ہے اگر رورا چینی یا حبشی قوم کی بھی ہوتی تب بھی میں اُسی سے شادی کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا عشق کے ہاتھوں مجبور تھا۔

اِسی جھنجھٹ میں دو سال گزر گئے۔ رورا پہلے تو مجھے برابر خط لکھتی رہی۔ مگر رفتہ رفتہ جب بنگال کے ایک امیر نوجوان نے رورا کے کانوں میں میرے غیر بنگالی ہونے کا راگ متواتر ڈالنا شروع کیا تو رورا نے مجھکو باقاعدہ خط لکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اور آخرکار اپنے گھر والوں کے طعن و تشنیع اور میرے خلاف زہر اُگلنے سے رورا کی محبت بھی صوبجاتی سد سکندری سے سر پھوڑ پھوڑ کر مر گئی۔ اُس نے مجھے اپنے آخری خط میں مطلع کر دیا کہ آئندہ میں اُسکو خط نہ لکھا کروں کیونکہ اُس کی سگائی اُسی بنگالی نوجوان سے ہو گئی تھی . . . .

وقت اور رورا کی بیوفائی میری محبت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ میری محبت اُس کے لئے اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی اور عدم تک رہے گی۔

خیر یہ تو جو ہوا سو ہوا مگر آپ نے دیکھا تقدیر کا زبردست ہاتھ؟ اگر اُس دن بارش نہ ہوتی تو میں ٹینس کھیلنے جاتا یعنی یہ کرتے نہ جاتا۔ اگر راستے کے پتھر سے میرے ٹھوکر نہ لگتی تو مجھے گرے ہوئے پھول نہ نظر آتے اگر گرے ہوئے پھول نہ نظر آتے تو روزا سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ اور اگر ملاقات نہ ہوتی تو میں اُس کے دامِ محبت میں گرفتار نہ ہوتا۔ یہ قسمت ہی تھی جو مجھے روزا کے پاس کھینچ لے گئی۔ قسمت نے مجھے کلکتہ نہ رہنے دیا۔ نہ میں اس طرح کلکتے سے آتا۔ نہ جُدائی کے صدمے سہتا اور نہ اس طرح خود روزا کے اپنے قلم سے اُس کی بیوفائی اور اپنی بدقسمتی کا اعلان سنتا"

سامنے کی نشست پر وہ صاحب میری داستان بغور سُن رہے تھے۔ میں نے اُن کو سگرٹ پیش کرتے ہوئے پوچھا "کیوں صاحب کیا خیال ہے؟۔۔"

کہنے لگے "تمہارا روزا کو بنگالن جانتے ہوئے محبت کرنا ہی بیوقوفی تھی۔ نہ تم محبت کرتے نہ جُدائی کے صدمے سہتے نہ عورت کی بیوفائی کا تجربہ کرتے"

میں نے چیں بجبیں ہو کر کہا "محبت میں گرفتار ہو جانا میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ کیا آپ کو حضرت غالب کا مشہور قول یاد نہیں ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

خیر یہ تو میری تباہ شدہ زندگی کا پہلا باب تھا۔ باقیماندہ سرگزشت میں قسمت نے اور بھی زیادتیاں مجھ پر کی ہیں۔ اُن کی تفصیل بھی سُن لیجئے۔۔۔"

وہ کھانسے اور بے پروائی سے تھوک کر کہنے لگے "میں ہمہ تن گوش ہوں"

میں نے پھر کہنا شروع کیا "ناکام محبت کا تلخ تجربہ اُٹھا کر اور عورت کی بیوفائی کے صدمہ کے زیرِ اثر میں اپنی تباہ حال زندگی کے دن اس طرح گزار رہا تھا جس طرح کاغذ کی ناؤ کسی دریا میں بہی جا رہی ہو۔ اسی دوران میں میری اماں جان رحلت کر گئیں۔ کچھ عرصے بعد بڑے بھائی صاحب بھی جو کہ ہمارے خاندان کے سب سے زیادہ بارسوخ اور ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھے ہمیں خیرباد کہکر چل دئے۔ اب گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ میرے سر پر آن پڑا۔ بمشکل ہم لوگ گزارہ کر رہے تھے کہ قسمت نے میری زندگی پر ایک اور وار کیا اور میری ملازمت بھی چھن گئی۔ یہ قصہ بھی عجیب ہے۔ ایک سال ہوا میرے ایک قریبی رشتہ دار بیمار ہو گئے اور مجھ کو چھٹی لیکر اُن کی تیمارداری کے لئے جانا پڑا۔ تیمارداری میں صرف تین دن صرف ہوئے۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں میرے ایک دوست کی شادی ہونے والی تھی اور میں اُن کے مجبور کرنے پر اُن کی برات کے ساتھ گیا۔ شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ دونوں طرف سے فضولیات پر زر لٹایا گیا۔ براتیوں نے خوب جشن منائے۔ شادی کے بعد میں واپس آگیا اور اپنی ملازمت کا کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اُس شادی کے چھ ماہ بعد میرے محکمہ کے افسر نے مجھ کو جھوٹی وجہ بتلا کر چھٹی لینے کے لئے بہت بُرا بھلا کہا اور آئندہ سے مجھ پر اعتماد نہ کرنیکا بھی اعلان کر دیا۔ ایسی حالت میں میں نے اپنے خانگی حالات سے واقف ہوتے ہوئے بھی استعفیٰ دیدیا اور اس وقت سے اب تک بیکار ہوں۔ نوکری سے اس طرح علیحدہ ہو جانے میں قسمت کی کارروائی یہ تھی کہ اسی شادی میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہو گئی تھی۔ وہ صاحب بالغوں کی تعلیم کے ایک جلسے میں شریک ہوئے۔ ہمارے محکمہ کے ایک حضرت بھی اسی جلسے میں گئے اور قسمت دیکھئے کہ یہ دونوں اس جلسہ میں ساتھ ساتھ بیٹھے۔ باتوں باتوں میں میرے محکمہ والے صاحب نے اپنا حسب نسب اُنکو بتلایا۔ اس پر اُنہوں نے میرے متعلق پوچھا اور مجھ سے اس شادی میں ملاقات کرنے کا بھی ذکر کر دیا۔ اس طرح میرے اُس شادی میں شریک ہونے کا حال میرے افسر کے کان تک پہونچا۔ یہ قسمت نہیں تو کیا ہے۔۔۔ میرا شادی میں شریک ہونا۔ اُن صاحب سے ملاقات ہو جانا۔ اُن کا بالغان کی تعلیم کے جلسہ میں شریک ہونا اور وہاں ہمارے محکمہ کے ایک صاحب کے ساتھ ہی بیٹھنا اور اُن سے میرا شادی میں فلاں فلاں دن شریک ہونے کا حال بتلانا۔۔۔ بدقسمتی کے سوا اسے اور کیا کہا جائے"

میرے ہمسفر کی آنکھوں میں نیند ناچ رہی تھی۔ اُنہوں نے صرف اتنا کہا کہ تیمارداری کا فرض ادا کرنیکے بعد مجھے فوراً واپس آجانا چاہیئے تھا یہ کہکر اور شکریہ ادا کر کے وہ بہت جلد سو گئے اور جب میں دانت صاف کر کے لیٹا تو وہ اطمینان سے خراٹے لے رہے تھے۔

گاڑی صبح آٹھ بجے دہلی اسٹیشن پر پہونچ گئی۔ میں ساری رات نہ سو سکا۔ کیونکہ میرے کرمفرما متواتر خراٹے لیتے رہے تھے۔ دہلی اسٹیشن پر میں نے اُنکی شخصیت سے نجات پائی۔ ایک دوست کے گھر گیا وہاں نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہنکر جائے مقررہ پر انٹرویو کیلئے وقت پر پہونچ گیا۔ عین ساڑھے گیارہ بجے مجھے چپڑاسی اندر لے گیا۔ جونہی میں انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔۔۔ سامنے ایک نہایت خوبصورت میز کے پیچھے وہی رات کے ہمسفر، انسان نما درندے کی غلیظ شخصیت کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔

آدھ منٹ کے انٹرویو کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ ●

ساس

سورج کچھ ایسے زاویہ پر پہونچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی گرمی اور روشنی پہونچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دُھوپ کے رُخ سے گھسیٹی اور ئے لو وہ پھر پیروں پہ دُھوپ۔ اور جو ذرا اُونگھنے کی کوشش کی تو دھمادھم اور ٹھٹوں کی آواز چھت پہ سے آئی۔

"خدا غارت کرے بیاروں پیٹی کو" ساس نے بیچیا بہو کو کوسا جو محلّے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اُڑا رہی تھی۔

"دُنیا میں ایسی بہو میں ہوں تو کوئی کاہے کو جیئے۔ لے لو وہ پہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر ذرا ذرا سے چھوکروں اور چھوکریوں کا دل آن پہونچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔

"بہو۔۔۔ق۔۔۔" بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا "اری او۔۔۔بہو!"

"جی آئی" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا۔ اور پھر وہی دھمادھم۔ دھمادھم۔ جیسے کھ پڑی پر بھوت ناچ رہے ہیں۔

"ارے تو آ چک خدا سمجھے تجھ سے" اور دَھم دَھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اُتری اور اُس کے پیچھے کتّوں کی ٹولی۔ ننگے، آدھ ننگے، چیچک مُنہ داغ، ناکیں سُڑسُڑاتے کوئی پون درجن بچّے، کِھی کِھی کِھی کِھی۔ کھُوں کھُوں، سب کے سب کھنبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی یا تو ان حرامی پلّوں کو موت دے یا میری مٹّی عزیز کرلے۔ نہ جانے اُٹھائی گیرے کہاں سے مرنے کو آجاتے ہیں ــــ چھوڑ دئے ہیں جن جن کے ہماری چھاتی پہ مُونگ دلنے کو ــــ" اور نہ جانے کیا کیا۔ پر بچّے مُسکرا مُسکرا کر ایک دوسرے کو گھُونسے دکھاتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے ــ جو"

"واہ تم تو مر گئی تھیں" بہو نے بشریا کے کہنی کا ٹہوکا دیکر کہا۔

بڑھیا جُملے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اُٹھی۔

"جھاڑو پھیروں تیری صورت پہ۔ مریں تیرے ہوتے سوتے، تیرے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"واں ہم تمہیں کب کہہ رہے تھے" بہو نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

مگر بڑھیا کوسے گئی۔ اور بچّوں کو تو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بچارے کو مُنہ چڑا بھاگتے ہی بنی۔ اور بہو پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"دُنیا جہان میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ گُدگُڑے لگاتی ہوں گی؟ دن ہے تو لونڈھیار رات ہے تو۔۔۔۔۔۔"

ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

"غُن غُن۔ غُن غُن" بہو منمنائی۔ اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے سے تنکے نکال نکال کر ڈالنے لگی "ٹیں ٹیں" طوطا چنگھاڑا۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے" ساس غُرّائی۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں" بہو نے جواب دیا۔

"تیری بلا سے۔ نہیں بولتا ــــ تیرے باپ کا کھاتا ہے ــــ" ساس نے پہلو بدل کر کہا۔

"ہم تو اِسے بلائیں گے" بہو نے اٹھلا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کونچ کر کہا۔

"آئیں ــــ آئیں ــــ اے میں کہتی ہوں تیرا اچّھا ہی گھُل گیا ہے۔ اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگا دُوں" بڑھیا نے دھمکی آمیز پہلو بدل کر کہا۔ اور جب بہو نے اور سُلگایا تو کھڑاؤں کی شکل کی جوتی اُٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ گھڑونچی کے نیچے سوتے ہوتے کتّے کے لگی جو بلبلا کر بھاگا اور بہو کھِل کھِل کر کے ہنسنے لگی۔ بڑھیا نے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کی آڑ میں۔

"آنے دے اصغر کے بچّے کو ــــ"

"بچّے۔۔۔۔" بہو کو بچّے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی۔

"تھُو ہے تیرے جنم پہ۔ اَے اور کیا۔ بچّہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آتی۔ جس دن سے قدم دھرا گھر کا گھورا ہو گیا"

بہو اور مُسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھکول ڈالا۔

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آگئی ہے"

"تو یہ بولتا کیوں نہیں ــــ ہم تو اِسے بلائیں گے"

بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی "یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے دوسری نہ کرلائی ہوں تو نام نہیں ــــ"

دھوپ ڈھل کر گھرونچی پر اور وہاں سے کنڈیلی پر پہونچی۔

ساس بڑبڑاتی رہی "موتے نقفتے بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا — اے واہ واہ قربان جائیے، خولی کپڑے اور ملمع کی بالیاں۔ اور . . . "

"تو ہم کیا کریں" بہو پھوہڑ پنے سے بڑبڑائی۔ اور کھٹولی پر پسر کر لیٹ گئی۔

"اور وہ المونیم کے . . . ." جمائی لیکر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھکر ذرا ٹانگیں پھیلا کر کہا — اور پھر سونے سے پہلے وہ سمدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں، پھیکے زردے اور گھُنے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی۔ مگر بیچاری بہو آدھی کھٹولی پر اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی۔

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل بھی گئی۔

اصغر نے چھتری کو کھمبے سے لگا کر کھڑا کیا اور کتھئی بچھائے والی نیلی واسکٹ کو اُتار کر کرتے سے پسینے کے آبشار پوچھتے ہوئے والان میں قدم رکھا۔ پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچّے کی طرح روٹھکر سوئی ہوئی بڑھیا پر نظر ڈالی اور پھر بہو پر۔ آموں اور خربوزوں کی پوٹلی کو زمین پر رکھکر کچھ دیر سر کھجایا اور جھک کر بہو کی بانہہ بھینچ دی۔

"اوں —" بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی۔ اور اُس کا ہاتھ جھٹک مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اُٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا کوٹھری میں چلا گیا۔ بہو نے ہوشیار بلّی کی طرح سر اُچکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ کڑھیڑتی جھپاک سے کوٹھری میں۔

لو رُک گئی — پسینے کے شرّاٹے چل نکلے۔ مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے منہ کا مزہ بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں۔ دو چار نے باچھوں میں بہی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا۔ دو چار آنکھوں کے کوئے میں تندھی سے ہم گھسنے لگیں۔ چھ سات ناک میں گدگدیاں کرنے لگیں . . . . کوٹھری میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری سُریلی سی چہچہاہٹ "اوں — اوں" سُنائی دیتی رہی ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکوں اور آموں کو چھوڑنے کی چپڑ چپڑ سکون کو توڑتی رہی۔

مکھیوں کی چُھلوں سے دُکھی ہو کر آخر بڑھیا پھڑپھڑا ہی اُٹھی۔ یہ مکھی فات جی کے ساتھ لگی تھی — پیدا ہوتے ہی گھُٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں — اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اُسکی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا — پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا اور نو سندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اُسے اُس کے جسم کے کونسے مخصوص حصّے سے اُنس ہے تو وہ ضرور وہ حصّہ کاٹ کر مکھی کو دیدیتی۔ مگر وہ تو ہر حصّہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اُسی خاص کٹکھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی چتکبرے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا چھپاکا مارتی — مکھی تمن تمن کرکے رہ گئی — آہ معبود! اُسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار سکے — لنگڑا ہی کر دے۔ اُس کا بازو مڑوڑ کر مرغی کی طرح گڈّی باندھ کر ڈالدے۔ اور مزے سے پاندان کے ڈھکنے پر رکھکر تڑپتا دیکھے۔ مگر خدا تو شاید اس مکھی سے بھی شیطان کی طرح قول ہار بیٹھا تھا کہ بس ستاتے جائے اُس کی ایک حقیر بندی کو۔ نہ جانے اس میں کیا مزہ آتا ہے مگر اُسے یقین تھا کہ اس دوزخی مکھی کا گریبان — اس مکھی کی فریاد ضرور اس قہّار و جبّار کے حضور میں لیکر جائیگی اور ضرور فرشتے اُسے خُون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے . . . . مگر پھر . . . کیا یہ مونڈی کاٹی مکھیاں بھی جنّت میں جائیں گی! اور ساری جنّتی فضا مکدّر ہو جاتی۔ بڑھیا نے پنکھے کی پتوار بنا کر چھپا چھپ اپنے منہ، ہاتھوں اور سوکھے پیروں کو پیٹ ڈالا۔

"بہو — اے بہو۔ مرگئی کیا" وہ جلکر چلّائی۔

اور بہو تڑپ کر کوٹھری سے نکلی۔ دوپٹہ ندارد، گریبان چاک ہاتھ میں آم کی گٹھلی، جیسے کسی سے کُشتی لڑ رہی ہو — پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔

"ارے بہو — میں کہتی ہوں — ارے دو بوند حلق میں پانی"

اصغر بھی شلوار کے پائنچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن رگڑتا آیا۔

"لو امّاں — کیا خوشبودار آمیاں ہیں" اُس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کر کہا۔ اور کھٹولی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر مکھیوں کی ناانصافی کو بھول گئی، جو اَب آموں کی بونڈیوں کا معائنہ کرنے کیلئے اُسکی باچھوں سے اُتر آئی تھیں۔

"اے بہو چھُری . . . ."

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا

اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں بچا کچھا پانی چھلکا اور بڑھیا غرائی۔

"اندھی میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے" اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ گلاس مع بھاری پیندے کے بہو کے پیر پر۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا اور جلدی تنتناتی۔

"اماں لو پانی" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا۔

"یہ بہو تو بڑی وغ ہوگئی"

"تمہیں دیکھو" بڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دو مار کے حرامزادی کو۔ اماں اب دوسری لائیں یہ تو ـــ" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھکر کہا۔

"اے زبان سنبھال کمینے!" بڑھیا نے آم پلپلا کر کہا۔

"کیوں اماں؟ دیکھو نا کھا کھا کر بھینس ہو رہی ہے" اس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کر کہا اور بہو نے چھری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھری بڑھیا کے گٹے پر پٹخ دی۔ جو تلملا گئی۔

"دیکھتی ہو اماں ـــ اب ماروں چڑیل کو" اور لپک کر اصغر نے دیا دھموکا بہو کی پیٹھ پر۔ اور فرمانبردار بیٹے کی طرح پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"خبردار، لو ـــ اور سنو۔ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی بچے جو تو نے ہاتھ اٹھایا" بڑھیا غنیم کی طرفداری کرنے لگی "کوئی لائی بھگائی ہے .... جو تو ـــ اے میں کہتی ہوں پانی لا دے" اس نے ایکدم پھر بہو پر برسنا شروع کیا۔

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی اور گلاس سے زخمی ہوتے انگوٹھے کو دبا دبا کر اور خون نکالنے لگی۔ بڑھیا مزے سے گٹھلیاں پچوڑا کی۔ اور پھر شکر کا ڈبہ دیتے وقت کچھ ایسا بڑھا کے پاؤں رکھا کہ خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ ہی لیا۔

"اوئی یہ خون کیسا؟" پر بہو روٹھ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی اور خون بہنے دیا۔

"اے میں کہتی ہوں ادھر آ دیکھوں تو خون کیسا ہے؟" بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔

بہو ہلی بھی نہیں۔

"دیکھو تو کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔ اصغر اٹھ تو ذرا اسکے پیر پر ٹھنڈا پانی ڈال" ساس بھی گرگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا" اصغر نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"حرامزادے!" بڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پر۔ اے میں کہتی ہوں یہ گلاس موا سوا سیر کا ہے اس کمینے سے کتنا کہا ہلکا المونیم کا لا دے مگر وہ ایک حرامخور ہے۔ لے اٹھ ذرا" بہو ٹس سے مس نہ ہوئی بلکہ کہنی آگے کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے" اور اصغر سینے پر پتھر رکھکر اٹھا۔

بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے وہ بہو کے گریبان میں دھار ڈال رہا ہے اور بہو اس تاک میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے۔ وہ ایکدم بکھر گئی۔

"خاک پڑے تیری صورت پر!" بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیاں ڈالکر کہا۔ اور اس نے ایک سسکی لیکر جلکر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا اور خود روٹھ کر آم کھانے چلا گیا۔ ماں بیٹے کے لئے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کی ارمان کرنے لگی

"بدذات ٹھہر جا آنے دے اپنے چچا کو وہ کھال ادھڑوائی ہو کہ بس ـــ" بڑھیا نے میلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔

"لے بس اب پلنگ پر لیٹ جا" بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بنا کر کہا۔ اور پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی "لے ہاں ـــ لے اصغر ذرا بہو کو کھٹولی پر پہونچا دے"

"مجھ سے تو نہیں اٹھتی یہ موٹی بھینس کی بھینس" اصغر جلکر بولا۔

"ارے تیرے تو باپ سے اٹھیگی ـــ سنتا ہے کہ اب ـــ"

اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اٹھانے لگی۔

"اماں میں آپ اٹھ جاؤں گی" بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی ـــ میں ـــ" اور اس نے پھر اصغر کی طرف آنکھیں نیلر کر دیکھا گویا کہہ رہی ہو ٹھہر جاؤ میاں دودھ نہ بخشوں اور پہ نہ بخشوں۔

اصغر بھناکر اٹھا اور ایک جھپاکے سے بہو کو اٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف۔ بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اٹھا کر اسی جگہ دانت گاڑ دئیے جہاں ابھی ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔ اور اصغر نے کچکچا کر اسے کھٹولی پر پٹخ دیا اور اسکے سرخ سرخ ہونٹ چٹکی سے مسل دئے۔

بہو ناک چھپا چھپا کر فتحمندانہ طریقہ پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غراتا رہا ـــ ساس وضو کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ بڑبڑا رہی تھی ـــ"

نشاطِ غم

"تعاون ؟"

"ہاں تعاون۔ ہر شے کا تعاون اچھا ہے"

"مثلاً ؟"

"مثلاً محبت و حماقت کا تعاون۔ کمزوری اور اکڑ کا تعاون۔ ضربِ شدید اور ضبط کا تعاون"

"لیکن ذہانت اور افلاس کا تعاون سب سے زیادہ بھیانک ہے۔ تم نے اب تک جتنے تعاون گنے ہیں مذاق کے پیرائے میں گنے ہیں۔ اب ذرا سنجیدگی سے افلاس و ذہانت کے تعاون پر بھی غور کرو۔ تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان میں اکثر گھرانوں کے اندر کیسے کیسے ذہانت کے پھول کھلے ہوتے ہیں لیکن چونکہ اُن کی آبیاری سونے کے پانی سے نہیں ہوتی، وہ افلاس کے اندھیرے میں مرجھا کر رہجاتے ہیں اور ایسے مُرجھاتے ہیں کہ ان کی خاک سے پھر کوئی سرسبز پودا اُگھڑا ہی نہیں ہوتا۔ اِن ذہانت کے نوشگفتہ پھولوں سے مہک آتی ہے مفکری کی۔ صناعی کی، ایجاد و اختراع کی، لیکن ہمارے نصابِ تعلیم کا متعفن پانی ان کی ابتدا ہی میں جڑ مار کر رکھدیتا ہے!"

"اور اس کی ایک مثال تم ہو۔ لیکن بھائی زر کی ہیجانی قوت ہی کے اندر تم تمام کامیوں کے راز کو کیوں مستور کئے دیتے ہو۔ زر کی مثال تم ایسی سمجھو جیسے ایک بازو ئے پرواز۔ جب تک اس بازو سے پر پرواز تعاون کرتے رہیں گے اس میں اڑان کی قوت موجود رہے گی لیکن کبھی اگر صیادِ حوادث کا ایک کاری تیر بھی اسیر پڑ گیا تو وہ سوائے پھڑپھڑانے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہر دولتمند مسرور و مطمئن زندگی کا مالک ہے۔ غلط خیال ہے۔ میرے خیال میں تو فلاکت زدہ مگر ذہین دتوانا شخص کہیں زیادہ قابلِ رشک ہے!"

"میرے متعلق تمہاری رائے بالکل غلط ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ میری حسِ کارکردگی اور حرصِ عمل اس افلاس کے ہاتھوں کیسے خون کے آنسو روتی رہتی ہے۔ نعیم میری زندگی کے ایک ایک تار میں آگ لگ چکی ہے اور تمام کا تمام دامانِ حیات جل کر خاکستر ہو گیا ہے!"

بجھ جائے گی یہ آگ بھی۔ بجھادی جائیگی۔ کسی کے حسین ہاتھ بجھادیں گے اسکو بھی!"

"خدا وہ وقت نہ لائے کہ اس باب میں مجھے کسی کے حسین ہاتھوں کا رہینِ منت ہونا پڑے۔ کیا تم مجھے ٹامس ہارڈی کی ایک مہیب کتاب کا پامال محبت و حوادث ایک کیریکٹر بنا دینا چاہتے ہو؟"

زندگی کی سُبک پائی کی آرزو ــــــ انسان کی تمام بشری نارسائیاں۔ آدمی کے غیر مختارانہ اختیارات ــــــ معاذاللہ یہ کیا الجھنیں ہیں؟ یہ گتھیاں ہیں؟؟ کیا زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا یا جی جی کے مرے جانے کا؟ ہوگا۔ جب تم شاد باید زیستن کا نعرہ بلند کرتے ہو تو ناشاد باید زیستن کے اعلان سے منہ موڑنا مردانگی کے شایانِ شان نہیں۔ پھر ایک تہی دست اور تہی داماں کی زندگی تو جسکو بدقسمتی نے ذکاوت بھی عطا کردی ہو ایک گریۂ طویل کے لئے مقدر ہوچکی ہے اُسکے لئے تو ازل سے طے ہوچکا ہے کہ اپنے ہی خونِ تمنا کے متلاطم دریا میں ڈوبے اور اُبھرے ــــــ اُبھرے اُمید کی چند سانس لینے کے لئے اور پھر ڈوب جائے۔ جب تک سازِ حیات کے ایک ایک تار سے الم و ناکامی، حزن و پژمردگی کا ایک نغمۂ مسلسل جاری نہ ہونے لگے حوادث کی مضراب اسکو چھیڑے چلی جائے گی حتیٰ کہ تمام تار ٹوٹ جائیں گے۔ نوحۂ زندگی ختم ہوجائیگا اور حوادث کی بے رحم دیوی اپنے خون چکاں ہونٹ، کو چاٹتی ہوئی مسکراتی اُٹھ جائیگی۔

اس المناک پس منظر میں تبدیلیاں بھی پیدا ہوتی ہیں مناظر بھی بدلتے ہیں اور بعض دفعہ تو تمام کا تمام نقشہ ایک دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آپ دیدۂ رس دماغ۔ قوی جسم اور خونِ شباب سے بھری رگوں کو لئے زندگی کا ایک تاوانِ خاموش ادا کر رہے ہیں کہ محبت کی فریب کار چڑیل آپ کے جذباتِ برنائی سے کھیلنے کے لئے آنسو پونچھتے مسکراتی ہوئی آ کھڑی ہوتی ہے۔ آپ اس کے اس تلخ تبسم و زہر خند سے مغلوب ہوکر اپنا منتشر نظامِ حیات اس کے سپرد کر دیتے ہیں یعنی زندگی کی گرانباری کو اور بھی

ذہن ہمالیہ میں تبدیل کر لیتے ہیں۔!

شاکر نہایت ہی ذکی الطبع اور صحیح الدماغ نوجوان تھا۔ لیکن وہ بھی دیگر ہونہار نوجوانوں کی طرح زر کی غلط تقسیم کا ایک مستقل شکار بنا ہوا تھا۔ ناسازگار ماحول میں اسکے اُمید دل کے بکھرے ہوئے تخیلات اور منصوبوں پر قدرت اس پر ہنسا کرتی تھی۔ وہ ایک ہزار منصوبے گانٹھتا اور اُن میں سے جب آدھا بھی پورا نہ ہوتا تو اپنی ذات کو آپ فریب دینے کے لئے دوسرا نظام عمل تیار کرتا اور اس کی شکست کے بعد تیسرا، اس طرح کئی سال سے یہ سلسلہ لا متناہی چلا جا رہا ہے۔ ایک پہاڑی کی ناہموار چوٹی اس کی گویا "دار التجارب" تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا گھنٹوں اپنی زندگی کا ایک عنوان قائم کرنے کے لئے مختلف تجاویز پر غور کیا کرتا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں ایک مختصر سا تالاب تھا جس کے متعفن پانی کی بُو پہاڑی پر اس کی شامہ نوازی کیا کرتی تھی۔

اِس خاموش فضا میں بیٹھکر اُسنے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی تھی۔ یہیں بیٹھکر اس نے اثر میں ڈوبے ہوئے افسانے لکھے تھے۔ اسی پہاڑی کی کھردری چٹانوں پر بیٹھکر اس نے اپنی صاف سادہ اور موثر نظمیں لکھی تھیں اور اسی بھیانک ماحول میں اس نے ایسی حقیقت رینہ تصاویر تیار کی تھیں جو دنیا کا عنوانِ زندگی بدل ڈال سکتی تھیں۔ اس پہاڑی کا ایک ایک سیاہ کونہ ایک ایک اژدہا پیکر چٹان اور ایک ایک ناہموار پہاڑی اس کی زندگی کی صحیح آواز تھی۔ تمام بلند وہ سنگ و گِل ناہمواری، وزن اور نشیب و فراز دنیا میں اپنی حیات کی تعبیر تھی!

اس طرح پہاڑی اس سے وہ پہاڑی سے مدتوں مطابقت کرتے رہے یعنی نعیم کے الفاظ میں "تعاون" کرتے رہے۔ شاکر اکثر اپنے ناتمام افسانے، نظمیں اور تصاویر وہیں پہاڑی پر کسی پتھر کے نیچے دبا آیا کرتا تھا تاکہ ان کو بعد میں جاکر مکمل کرے۔ ان نامکمل اشیا میں اُسکا ایک مکمل افسانہ بھی تھا جس کا اُسنے ابھی عنوان بھی قائم نہیں کیا۔ دوسرے روز سب سے پہلے اُسنے اُسی کو اُٹھایا تاکہ عنوان سوچ سکے۔ لیکن اس پر پہلے ہی سے عنوان موجود تھا۔ ایک مکمل و موزوں عنوان! اسکو بڑی ہی حیرت ہوئی۔ کوئی بات آج تک اس کی توقع کے مطابق پوری نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ خلافِ توقع واقعہ کیسے ظہور میں آیا ہو سکتا ہے کہ اس نے بے خیالی میں اس افسانہ کا عنوان قائم کر دیا ہو۔ مگر اتنا مکمل اسقدر اچھا!

شاکر نے حیران ہوکر ایکبار پھر اس عنوان کو پڑھا اور اس پر غور کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں فقط یہ آیا کہ یہ عنوان اُسنے خود نے شاید حالتِ غیر شعوری میں لکھ دیا ہوگا مگر مزید غور کے بعد پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس قسم کے عنوان کا مفہوم تو شاید کبھی اس کے ذہن میں آیا ہی نہ تھا۔ اسکا ہر حرف اس کی قوتِ فکریہ کے لئے اجنبی اور ایک علیحدہ سا حرف تھا۔ دیوانگی کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ انسان مسابقت کے میدان میں پچھڑ کر کبھی خودکشی کر لیتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو پھونک تماشا دیکھنے لگتا ہے۔ چنانچہ شاکر نے بھی دیا سلائی نکالی اور اپنے افسانے کو آگ لگا کر اضطراری اطمینان کے ساتھ شعلوں کو دیکھنے لگا۔ کاغذ کی بُو، دھوئیں کے گندے چھلّے اور شعلوں کی زبان کوتاہ چند منٹ کے لئے فضا میں رونما ہوکر ہمیشہ کیلئے غائب ہو گئی!

واقعات کے اس نئے مذاق سے گھبرا نہ ہوکر شاکر نے تدریجاً نشیب میں پتھر لڑھکانے شروع کئے اور لگا کر وہ اپنے کو فریبِ سکون میں مبتلا کرنے لگا۔ ناگاہ تقریباً تیس فٹ کے ایک نشیب میں اس کی نظر پہنچی۔ اُس نشیب میں ممبر نما بڑا سا پتھر تھا جسکو یا تو گوالیوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے کہیں سے لا ڈالا تھا یا قدرت کے بھدے ہاتھوں نے اسکو تراش کر وہاں ڈال دیا تھا۔ آج اس [illegible] پتھر پر ایک گہرے رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ نہیں ایک انسانی قد اس پر اس طرح جھکا ہوا تھا گویا عالمِ اسفل کی کوئی بے چین روح خدا کے قدم چومنے کی کوشش میں سفلی موانعات میں پھنس کر رہ گئی ہو۔

شاکر اپنی دیوانگی کو بھول کر حیرت سے ادھر دیکھنے لگا۔ آہستہ سے اپنی جگہ سے کھسکا اور جلد جلد او گھٹ راستہ طے کر کے اس سنگ پیچاں انسان تک پہنچا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُسنے دیکھا کہ اس انسان کے لانبے لانبے سیاہ بال پتھر پر منتشر ہیں۔ بھری بھری سفید باہیں گول کنڈلی کی شکل میں پتھر پر رکھی ہوئی ہیں اور انکے درمیان اسکا چہرہ چھپا ہوا ہے۔ شاکر چند سیکنڈ تک اسکو دیکھتا رہا۔ پھر زور سے کھانسا۔ باہیں دفعتاً سیدھے ہوئے اور اُن کے درمیان سے ایک عورت کا جوان

عورت کا اشک آلودہ چہرہ نمودار ہوا جسکے ایک ایک خط پر انتقامِ حیات کے نقوش نظر آرہے تھے۔ یہ غیر دلچسپ پہاڑی جس کو آج تک کسی انسان نے تفریح یا حصولِ سکون کا ذریعہ نہ بنایا ہوگا آج ایک مغموم عورت کے الم رسیدہ دل کی دھڑکن سُن رہی تھی۔ شاکر نے اس کی اس حالت پر زیادہ اظہارِ حیرت نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں اس سے بھی زیادہ زندگی کے سوگ کے تماشے دیکھ چکی تھیں۔ اور نہ عورت زیادہ متعجب نظر آتی تھی کیونکہ اسکو بھی معلوم تھا کہ میدانِ حیات کا ہارا ہوا کوئی انسان یہاں آکر کبھی جیون کے دھوکوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ——"

"اس غلطی کی بنا پر ہی میں آپکو انسان سمجھنے پر مجبور ہوئی ورنہ خدا جانے میں آپکو کیا خیال کر لیتی۔ کہیے عنوان کیسا رہا؟" یہ اس نے اس طرح کہا گویا وہ اپنی پچھلی تقریر سے اسکو مربوط کر رہی ہے۔

"عنوان و معنون دونوں آتشیں پریس کے نذر کر دئے گئے ہیں۔" اتنے میں پہاڑی کے دامن سے کسی گڈریے کے الاپنے کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی تالاب کے کنارے سے سارس کی رسیلی قین قین بلند ہوئی۔

"دُنیا اتنی بُری جگہ تو معلوم نہیں ہوتی جتنی میں اُسکو سمجھتی ہوں۔ بارے یہاں ایک نہ ایک تو خوش ہے۔"

"مگر اشک ریز آنکھوں کے ساتھ یہ الفاظ کچھ مطابقت نہیں کرتے ہیں۔ پہلے آنسو صاف کر ڈالئے اس کے بعد زندگی کی دیوی کی تعریف کیجئے۔"

"میں نے شاید اپنی گفتگو کی ابتدا ہی غلط کی۔ آپ شاید مجھے اب تک غول بیابانی میں سے سمجھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ میں بھی آپکی طرح ایک انسان ہوں۔"

"اگر آپ بھی مجھ جیسی انسان ہیں تو آپکو یوں علیحدہ خود غرضانہ طور پر آنسو بہانے کا حق نہیں۔ میری شریک گریہ ہوکر نوحۂ زندگی میں میرا ساتھ دیدیجئے۔"

"اچھا تو آپ بھی زمانہ کے ہاتھوں تنگ ہیں؟" اُسکے جوان چہرے پر ایک پژمردہ سی مسرت پیدا ہوئی اور مٹ گئی۔

"ہم اب تک بڑی غیر دلچسپ گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ بات چیت تو ایسی معلوم ہوتی ہے گویا ہم کسی کتاب میں سے سبق پڑھ رہے ہیں۔" عورت ہی نے پہلے پراگندگی میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ حق اس کو پہنچتا ہے۔"

"آپکے متعلق میں زیادہ معلوم کرنا نہیں چاہتی۔ اتنا سمجھتی ہوں کہ آپ لکھے پڑھے آدمی ہیں۔ صاحب قلم بھی ہیں اور غالباً مصور بھی۔ اور آپکے ہر شعبہ کو تشنۂ تکمیل دیکھکر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپکے راستہ میں ایسی روکاٹیں ہیں جنکو آپ ہٹانے سے قاصر ہیں اور دوسرے لوگ ہٹانے سے بےخبر۔ لیکن اسکے باوجود آپکی زندگی قابلِ رشک ہے۔"

"میری زندگی قابلِ رشک؟ میری؟ جو پیسے پیسے کو محتاج ہے۔"

"اچھا؟ تو گویا آپ غربت کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ خوب۔ اور میں ثروت کے ہاتھوں گریاں ہوں۔ اُفوہ! یہ دُنیا بھی کسقدر مجموعۂ اضداد ہے۔"

"اچھا یہ بتائیے کہ اس پتھر کو کب سے آپسے شرفِ ہمکناری حاصل ہے؟"

"ہمکناری؟ کیسا لطیف لفظ ہے مگر کسقدر تحت خیز ہے ——— اچھا آپ نے مجھے اس حالت میں دیکھکر کیا رائے قائم کی؟"

"یہی کہ پریوں کے قصے غلط نہیں ہیں۔"

"آپ شاید اب منتظر ہونگے کہ میں ان ستائش کے الفاظ پر آپکا شکریہ ادا کرونگی۔"

جی نہیں۔ اچھا اب ہم چلدیئے۔ ہمارے شوہر نامدار منتظر ہوں گے۔" اس عورت کے رویہ میں دفعتہً حیرت انگیز تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسکی شکار تنہائی روح کو عرصہ سے کوئی دلچسپ مخاطب نہیں ملا تھا۔ لیکن یہ بات تو صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ آخر اسکا شوہر بھی تو موجود تھا۔ کیا شوہر کا وجود اس بات کی صریح دلیل ہے کہ عورت اس میں دلچسپی لیتی رہتی ہے۔ شوہر کی بھی تو صد ہا قسمیں ہیں۔

"پھر اب کب ملاقات ہوگی؟" جب وہ جانے لگی تو شاکر نے پوچھا۔

"کیا خبر"۔

"لیکن میں اب آپکو اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرونگا جس حالت میں چند منٹ پیشتر دیکھ چکا ہوں۔ کیا آپ یہاں اکثر آتی رہتی ہیں؟"

"کبھی کبھی آجاتی ہوں۔ جی گھبرانے پر۔"

"جی کیوں گھبراتا ہے؟"

"سب کچھ آج ہی نہ دریافت کر ڈالئے۔ اچھا خدا حافظ" اس نے شاکر پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی پہاڑی پر سے اُتر گئی۔

شاکر کئی منٹ تک وہاں کھڑا رہا۔ زندگی کے رواں واقعات میں کبھی کوئی نیا واقعہ رونما ہوجاتا ہے وہ ہماری توجہ کا کسقدر مستحق بنجاتا ہے۔ شاکر کی حیاتِ گریز پا گذر رہی تھی گذرے جا رہی تھی، کانٹوں میں الجھتی ہوئی، پہاڑوں سے سر ٹکراتی ہوئی گڑھوں میں پھسلتی ہوئی۔ اس کے باوجود اُمید کا آفتاب رہبری کر رہا تھا۔ اُسکو آس تھی کہ وہ ہمیشہ اس حال میں نہیں رہے گا۔ بدقسمتی کو اس پر ضرور کبھی رحم آئیگا۔ اس وقت وہ تمام مایوسانہ خیالات سے خالی تھا۔ صرف ایک خیال اُسکو آرہا تھا۔ یہ چلی جانیوالی کون تھی؟

شاکر اب پہاڑی پر آتا تو سب سے پہلے اس ممبر نما پتھر کی طرف نظر دوڑاتا جس پر وہ لڑکی یا عورت اس روز حزنِ رقیق کے نشانات چھوڑ گئی تھی۔ اُس نے کئی دن سے مضمون کی سطر بھی نہیں لکھی تھی، نظم کا ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں کیا تھا۔ دوستوں سے ایک سکنڈ کے لئے بھی نہیں ملا تھا اور اپنے مستقبل کا ایک خوابِ سُبک بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسکو اپنا تمام ماحول متموج معلوم ہو رہا تھا، سارے ارادے متزلزل نظر آرہے تھے اور تمام اسباب منتشر دکھائی دے رہے تھے۔ پھر بھی وہ طبیعت پر یاس کی گرانی کی بجائے سرور و کیف کی ایک موجِ لطیف محسوس کر رہا تھا۔

دو تین دن تک وہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے پہاڑی پر نہ جا سکا۔ اس عرصہ میں اُسنے عجیب و غریب قسم کے خواب دیکھے۔ خود اُن کی تعبیریں لیں اور خفیف سا ہوکر چُپ ہوگیا۔ ابھی وہ تمام تر صحت یاب نہیں ہوا تھا کہ ایک روز جی جو گھبرایا تو ذرا جلدی ہی افتاں و خیزاں پہاڑی پر آپہنچا۔

چوٹیوں پر آفتاب کی پوری شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ تمام پتھر گرم تھے اور خنکی جھاڑیوں کی مرجھائی ہوئی ٹہنیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ممبر نما پتھر آج بھی خالی تھا ہاں اس کی نشست کی چٹان پر کوئی آنچ دراز تھا۔ شاکر اشتیاق سے جلد جلد چڑھائی طے کرتا ہوا اُوپر پہنچا۔ وہی ہستی جو نامعلوم طریقہ سے اس کے تخیل پر چھا گئی تھی وہاں موجود تھی۔

"ہم تین چار دن سے یہاں آرہے ہیں لیکن آپکا پتہ ہی نہیں ہے" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُسکے تبسم میں پھر ایک افسردگی سی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں۔ کچھ جی خراب تھا" اُسنے ایک بھدے سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر آج کیسے نازل ہوگئے؟"

"وہی جی گھبرانے کا قصّہ۔ یہ جی کے گھبرانے کی ہے تو اچھی بیماری۔ اس روز آپکا جی گھبرایا تھا تو مجھ سے آپ کی ملاقات ہوگئی تھی۔ آج میری طبیعت بیقرار ہوئی تو آپ سے ملاقات ہوگئی"۔

"بیقرار؟ آپ اپنی گفتگو میں بہت غیر محتاط معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میں آپکے کسی لفظ کا بُرا نہیں مان سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ سے آزادی سے بات چیت کرسکتی ہوں میں نے آپ کے جسم کے اندر ایک بے تکلف؟ ہمدرد روح کا اندازہ لگایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا اندازہ غلط بھی ہو"

"ہماری روحیں کچھ ایک دوسرے سے آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے بھی آپکی روح پر ایک مستقل اُداسی سی چھائی نظر آتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں آپکی کچھ مدد کرسکوں اُکسی باب میں اپنے کو کچھ مفید ثابت کرسکوں؟"

"نہیں۔ آپ کچھ نہیں کرسکتے۔ ایسی عورت کے لئے کچھ نہیں کرسکتے جس نے دانستہ اپنا مستقبل ایک دیوانہ کے ہاتھ بیچ دیا ہو۔ جب آپ نے اس ساز کو چھیڑ دیا ہے تو میں آپکو اسکی آخری تان تک سُنا دینے سے کیوں شرماؤں۔ میرے والدین بہت غریب تھے اور مجھے پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ میری عمر سولہ سال کی ہوگی جب میں میٹرک میں پڑھتی تھی۔ والدین کا سرمایہ جواب دے چکا تھا۔ اسوجہ سے میں نے ایک پینتالیس سالہ دولتمند آدمی سے شادی کرلی یعنی شباب کی مسرتوں کو تعلیم پر

قربان کر دیا۔ شروع میں تو اس شخص کی صحت زیادہ خراب نہ تھی۔ لیکن کثرت شراب نوشی نے اسکو سو سال کا بڈھا بنا دیا اور ایسا ہی اس کا مزاج ہو گیا۔ خدا خدا کر کے میں دو سال ہوئے بی۔ اے پاس کر سکی۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ ابتدائی تعلیم کے بعد ہی اگر میں اپنے کو کسی نیک مرد کے سپرد کر دیتی تو مجھے اتنی گراں قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی جتنی میں نے ڈگری کی حرص میں ادا کی ہے۔ اب میرا شوہر انسانیت کا ایک بگڑا ہوا خاکہ ہے۔ وہ دائم الخمر ہے اسکو نہ اخلاق کی پروا ہے نہ اپنے فرائض کی۔ نہ اپنا نہ کی قدر ہے نہ محبت کی۔ حالت نشہ میں تقریباً روزانہ مجھے پیٹتا رہتا ہے۔ اس کی لاتعداد دولت کی بیشک میں مالک ہوں اور وہ مجھے نان و نفقہ سے بھی محتاج نہیں رکھتا۔ لیکن انسان، بالخصوص عورت محض غذا کی بھوکی نہیں ہوتی ہے جس شے سے اس کی زندگی قائم ہے وہ محبت ہے اور میں اس سے قطعاً محروم ہوں۔

اگرچہ ہم عیسائیوں میں بھی طلاق جائز ہے لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہیں۔ اس گلو خلاصی کے بعد بھی کوئی میری مردہ مسرت کو زندہ نہیں کر سکتا۔ میں نے زندگی کے ہر شعبہ کو ویران کر لیا ہے موٹریں، نفیس ملبوسات، خوش مذاق لوگوں کی سوسائیٹیاں وغیرہ ہر وقت بھوت کی طرح میرا تعاقب کیا کرتی ہیں مگر مجھے صرف اس پہاڑی کے تنہا گوشہ میں سکون ملتا ہے۔ بنگلہ بہت خوشنما ہے مگر اسکا ماحول اور فضا جہنم سے کم نہیں۔ میں اُن غریب مزدور عورتوں پر رشک کرتی ہوں جو روز کمر پر اپنے گندے بچوں کے پشتارے باندھے ہوئے گاتی ہوئی ہمارے بنگلے کے سامنے سے نکلا کرتی ہیں۔ دنیا میں روٹی ہی کا سوال ایک اہم سوال نہیں ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہی لٹریچر کا ایک مستقل عنوان نہیں ہے بلکہ اسباب، انسانی خواہشات، عام ہمدردی، اخلاقیات اور عام بنی نوع انسان کی روزانہ کی ضرورت اور زندگی کی اہم کمیاں یہ ہونا چاہیئے ہمارے ادب کا موضوع۔ آپ لوگوں نے مزدور کو (بغیر سرمایہ دار کو لتاڑے) خواب گراں سے بیدار کر کے اس کی قانع زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔ جب آرٹ کے لئے آپکے پاس اچھے اوزار نہیں ہیں تو آپ محض مواد بگاڑ کر کیوں چھوڑ دیتے ہیں ــــــــ اُفوہ معاف کیجئے میں کہاں پہنچ گئی۔ اس موضوع پر تو پھر کبھی تفصیل سے گفتگو کرونگی۔ اچھا تو آپ نے سُن لی نہ میری داستان غم؟"

سُن لی اور بہت عبرت حاصل کی۔ میں سمجھتا تھا کہ قلت سرمایہ ہی ایک مصیبت مستقل ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی گتھیوں کا حل کسی اور ہی شے میں ہے۔ بلندی اخلاق و باہمی ہمدردی، سردست تو میں ان دو چیزوں کو تسہیل حیات کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ خیر چھوڑ ئے اس خارج از بحث بات کو۔ اب یہ بتایئے کہ میں کس طرح آپکی مدد کر سکتا ہوں۔"

" واہ ڈاکٹر صاحب آپ تو مریض سے پوچھتے ہیں کہ تجھے کیا دوا پلاؤں۔ جائے دُنیا میں اور ایسے بہت سے جرائم ہو رہے ہیں اُن کا انسداد کیجئے۔ میں تو مر چکی۔"

" لیکن میں تو آپکو کبھی نہیں مرنے دونگا۔ اگر اجازت ہو تو میں کل آپکے بنگلے پر حاضر ہوں۔"

" آپکی مرضی۔ لیکن میرا شوہر اگر آپکے ساتھ درشتی سے پیش آئے تو اُس کی ذمہ دار میں نہیں۔ کیونکہ وہ جانور ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آکر کیا کیجئے گا؟"

" میں خود بھی اسکا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آپکی مصیبت سے دلچسپی سی ہے۔ میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ ہم دونوں دو مختلف وجوہات کے ساتھ بارادۂ خودکشی دریا میں کود پڑے تھے۔ لیکن موت کو توقع سے زیادہ بھیانک پا کر دونوں ایک تختہ سے چمٹے ہوئے ہیں تا کہ کسی طرح گرداب فنا سے بچ جائیں۔"

" آپ کا خیال ایک حد تک درست ہے۔ آپکی پہلی ملاقات کے دن سے میں بھی موت کا انتظار کچھ زیادہ اشتیاق سے نہیں کیا کرتی ہوں۔ لیکن جو تختہ ہم نے اپنی حیات کے سہارے کو پکڑا ہے کہیں وہی ہماری موت کا باعث نہ بن جائے۔"

" دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہم بچ بھی سکتے ہیں اور ڈوب بھی سکتے ہیں۔"

" اچھا اب میں جاتی ہوں۔ کافی وقت ہو گیا۔ آپ پرسوں شام کو آئیں۔" یہ کہہ کر وہ جلدی اور شاکر پھر کہنا بھول گیا کہ اُسکے چلے جانیکے بعد اسکی کیا حالت ہو جاتی ہے۔

تیسرے دن شاکر آخر بنگلے پر پہنچا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ایلس کے شوہر سے اپنے آنے کی کیا وجہ بتائیگا۔ اسی خیال میں تھا کہ اُس کی نظر ایلس پر پڑ گئی جو گملوں میں پانی دے رہی تھی۔

ایلس نے بھی اُسکو دیکھا اور ویسے ہی پانی کا برتن لئے مسکراتی ہوئی احاطہ کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"کہیئے کیسا مزاج ہے؟"

"مزاج آج ٹھیک نہیں ہے۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا گملوں کو پانی دیتے ہوئے۔ تھک گئی۔"

"کیا آپکے پاس مالی نہیں ہے؟"

"ہے تو لیکن اُسکو دوسرے کاموں سے فرصت نہیں۔"

"لیکن جو قدرت آپکو تازگی بخشنے کی ہے وہ مالی کو کہاں۔"

"خوشامد کرنا تو آپ لوگوں کی فطرت میں داخل ہے۔"

"یہ خوشامد ہے؟" اُس نے بے خیالی میں ایلس کے دیوار پر رکھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔

"ہم نے اب تک فضول گفتگو میں وقت ضائع کیا۔ ہم ایک دوسرے کے نام تک سے نابلد ہیں۔ میرا نام ایلس ہے۔"

"ہم علامہ شاکر ہیں۔"

"بلکہ علامہ الدہر۔"

"ابے او گدھے مالی۔ ایلس کہاں ہے۔ یہ کمبخت کہاں جاکر مرجاتی ہے۔ لعنت ہے سب پر۔ آخاہ! یہاں تو معاشقہ ہو رہا ہے۔" اس کے بعد آنیوالے کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔

"جارج یہ مسٹر شاکر تم سے ملنے آئے ہیں۔" ایلس نے اپنے جانور صفت شوہر کو دیکھکر خوف کھاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے ملنے یا تجھ سے آنکھ لڑانے۔ مُردار مجھے دھوکا دیتی ہے۔ مجھ سے ملنے والا پھاٹک کی طرف سے آتا دیوار کود کر نہیں۔ کون ہو جی تم؟ ہیں۔ میں سمجھ گیا۔ غنڈا کہیں کا لوفر—"

"جارج تم کو کیا ہو گیا ہے ایک شریف آدمی کی شان میں کیسے نامناسب الفاظ استعمال کر رہے ہو۔"

"جارج صاحب معاف کیجئے گا۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں یہاں ایلس سے بات کرنے کھڑا ہو گیا۔ میں ملنے تو آپ ہی سے آ رہا تھا۔ لیکن آپکی حسین بیوی کو دیکھکر اس طرف آ گیا۔"

"اچھا تم اب رفو چکر ہو شریف کے بچے۔ اور کہے دیتا ہوں کہ اگر پھر کبھی اس طرف کا رُخ کیا تو گولی کا نشانہ بنا دونگا۔ اور تو مُردار اگر کبھی اس بدمعاش سے ملی تو تیرا بھی یہی حشر کرونگا۔" یہ کہہ کر اُسنے ایلس کے ایک زور کا چپت اور ایک اُسی قدر زور کی لات رسید کی اور خود بھی مُنہ کے بل زمین پر گر کر زور سے کھانسنے لگا۔

شاکر کو اس بیمار مگر حیوان نما انسان پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی لیکن ضبط سے کام لے کر چلا آیا۔ عقل سلیم نے اُسکو جلد آگاہ کر دیا کہ اس کے تمام اقدامات غلط تھے۔ دوسرے شخص کی ملکیت پر تصرف کی کوشش بہت سفیہانہ حرکت تھی۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے عہد کر لیا کہ وہ ایلس کے بنگلے پر اب کبھی نہیں جائیگا۔

کئی روز کے بعد جب اس کی ملاقات ایلس سے پھر پہاڑی پر ہوئی تو وہ اپنی اس روز کی حماقت پر بہت نادم ہوا اور اُس سے بہت معذرت خواہ بھی ہوا۔

"آپ کا اس میں کچھ قصور نہیں ہے۔ میں نے آپکو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ آپکا مقابلہ ایک درندے سے ہے۔"

"ایلس ہم دونوں غلطی پر ہیں۔ ہمکو یہاں بھی آکر نہیں ملنا چاہیئے۔ تمہاری تمام خانگی زندگی کی قیمت پر یہ ہنگامی خوش وقتی بہت قیمتی ثابت ہو رہی ہے۔ تم کوشش کیوں نہیں کرتیں کہ تمہارا شرابی شوہر جادۂ انسانیت میں آجائے۔ اس میں تمکو اپنی جانسے اپنی آسائش اپنی تمنائیں آزادی بلکہ جان تک کی قربانی دینی پڑیگی۔"

"مگر شاکر اگر جارج کے جسم میں اس قربانی کا اعتراف کرنے والا کوئی انسان ہوتا تو میں بسر وچشم ایسا کرتی۔ میں کئی بار اس قسم کی کوشش کر چکی ہوں مگر وہ سمجھتا ہے کہ میں اسکو بنا رہی ہوں۔ ابھی دو تین دن کی بات ہے میں اس کو نہلا رہی تھی کہ چھینٹا پر ذرا زور سے پانی گر جانے پر اُس نے مجھے مار ہی ڈالا ہوتا۔ اُس زور سے پکڑ کر میرا گلا دبایا کہ اگر وہ خود اپنی کمزوری سے مغلوب ہو کر نہ گر پڑتا تو میرا دم ہی نکل جاتا۔ اس صورت میں بتاؤ کہ میں کس کے لئے قربانی کروں؟"

"تمہاری پوزیشن واقعی ہے بڑی نازک۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"آپکو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس زندگی کو بھگت رہی ہوں اور اُس وقت تک برداشت کرتی رہوں گی جبتک جارج ہی کے ہاتھوں سے جان نہ نکل جائے۔"

"ایلس۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ افسوس تم نے اپنے لئے بڑا غلط انتخاب کیا۔ خیر میں تمکو اس طرح تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی تدبیر کرونگا۔ اچھا اب جاؤ اور یہاں کا آنا جانا بھی کم کر دو۔ ایلس میں بھی مرد ہوں اور اپنی تمناؤں کا غلام نہیں ہوں افسوس

ہماری معاشرت نے انسانیت کے کسقدر ٹکڑے کر رکھے ہیں! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک شخص کا ظلم سوسائٹی کی نگاہ میں جائز قرار دے لیا جائے محض اس بنا پر کہ وہ اس کے قوانین کو ماتحت مظلوم کا وارث قرار دے لیا گیا ہے۔ اور دوسرے انسان رحم و ہمدردی کو بالائے طاق رکھکر اس ظلم کا چپ چاپ تماشا دیکھتے رہیں۔ کیونکہ دخل اندازی کی سوسائٹی اجازت ہی نہیں دیتی۔ اچھا میں بھی تمکو مصیبت سے رہائی دلانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دونگا۔ جارج پہلے مجھے قتل کریگا بعد میں تمکو۔"

بنظر غور دیکھا جائے تو شاکر کا یہ اعلان بیکار سا تھا۔ وہ حقیقتاً ایلس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سماج کی بعض غیر آئینی پابندیاں بھی کس قدر انسانیت سوز ہیں۔ اور انسان کی ضروریات بھی کسقدر اندھی ہوتی ہیں۔ اگر ایلس ضرورتاً اپنے کو اس درندے کے سپرد نہ کرتی تو کیا اسکو یہ روز بد دیکھنا پڑتا۔ کاش ایک ایسی جمعیۃ الاقوام ہوتی، ایک عام انسانوں کی ایسی لیگ ہوتی جسکا مقصد صرف دوسروں کی ضروریات معلوم کرنا اور حتی الوسع انکو پورا کرنا ہوتا!

اب شاکر اور ایلس کی ملاقات بہت کم ہوا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کی زندگی کا رومانی پہلو اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا لیکن دونوں کے درمیان میں مجبوریوں کا اس قدر بلند پہاڑ حائل تھا کہ کوئی بھی اسکو طے نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف چند گھٹی ہوئی ٹھنڈی سانسیں تھیں تو دوسری طرف چند اعضا آماس [illegible] دتنا ہے۔

اپنی ملکیت پر دوسرے کا قبضہ ہوتے دیکھکر انسان بغرض پیش بندی عزوریوں کو راہ سے ہٹا کر ذرا چوکنا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت جارج کی ہوئی۔ اسکا معطل دماغ اُسکو جس قدر اس کی اپنی کمزوریوں سے آگاہ کر سکا کرتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے چند روز سے شراب نوشی یک لخت ترک کر دی تھی اور اپنے اطوار میں بھی نرمی و ملائمت پیدا کر لی تھی۔ یہ اسکا بڑا عاقلانہ اقدام تھا اور نفسیات اسکو اپنی موجودہ دار و گیر سے نجات دلانے کے لئے اسی راستہ پر ڈال سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلس کو بھی خودکشی کرنے کے لئے روزانہ ایک خاص ساعت ڈھونڈھنے کی فکر سے نجات مل گئی۔ جب فطرت کو بغاوت کے لئے کوئی معقول حیلہ ہاتھ نہ آنے لگا تو اُسپر حقیقت واضح ہونا شروع ہوئی۔ وہ حقیقت یہی تھی کہ اس غیر استوار سکون کے باوجود اسکو شاکر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کیا انسان کی ذہنیت ہے۔ خدا ہی اسکو بہتر سمجھتا ہے۔

مہینے بھر تک جارج نے انسانوں کی سی زندگی گذار کر ایلس کو حیرت میں ڈال دیا۔ آخر ایک روز اس نے اپنی بیوی سے درخواست کی کہ موسم خوشگوار ہے آج تو ایک چلو پینے کی اجازت مل جائے۔ ایلس نے اس میں کوئی مضائقہ نہ خیال کر کے اجازت دیدی۔ ایک گھونٹ کا حلق سے اُترنا تھا کہ خمر کی لعنت مُردہ اثرات کے سسکتے ہوئے بھوت، خباثت کے خفتہ اہرمن پھر جارج کے جسم میں پیدا ہو گئے۔ جس طرح دہکتی آگ پر دفعتاً پانی پڑنے سے ابخارات کا بھبکا اُٹھتا ہے، جس طرح بعض مناظر دیکھنے سے شہوانیات کی دُنیا میں زلزلہ سا آجاتا ہے اور جس طرح کسی خونی دیوانہ کو چھوڑ دینے سے ایک ہل چل بپا ہو جاتی ہے جارج بھی بے قابو ہو گیا، بالکل اسی طرح بے قابو ہو گیا۔ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور جبکہ ایلس کسی دوسرے کام میں مصروف تھی، باورچی خانے میں چھپکر پوری بوتل اُڑا گیا۔ ابھی وہ دوسری بوتل کھول ہی رہا تھا کہ ایلس آ گئی۔ اُس نے بیک نظر موقع کو سمجھ لیا اور فہمائش کے طور پر چلائی۔ "ہیں ہیں جارج یہ کیا کرتے ہو!" جارج نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خالی بوتل ایلس کے کھینچ ماری جو زور سے کھڑکی پر لگی اور اُس کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے سر پر آکر لگا۔ خون بہنے لگا مگر اسپر بھی اس نے جارج کا ہاتھ پکڑ لیا جس طرح ایک درندہ خون پی کر مست ہو جاتا ہے جارج بھی وحشی بنا ہوا تھا۔ ایلس کو ایک جھٹکا دیکر بوتل منہ سے لگائے دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ راستہ میں ایک نوکر نے کچھ تو ایلس کی مدد کے خیال سے کچھ اپنے آقا کو تباہی سے بچانے کے ارادہ سے اُسکو پکڑنا چاہا مگر ایک فائر کی آواز آئی اور نوکر ایک چیخ کے ساتھ بیجان ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

"آہا ہا ہا آ میری جان اب تیری باری ہے۔ آ میری ایلس اب تجھے بھی اس دکھ بھری زندگی سے نجات دلا دوں۔ آہا تو سیدھی کھڑی ہوئی کیسی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ لا دو گھونٹ اور پی لوں پھر تجھے بھی اچھی جگہ پہنچا دوں۔ آج کہاں ہے وہ تیرا دوست۔ آج تجھے کوئی نہیں بچا سکتا ــــــ" جارج نے بوتل میز پر رکھدی۔ اعصابی کمزوری کے باعث اُسکا بدن تھرتھر کانپ رہا تھا۔

وہ بمشکل زمین پر قدم جمائے رکھنے کے قابل تھا۔ جس ہاتھ میں اُسکے پستول تھا وہ بھی بُری طرح لرز رہا تھا۔ ایلیس اپنی موت قریب سمجھکر سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ دفعتہً اُسکو ہوش آیا۔ مدافعت کا جذبہ اس کے اندر بیدار ہوا۔ وہ جھپٹی اور لپک کر جارج کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہر چند جارج نشہ میں تھا مگر خون اسپر سوار ہوچکا تھا۔ کانپ رہا تھا لیکن پستول ہاتھ سے نہیں نکلنے دیا۔ ایلس دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ سے جھوم رہی تھی اور جارج دیوانگی میں بک رہا تھا۔ آخر ایلس کا قصّہ ختم ہی کردینے کی نیت سے اُس نے پستول داغ دیا۔ یہ تو اُسکو ہوش تھا ہی نہیں کہ پستول کا مُنہ کدھر ہے چنانچہ خود اس کا نشانہ بن گیا۔

ایلس سمجھ نہ سکی کہ یہ کیا ہوا معاً اُسکو خیال آیا کہ جارج اس کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے۔ ذلت کی زندگی سے مرجانا بہتر ہے یہ سوچ کر وہ جس حالت میں تھی اسی حالت میں بنگلے سے نکل بھاگی اور تالاب کا رُخ کیا۔

جھٹپٹا وقت ہوگا۔ شاکر بادہ پیمائی کرکے تالاب ہی کی طرف سے آرہا تھا۔ دفعتہً کوئی عورت بہت تیزی سے اسکے پاس سے دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ وہ اپنے خیالات سے بیدار ہوا اور عورت کو اس سراسیمگی میں تالاب کی جانب بھاگتے دیکھکر اسکو فوراً خیال آیا کہ یہ خودکشی کے لئے جارہی ہے۔ وہ بھی لپکا۔ کئی منٹ تک یہ ریس رہی۔ عورت کافی تیز دوڑ رہی تھی شاکر بھی پوری قوت سے اس کے تعاقب میں اُڑا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ دونوں ہانپتے ہوئے تالاب کے کنارے جا پہنچے۔ قبل اس کے کہ عورت پانی میں کود پڑتی شاکر نے جالیا اور اس سے لپٹ گیا۔

"ایلس۔ ایلس یہ تم ہو۔ ہائیں! یہ حرکت تھی تمہاری!" اُسنے ایلس کے کپکپاتے جسم کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

"چھوڑدو شاکر مجھے چھوڑدو۔ میں نے آج جارج کو مار ڈالا ہے، میں بھی مرجانا چاہتی ہوں، مجھے خدا کے لئے چھوڑدو!"

شاکر نے بمشکل اُسکو روکا۔ جب ذرا اسکی حالت سکون پر ہوئی تو تمام واقعہ ایلس نے بیان کیا۔

"پاگل تم نے اُسکو قتل نہیں کیا ہے بلکہ وہ تمکو مارنے کی کوشش میں آپ مرگیا ہے۔ چلو میرے ساتھ چلو!"

چند روز تحقیق تفتیش اور سراغ رسانی میں صرف ہوگئے اس کے بعد ایلس بری کردی گئی۔

اب دونوں ٹھاٹھ سے موٹر میں بیٹھے پھرتے ہیں معلوم ہوتا ہے دونوں اپنی پچھلی زندگی کو بالکل بھول گئے ہیں۔ شاکر اپنے افلاس کو فراموش کرچکا ہے اور اسکے ساتھ تمام مفلسوں کی زندگی بھی اسکے حافظے سے نکل چکی ہے۔ ادھر ایلس بھی اب ثروت کے ہاتھوں نالاں نہیں ہے اس افلاس و ثروت کے ادغام نے ایک ایسی زندگی پیدا کردی ہے جو محض خرّمی و مسرت کے لئے وقف ہے۔ یہ شادمانی کی نوزائیدہ منچے اب غم کی چیخوں سے اسقدر نابلد ہیں کہ با ازل ہی سے وہ خوشی کی قلقاریاں مارتے چلے آرہے ہیں۔ دونوں نے اپنی کتابِ زندگی میں سے الم کے خون چکاں باب نکال کر ایک گڑھے میں پھینک دئے۔ شاکر کو اب مطلق یاد نہیں ہے کہ اس نے کبھی آسودہ حال ہوکر غربا کی زندگی سنوارنے کا عہد کیا تھا جس طرح ایک رہرو بیابانک اور ڈراؤنے راستے طے کرکے منزل پر پہنچنے کے بعد کبھی انکو مڑکر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا ہو اسی طرح کامرانی کی منزل پر پہنچکر ایلس اور شاکر نے آلام و آلام رسیدہ لوگوں کے خیال کو دل سے نکال پھینکا۔ اب منصوبوں کی دُنیا ختم ہوچکی تھی۔ پہلے وہ قلتِ سرمایہ و فقدانِ اسباب کی وجہ سے پورے نہیں ہوسکتے تھے اب وہ عدیم الفرصتی و فراوانی عیش کے باعث شرمندۂ تکمیل نہیں ہورہے تھے۔ اب بھی پاپ کی دُنیا میں جرائم ہو رہے تھے لیکن شاکر کو انکی انسداد کی اب کہاں فرصت تھی۔ لٹریچر کے موضوع کو اب بھی نئے لکھنے والے گندہ کررہے تھے لیکن ایلس کو اپنے معقول نظریات کی تبلیغ کا وقت اب کہاں مل سکتا تھا۔ اور اب بھی مزدور عورتیں اپنے بیمار بچوں کے پشتارے باندھے ہوئے شام کو گاتی ہوئی اُن کے بنگلے کے سامنے سے گذرتی تھیں مگر اب کس کو ان پر رشک کرنے کی ضرورت تھی —— زندگی اسی کا نام ہے۔ جب تک خود پر بیتا پڑتی رہتی ہے انسان "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کا اعلان کرتا پھرتا ہے۔ سازگارِ زندگی حاصل ہوجانے کے بعد تمام فیض رسانی کے جذبات پادر ہوا ہوکر رہ جاتے ہیں:

قیسی رامپوری

پتہ تبدیل کرانے کیلئے پتہ صاف اور خوشخط تحریر کریں (منیجر)

"گرودیو"

ہمالیہ پربت کے جنوب میں امرناتھ جی کے مشہور مندر سے پچاس میل کے فاصلے پر جہاں سلسلہ کوہ کی اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں سال سے سال خاموش اور ساکت کھڑی رہتی ہیں۔ ایک پُرسکون دریا اس میں بہتا ہے، بہت ہی پُرسکون دریا، کیونکہ اسکی سطح بھی انتہائی برودت کی وجہ سے منجمد رہتی ہے اور جس طرح انسانی فریبوں اور حیلوں کے خیالات چہرے کے آئینہ پہ نظر آجاتے ہیں اسی طرح اس کے پانی کی زیریں امواج بھی نہایت سرعت کے ساتھ بہتی رہتی ہیں۔ یہ دریا غیر آباد پہاڑیوں کے پیچ در پیچ راستوں میں سے گذرتا ہوا ایک عمیق غار میں جا گرتا ہے۔ جہاں غار کی سنگین دیواروں سے پانی اور برف کے ٹکڑے ٹکرانے سے ایک مبہم سی آواز۔ کرب والم کی سی دردناک چیخ کی مانند پیدا ہوتی رہتی ہے۔ مگر گرد و نواح کی پہاڑیاں اسے جلد اپنے مرگ آفریں آغوش میں لیکر اسقدر پیار سے بھینچتی ہیں کہ اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ اور یہ گھاٹیاں، اُف، کیسی بھیانک اور المناک کفن کی طرح سفید اور مُردے کی طرح سرد، برف سے مستور خاموش پڑی رہتی ہیں — بے برگ و گیاہ منجمد تودے۔ اگر کوئی شورش سنائی دیتا ہے تو صرف پانی کا۔ جوش اور شورش کی اگر کوئی رمق کہیں پائی جاتی ہے تو اس جگہ۔ اور جب یہ شور غل آپ گونجتی ہے تو وہ ان بے معنی الفاظ کی مانند ہوتی ہے جو آدمی کے لبوں سے بوہران کی حالت میں کبھی نکلا کرتے ہیں۔ یہ بڑبڑاہٹ تھوڑی دیر کے بعد اپنی قدرتی موت خود ہی مرجاتی ہے۔ پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے پھر ہیجان پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

غار کی جس سمت دریا آکر گرتا ہے اس کے بالکل سامنے بے ڈھنگے اور ناتراشیدہ پتھروں کا ایک زینہ چلا گیا ہے، طویل اور مسلسل جو ظاہر کرتا ہے کہ انسانی آبادی کی آلودگیوں سے متنفر ہو کر فطرت یہاں آکر پناہ گزیں ہوئی تھی مگر انسان کے ہاتھوں نے اسے یہاں بھی ملوّث کئے بغیر دم نہ لیا۔ زینوں کا یہ سلسلہ پہاڑی علاقہ کی ان سیڑھیوں کے مانند ہے جو دریا کے کنارے ہر گاؤں کے پہلو میں ہوتا ہے اور صبح یا شام کے وقت حور تمثال پہاڑی عورتیں قطار اندر قطار چوڑے کولھوں پر چمکتی ہوئی گاگریں رکھے چڑھتی اترتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہاں چونکہ قریب کوئی انسانی آبادی نہ تھی اس لئے اس نوع کا کوئی دلکش اور نظر نواز نظارہ بھی دکھائی نہ دے سکتا تھا۔

ان زینوں کی سب سے اونچی بلندی پر بدھ مت کے بھکشوؤں کی ایک قدیم خانقاہ تھی۔ اپنے جسم کو "نروان" یعنی نجات دلانے کی آرزو میں سخت اذیتیں پہنچانے میں دن رات یہ فقرا محو رہتے تھے۔ کوئی دنیادار اگران سخت اذیتوں اور جسمانی تکلیفوں کو دیکھے تو لرز اُٹھے۔ خانقاہ کے بیچ میں پتھروں کا ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ جس پر بودھ دیو کی مورت تھی۔ اس کا رنگ مٹیالا تھا اور نقش و نگار زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہو چکے تھے جس سے اس کی قدامت اور پاکیزگی کا پتہ چلتا تھا۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو ناک کی نمایاں نوک اور پلکوں کی لمبائی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے یونانی سنگتراشی کے اصول پہ ہندوستانی ہاتھوں نے اپنے تخیل کے مطابق تیار کیا ہے۔ مورت دیکھکر اندازہ ہو سکتا تھا کہ ہندوستان میں یونانیوں کی آمد کے بہت عرصہ بعد وجود میں آئی ہو گی۔ اور کیا یہ امر تعجب سے خالی نہ تھا کہ حسن اتفاق سے مورتی کے اوپر اس برفستانی سرزمین میں بھی ایک بڑھ کا درخت سایہ افگن تھا، سکون اور شانتی کا وہ مدار جس کے سایہ میں بدھ نے عرفان کی روشنی دیکھی تھی۔

جب بھکشو کسی خاص تقریب پر اس مورت کے گرد جمع ہوتے تو اُن میں سے اکثر ایک تمکنت اور تقدس مآب سکوت کے ساتھ ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہ اُس درخت ہی کی شاخ ہے جہاں ایک تپتی ہوئی چلچلاتی دھوپ میں مہاتما بودھ نے "نروان" حاصل کیا تھا۔ اس درخت کے گرد اگرد ایک وسیع گھیرا چھوڑ کر پرانے پتھروں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنائی گئی تھیں۔ یہ اسقدر نیچی تھیں کہ کوئی آدمی سرو قد اس میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کھڑا ہو تو اس کی پتھریلی چھتیں لمبے تڑنگے بھکشوؤں کے جسموں کو دوہرا کر دیا کرتی تھیں۔ چوڑائی میں اسقدر تنگ کہ اگیں

باہم جوڑے بغیر لیٹنا محال تھا۔ ان کال کوٹھریوں میں یہ بھکشو ریاضتِ الٰہی میں دن رات مصروف رہتے اور کوئی ایسی اذیت اٹھا نہ رکھتے جسے یہ ناتواں جسم انسانی برداشت کرنے کے بعد زندہ رہ سکتا ہو۔ اور انھوں نے وہ پوری طرح اپنے جسم پر جاری نہ کردی ہوں۔ جوان ریاضتوں اور جسمانی تکلیفوں کو پوری طرح حاصل کرلیتا وہ ان کوٹھریوں کو چھوڑ کر میدان میں آجاتا اور سردی کی کڑکڑاتی راتیں کھلے آسمان کے نیچے بسر کرتا۔ خانقاہ کے ساتھ ہی ایک غیر ہموار قطع زمین تھا جس میں یہ بھکشو لوگ کچھ بویا کرتے تھے مگر صرف اسقدر بویا جاتا تھا کہ ان ہی لوگوں کے لئے صرف اسقدر غذا مہیا ہوسکے کہ وہ مر نہ جائیں۔ بعض خدا پرست بزرگ بھکشو تو اس سے بھی پرہیز کرتے تھے اور درختوں کے پتّوں اور جڑی بوٹیوں پر قناعت کرتے تھے۔ جو غلّہ وغیرہ یہاں پیدا ہوتا تھا وہ اگر بچ جاتا تھا تو عورتوں کی اس خانقاہ میں بھیج دیا جاتا تھا جو یہاں سے پانچ چھ میل اُوپر نہایت دشوار گذار چوٹی پر بنی ہوئی تھی اور تپسیہ کرنے والی بھکشو عورتیں بھی بالکل اس ہی قسم کی ریاضتوں اور جسمانی اذیتوں میں مصروف رہ کر "نروان" یا نجات مطلق کی جستجو میں لگی رہتی تھیں۔

ایک نوجوان تپسوی تھا جو تمام بھکشوؤں میں اپنی ریاضتوں کی وجہ سے ایک خاص درجۂ افتخار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ تمام خانقاہ کا انتظام دراصل اُسی کے سپرد تھا اور وہ اپنی عبادت و ریاضت میں اسدرجہ بلند مانا جانے لگا تھا کہ لوگ اس کی ہدایتوں پر عمل کرتے تھے اور اگر کبھی ایسا ہوجاتا کہ دُنیا کی کسی دلفریبی یا شادابی نے کسی راہب کے دل کو لبھا کر ستانا چاہا تو وہ فوراً مدد کے لئے اس نوجوان بھکشو کی طرف رجوع کرتا اور وہ علائق دُنیا سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُسے کوئی اور بھی سخت ترین ریاضت بتادیتا۔

یہ نوجوان بھکشو چار سال تک مسلسل اپنی کوٹھری میں بند رہا اور ایک لمحہ کے لئے بھی باہر نہ نکلا۔ اُس نے سمجھا تھا کہ جذبات انسانی کا پھنکارے مارتا ہوا سانپ مرچکا ہے اور دنیاوی جال کی زنجیریں درحقیقت ٹوٹ چکی ہیں اور وہ ان کڑیوں سے آزاد ہوچکا ہے۔ عبادت کی کوٹھری کی ہر صعوبت اور ریاضت کے بعد اس نے برفانی میدان میں تپسیا شروع کردی۔ نفس امّارہ بالکل پارہ پارہ ہوچکا تھا اور اب اس کو اس عالم اسباب سے وہ بے نیازی اور استغنائے خالص حاصل ہوچکا تھا جو دُنیا والے صرف فرشتوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ محبت اور نفرت کے الفاظ اگر اب بھی اس کے ذہن میں کبھی آجاتے تھے تو ان کے کچھ معنی اس کے لئے اب باقی نہ رہے تھے۔ رنگ و بو کے تمام حجابات بھی اُٹھ چکے تھے جو فطرت کو دلفریب تر بنا کر دکھاتے ہیں۔ وہ دن کے وقت نیلگوں آسمان کو آئینہ ساماں برف پر منعکس دیکھتا اور اس کے دل میں آرزوؤں کا ہلکا سا تموّج بھی پیدا نہ ہوتا۔ رات کو زیرِ آسمان وہ اگر ایک پاؤں کے سہارے کھڑا ہوتا یا دیوار سے سہارا لگا کر سر کے بل تپسیا میں مصروف ہوتا تب بھی اس کی نگاہ فطرت کی جلوہ آرائی کی طرف سے پھری رہتی۔ کبھی اس کی نگاہ اس دلفریب منظر پر نہ پڑتی جو تاروں بھری رات میں چاند برفستان ہمالیہ میں پیدا کردیتا ہے۔

مگر ایک صبح کا ذکر ہے جبکہ مہینہ کا آخری چاند تھا۔ دُور کی گھاٹیوں میں وہ غروب ہو رہا تھا۔ خلاف عادت اس کی نظریں چاند کے دل نشین داغوں پر جم گئیں۔ وہ رات کی کوفت سے مضمحل سا ہو رہا تھا، اس لئے روح بھی قدرتی طور پر کمزور تر تھی۔ وہ اس منظر سے اس کی مرضی کے خلاف تھوڑی سی دیر کے لئے متاثر ہوگئی اور ایک خفیف سی لہر اس کے برف جیسے سرد دل میں پیدا ہوگئی۔ یہ نظارہ اُسے نہ معلوم کس برقی سرعت کے ساتھ اس کے عہد گذشتہ میں لے گیا جبکہ گرمیوں کے دن تھے۔ اور وہ ایک ماہ پارہ مہ جبیں لڑکی کے ساتھ دم سحر سیر دریا میں مصروف تھا۔ اس رات بھی وہ جاگتا ہی رہا تھا۔ مگر آہ، آج کی رات اور اس رات میں کیسا بیّن فرق تھا؟ وہ رات جس کا تصوّر ہی جنّتِ خیال ہے اور پھر یہ رات یہ بھی بسر کی ہے! اس خیال سے اس کی روح میں جُھرجُھری سی پیدا ہوگئی۔ وہ کانپ اُٹھا، اس نے پھر ایک بار خشوع و خضوع کے ساتھ توبہ کی اور ریاضت میں پھر مشغول ہوگیا۔ مگر یکایک اُس نے محسوس کیا کہ جسقدر انہماک کے ساتھ اسے عبادت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ وہ حالت ظاہری نہیں ہے اس کا خیال بار بار اس شبِ ماہ کی طرف چلا جاتا ہے جو آج سے کئی سال پیشتر اُس نے کسی کی ہم آغوشی

میں گذاری تھی۔ وہ جسقدر اس خیال کو دل سے محو کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر وہ تصویر اور بھی واضح تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ تصویر سامنے آ گئی۔ ایک عصمت فروش مجسمۂ گناہ تھی وہ جس نے ایک طویل عرصہ تک اس کے نوجوان دل پر حکومت کی تھی۔ وہ تمام حسن آفریں دلاویزیوں کے ساتھ اس وقت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بکھرے ہوئے بال۔ اُبھرا ہوا نیم عریاں سینہ، سڈول کندھوں پہ ڈھلکا ہوا ریشمی لباس۔ بیباک آنکھیں جو بعد ساماں بے حجابی کر رہی تھیں۔

"ہمیں چوم لو۔۔۔۔ چوم لو نہ ہمیں۔۔۔۔!"

آہستہ آہستہ اس کے سڈول گورے گورے بازو آگے بڑھتے دکھائی دیئے، اور نوجوان بھکشو نے ان گرم حلقوں کو اپنی سرد گردن کے گرد حمائل ہوتے اور گرم تنفس کی معطر مشام سے فضا لبریز ہوتے محسوس کی۔ بس اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سانپ نے سینہ میں ڈس لیا ہے۔ وہ فوراً چونک پڑا۔ صبح ہو چکی تھی۔ چاند اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف مغرب کی جانب آسمان کے کناروں پر خفیف سی زردی تھی گویا آسمان اپنی پیلی پیلی ہتھیلیاں دکھا کر اسے اپنے خندۂ بے محابا سے ڈرا رہا تھا۔ اور ادھر مشرق سے کچھ اُوپر ایک ستارہ چمک رہا تھا جس نے بھکشو کی طرف حجاب کے ساتھ دیکھا اور آنکھ جھپکا کر رہ گیا۔ آہ، وہ ایک آگ جو اس کے دل میں کبھی پیدا ہوئی تھی اور جسے وہ عرصہ ہوا مُردہ سمجھ چکا تھا اب پھر زندگی کے آثار محسوس کر رہی تھی۔ کیا اس چنگاری کو پھر شعلہ بنا دے۔ کیوں اس پر ریاضت کے سرد چھینٹے ڈال کر اسے ٹھنڈا نہ کر دے۔ اس نے سوچا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اسے ضرور ختم کر دونگا"

اس روز بھکشو تمام دن اپنی کوٹھری میں بند رہا اور پہلے سے بھی زیادہ سخت ریاضت شروع کر دی اور دس دن تک کوٹھری سے باہر نہ نکلا۔ کھانا پینا اُس نے بالکل بند کر دیا۔ یہ تکلیف تھی مگر پھر بھی اس حسینہ کا چہرہ محویت میں بار بار اسکے سامنے آ جاتا تھا۔ اس نے گویا ایک خواب سا دیکھا۔ کیا معلوم ہوا اُسے کہ گویا وہ ایک صاف و شفاف چشمہ کو عبور کرتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ یہ چشمہ جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔ جونہی یہ محسوس ہوا اسے ایک نوحہ دار نسوانی آواز سنائی دی جو اُسے اپنی طرف بُلا رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ غم و الم میں ڈوبی ہوئی ایک آواز ہے جو اُسے مدد کے لئے بلا رہی تھی۔۔۔۔ اس نے پہچانا یہ اُسی حسینہ کی آوازِ دلنواز تھی جس کی زلفیں اکثر اس کے بازو پر پریشان ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک نیم مدہوشی کی سی کیفیت کے ساتھ اس نے کہا "بول لالی تو کیا چاہتی ہے۔ بول نہ!" اپنی ہی آواز کی بھیانک گونج سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جسم پر نقاہت نے غلبہ پا لیا تھا۔ اور اب وہ اور عبادت یا ریاضت کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لئے خود ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر اس نے کیا دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے زمین و آسمان تپ رہے ہیں۔ صرف بُدھ دیو کی مقدس مورتی بڑھ کے درخت کے سایہ میں رکھی ہے۔ لالی ہانپتی ہوئی آ رہی ہے۔ سر کے بال پریشان اور چہرہ دھوپ سے تمتما رہا ہے۔ سینہ نیم عریاں ہے اور وہ سایہ کی تلاش میں لرزاں و ترساں چلی آ رہی ہے، وہ بڑھ کے درخت کے نیچے آ کر رُک گئی اور جونہی وہ رُکی ایک کالا کُتا نمودار ہوا جس نے اس کا دامن کھینچکر گھسیٹنا شروع کیا۔ لالی نے اس بھکشو کو پکارا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی مدد کے لئے آگے بڑھے کہ آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوا تو نہ وہ چھتنا ہوا میدان تھا نہ مہاتما بدھ کی مورت۔ لالی کا بھی کہیں وجود نظر نہ آتا تھا۔ کوٹھری میں اندھیرا چھا رہا تھا اور پتھروں کی دراڑوں میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات کا عمل ہے۔ بھکشو نے کوٹھری کے دروازہ پر سے پتھر کی سلیں نیچے لڑھکائیں۔ آخر مہینہ کا پتلا مضمحل چاند رات کی خاموش تاریکی میں چمک رہا تھا۔ اس کی مدہم سی روشنی بڑھ کی شاخوں میں سے چھن چھن کر مہاتما بودھ کی مورت پر پڑ رہی تھی۔ بھکشو نے دیکھا کہ ایک انسانی پیکر اس مورت کے پاس حرکت کر رہا ہے۔ وہ سمجھا کہ کوئی بھکشو یہاں تپسیا کر رہا ہوگا۔ مگر اس نے فوراً ہی محسوس کیا کہ اس کی توجہ بہت دیر سے اسی جانب منعطف ہے اور وہ اپنا خیال اِدھر سے نہ ہٹانے پر اپنے آپ کو کچھ کچھ مجبور سا پاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ اس پیکر کا لباس بھکشوؤں کا سا نہ تھا۔ اس کا قد بھی چھوٹا سا تھا۔ اس قد کا خانقاہ میں کوئی بھی نہ تھا، پھر یہ کون تھا۔ کوئی اجنبی ہے یا کوئی بھکشو نیا آیا ہے۔ لیکن جب اُس نے ذرا اور غور سے دیکھا تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ محسوس کیا کہ وہ لالی کے سوا اور کوئی ہستی نہیں ہے۔ ایک حسن کا سراپا تھا متحرک اور

گریزاں۔ اس خیال کے آتے ہی ہوا کا ایک خنک جھونکا آیا اور وہ سایہ فوراً غائب ہو گیا۔ فضا میں پتوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کیا باقی رہ جاتا۔ ہاں دل کی دھڑکن تو وہ بیحد تیز اور طبل جنگ کی سی تند آواز کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

بھکشو کو حیرانی تھی کہ آج دس سال کے بعد بار بار لاآلی اس کے تصور میں کیوں آ رہی ہے اور اب جبکہ جذبات و خواہشات بشری کو وہ ہمیشہ کے لئے فنا کر چکا ہے وہ پیکر حسن و معصیت بار بار کیوں نمودار ہو کر اس کی روحانی تسکین اور اس کے شانت ہردے کو تباہ کر رہا ہے۔ کیا یہ ظلمات اور "تاریکی" ہے نفس کی۔ مگر تاریکی کو تو وہ بہت دن ہوئے شکست دے چکا تھا۔ ایک زمانہ ایسا تھا ضرور جبکہ وہ ایک مرغ نو گرفتار کی طرح تاریکی کے قفس میں سر ٹکرایا کرتا تھا لیکن جب لاآلی نے بیوفائی کر کے اس قفس کی تیلیاں توڑ دیں تو تاریکی کو نور کے ماہتاب نے منور ہو کر ہمیشہ کے لئے دور کر دیا تھا۔ تاریکی طوفان کی مانند اس کی زندگی میں اٹھی تھی، مگر اچانک بجلی چمکی اور مطلع صاف ہو گیا۔ تاریکی اب اس پر دوبارہ مسلط ہونا چاہتی تھی۔ نہیں۔ تو پھر یہ لاآلی کا تصور اب بار بار آنا کیا معنی رکھتا تھا؟ کیا ذلت اور اسفل درجۂ زندگی کی طرف وہ پھر جا رہا تھا جو کبھی اس کے لئے باعث صد ناز تھا۔ کہیں عشرت رفتہ کی یاد تو دوبارہ اسے نہیں ستا رہی ہے۔ ! نہیں۔ یہ آزمائش ہے اور اس میں اسے ثابت قدم رہنا ہوگا! یہ ایک پکار ہے نور کی! آہ۔ لاآلی کی روح ضرور اس کے لئے تشنگی سی محسوس کر رہی ہوگی جیسے ریگستان میں مسافر کو پیاس ستاتی ہے۔ بھکشو اسے ضرور سیراب کریگا اور وہ اسے واپس لائیگا۔ نور ازلی کی نور کی مقدس بارگاہ میں وہ اسے لائیگا اور عروس بنا کر رکھیگا اور کہیگا۔ اس سے:۔

"لاآلی! دیکھ تو نے تاریکی کے آغوش میں پرورش پائی ہے لیکن تیری روح دراصل ابدی نور کے لئے بیقرار ہے اور میں تجھے نور سے ہم آغوش کراتا ہوں۔ آ کہ وہ نور میں تجھے دکھا دونگا اور تیری سچی رہنمائی کرونگا۔ اس ذات مطلق کے نور کی طرف جس سے ہر چیز اکتساب حیات کر رہی ہے۔ کیسا نور، ابدی اور سرمدی پاکیزہ اور منزہ ——— ایک لافانی نور مطلق!"

۲

"سرکار! ایک سنیاسی آپ سے ملنا چاہتا ہے!"

"کوئی سنیاسی ——— ؟ سنیاسی ہے کوئی۔ چاہتا ہے ہم سے ملنا!" ایک مخمور نوجوان نے اپنے خیالوں میں محو رہتے ہوئے جواب دیا۔

"اس سے کہدو کہ یہ لمحے خداوندہ حسن کی بارگاہ کے لئے وقف ہو چکے ہیں ——— ہاں ——— لاآلی ——— کیسے گاتی ہے تو!۔

"مجھے معلوم ہے تیری محبت رات بھر کی ہے!"

——— ہاں، اے کافرہ، گائے جا، گائے جا، نظروں سے دل برمائے جا، اور میرا ایمان و تقدس ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ بیشک میں یہ جانتا ہوں کہ ایک رات ضرور ایسی آئیگی جس رات میں میں تیری عشوہ سامانیوں اور حسن کی فریب کاریوں دلنوازیوں کو نہ خریدا سکونگا ——— مگر میں اس منحوس وقت کا تصور ہی اس وقت کیوں کرنے لگا ———"

محفل رقص و سرود آراستہ تھی عشرت کے سامان برپا تھے۔ رقاصہ کے چھاگلوں کی چھما چھم اور نور د امارت کے جلووں سے محفل یکسر جنت نگاہ اور فردوس گوش بن رہی تھی۔ شعلۂ حسن لرز رہا تھا۔ رقصاں و پراں۔ ایک ایک ضرب قدم پر جذبات پامال ہو رہے تھے اور جب وہ آنکھوں میں واقعی ایک خواب کی سی نشیلی کیفیت پیدا کر کے بول نکالتی:۔

"مجھے معلوم ہے تیری محبت رات بھر کی ہے!"

تو محفل پر ایک عجیب وارفتگی طاری ہو جاتا۔

ملازم نے نوجوان کی طرف بڑھکر کان میں کہا "سرکار وہ بیراگی کہہ رہا ہے کہ میں ضرور آپ سے ملونگا اور کہتا ہے سرکار! کہ وہ آپکا بچپن کا ساتھ کھیلا ہے!"

لاآلی کی آواز خاموش تھی؛ فضا میں مست کن نشیلی رعنائی کیفیت ہنوز طاری تھی۔ اور وہ اب کسی قدر تھک سی گئی تھی اسلئے سستانے کے لئے نیم دراز ہو گئی ایک فرش گل پر جو اسی کے لئے سجایا گیا تھا۔ محفل پر ابھی تک ایک نیم مدہوشی کی سی کیفیت مسلط تھی۔ حسن اور راگ دونوں جادو تھے پھر کس کی مجال تھی کہ کشاکش

کرتا اور ایمان و آرزو کی شہادت دیئے بغیر گلو خلاصی کرا لیتا۔

قیصر ذرا جھلّایا اور محفل سے اُٹھ کر ملاقات کے کمرے میں آ گیا۔

"مجھے پہچانتے ہو، قیصر؟"

سامنے سنیاسی کھڑا تھا، ہرچند کہ وہ صورت نہ پہچان سکا لیکن آواز۔ ہاں یہ گوش آشنا ضرور تھی۔ اس مختصر عرصے میں قیصر نے نہ معلوم کس قدر مناظر دیکھے تھے اور کیا کیا شکلیں اس کے ذہن میں آ کر نکل گئی تھیں اس لئے وہ ابھی طرح شکل نہ پہچان سکا۔ مگر یکایک اس کا حافظہ عود کر آیا اور ایک ہی لمحہ میں نہ معلوم کتنی دنیائیں اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئیں۔ کیسے کیسے نقشے اور زندگی کے کیسے کیسے مرحلے تھے جو پس منظر میں تھے یکایک اُبھر آئے اور وہ بیتاب ہو کر سنیاسی سے لپٹ گیا۔ ایک مستقل چیخ تھی جو اُس کے مُنہ سے نکلی ——

"او بے وفا، نہال!"

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور عرصے تک سسکیاں تھیں۔ وہ عالم بے ستی نامہ و پیام کا کام کر رہی تھیں۔

نہال سنگھ آج سے دس بارہ سال پہلے ایک مشہور دولتمند عیاش تھا۔ اس کے والدین اس کے لئے کافی مال و زر چھوڑ گئے تھے اور وہ ان کی دولت سے حسن کی تمام دلآویزیاں جو روپیہ خرید سکتا ہے، حاصل کیا کرتا تھا۔ واقعہ نہایت مختصر طور پر یہ ہے کہ وہ اور نوجوان عیش پرستوں کی طرح لالی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا مگر لالی کا دل تو لالی کا دل تھا، وہ کیسے پابندی قبول کر لیتا اور صرف ایک نوجوان کا ہو کر رہ جاتا۔ نہال تو لالی سے دل کی بات کہہ سکتا تھا کہ مجھے تجھ سے پیار ہے۔ اور بیحد سخت۔ مگر لالی تو ایک طوائف تھی اور اس لئے وہ کب اس کا جواب انہی لفظوں میں دے سکتی تھی اور دیتی تو ضرور تھی مگر حقیقت سے تو وہ خالی ہوتے تھے —— نتیجہ نتیجہ کیا ہونا تھا۔ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ نہال سنگھ نے دُنیا کو تیاگ دیا اور اس رات کے بعد کسی نے اُس کی شکل نہ دیکھی جب لالی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مست شباب بازو قیصر کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا "میں تمہاری اسیر تو ہوں نہیں۔"

قیصر کو اس بات کا ملال تھا اور ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اُسے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ہرچند کہ قیصر کو لالی کا حسن جلوہ فروش ہر لمحہ حاصل تھا لیکن نہال کی یاد اسے اکثر ستاتی رہتی تھی مگر جونہی وہ لالی کے سامنے آتا سب کچھ بھول جاتا۔ اپنی ہستی کو ہی بھول جاتا۔ مگر اب نہال کو سامنے دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا اور بیقرار ہو کر اس نے سنیاسی کو پکڑ کر اندر گھسیٹتے ہوئے کہا:-

نہال لالی آج بھی تیری ہی ہے اور حاضر ہے۔

اندر چل۔ رقص کر رہی ہے۔ اسی ایوان میں،

چل اندر!"

"میں اسے ہی لینے آیا ہوں،" نہال نے آہستہ سے کہا۔ اور قیصر اس فقرہ کو شسدر و حیران اس کے چہرے کی طرف تکنے لگا اور کچھ زیادہ سمجھ نہ سکا۔

سنیاسی کی وحشیانہ صورت اور بزمِ نشاط!

ہر ایک محوِ حیرت تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ جٹا دھاری سنیاسی کہاں سے آ کودا، یہ محفلِ عشرت اس نے کیوں برہم کرنے کی ٹھانی۔ لالی اس وقت کھڑی ہوئی اپنی ٹھوکروں سے سو سو فتنے جگا رہی تھی اور دلِ عشق کی آگ سے جل رہے تھے۔ اس نے سنیاسی کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالی مگر ذرا جھجک سی گئی۔ کچھ رقص کیا اور پھر ٹھٹکی اور بس تصویر کی مانند کھڑی ہو گئی۔

قیصر، نہال، کو مسند کے قریب لایا مگر اس نے ہاتھ کو جھٹک کر چھڑا لیا اور سیدھا لالی کی طرف بڑھا۔ اُسکی نگاہوں سے وحشت اور خونخواری کی چنگاریاں اُبل رہی تھیں، اس وقت جو آگ اس کے دل میں سلگ رہی تھی اس کی تپش سوزاں سب محسوس کر رہے تھے۔ لالی تھرتھرا رہی تھی، کانپ رہی تھی اور جانتی بھی نہ تھی کہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ بس اتنا اس نے ضرور محسوس کیا کہ وہ کسی اونچائی پر کھڑی ہے اور نیچے گہرا غار ہے اور بس اس کھائی میں گرا جاہتی ہے سر چکرا رہا ہے اور قدم کو اب لغزش ہوئی اور اب ہوئی۔ اس کے نازک قدم بوجھل ہو گئے۔ لبوں پر خشکی آ گئی اور وہ گرنے کو ہوئی۔ مگر سنیاسی اُسے تھامے ہوئے تھا۔ مجلسِ نشاط کا ہر چہرہ مکروہ اور ذلیل نظر آ رہا تھا۔ سنیاسی کو اس نے ایک حقارت آمیز نظر سب کے پھٹکارے ہوئے مُردوں جیسے سفید چہروں پر ڈالی۔ سہم آلود اور قہر آفریں نگاہ سے لالی کی طرف دیکھا اور بکنے لگا:-

"یہ سب جھوٹے ہیں۔ دنیا کے ذلیل کتے۔ کمینے۔ اوباش۔ یہ مکر و فریب کے دلّال ــــــ لالی یہ تیرے کالے کالے بال۔ یہ لال لال ہونٹ۔ یہ تیرا سبک نقشہ۔ یہ سراپائے جمال۔ یہ میٹھے میٹھے گیت۔ مدبھری آواز۔ واہ واہ کا شور، اس تمام ہنگامہ کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے سب فریب ہے اور نہایت مکروہ دھوکہ، اس دھوکہ کو چھوڑ لالی۔ میں ان سب کی اصلیت سے واقف ہوں۔ یہ سب نقش خیالی ہیں۔ اور تجھے جن مکروں نے فریفتہ کر رکھا ہے وہ دھوکہ ہے ان سے ہوشیار ہوجا۔ آخر ان فریبوں سے تو کب تک کھیلتی رہے گی۔ تو، لالی کب تک ان تاریکیوں میں بھٹکا کریگی۔ چل، کہ میں تجھے راستہ دکھانے آیا ہوں" نور" کا۔ ہمیشہ قائم رہنے والی روشنی کا۔ آ! کہ میں تیری رہنمائی کروں، بس آ میری طرف اور میرے ساتھ چلی چل، اگر تو چاہتی ہے کہ تیرا حسن ہمیشہ چمکیلا رہے اور کبھی پژمردہ نہ ہو تو اس حسن کی تلاش کر جو تمام حسنوں کا سرچشمہ ہے۔ ابدی جمال بس اگر تلاش کرتی ہے تو اسی حسن کی تلاش کر ــــــ اور یہ تیرے جھوٹے چاہنے والے تعریفوں کے پل باندھنے والے لسان فطرتی۔ یہ تو بالکل ہی دھوکہ ہیں۔ فریب و مکائید کے محل میں قدآدم ستون۔ لالی۔ جب تیرے ہونٹ مرجھا جائیں گے۔ جب تیرے گلاب جیسے رخسار زرد پڑ جائیں گے اور اے لالی جب تو لالی نہ رہے گی تو یہ حسن کے بندے تجھے بے یار و مددگار چھوڑ دینگے اور ان میں سے ایک بھی تیرا ساتھ نہ دیگا۔ بیٹی تو بھی انہیں ابھی سے چھوڑ دے۔ نور کے راستہ پر گامزن ہوجا جو تجھے سدا رہنے والی خوشی سے ہم کنار کرادیگا۔ ہے تو وہ دشوار گذار معصیت کی تمام جلوہ فروش آرائشیوں اور رونقوں سے معرّا اور بہ ظاہر تاریک اور تنگ مگر وہ تجھے سچی راحت اور ہمیشہ رہنے والی خوشی سے گلے ملادیگا۔ یہ دنیا تیاگے بغیر یہ ابدی مسرت تجھے کیسے مل سکتی ہے؟ لالی چل، میری بچی!"

لالی نے پہلے تو ذرا مدہوشی کے ساتھ اور پھر استعجاب کے جذبات کے ساتھ ان باتوں کو سُنا، سنا کیا، سُن تو خود اس کے ضمیر کی آواز بازگشت تھی۔ جب وہ تنہائی میں ہوا کرتی تھی تو اکثر یہی باتیں دل میں دوہرایا کرتی تھی اُسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ گناہ کی جو زندگی بسر کر رہی ہے وہ حقیقی مسرت سے مطلق خالی ہے۔ بیشک زندہ ہے وہ۔ مگر روح غم سے آلودہ ہے۔

وہ دوسری طوائفوں سے کہا کرتی تھی "دنیا میں ہر عورت کا بیاہ ہوتا ہے میرا بھی بیاہ ہوا ہے مگر غم سے اور گناہ سے۔ کیونکہ جہاں گناہ ہے وہاں غم کا ہونا لازمی ہے۔ غم نے مجھ پر قابو پالیا ہے اور ہر طرف غم و ملال کی تصویریں مجھے دکھائی دیتی ہیں۔ محفل رقص میں جب حُسن بیں نظریں میرے تماشے میں بیخود و محو ہوجاتی ہیں مجھے غم کا دیوا اپنا بھیانک مُنہ کھولے سامنے دکھائی دیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے بچ کر نکل جاؤں مگر نہیں ہوسکتا ایسا مجھ سے۔ جب رقص سے میں واپس آتی ہوں تو میرا جسم تھکا ہوا اور دل غم سے نڈھال ہوتا ہے۔ اور جب میں سونے کے کپڑے پہنکر اپنی خوابگاہ میں داخل ہوتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی میرے بستر پر کوئی دراز ہے۔ اس وقت بھی جب دوسری عصمت فروش عورتیں اپنے پرشکن بستروں پر تنہا ہوتی ہیں میں حیران ہوکر دیکھا کرتی ہوں کہ یہ کون ہے جو میرے ساتھ ہم خواب ہے۔ اس کے چہرے سے میں کپڑا اُٹھاتی ہوں۔ آہ! مجھے غم کا چہرہ بالکل صاف نظر آتا ہے۔ تھرّا لودنگاہوں سے وہ میری طرف گھورتا ہے اور میں خاموشی سے اپنا وجود اس کے بازوؤں میں نذر کرکے بے بس سی ہوجاتی ہوں۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آتا ہے۔ میں کہتی ہوں شکر ہے اب چھٹکارا ملا۔ لیکن جب میں حمام میں جاتی ہوں تو وہاں بھی وہ مجھے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ سب کی نظروں سے چھُپ کر وہ مجھے عریاں حالت میں دیکھتا ہے۔ میرے دست و بازو کو جو گناہ سمیٹنے کیلئے ہمیشہ کھُلے رہتے ہیں۔ سینہ کو جو کینہ سے پُر اور صفائی سے عاری ہے۔ پنڈلیوں اور رانوں کو جو گناہوں کا سنگھاسن ہیں۔ وہ مجھ سے لپٹ جاتا ہے بیقرار ہوکر ــــــ میری گردن پر بار بار بوسے دیتا ہے۔ سرد اور بے کیف، برودت مرگ سے مشابہ۔ اب میں بالکل نہیں شرماتی اور اس سے کہتی ہوں ــــــ "تنہائی کے رفیق اب میں تیری ہوں، صرف تیری!"

وہ جواب دیتا ہے" تو میری دلہن ہے!"

بیشک اس کا جواب صحیح ہے میں غم اور گناہ کی عروس ناشاد ہوں۔ پرورش بیشک میری نیکی میں ہوئی تھی مگر بیاہ ہوا گناہ کے ساتھ، بیاہ کا رشتہ پاک اور مقدس ہوتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اس میں ثابت قدم رہوں۔ تادم مرگ اسے نبھاؤنگی اور دھرم سمجھکر ایسا کروں گی اور پھر اسی کے ساتھ

ستی بھی ہو جاؤ گی تاکہ دوسری دنیا میں ــــــ اگر کوئی ہے ایسی کوئی چیز ــــــ بھی اسی کے ساتھ رہا کروں"

یہ خیالات تھے جو اُس وقت لاؔلی کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ گاتے ہوئے رقص کرتے ہوئے اور ان حیاسوز لمحوں میں بھی جب حسن دنیا کی دولت کے لئے اپنے سراپا کو کسی بھان کے سپرد کر دیتا تھا۔ یہی خیالات اُسے ستایا کرتے تھے۔ جو کچھ اس وقت سنیاسی نے کہا دراصل اس کے ہردے کی گونج تھی۔ اور اسی کے خیالات کی آواز بازگشت تھی۔

ایک بھرّائی ہوئی آواز میں اس نے سنیاسی سے کہا "گروجی، مجھے کہاں لے جائیںگا آپ؟"

"میں تجھے نور کے آغوش میں لیجاؤنگا ــــــ بہت دُور رامرناتھ جی کے مندر میں بھکشوؤں کی خانقاہ میں یا اس سے بھی کہیں آگے جہاں ایک خانقاہ ہے نور کی بیٹیوں کی، خدا برکت دے ان کی عبادتوں اور انتھک ریاضتوں میں۔ پاک ہوان کی زندگی۔ اور آزاد ہوں ان کے خیالات وسواس دُنیا سے۔ میری بچی میں تجھے بھی وہیں لیجاؤنگا اور تجھے غرق نور بنا دونگا۔ مایاوتی تیرے یہ لمبے لمبے گھنیرے معطر بال کاٹ دیگی۔ یہ تیری کالی ناگنیں جو گناہوں میں تیری مدد کرتی ہیں اور عفونت وکراہت کی پردہ دار ہیں۔ اور تجھے نور ومسرت ابدی سے ہمکنار کرنیکے لئے آراستہ کریگی۔ ابدی راحت انت نروان اور عرفان الٰہی تجھے حاصل ہو جائیگا بچی اور تیری روح جو مسرت کی تلاش میں تڑپ رہی ہے یہی مسرت ضرور حاصل کرے گی"

لاؔلی نے کہا۔ "گرودیو! مجھے اپنی یہ چادر دیدیں میں گناہ کے اس لباس کو یہیں چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ یہ زیور۔ یہ قیمتی معطر لباس و پشواز اب میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ یہ سب یہیں کی چیزیں ہیں اور یہیں رہ جائیں گی"

لاؔلی نے ذراسی دیر میں تمام سامان عیش ونشاط اُتار کر رکھدیا اور سنیاسی کی پُرانی چادر کو اپنے لئے پسند کر لیا۔ بال بکھر کر کاندھوں پر آپڑے اور چہرہ نور سے تمتمانے لگا۔ وہ جوش میں بھری ہوئی تھی اور سنیاسی آنکھوں سے مسحور کر رہا تھا۔

قیمتی کپڑوں کو لاؔلی نے آگ لگادی اور سنیاسی کے ساتھ محفل سے باہر نکل آئی۔ حیرت سے سب ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے اور یہ سب آناً فاناً ہو گیا۔ کسی کی اتنی طاقت کہاں تھی کہ اٹھکر سنیاسی یا لاؔلی کو روک سکتا۔

(۳)

سنیاسی کو خانقاہ میں آئے ہوئے کئی روز ہو گئے ہیں لاؔلی کو وہ اور عورتوں کے ساتھ خانقاہ میں داخل کرآیا ہے اور کچھ دنوں سے یہ خبر بھی مل رہی ہے کہ اس میں شوق ریاضت بہت بڑھا ہوا ہے اور دوسری عورتوں کی نسبت وہ کافی ذوق وشوق ظاہر کر رہی ہے بلکہ بعض حالتوں میں تو وہ ان سے بڑھ بھی گئی ہے۔ سنیاسی کو اس بات کی مسرت تھی۔ کہ نور کی بیٹیوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کئی روز تک آرام کرنے کا اُسے کفارہ بھی ادا کرنا تھا اس لئے سنیاسی نے نہایت تندہی کے ساتھ سخت ریاضتوں کا شبانہ روز سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ ریاضت برابر جاری تھی مگر لاؔلی کا خیال اُسے بار بار آکر ستا رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ اب لاؔلی کا خیال کس وجہ سے آتا ہے؟ اب اس کا آنا یقیناً شیطانی چالاکی ہے۔

ایک رات کا ذکر ہے وہ میدان میں عبادت کر رہا تھا کہ اس کی آنکھ جھپک گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ لاؔلی اُس کے بازوؤں میں ہے۔ اس کے لانبے لانبے بال پیچھے کو لٹکے ہوئے ہیں آنکھوں میں نشہ کی سی کیفیت چھلک رہی ہے۔ اس کا مُنہ اسقدر قریب ہے کہ گرودیو کو اس کا گرم گرم تنفس برابر چہرہ پر محسوس ہو رہا ہے، آہستہ آہستہ اس کا مُنہ جُھکا اور دونوں کے لب پیوست ہو گئے ــــــ سنیاسی کی آنکھ فوراً کھل گئی اور وہ تپسیہ چھوڑ کر اس خواب پر دیر تک غور کرتا رہا۔

(۴)

اب اس کا دل تپسیہ میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ کوٹھری کے دروازے سلوں سے ڈھانک کر وہ پہروں آسن جما کر عبادت الٰہی میں مصروف ہوتا مگر کاشانۂ حُسن سے آگے اسکی روح کی پرواز اب ممکن ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اپنی پچھلی زندگی کے جملہ واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے پردۂ دماغ پر بے یکان نظر آتے اور نکل جاتے تھے۔ اس کے بعد تاریکی چھا جاتی اور اس ظلمات میں اگر کوئی نور کی رمق اُسے دکھائی پڑتی تو وہ صرف لاؔلی کا چہرہ ہوتا۔ وہ اُسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں

دھیان کے عمق میں وہ اپنے آپکو گم ہوا پاتا تھا۔ اور اکثر اوقات وہ دل میں [illegible] چتا ـــــ "دنیا، اگر ایک طرح دیکھا جائے تو ہے کتنی اچھی چیز ـــــ میں نے اسے تیاگ کیوں دیا۔ یہ احمقانہ حرکت نہ تھی تو کیا تھا۔ کیا لالی مجھے خوش کرنے کیلئے دُنیا میں کافی چیز نہ تھی۔ کون بدنصیب ہے جو لالی کے ساتھ مسرور و شاداں زندگی اس دُنیا میں نہیں گذار سکتا۔"

"لالی! ـــــ ہاں، لالی، ہرنوں جیسی بڑی خوبصورت آنکھوں والی ہستی۔ شاداب رسیلے ہونٹ۔ لانبی گھنیری زلفیں گول گول چکیلے بازو۔ کون ہوسکتا ہے جو ان چیزوں کو پیلے اور مست نہ ہوجائے کیسی حماقت کی میں نے۔"

ایک روز اسی ذہنی کشمکش میں سنیاسی مبتلا تھا اور ایک پتھر پر کوٹھری کے اندر ساکت بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ باہر سے کسی نے دروازے کے پتھر کو ٹکرایا۔ آج اس کی راہبانہ زندگی میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی نے اسکی عبادت میں مخل ہونے کا خیال کیا تھا اور دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک امیروں اور دولتمندوں کے دروازے پر دی جاتی ہے۔ فقیر کا دروازہ اگر بند ہے تو کسی کو کھلوانا نہیں چاہیئے۔ اور اگر کھلا ہے تو دستک و دربان کی قید سے آزاد ہے۔

سنیاسی نے غصّہ میں بھر کر پتھر کو ہٹایا۔ یہ ایک بڈھا سنیاسی تھا جو عورتوں کی خانقاہ میں رہتا تھا۔ سر سے پیر تک ایک لبادہ میں لپٹا ہوا تھا وہ اور ایک دھیمی قبر کی سی آواز میں وہ بول رہا تھا۔

"گرو دیو ـــــ! ـــــ لالی ـــــ لالی ـــــ لالی جو آئی تھی، وہ اب ہم سے رُخصت ہو رہی ہے، شاید!"

"لالی رُخصت ہوا چاہتی ہے ـــــ کیا دوبارہ دُنیا کی ناپاک زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے؟"

"نہیں گرو دیو، وہ مر رہی ہے۔ اُس کا دم آخر ہے گرو جی!"

سنیاسی اندھا دھند عورتوں کی خانقاہ کی طرف دیوانہ وار بھاگا۔ سنیاسنیں لالی کو گھیرے کھڑی تھیں جسکا دم نکل رہا تھا۔

گرو دیو کو سامنے آتا دیکھکر سب عورتیں چپ چاپ الگ الگ ہوگئیں۔ صرف ان کی منتظمہ مایا دئی لالی کے پاؤں کی طرف کھڑی رہی۔

لالی نے آنکھیں کھولدیں۔ اسے اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا شاید۔ دُنیا بالکل دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی اسے۔ آہستہ سے اُس نے بولنے کی کوشش کی۔ "یہ باغ کسقدر دلکش ہے ـــــ یہ [illegible] شفاف نہریں۔ یہ انکا موتی جیسا پانی۔ یہ سبز و شاداب [illegible] یہ میرا مسکن حقیقی ہونگے، اور یہاں میں ایک کٹیا بناؤنگی اور نور کی پرستش کیا کرونگی۔ آہ! میرے گناہ اب پاک ہوگئے۔ پاک ہیں یہ نور کی بیٹیاں جو میرے گرد کھڑی ہیں۔ ان پہ نور کی برکتیں نازل ہوں ـــــ،"

"لالی!" سنیاسی سے ضبط نہ ہوسکا اور بالکل چیخ نکل گئی اسکی۔ "میں تو یہاں کھڑا ہوں۔"

لالی نے گھبرا کر دیکھا۔ اُسکا سانس اکھڑ چکا تھا۔ ایک دفعہ پھر اسکی آنکھوں میں بینائی آگئی تھی اور اُس نے سنیاسی کو ایک نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "گرو دیو! یہ باغ یہ چمن لالہ زار میرے لئے ہیں۔ یہ مقدس بھکشو میرے استقبال کے لئے آئے ہیں۔ ان کے پاس پھولوں کے گجرے ہیں۔ کیسے دلکش، کسقدر سہانے اور بھینے، انھوں نے نور کے دریا میں پرورش پائی ہے اور نور ہی کے پانی سے سینچے گئے ہیں ـــــ الوداع، اے دُنیا، الوداع۔ گرو دیو میں جاتی ہوں، میں نے نور کو پالیا ـــــ گرو، میں تیری منتظر رہونگی!"

ایک ہچکی آئی اور لالی نے دم توڑ دیا۔

سنیاسی لپٹ گیا لاش سے۔ اُسکا صبر و قرار جاتا رہا تھا۔

"لالی، تو کہاں جاتی ہے، یہ بھی ایک فریب ہے۔ مایا ہے اور مایا جال سب ہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ لالی مت جا، نور کی طرف مت جا۔ تیرا نور ادھر ہے۔ میں تجھے خوش رکھونگا۔"

لالی خاموش ہوچکی تھی اور جواب سے عاری تھی۔ گرو دیو جھک گیا لالی کے ہونٹوں پر اور یہ اقرار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ "لالی تو جانتی ہے مجھے تجھ سے کسقدر محبت ہے" آہ مایا دئی، ظاہر میں مایا دئی نے پاپی مان کر سنیاسی کو ایک طرف دھکا دیدیا۔ "چل دور ہو یہاں سے مکار فریبی!" اعورتیں ملامت ونفریں کر رہی تھیں، سنیاسی پرے ہٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا چہرہ مسخ ہوگیا ہے!!

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

بڑھ کے نیچے اب بھی بودھ کی سنگین مورت رکھی ہوئی دھوپ میں تپا کرتی ہے اور شاید وہ مسکراتی سی معلوم ہوتی ہے ـــــ نہ جانے کس قصہ پر؟!

ظفر قریشی دہلوی!

شوہر پرست بیوی

بابو فرزند علی دولت و اقبال کے لحاظ سے تو کچھ زیادہ خوش نصیب تھے نہیں البتہ اولاد کی طرف سے انہیں پورا اطمینان تھا۔ پانچ بچے ہوئے پانچوں چراغ۔ تعلیم بھی اپنی حیثیت سے زیادہ دلائی اور تربیت تو ایسی دی کہ انسان بنا دیا۔ یہ انہی کا کمال تھا کہ لڑکے بی۔ اے ہونے کے بعد بھی اپنے بڑوں کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ جو پہنا دیا پہن لیا جو کھلا دیا سر جھکا کر کھا لیا۔ اور جو کہہ دیا کیا مجال ہے کہ کبھی اس کے خلاف کیا ہو۔ لڑکیاں انھیں تو ایسی کہ باوجود انگریزی تعلیم کے لونڈیوں کی طرح گھر کا سارا دھندا کرتیں۔ کھانا پکاتیں کپڑے سیتیں۔ دکھ درد میں آپس میں ایک دوسرے کی تو کیا محلے والیوں تک کی خدمت کرتیں۔ کنوار پتے میں نہ انہیں کسی نے قہقہہ لگا کر ہنستے دیکھا، نہ آج کل کی فیشن ایبل لڑکیوں کی طرح بنتے سنورتے۔ جب تک وہ اپنے گھر کی نہ ہو گئیں کنبے رشتے کی زیادہ بڑی تقریبوں میں بھی انکے جانے کی بندش رہی۔

سلیمہ پانچوں بہن بھائیوں میں چھوٹی جتنی سب کی لاڈلی تھی اتنی ہی سمجھدار، اطاعت گزار اور سلیقہ شعار بھی تھی۔ عام طور پر جو گھر میں سب کا لاڈلا ہوتا ہے لڑکا ہو یا لڑکی اور گھر امیر ہو یا غریب اس میں سینکڑوں تعلیمی اور تربیتی عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سلیمہ نے ثابت کر دیا کہ اگر فطرت اچھی ہے تو پیار و محبت کے ماحول میں کیریکٹر زیادہ بہتر بن جاتا ہے۔ سیرت کے علاوہ اس کی صورت بھی اپنی دوسری بہنوں کی نسبت زیادہ دلفریب تھی۔ بابو صاحب شادی بیاہ کے معاملہ میں پرانے زمانہ کی رسمیات کے پابند تھے۔ ان کی رائے تھی کہ نسبی شرافت کے بعد صرف نیک چلنی کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ لڑکی میں گھرداری کا سلیقہ خاوند کی اطاعت کا شعور اور لڑکے میں تھوڑا سا مذہبی ذوق۔ کمانے کی قابلیت اور بیوی کو بیوی سمجھنے کا شوق ہو۔ تعلقات ازدواجی میں نہ وہ دولت کو مقدم سمجھتے تھے نہ حسن کو تندرستی کا سوال ایک ہندوستانی دماغ میں آنے کی چیز ہی نہیں نہ ہمارے بڑوں نے کبھی اسے اہمیت دی نہ آج اس پر کوئی توجہ ہے۔ گئے وقتوں میں عورت و مرد سب کی عام طور پر تندرستیاں اچھی تھیں اور شادی کا مقصد خانہ آبادی ہوتا تھا اس لئے یہ وہم بھی نہیں ہوتا تھا کہ بیمار لڑکی کسی کے پلے باندھ دی جائے گی یا داماد کا دولتمند ہونا کافی ہے۔ مگر اس کمزوریوں اور بیماریوں کے زمانہ میں روپیہ۔ قابلیت حسن وغیرہ ساری چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ نہیں دیکھی جاتی تو وہ چیزیں جن پر حقیقی ازدواجی مسرتیں منحصر ہیں۔ ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ تندرستی اور وہ بھی مرد کی۔

چنانچہ اُنھوں نے اپنے اسی اصول کے ماتحت دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ بیٹ کا پھل کہ چاروں اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد۔ ایک سلیمہ باقی تھی والدین کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اسے پہلو سے جدا کریں لیکن جوان لڑکی کو کون گھر میں بٹھا سکتا ہے۔ مولانا عارف کے چھوٹے لڑکے میاں ماجد سے نسبت ٹھیری۔ دونوں خاندان شریف۔ خوش گزر۔ مذہبی۔ تیاری میں کیا دیر تھی۔ شب برات کے مہینے میں بات ہوئی۔ عید کی تیرہویں تاریخ نکاح ہو گیا۔ اور بی سلیمہ خاتون۔ ماں۔ بہنوں بھاوجوں وغیرہ کو رسمی روتا چھوڑ کر نئے گھر نئے لوگوں میں چلی گئیں۔ اِدھر اُداسی تھی اُدھر خوشیاں مگر اوپر والوں کے جذبات کی یہ نمائشیں چند روزہ اور عارضی ہوتی ہیں۔ اصلی شادی و غم تو ان کا ہے جو رشتہ مناکحت میں جکڑے گئے ہیں اور جس کا انحصار محض آپس کی محبت۔ اتفاق اور برتاؤ پر ہے۔

شادی کے وقت سلیمہ کی عمر سولہ برس کی تھی اور میاں ماجد کی اُنیس ۱۹ سال کی تعلیم تو ایف۔ اے سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی لیکن مولانا عارف کے اثر و رسوخ کی برکت سے انہیں ایک دفتر میں ۶۵ روپے کی ایک جگہ مل گئی۔ اس زمانہ میں کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی قیمت تیس چالیس سے زیادہ نہیں لگتی۔ ایسا غنیمت تھا۔ سلیمہ کا بیڑا بھاگوان سمجھا گیا اور بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ موزے کا گھاؤ میاں جانے یا پاؤں۔ اندرونی تکالیف کا حال تو یہ دونوں جانیں یا خدا لیکن بظاہر بی سلیمہ شمع تھیں اور سارا گھر پروانہ۔ دیکھنے والوں کے نزدیک میاں بیوی کی محبت قابل رشک تھی۔ میاں ماجد بیوی کی ہر خواہش کی قدر کرتے تھے اور سلیمہ میاں کی رضاجوئی ہر معاملہ میں مقدم سمجھتی تھی۔ ماجد کے والد۔ والدہ۔ بہنیں اور بھاوجیں سلیمہ کی سلیقہ مندی اور فرمانبرداری سے بے حد خوش تھے۔ صرف ماجد کی

والدہ ساس ہونے کا وقار جمانے کیلئے البتہ عام عورتوں کی طرح کبھی کبھی ناراض ہو جاتیں تو اس کا تدارک بآسانی ہو جاتا۔ اور سلیمہ نہایت خوش سلوبی سے ان کی خفگی کو برداشت کر لیتی۔

ماجد صاحب بہت خاموش۔ سادہ مزاج اور شریف نوجوان تھے۔ ان کی عادتیں معین۔ ان کی ضروریات مختصر اور خواہشات بالکل محدود تھیں۔ اس عمر میں جبکہ خوشحالی سے بسر کرنے کا سامان بھی ہو جو امنگیں اور جوش ہونی چاہیئے ان میں مطلق نہ تھی۔ نہ پان سگرٹ اور چائے کا شوق، نہ سینما اور دوستوں سے دلچسپی۔ دفتر سے گھر آتے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی اور لیٹ گئے۔ جی گھبرایا تو کوئی کتاب لے بیٹھے۔ تنہائی زیادہ پسند تھی۔ الگ سوتے تھے۔ صبح بڑا نا نہ نہانا۔ نماز پڑھنا اور قرآن شریف کی تلاوت ان کا شغل تھا۔ بہت ہی بے لاگ زندگی بسر کرنے والے مرنجان مرنج آدمی تھے۔ گھر بار باہر شاید ہی کبھی کسی سے تیز ہو کر بولے ہوں۔ بھتیجے بھانجے اکثر انہیں لپٹتے تھے مگر ان سے بھی کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ خون سے ان ہنگاموں کا جواب ان کے پاس فقط ایک ہلکی سی مسکراہٹ یا پاس پر ہاتھ پھیر نا تھا۔ ایک مرد کی یہ ایسی صفات ہیں جن سے کم بیویوں کو سابقہ پڑتا ہوگا۔ یہ اسباب ظاہر اس فردوسی فضا میں رہ کر سلیمہ کے لئے کسی مادی شکایت کا موقع ہی نہیں پیدا ہوا اور پانچ سال اسی طرح گزر گئے۔

بہار کے بعد خزاں اور سکون کے بعد طوفان انسانی زندگی کیلئے لازمی ہے۔ یہ عارضی اور مصنوعی اطمینان آخر ایک مصیبت اور پریشانی اور قلبی تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوا شادی کو پانچ برس ہو گئے تھے کہ یکایک میاں ماجد کو اپنی بیوی کی صحت کا فکر ہوا۔ وہ اچھی خاصی تندرست تھی۔ چہرہ پر شباب کا حسن۔ نگاہیں متبسم۔ نہ کھانے پینے میں فرق۔ نہ پہننے اوڑھنے کے انداز میں تبدیلی۔ لیکن وہ آتے اور جاتے یہی کہتے کہ دلھن بیمار ہیں۔ بیسیوں حکیم اور ڈاکٹر بدل ڈالے سینکڑوں دوائیں کھلا پلا دیں۔ سلیمہ غریب ان کی محبت اور ہمدردی سے مغلوب ہو کر کچھ نہ بولتی۔ بری سے بری دوا کو شہد کی طرح بے حجت پی جاتی۔ اگر اتفاقیہ طور پر میاں ماجد کی اس دوڑ دھوپ کا راز نہ کھل جاتا تو خدا معلوم سلیمہ اور کتنے دن تک اندھیرے میں رہتی۔ ہوا یہ کہ ایک حکیم صاحب کہیں باہر سے سلیمہ کے علاج کو بلائے گئے اور انھوں نے عام صحت کے متعلق کچھ پوچھنے کے بدلے ایسے سوالات کئے جن سے سلیمہ کھٹک گئی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ عقیل و فہیم اور پھر معاملہ اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھنے والا۔ کیوں نہ اصلی بھید کو پا جاتی۔ اصل چیز یہ تھی کہ شادی کو پورے پانچ سال گزر گئے تھے اولاد کوئی ہوئی نہ تھی اور ہندوستانی رواج کے مطابق اولاد نہ ہونے کا سارا الزام سلیمہ پر تھا۔ فطرت کا بھی عجیب مذاق ہے۔ مرد کی کمزوریاں بھی عورت کے سر تھوپی جاتی ہیں۔ سلیمہ اگر ماجد کے وظیفہ شوہری سے غفلت اور اس کے جنسی نقائص کو نظر انداز کئے ہوئے تھی تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ماجد اپنے کو بھول جائے اور سلیمہ شوہر کی مردانہ قوتوں سے بے نیاز ہو کر بچے بھی پیدا کرنے لگے۔

تاہم سلیمہ کو اپنی طبی معلومات کا دعویٰ نہ تھا گو وہ ابھی شبہ میں مبتلا تھی کہ ایک روز دوپہر کے وقت جبکہ ماجد کا گلوبند بنتے بنتے پلنگ پر لیٹ کر اس نے غنودگی کی حالت میں رضائی سے اپنا منہ ڈھانک لیا تھا۔ کمرے کے کواڑ بند تھے۔ صدر دالان سے کچھ آہستہ آہستہ باتوں کی آوازیں کان میں آئیں۔ ہوشیار ہو کر دروازہ کی درزوں میں سے جو جھانکا تو ساس نندیں اور جٹھانیاں سب جمع ہیں اور کسی اہم مسئلہ پر رازداری کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے۔ پانچ برس کے بعد گھر والوں کی اچانک بے رخی سے سلیمہ کے دل میں ایک بے چینی سی تو پیدا ہو ہی چکی تھی اب جو اس نے دیکھا میرے کمرے کی طرف نگاہیں ہیں اور کوئی تیوری چڑھا کر بات کرتی ہے تو کوئی منہ بنا کر۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور کواڑوں کی جھری سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی سلیمہ اور اس کی ساس نندوں میں کئی گز کا فاصلہ تھا اور باتیں چپکے چپکے ہو رہی تھیں۔ پوری گفتگو تو کیا سننے میں آتی۔ چند جملے وہ بھی ٹوٹتے ہوئے۔ ادھوتے کانوں میں پڑے۔ خوشدامن صاحبہ جن کو سب بہوؤں سے بڑھ کر سلیمہ کا چاؤ تھا فرما رہی تھیں۔ "بانجھ عورت...... بیوی خدا نہ کرے ...... مرد کے لئے گھن ہے ...... ماجد کی جان کوئی مجھ کو دو کھ رہے ...... میرا بچہ اس غم میں آدھا رہ جائے۔ اور میں مٹر مٹر بیٹھی دیکھا کروں نہیں بیوی اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔"

شوہر کی معصوم خواہش کا علم سلیمہ کو ہو چکا تھا۔ گھر کی کھسر پھسر سے بھی وہ ناواقف نہیں رہی تھی اور اپنی جنس کی ساری کمزوریاں بھی اس کے سامنے تھیں کہ یہ حوا کی بیٹیاں اپنی فطرت سے لاچار ہیں۔ خدا ان سے اپنی پناہ میں رکھے۔ یہ جہاں کسی کے پیچھے پڑیں۔ نیک بد۔ عذاب ثواب کا امتیاز مٹ گیا۔ اب جو اپنی

ساس کی زبانی اپنے بانجھ ہونے کا ناقابلِ معافی الزام سُنا تو زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ سر چکرانے لگا۔ اگر دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ نہ جاتی تو شاید گر پڑتی۔ ماجد نے پیدائشی کمزوریوں یا لڑکپن کی غلط کاریوں کو چھپانے کے لئے اپنے گھر والوں سے جو کچھ کہتے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے یا چاہتے ہوں گے اُن سب کا ایک دھندلا سا نقشہ سلیمہ کے ذہن میں کھنچ گیا۔ شریفوں کی بیٹی۔ مرنے بھرنے والی۔ شوہر کی پُجارن خواہ وہ مٹی کا ہی کیوں نہ ہو۔ دائم ہو کر رہ گئی۔ سچا ہے اس کے کہ میاں ماجد شرمانے اور مرد بن کر اس کی آبرو سچانے وہ عورت ہو کر اُن کی پردہ پوشی کرتی رہی۔ اتنا احسنہ ہوا کہ اسے گھر والوں اور ماجد کے رشتہ داروں کے سامنے آتے ہوئے حجاب آنے لگا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس الجھن کے آخری نتیجہ کا خیال اس کی ہمت کو پست کر رہا تھا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک رات کو شاید کوئی دس بجے ہوں گے، ماجد صاحب اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے خرّاٹے لے رہے ہیں اور سلیمہ پڑوس کی ایک یتیم لڑکی کیلئے روئی کی کُرتی سی رہی ہے کہ برابر کے کمرے میں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ یہ کمرہ ماجد کی والدہ اور چھوٹی بہن سکینہ کے لئے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی مخصوص تھا۔ گھر کی عورتیں عموماً دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد یا رات کو سارے کام دھندوں سے فرصت پا کر اپنی انجمنیں آراستہ کیا کرتی ہیں۔ پانوں کی جگالی ہوتی جاتی ہے اور دنیا بھر کے عیب و صواب نکالے جاتے ہیں۔ سلیمہ کے ہاں بھی انہی اوقات میں بزم آرائیاں ہوتی تھیں۔ دن کو موسم کے لحاظ سے دالان یا صحن میں اور رات میں کمرے کے اندر یا بالاخانہ کی چھت پر۔ سلیمہ کی کبھی کن سوئیاں لینے کی عادت نہ تھی۔ جن عورتوں کو اپنے کیریکٹر پر اعتماد ہوتا ہے وہ دوسروں کی باتیں سُننا خصوصاً جبکہ ان میں رازداری کا شبہ ہو عیب سمجھتی ہیں لیکن معاملے کی اہمیت نے کچھ ایسی شدت پکڑلی تھی اور سلیمہ کے احساسِ خودداری کو اس قدر مجروح کر دیا تھا کہ اپنی ساس نندوں کے منہ سے سُننے کے لئے ہمہ تن گوش رہتی تھی۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے نکل کر اپنی خوشدامن کے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچی اور کان لگا دیئے۔ اس سے پہلے جو گفتگو ہو چکی تھی اُس کا تو سلیمہ کو علم نہیں، ہاں اُس نے جو سُنا تھا وہ یہ تھا۔

بڑی نند:۔ اماں جان! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ مگر اس میں ان بیچاری کا کیا گناہ۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ وہ نہیں دیتا کچھ اس کی مصلحت ہوگی۔

خوشدامن:۔ تو میں تھوڑی اسے کچھ کہہ رہی ہوں۔ شکایت تو اُس دینے والے ہی سے ہے۔ نہیں معلوم کس منحوس گھڑی بات ٹھہری تھی کہ شادی ہوئی تو ہوئی برابر ہو گئی۔ میرے تو پھول نہ کھلنے تھے نہ کھلے۔

بڑی نند:۔ خدا کی خدائی میں کس کو دخل ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ آپ اتنی بے آس کیوں ہوئی جاتی ہیں۔ اللہ اور اللہ کے حبیب سے اُمید رکھئے۔

خوشدامن:۔ بس بی۔ رہنے دو۔ سال نہیں دو سال نہیں پورے پانچ برس ہو گئے۔ ڈاکٹر حکیم ملا سیانے سب کو دیکھ لیا۔ ابھی تمہاری آس ہی نہیں ٹوٹی۔ ہوئی۔ کیا کوئی آسمان سے فرشتہ تمہاری بھاوج کو دو جیا کرنے آئیگا۔

بڑی نند:۔ میری دیورانی کو بھی تو دس برس کے بعد اللہ نے بیٹا دیا۔۔۔۔ اور جو میاں ماجد ہی ہیں۔۔۔۔۔۔ انہیں بھی تو کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔

خوشدامن:۔ لڑکی ہوش میں آ۔ تمہاری دیورانی کی اور بات تھی۔ بانجھ عورت کو کون بچہ دے سکتا ہے۔ اور یہ تم نے کیا کہا کہ ماجد کو بھی دکھانا چاہیئے۔ مردوں میں کیا عیب ہوتا ہے۔ ماجد جیسا لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملے۔ جیسی اس نے بیوی کی تابعداری کی ہے دوسرا کر تو لے۔ میں تو کہتی ہوں اب انہیں اللہ پر چھوڑ دو۔ نصرت علی کی لڑکی کو میں دیکھ چکی ہوں۔ تمہارے ابّا راضی ہو جائیں تو کل ہی بیاہ لاؤں۔

بڑی نند:۔ غریب ماجد کی کیوں مٹی خراب کرتی ہو۔ خدا جانے کیا بات ہے۔ اولاد کے ہونے میں ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ میں تو پھر یہی کہوں گی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

خوشدامن:۔ کیا کہا؟ ماجد کی مٹی خراب ہو جائے گی۔ بیٹی خدا سے ڈرو۔ تمہارے نزدیک میں ماں ہو کر بیٹے کا بُرا چاہتی ہوں۔ توبہ کرو۔ آج کل کی لڑکیاں دو حرف کیا پڑھ لیتی ہیں کہ خدا و رسول کے حکم کو بھی بھول جاتی ہیں۔ دیدے کا پانی ڈھل جاتا ہے۔ نوج۔ ارے ایسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تیری لڑکیاں جوان ہوں گی تو اُن کی شادی بغیر ڈاکٹر کے دکھائے کسی سے نہ کیجیو۔ لو بیوی اب مرد بھی ڈاکٹر حکیم کو دکھائے جانے لگے۔

یہ باتیں سن کر سلیمہ کا دل کانپ اٹھا جس بات کا کھٹکا لگا ہوا تھا سامنے آ گئی۔ ہندوستانی سماج کی ذہنیت سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ماجد کی والدہ کے یہ خیالات کتنے مناسب حال تھے۔ ماجد کے عقد ثانی کی تحریک اس کے لئے کس درجہ معاشرتی اور حق بجانب تھی۔ سلیمہ کو تعجب یہ تھا کہ میاں ماجد نے ایک لمحہ کیواسطے بھی اپنی حالت پر غور نہ کیا۔ گھر کی فضا میں وہ ایسے مسحور ہوتے کہ قال اللہ وقال الرسول کا سارا جذبہ عورتوں کے جھرمٹ میں فنا ہو گیا۔ لیکن فی الحقیقت اس امر خاص میں وہ زیادہ قصور وار نہ تھے۔ ماحول کا اثر انسان پر پڑتا اور ضرور پڑتا ہے۔ آزاد سے آزاد خیال آدمی بھی اپنے گرد و پیش سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پھر ماجد جیسا آپا، قسم کا شخص۔ شرمیلا۔ مردانہ صحبتوں سے بھاگنے والا۔ قدامت پرست جنسی لذتوں سے محروم۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ سلیمہ پر ان کی مغلوبیت کا اظہار ہونے لگا۔ ماجد صاحب نے اپنی والدہ کی تجویزوں کے سامنے سر جھکا دیا۔ میاں بیوی کے ظاہری تعلقات غیر معمولی خاموشی سے بدل گئے۔ آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے جو موانست کا اظہار ہوتا تھا اس میں بھی فرق آ گیا۔ یہاں تک کہ سلیمہ خاتون اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنے میکے چلی گئیں۔ میاں ماجد کا قاعدہ تھا کہ جب تک بیوی اپنے والدین کے ہاں رہتی تھیں روزانہ جایا کرتے اور چوتھے پانچویں دن کے بعد گھر چلنے کا تقاضہ شروع کر دیتے۔ اس مرتبہ ان کی یہ عادت بھی بدلی ہوئی نظر آئی۔ گھر چلنے پر اصرار تو کیا بیوی کے پاس جانا بھی بے تکلف نہ رہا۔ رسمی طور پر اتوار کے اتوار با دل ناخواستہ جاتے خاموش بیٹھے رہتے اور چلے آتے۔ بیس دن گزرے، مہینہ گزرا۔ پورے چھ ہفتے ہو گئے اور میاں سلیمہ سے گھر چلنے کا نام نہیں لیتے۔ آخر بے غیرت بن کر خود سلیمہ نے گھر چلنے کو کہا۔ ماجد صاحب بہت گھبرائے اور بات بنا کر ٹالنا چاہا کہ "ابھی کیا جلدی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہو جانے دو۔ جو میکے میں آرام ملتا ہے وہ سسرال میں نہیں ملتا۔ یہ میں تمہارے ہی لئے کہتا ہوں ورنہ تمہارا گھر ہے"۔

عورت کے نسوانی جذبات کا میاں ماجد کو کیا تجربہ۔ ان کے اندر عورت کو جذب کرنے اور عورت میں جذب ہونے والی چیز ہی نہ تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ بیاہی بیٹی پڑوس برابر ہو جاتی ہے۔ ایک عورت کی دنیا شادی سے پہلے کچھ اور ہوتی ہے اور شادی کے بعد کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کا مرکز ہی بدل جاتا ہے۔ غرض یہ کہ میاں ماجد نے ہر چند ٹالا۔ بہانے کئے مگر سلیمہ تو اپنی قسمت کا تماشہ دیکھنے کیلئے بیتاب تھی۔ تکلف کو بالائے طاق رکھ شوہر کی مرضی کے خلاف ڈولی منگا سسرال آ پہنچی۔ آنے کو تو آ گئی اس کا گھر تھا۔ بیٹی بھی شریفوں کی اور بہو بھی شریفوں کی۔ کون روکتا اور کیا کہہ کر روکتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ نہ یہ وہ گھر ہے جس میں بیاہ کر آئی تھی نہ وہ لوگ ہیں جو سر پر آنچل ڈال کر لائے تھے۔ ناخواندہ مہمان کی طرح ڈولی سے اتری اور اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ خوشدامن الگ خاموش۔ نندیں جٹھانیاں جدا دامن سمیٹے ہوئے۔ گویا سلیمہ اچھوت تھی اور وہ سب برہمن زادیاں۔ چھوٹے بڑے تمام نہ زیادہ بات کرتے نہ اس کا میل جول پسند کرتے اور تو اور میاں ماجد بھی ہر وقت منہ پھلائے رہتے۔ پھر بھی وہ سلیمہ کے خاوند تھے۔ ان پر سلیمہ کا حق تھا۔ اور سلیمہ کے ہر نیک و بد کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی اس لئے سلیمہ نے بہت چاہا کہ ماجد سے گفتگو کر کے معاملہ کو صاف کرے لیکن نہ اسے ہی مدعائے دل زبان پر لانے کی جرأت ہوئی نہ ماجد صاحب اپنی خلقی کمزوریوں کی وجہ سے سلیمہ کی تقدیر کا فیصلہ سنا سکے۔

سلیمہ کی زندگی جس عذاب کی گھاٹی سے گزر رہی تھی اسکا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے "جس کی نہ پھٹے بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی"۔ کبھی سوچتی کہ جلدی کیا ہے مصیبت جتنی دیر میں آئے اچھا ہے۔ قضاء و قدر کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ گھبرانے سے کیا فائدہ۔ کبھی کہتی پھانسی گلے میں پڑتی ہے تو آج ہی کیوں نہ پڑ جائے۔ کل کا انتظار کس لئے۔ لیکن ان استدلال سے کہیں صبر آ سکتا تھا۔ الٹا جی گھبرانے لگا۔ اور اس ذہنی کشمکش کے نتیجہ کے طور پر آخر سلیمہ نے یہ ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو ماجد صاحب سے کھل کر گفتگو کرنی ضروری ہے۔ تذبذب کی زندگی سے بہر حال یقین کی زندگی کم تکلیف دہ ہوگی۔ دل میں یہ طے کر کے سلیمہ موقع کی منتظر تھی کہ اسے خیال آیا کہ ماجد میاں سے ان کی سرد مہری کا سبب پوچھنے سے پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے معلومات بہم پہنچانا زیادہ مناسب ہے تاکہ بحث بلا دلیل نہ ہو۔ ایسلئے کہ اب وہ پہلی سی مجلس آرائیاں اور سرگوشیاں تقریباً ختم ہو گئی تھیں اور معاملات کا اس قدر آگے بڑھ کر یکایک رک جانا خطرناک نظر آ رہا تھا کہ "بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں"۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے سلیمہ نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ حسنہ اپنی چھوٹی نند پر جو ابھی بارہویں برس میں تھی اس کا خیال جما۔ چنانچہ حسنہ کو پرچانا شروع

کیا سیدھی سادی لڑکی اور پھر سلیمہ کی محبت بھری باتیں دو چار ہی دن میں گھُل گئی۔ سارا سارا دن اور رات کے دس دس بجے تک سلیمہ کے پاس بیٹھی رہتی۔ جگ بیتی کہانیوں کے ساتھ یہ آپ بیتی سُناتی اور وہ نہایت دلسوزی سے سُنتی۔ ہوتے ہوتے ایک دن دوپہر کے بعد دونوں نند بھاوجیں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بارش ہوکر تھمی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کیلئے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ سلیمہ نے اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد حُسنہ سے پوچھا "حُسنہ! پچھلے دنوں اماں جان یہ کس کے شادی بیاہ کا ذکر کررہی تھیں" حُسنہ گھبرا گئی۔ اس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایسی بچہ تو نہ تھی کہ بات کا پہلو نہ سمجھتی۔ بھاوج کو دیکھکر نیچی نگاہ کرلی اور کچھ جواب نہیں دیا۔

سلیمہ :۔ کیوں چُپ کیوں ہوگئیں۔ نہیں بتانا تو ویسی کہہ دو۔

حُسنہ :۔ کیا بتاؤں۔ بڑے بھائی جان کے سالے کی بات تھی۔

سلیمہ :۔ اللہ اللہ بی حُسنہ مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم بھی بات چھُپاؤگی۔ نصرت علی کی لڑکی آخر کس کے لئے مانگی جارہی ہے۔

حُسنہ بچہ نہ سہی لیکن موجودہ دورِ تہذیب کی دیوی یا خاتون بھی نہ تھی کہ معاملہ پر گفتگو کرنا جانتی سٹپٹا گئی اور یہ کہہ کر بات بنانے کی کوشش کی۔ "بھابی جان آپ نے کس سے سُنا۔ یونہی آپکو شُبہ ہوگیا ہے۔ باتوں باتوں میں چھوٹے بھائی کا ذکر آگیا ہوگا۔ اماں جان نے اس لڑکی کو کہیں آپا رقیہ کی سسرال میں دیکھ لیا تھا۔ بس اور کوئی بات نہیں۔"

سلیمہ نے حُسنہ کی سادگی اور گھبراہٹ سے فائدہ اُٹھایا۔ بولتے ہوئے تار پر اُنگلی رکھ کر کہا۔

سلیمہ :۔ افوہ بی حُسنہ۔ ایسی بکّی دادی۔ تمہارے بھائی تو کہہ دیں اور تم نہ بتاؤ۔

حُسنہ سلیمہ کا مُنہ دیکھنے لگی۔ سلیمہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

"تو بھائی میاں نے آپسے کہہ دیا۔ ایسی باتیں کہیں کہنے کی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا کہا تھا اُنھوں نے؟"

سلیمہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر اسے کُرید نہ ہوتی تو شاید ضبط نہ کرسکتی۔ زبردستی آواز کو بنا کر بولی۔ "پوری بات تو نہیں بتائی۔ اتنا ہی کہا۔۔۔۔ بس اتنا ہی۔۔۔۔۔ یہی کہ وہ۔۔۔۔۔ یعنی اماں جان پیام بھیجنے والی ہیں۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اُس طرف والے رضامند بھی ہیں۔"

حُسنہ :۔ (کچھ شرمندہ سی اور کچھ ہمدردی سے متاثر) بھابی جان اب تو بھید کُھل ہی گیا۔ چھُپانے سے کیا فائدہ۔ مگر آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ کام خوشی سے نہیں ہو رہا۔ سب کے ہاں بچے ہوں اور بھائی میاں کُڑھیں۔ اماں جان کو وہم آتا ہے۔

سلیمہ :۔ میرا بانجھ ہونا تو ظاہر ہے۔۔۔۔۔ تم تم ہو۔۔۔۔۔۔ اچھا پھر نکاح کب کا ٹھیرا ہے۔

سلیمہ کے کلیجہ میں اب ضبط کی تاب نہیں رہی تھی۔ آنسو اُمنڈ آئے۔ آواز بھرا گئی۔ حُسنہ یہ دیکھ کر سلیمہ کو لپٹ کر رونے لگی۔ اسے واقعی سلیمہ سے محبت تھی لیکن بس کیا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی اور اس پر ستم یہ کہ کنواری۔ اس کا ایسے معاملات میں دخل ہمارے سماج کی توہین تھی جسے کوئی شریف برداشت نہیں کرسکتا۔ بڑی دیر کے بعد دونوں کے حواس درست ہوئے۔ رات زیادہ آگئی تھی اور سلیمہ کا دل اب تنہائی چاہتا تھا۔ اس نے حُسنہ سے کہا۔ "بہن اب تم جاؤ آرام کرو۔ میرے نصیب میں جو لکھا ہے وہ پورا ہوگا۔ کہیں اماں جان خفا نہ ہوں۔ میرا سایہ بھی تمہارے لئے اچھا نہیں۔

حُسنہ :۔ بھابی جان آپ اپنا دل بھاری نہ کریں۔ خدا کو یاد کیجئے۔ بچہ ہوجاتا تو یہ جھگڑا کا ہے کو ہوتا۔۔۔۔۔ اس کے بعد اُس نے سلیمہ کے گلے میں باہیں ڈال کر خوب پیار کیا اور چلی گئی۔

بظاہر اب ماجد صاحب سے کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس کا ارادہ تھا کہ اس راگنی کو بغیر الاپے ہی رہنے دیا جائے۔ لیکن سوت کے معاملہ میں عورت ساری مصلحتیں بھول جاتی ہے۔ دوسرے دن اتفاق سے اتوار تھا حسب معمول میاں ماجد تلاوت کلام مجید سے فارغ ہوکر کمرے میں جو آئے تو سلیمہ سے نہ رہا گیا۔ دامن پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگلی پچھلی ساری شکایتوں کے دفتر کھول دئے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جتنی تلخی اس کی سرشت میں تھی ایک دفعہ ہی کل کی کل اُگل دی۔ شکایتیں ناواجب نہ تھیں کیا جواب دیتے۔ ندامت ماتھے سے ٹپک رہی تھی۔ لیکن اپنی کمزوریوں کا کھلم کھلا اعتراف کرنا بھی شانِ مردانگی کے خلاف تھا۔ اس لئے اپنی بے رُخی کا الزام کچھ سلیمہ کے سر تھوپا اور کچھ اپنے والدین کے۔ سلیمہ کے سر پر اس وقت سوکن کا بھوت سوار تھا۔ بکھر کر بولی۔ "ایسے ہی تو آپ ننھے بچے ہیں۔ مجھ پر الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں بانجھ ہوں یا آپ دیکھت کے مردوئے۔ کیوں نہیں صاف کہہ دیتے

میں جو اتنے دن سے اپنی زبان پر قفل ڈالے بیٹھی رہی۔ آپکی بدنامی کے ڈر سے اپنی جوانی خاک میں ملا دی اس کا یہی ثمرہ ہے کہ آپ میری تذلیل کر رہے ہیں۔

ماجد:۔ میں نے انہیں سمجھا تو دیا مگر وہ نہ مانیں تو میں کیا کروں۔

سلیمہ:۔ کیا آپ نے صاف صاف ان سے اپنی حالت بیان کر دی ہے۔

ماجد:۔ صاف صاف تو نہیں مگر بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔

سلیمہ:۔ انہیں شبہ میں نہ رکھیئے۔ کہہ سکتے ہیں تو کھول کر کہہ دیجئے تاکہ وہ ایک دوسری لڑکی کا صبر نہ سمیٹیں۔

ماجد:۔ میں سب کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن ابا جان اور اماں جان کو اس ضعیفی میں رنج نہیں دینا چاہتا۔

سلیمہ:۔ سبحان اللہ۔ فرمانبرداری کے اظہار کا موقع بھی یہی ہے کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ ایک میری زندگی تباہ ہوئی دوسری اور معصوم کو کانٹوں میں پھانسو۔ محض اس لئے کہ والدین کی خوشی پوری ہو جائے۔ یہ کہاں کا مذہب اور کس خدا کا حکم ہے۔

ماجد:۔ کچھ بھی کہو میں والدین کی خواہش نہیں ٹال سکتا۔

سلیمہ:۔ تو یہ شادی ہو کر رہے گی۔

ماجد:۔ مشیت کے سامنے مجبوری ہے۔

سلیمہ:۔ بے شک آپ تو مجبور محض ہیں۔ اچھا ایک بات تو بتا دیجئے۔ آپ مجھ پر غلط الزام لگا کر دوسری بیوی لانا چاہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہو۔ حالانکہ یہ خواہش مرد کی نسبت عورت میں زیادہ ہوتی ہے۔ پھر اگر میں آپکی ناقابلیت کو مدنظر رکھ کر اپنی گود بھرنے کے لئے دوسرا خاوند تلاش کر لوں تو آپ خوشی سے گوارا کر لیں گے۔

ماجد:۔ لاحول ولاقوۃ۔ اسلامی قانون کے خلاف دنیا میں کوئی مسلمان مرد عورت کی یہ ناجائز آرزو پوری کر سکتا ہے۔

سلیمہ:۔ جی ہاں۔ میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو۔ اسلامی قانون مردوں ہی کیلئے تو وضع کیا گیا ہے۔ خیر۔ کہئے بات چیت تو سب ٹھیک ہو چکی ہے نا۔

ماجد:۔ میں کچھ نہیں جانتا تم تو منطقی باپ کی منطقی بیٹی ہو۔ یہ کہتے ہوئے میاں ماجد کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس گفتگو کو کئی ہفتے گزر گئے۔ سلیمہ کی اندرونی کیفیت تو کوئی کیا جان سکتا۔ البتہ بظاہر اسے صبر سا آ گیا تھا۔ ایک روز سرشام وہ نہا کر بال سکھا رہی تھی کہ ماجد صاحب دفتر سے سیدھے اس کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آج منگنی کی رسم ہے تمہیں بھی جانا چاہیئے۔“

سلیمہ:۔ قربان آپکی ستم ظریفی کے۔ میرے قتل نامہ پر مجھ سے ہی مہر کراتے ہو۔

ماجد:۔ تو کیا تمہیں جانے سے انکار ہے۔

سلیمہ:۔ اپنے ہاتھ سے کسی نے اپنا سہاگ آتار کر دوسری کو پہنایا ہو تو بتا دو۔

ماجد:۔ یہ فضول باتیں میں نہیں سننا چاہتا۔ بولو جاؤ گی یا نہیں۔

سلیمہ:۔ نہیں۔

ماجد:۔ انتقام لینا چاہتی ہو؟

سلیمہ:۔ ایک پردہ نشین۔ بے زبان کمزور عورت کیا انتقام لے سکتی ہے۔ انتقام تو خدا لے گا۔ وہ منتقم حقیقی ہے۔ ظالم و مظلوم دونوں اس کی نگاہ میں ہیں۔

سلیمہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھکر ماجد صاحب نے اپنی غیر معمولی تیزی کو نرمی سے بدل دیا اور دبی زبان سے کہنے لگے۔ نہیں آپکو جانا چاہیئے۔ آپ کا جانا اس لئے ضروری ہے کہ لڑکی والے آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ جبر تو ہے نہیں لیکن آپ چلی جائیں تو اچھا ہے۔ اماں جان کی بھی بات رہ جائے گی اور وہ لوگ بھی مطمئن ہو جائیں گے۔

کچھ تو میاں ماجد کا مایوسانہ انداز گفتگو اور کچھ یہ خیال کر کے کہ اب پہلی سی عزت تو رہی نہیں ساس سسرے کی مرضی کے خلاف چل کر اتنی بات بھی جاتی رہے گی۔ سلیمہ نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ اگر آپ کی عدالت کا یہی فیصلہ ہے کہ سزائے موت کا مستحق اپنے ہاتھ سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے تو میں حاضر ہوں آپ خاطر جمع رکھیں تعمیل حکم ہوگی۔

قصہ مختصر بی سلیمہ بھی اپنی سسرال والوں کے ساتھ سوکن کو دیکھنے اور منگنی کی رسم ادا کرنے گئیں۔ اس کی حالت بہت نازک تھی۔ چہرہ کمہلایا ہوا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ ہر چند اس نے علیحدہ رہنے کی کوشش کی مگر دلہن کی ماں اس کے پاس آ ہی گئیں اور دو چار سوالات ایسے بیڈھب کئے کہ سلیمہ ہی جیسی نیک سرشت اور عاقبت اندیش عورت تھی جو اس کٹھن گھاٹی سے پار ہو گئی۔ دوسری کوئی ہوتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔ پھر انہوں نے گھر کی دوسری عورتوں سے یہ کہہ کر ملایا کہ دیکھو شریف بیویاں ایسی ہوتی ہیں۔ خاوند کی خوشی سے کام ہے اس صورت میں میری ذاحت کو سوکن نے کا کیا اندیشہ“ سلیمہ کا کلیجہ منہ کو چلا آتا تھا اس نے

ہزار کوشش کی کہ چپ بیٹھی رہے لیکن مُنہ بند کرتے کرتے زبان سے نکل ہی گیا کہ "جی ہاں شریف بہولوں کو ایسا بھی کرنا پڑتا ہے!" سلیمہ کا یہ معنی خیز فقرہ کسی نے سُنا یا نہیں اور سُنا تو اس سے کیا نتیجہ نکالا۔ ہمیں خبر نہیں۔ بہرحال منگنی ہوگئی اور ساتھ ہی نکاح کا دن بھی مقرر ہوگیا۔

عورت۔ خاوند کے نام پر مٹنے والی عورت۔ ایک گھر سے لال جوڑا پہن کر آنے اور دوسرے گھر سے سفید کفن اوڑھ کر جانے والی عورت کس قدر بھولی اور کتنی وفادار ہوتی ہے۔ سلیمہ کے لئے ماجد میں حالانکہ کوئی کشش نہ تھی۔ وہ اس کا برائے نام شوہر تھا۔ آخر ماجد کے اس نکاح سے سلیمہ کی کیا چیز چھن رہی تھی۔ اس کے کس عیش کا خون ہو رہا تھا۔ اس کے تو تمام جنسی جذبات اوّل دن سے کنوارے تھے مگر نہیں اس کو اس برائے نام خاوند کے چھننے کا بھی اتنا ہی قلبی احساس تھا جتنا ایک شوہر پرست بیوی کو اپنے کیفِ شباب سے بھرپور شوہر سے ہوتا۔ ماجد کے جیتے جی رنڈاپے کی ساری صورتیں اس کے سامنے آگئی تھیں۔ آنے والے واقعات کا ناٹک اس کے تصور میں کھیلا جا رہا تھا۔ خود ساختہ دلیلوں سے وہ لاکھ اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتی لیکن بے فائدہ۔ رنگ برنگ کے نقشے اسے دکھائی دیتے۔ کبھی وہ ماجد صاحب کو دولہا بنے ہوئے دیکھتی۔ کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا کہ نئی دُلہن اس کی بے بسی پر مُسکرا رہی ہے۔ کبھی اس کو یہ نظر آتا کہ اس کی سوکن ماجد کے پہلو میں بیٹھی اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے مگر کیسی ہمدردی؟ جو ایک جیتنے والے کو ہارنے والے اور قوی کو کمزور کے ساتھ ہوتی ہے۔

سلیمہ کی اس کرب اور بے چینی کی حالت میں آخر وہ منحوس گھڑی بھی آگئی کہ ماجد میاں اپنی حماقت اور ماں باپ کے شوق سے نئی دلہن بیاہ کر گھر لائے اور اسی حجلۂ عروسی میں جہاں سلیمہ کی جوانی۔ اس کے حُسن اور اس کی آرزوؤں پر ہمیشہ کے واسطے تالا پڑا تھا اسے بھی گود میں اُٹھا کر لے گئے۔ ہرچند کہ وہ اس کمرے کی حقیقت سے پوری آگاہ تھی اور جو کچھ وہاں گزرنے والا تھا جانتی تھی تاہم اس کو انتہا سے زیادہ صدمہ ہوا۔ زہر میں بُجھا ہوا ایک تیر تھا جو اس کے کلیجہ میں گھُستا چلا گیا۔ لیکن قدرت کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ اِدھر تو سلیمہ چھاتی پکڑے ساری رات تڑپتی رہی۔ اور اُدھر ماجد صاحب کی بے حسی اور سرد مزاجی رنگ لائی۔ یہ دُلہن اپ ٹو ڈیٹ تھی۔ سلیمہ کی طرح موئی مٹی سے اس کا خمیر نہ تھا کہ دولھا میاں کے خراٹوں سے اس کی نیند میں خلل نہ آتا۔ صبح ہوتے ہوتے ساری ڈائری حضرت علی صاحب کو پہنچ گئی۔ یہاں ابھی کانا پھوسی ہی ہو رہی تھی کہ باہر سمدھیانے کے مرد اور اندر عورتیں آموجود ہوئیں۔ زنانخانے میں کوسنا پیٹنا اور مردانے میں سخت و سست گفتگو شروع ہوگئی۔ سلیمہ نے اس موقع پر بھی میاں کی لاج رکھنی چاہی اور رہم خواجہ کی حیثیت سے گواہی دینے کی بے غیرتی قبول کی مگر اصل حقیقت پر کون پردہ ڈال سکتا تھا۔ دلہن کا برات کا جوڑا ابھی نہیں بدلا گیا تھا اور دولھا میاں کی بدھی کے پھول بھی مرجھانے نہیں پائے تھے کہ طلاق ہوگئی۔ طلاق تو معمولی بات تھی ہوگئی۔ میاں ماجد اور اُن کے والدین کو شہر بھر میں مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہی۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید سارا گھر افیون کھا کر سو رہتا۔

اشرف صبوحی دہلوی!

اُردو سے

حسبِ معمول اتوار کے روز وہ ریلوے سٹیشن کے بک سٹال پر اپنے مطلوبہ رسائل و اخبارات خریدنے کیلئے آیا۔

ہفتے بھر میں یہی ایک دن تھا جسکو وہ اپنے ذاتی کاموں میں صرف کر سکتا تھا۔ دیتی زمانہ جو کلرکوں کی حالت ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اور پھر کلرک بھی ایسی جگہ کا۔ جو غیر سرکاری تھی جسکے کام کرنے کے اوقات بھی غیر مقررہ ہیں ——— مگر پھر بھی اس مُلازمت کو وہ غنیمت سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس دُنیا میں اسکا ایک بھی رشتہ دار زندہ نہ تھا۔ سوائے ایک ماں کے۔ جسکے سر کے بال ولایتی صابون کی جھاگ کی طرح سفید ہو چکے تھے تیس چالیس روپے میں گذر اوقات بڑی اچھی طرح سے ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ دنیا میں اپنے کوئی عالیشان مکانات اور بنگلے بنانے کی خواہش بھی نہ رکھتا تھا۔ اسلئے مزید ترقی کرنے کی خواہش بھی اُس کے دل سے مفقود ہو چکی تھی ———

اپنے مطلوبہ جرائد خرید کر چکنے کے بعد ابھی وہ بل ادا کر ہی رہا تھا۔ کہ اُسے ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ "کوئی اُردو کا رسالہ بھی ہے؟"

وہ ہر اتوار کو بک سٹال پر بیسیوں اشخاص کو اخبارات و رسائل خریدتے دیکھا کرتا تھا۔ جن میں زیادہ تر انگریزی۔ گجراتی اور مراٹھی زبان کے اخبارات کے خریدار ہوتے تھے ——— لیکن جب کبھی وہ کسی کو اُردو کا اخبار یا رسالہ خریدتے دیکھتا۔ تو مارے خوشی کے اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا ——— بعض اوقات جب وہ دیکھتا کہ کوئی خریدار اُردو کا رسالہ یا اخبار خریدتے خریدتے صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اس کی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہے تو وہ اپنی جیب سے بل ادا کر کے اُس شخص کو اُسکا مطلوبہ اخبار یا رسالہ خرید کر دیتا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی تھی۔

اُس نے آنے والی خاتون پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ از سر تا پا ریشمی لباس میں ملبوس۔ مختصر لیکن قیمتی زیورات پہنے ہوئی تھی ——— اُس نے اپنے دل میں اندازہ لگا لیا کہ اگر اور کچھ نہیں تو پانچ سات روپے کے اخبارات ضرور خرید لے گی ———

پیشتر اس کے کہ سٹال ایجنٹ اُس خاتون کو جواب دے۔ وہ جلدی جلدی اپنے اخبارات کو احتیاط سے ایک طرف رکھ کر سٹال ایجنٹ کی جگہ کھڑا ہو کر کہنے لگا "جی ہاں! بہت ہیں اُردو کے رسالے۔ جتنے آپ خریدنے چاہیں" اور یہ کہنے کے بعد اس نے خاتون کے سامنے اُردو رسائل کا ڈھیر لگا دیا۔

وہ چونکہ ایک طویل عرصہ سے باقاعدگی کے ساتھ سٹال پر اخبارات خریدنے آیا کرتا تھا۔ اسلئے سٹال ایجنٹ کے ساتھ اس کی ایک "خاموش واقفیت" ہو گئی تھی۔ خاموش اسلئے کہ سٹال ایجنٹ کے ساتھ اس نے کبھی کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی۔ اتوار کی شام کو آتا۔ اخبارات خریدتا اور چل دیتا۔

اسلئے سٹال ایجنٹ نے جب اُسے اس طرح اخبارات پیش کرتے دیکھا تو کچھ بھی نہ کہا۔ صرف اپنا مُنہ اس کے کان کے پاس لیجا کر کہا۔ "بابو صاحب! یہ خریدنے والی صورتیں نہیں ہیں۔ کیوں مغز ماری کر رہے ہیں آپ!!"

مگر اس نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ سال کا اختتام تھا اور کئی ایک سالنامہ سٹال کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اُس نے وہ بھی اٹھا کر خاتون کے سامنے رکھ دیئے۔ "یہ دیکھئے نا! کتنی کوشش و کاوش کے بعد ایڈیٹر نے اس سالنامے کو مرتب کیا ہوگا۔ کتنا دیدہ زیب ٹائیٹل ہے ——— اور پھر ٹائیٹل کا آپ کو کرنا ہی کیا ہے۔ یہ تو چھلکے ہیں چھلکے۔ رُوح اور دماغ کو ترو تازگی بخشنے والا گودا تو اندر ہے۔"

دوسرے کھڑے ہوئے گاہکوں میں سے کوئی بھی نہ پہچان سکتا تھا۔ کہ حقیقی سٹال ایجنٹ کون ہے۔ کیونکہ سٹال کا اصلی ایجنٹ اس کی حرکات کو دیکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے اُس کا مضحکہ اُڑا رہا ہے۔

وہ خاتون کے جواب کا منتظر تھا۔ وہ سٹال ایجنٹ کو دکھانا چاہتا تھا۔ کہ اگر خریدار کے حسبِ پسند چیز اس کے سامنے پیش کی جائے تو بکری میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

رسائل کو بہت کچھ اُلٹ پُلٹ کرنے کے بعد خاتون نے جواب دیا۔ "ایسا والا ہم نہیں مانگتا" ———

وہ حیران تھا کہ جب یہ خاتون ایک اُردو رسالہ خریدنا چاہتی ہے تو ضرور یہ اُردو زبان سے واقف ہوگی۔ مگر جس زبان میں وہ گفتگو کر رہی تھی۔ وہ نہ جانے دُنیا کے کس خطّے سے تعلق رکھتی تھی۔ دل ہی دل میں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس حسینہ کا گلا کوئی زبردستی گھونٹ رہا ہو۔ مگر زبان سے صرف اتنا کہہ سکا "تو اور آپ کیا چاہتی ہیں؟" ـــــــ

اب سٹال کا حقیقی ایجنٹ بھی قریب آ چکا تھا اور اُس کی طرف ایسی طنز آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "کیوں صاحب میں نہ کہتا تھا کہ یہ خریدنے والی صورتیں نہیں ہیں"

"اُم ایشیا والا رسالہ مانگتا ہے" خاتون نے ذرا رُک کر کہا "جیسے ...." اور یہاں اُس نے دو تین عریاں قسم کی تحریریں شائع ہونے والے رسالوں کا نام لیا۔ جن میں سے سٹال پر صرف ایک موجود تھا۔

"کیا قیمت ہے اس کا؟"

"چار آنے" ـــــــ

"اور اس کا؟" خاتون نے ایک اور رسالہ اُٹھا کر پوچھا۔

ایجنٹ نے جواب دیا "چھ آنے"

"اوہ۔ ریلوے سٹال والا بہت قیمت مانگتا" یہ کہتے کہتے خاتون نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک ریشمی بٹوہ نکالا۔ اُس بٹوے کے اندر چھوٹا سا ایک اور بٹوہ تھا۔ جس میں سے کرنسی نوٹوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس میں اپنی انگلیاں ڈال کر خاتون نے پیسے نکالنے شروع کئے۔ مگر آٹھ آنے سے زیادہ نہ نکل سکے۔

"ہمارے پاس تو صرف آٹھ آنہ ہے یہی لے لو"

"نہیں مس صاحبہ!" ایجنٹ نے جواب میں کہا "انکی قیمت مقرر ہوتی ہے اور ایک پائی بھی کم نہیں ہو سکتی"

"تمہارے پاس ہیں دو آنے؟" ـــــــ یہ الفاظ خاتون نے اپنے ساتھ ہی کھڑے ہوئے ایک اور شخص سے کہے۔

اُسے اب معلوم ہوا کہ خاتون اکیلی نہیں بلکہ ساتھ ایک اور شخص بھی ہے۔ جس نے ایک عامیانہ لباس پہن رکھا تھا ـــــــ اُس شخص نے اپنے کوٹ قمیض اور پائجامہ کی جیبوں کی پوری پوری تلاشی لینے کے بعد دو آنے کے پیسے نکالے۔ جن میں سے ایک تو اکنی تھی۔ تین پیسے اور تین پائیاں ـــــــ پیسے نکال کر اُس شخص نے خاتون کے ہاتھ میں دیدیے۔ اور خاتون نے دس آنے کے پیسے ترتیب سے رکھے ہوئے اخبارات و رسائل پر ایسی بے ترتیبی سے پھینکے جیسے سٹال ایجنٹ اور رسالہ کے ایڈیٹر پر بہت بھاری احسان کر رہی ہے۔ یا جیسے خیرات دے رہی ہے۔

لپنے دو رسالے اٹھا کر اپنے ساتھ والے شخص کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی ٹرین کے ایک سیکنڈ کلاس ڈبے کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اور ڈبے کی کھڑکی میں ہاتھ ڈالکر رسالے اور ہینڈ بیگ اندر رکھدیا۔

وہ ابھی تک بغل میں رسالوں کا بنڈل دبائے اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہ پہلی بار سمجھ سکا کہ امیر لوگ کیوں امیر ہوتے ہیں۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کہ خاتون کے بٹوے میں بہت سے کرنسی نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ مگر اُس نے دوسرے شخص سے دو آنے کے پیسے مانگنے گوارا کئے۔ لیکن نوٹ کو ریزگاری میں تبدیل کرانا گوارا نہ کر سکی۔

بخلاف اِسکے اُس نے اپنی حالت پر نگاہ ڈالی۔ اگر آج اُسکے پاس اتنے روپے ہوتے تو نہ صرف یہ کہ سٹال سے ہر ایک اخبار خرید لیتا۔ بلکہ حسب پسند ہر ایک رسالے کا مستقل خریدار بھی بن جاتا۔ ـــــــ اُس نے آج تک بنک میں ایک پائی بھی جمع نہیں کرائی تھی۔ کیونکہ وہ موسیقی اور مطالعہ میں اپنے آپ کو غرق کر دینا چاہتا تھا۔ اپنے گھر میں ریڈیو سیٹ لگوالینا یا ایک اچھا سا گراموفون خرید لینا اُس کی حیثیت سے باہر تھا۔ مگر مطالعہ اُسکے "بس کی بات" تھی۔ اسلیئے گھریلو ضروریات کا خرچ نکالکر جو کچھ بچتا وہ "ادبی خرید" میں صرف کر دیتا تھا۔

بعض دفعہ ماں اُسے جھڑکتی بھی تھی "کہ بیٹا! یہ جو ردّی کے ڈھیر" جمع کئے جاتا ہے۔ ان سے تجھے کیا ملتا ہے۔ اگر یہی پیسے کسی بنک میں جمع کرا دے تو تیری شادی پر کام آ دیں گے"

ـــــــ مگر وہ اپنی ماں کو کیسے سمجھاتا کہ اسی "ردّی کے ڈھیر" میں سے اُس نے وہ کچھ حاصل کیا ہے ـــ اور کر رہا ہے۔ جو وہ دس بارہ بیویوں سے بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بوڑھے اور تھکے ہوئے دماغ میں یہ بات کیسے ڈالتا کہ اسی "ردّی کے ڈھیر" سے اُس کی زندگی کا تار وابستہ ہو چکا ہے۔ جس دن اُس تار کو کسی نے کاٹ دیا۔ سمجھ لو اُس کی زندگی بھی ختم ہوگئی ـــــــ

اِسلیئے وہ ماں کو مُسکرا کر جواب دیتا "ماں ابھی تو بچہ ہوں شادی کی کیا جلدی پڑی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو ہو ہی جائیگی نا" ـــــــ

اور اتنا کہنے کے بعد "ردی کے ڈھیر" میں سے کچھ کوڑا کرکٹ اُٹھاتا اور آبادی سے دور ـــــ کسی ویرانے میں اپنی روحانی غذا حاصل کرنے کے لئے چلا جاتا تھا ـــــ

مگر آج ؟ ـــــ ریلوے بکسٹال پر جو کچھ اُس نے دیکھا. جس لاپرواہی سے پیسے پھینک کر دو رسالے خریدے گئے تھے. اُس منظر کو یاد کر کے اُس کا خون کھول رہا تھا ـــــ ادب کی اس طرح ہتک کرنے والی وہ ہوتی کون ہے ؟ ـــــ مالدار ہے تو اپنے گھر کی ـــــ ادب کی ہتک کرنا کیا معنے ؟

یکایک اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا. کہ خاتون کے ساتھ والا شخص ـــــ جس سے خاتون نے دو آنے کے پیسے لئے تھے۔ کون تھا ؟ ـــــ اُس عورت کا شوہر ؟ ـــــ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ بیوی دو تین صد روپے کا قیمتی لباس پہنے ہوا و خاوند کے لباس کی قیمت ساڑھے تین روپے سے بھی کچھ کم ـــــ تو پھر کیا ؟ ـــــ اُس کا ملازم ؟ ؟ ـــــ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جس انداز سے وہ اُس شخص کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔ وہ "آقانہ" یا "مہرانہ" نہ تھا ـــــ تو پھر وہ شخص اس عورت کا کیا تھا ؟ ؟ ؟ ـــــ

کیا وہ اُن دونوں کا پیچھا کرے ؟ مگر پھر اُس نے سوچا یہ تو انسانیت اور تہذیب سے بعید ہے۔

ٹرین ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑی تھی. چھوٹنے میں صرف بیس منٹ باقی تھے۔ انہیں بیس منٹ میں اُسے فیصلہ کرنا تھا۔ کہ اسے اُن دونوں کا پیچھا کرنا چاہیئے یا نہیں ؟

اُن کا پیچھا کرنا ـــــ ایک شریف آدمی کا کام نہیں۔ اخلاق اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اور پھر دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا اُسے کیا حق حاصل تھا ؟ ـــــ یہ سب اعتراضات بالکل صحیح تھے۔ مگر پھر بھی نہ جانے وہ ایسی کون سی غائبانہ طاقت تھی. جو زبردستی اُسے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اس سیکنڈ کلاس کے ڈبے کی طرف کھینچے چلے جا رہی تھی. جہاں وہ دونوں کھڑے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے ـــــ

وہ کبھی کبھی "کچھ" لکھا بھی کرتا تھا۔ اِسلئے نہیں کہ وہ لکھنا چاہتا تھا. بلکہ اس لئے کہ جو خیال اس کے دماغ میں آجاتا۔ اُسے تحریری جامہ پہنائے بغیر اُسے چین ہی نہیں پڑتا تھا ـــــ اس لئے اُس نے سوچا کہ اُنکا پیچھا کرنے سے اگر اور کچھ نہیں تو ایک دو افسانوں کا پلاٹ ہی سہی ـــــ بہرحال وہ گھاٹے میں نہیں رہیگا۔

دفعتاً سی۔ آئی۔ ڈی بننے کا خیال غالب آیا۔ اپنے رسائل اور اخبارات جو وہ خرید کر چکا تھا۔ اُن میں سے صرف ایک اُٹھا کر باقی سٹال ایجنٹ کے پاس امانت رکھ دیئے کہ ـــــ "ابھی آتا ہوں" ـــــ بھاگا بھاگا بکنگ آفس گیا ـــــ اُس سٹیشن سے ایک اور سٹیشن چھوڑ کر اگلا سٹیشن "مالیرا" جنکشن تھا. جہاں ٹرینوں کا کراس ہوتا تھا۔ اور وہاں سے وہ ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر واپس آسکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دوسرے درجے کا "مالیرا" کا ٹکٹ خریدا۔ اور ہانپتا کانپتا اُسی ڈبے میں آکر بیٹھ گیا جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اُسکے بیٹھتے ہی گاڑی چلدی ـــــ

پوری رفتار پر جب ٹرین پہنچ گئی تو اُسے کچھ غور کرنے کا موقعہ ملا۔ ڈبہ بالکل چھوٹا سا تھا۔ انگریزی زبان میں لکھا تھا "چار افراد کے بیٹھنے کے لئے اور دو اشخاص کے سونے کیلئے" ـــــ کل دو ہی نشستیں تھیں اور وہ انکی سامنے والی نشست پر بیٹھا تھا . . ـــــ ان تینوں کے سوا کوئی چوتھا فرد ڈبے میں نہ تھا۔

بظاہر وہ کچھ ایسے طریقے سے رسالہ کھول کر بیٹھا تھا کہ جیسے وہ ڈبے میں اکیلا ہی سفر کر رہا ہو۔ اور اس نے دیکھا کہ جیسے کو تو وہ بھی اسی انداز سے بیٹھے تھے۔ جیسے اُس کی موجودگی انکے لئے نہ ہونے کے برابر تھی۔

رسالے سے نظر ہٹا کر اُس نے دونوں پر ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ خاتون کی عمر تقریباً پچیس برس، درمیانہ قد. گوشت پوست اور خون سے بھری ہوئی۔ امیرانہ لباس۔ خد و خال موزوں رنگ گورا۔ بنفشئی رنگ کی آنکھیں. کھلی پیشانی اور لب ؟ ؟ ؟ مُنہ تو شاید اُس کا تھا ہی نہیں. نتھنوں اور خمدار ٹھوڑی کے درمیان ایک ہلکے گلابی رنگ کی پتلی سی لکیر کھچی تھی اور بس ! ! ! جب وہ مسکراتی تو اُسے ہیرالال پنالال جوہری کی دکان یاد آجاتی۔ جہاں اُسکا افسر ایکدفعہ اُسے ساتھ لیکر جواہرات خریدنے گیا تھا ـــ

پھر اُس نے مرد کی طرف دیکھا. عمر تقریباً تیس برس معمولی لباس. لمبا قد. گھنی ڈاڑھی، سر کے بال کھونسے کی طرح سیاہ. اسی رنگ کی آنکھیں. کسیقدر تنگ پیشانی اور موٹے ہونٹ ! ! !

جب عورت کوئی بات کرتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شام کے وقت کوئی ہلکے ہلکے سروں میں ستار بجا رہا ہو۔ بخلاف

زمینکے جب مرد کوئی بات کرتا۔ تو اُسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی معمولی
سا آتش فشاں پہاڑ پھٹ رہا ہو۔ اور جب وہ دونوں مل کر کوئی بات
کرتے یا ہنستے تو "نقارخانہ میں طوطی کی صدا" کا ٹھوس نقشہ اُسکے
سامنے آجاتا۔

اب اُس نے اصل سوال کو سوچنا شروع کیا۔ کہ یہ مرد اس عورت
کا کیا ہو سکتا ہے؟ شوہر یا ملازم تو وہ پہلے ہی رد کر چکا تھا۔ تو پھر
کیا یہ....... لیکن محبت بالکل اندھی بھی تو نہیں ہوتی۔ ایک قسم کا
"حور کے پہلو میں لنگور" والا معاملہ تھا۔

چنانچہ اِس رشتے کو حل کرنے کے لئے اُس نے ٹرین کے ڈبے
میں بیٹھے بیٹھے اپنی قوتِ ارادی کے زور سے ہندوستان بھر کے
افسانہ نویسوں کی عقل و ذہانت کھینچ کر اپنے دماغ میں جمع کر لی۔
مگر بے کار! وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ ان کا آپس میں کیا
رشتہ ہو سکتا ہے۔ اِس لئے نہایت ایمانداری کے ساتھ اُس نے
افسانہ نگاروں کی عقل و ذہانت واپس لوٹا دی۔ تاکہ ایسا نہ ہو
کہ بیچارے دنیاوی کاروبار سے ہی رہ جائیں۔

اب اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے اس ڈبے میں بیٹھ کر یا
صحیح الفاظ میں اُن کا پیچھا کرکے سخت غلطی کی ہے۔

خاتون نے چھوا ٓنے والا رسالہ مرد کے ہاتھ میں دیتے
ہوتے کہا "لو پڑھو نا" ـــــ اور مرد نے ایک مضمون پڑھنا
شروع کیا ـــــ "ادبی جرّاح"

مصنف نے لکھا تھا "ایڈیٹر کے قلم اور سرجن کے تیز ہتھیاروں
میں میں ذرا بھی فرق محسوس نہیں کرتا۔ مختلف صورتوں میں دونوں
کا ایک ہی کام ہے۔ اِس لئے دونوں کو "چیر پھاڑ" کرتے وقت
اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ "ہتھیار" کی نوک کہیں مریض کی
شہ رگ سے نہ جا ٹکرائے......."

"کتنا خشک مضمون ہے" خاتون نے مرد کے ہاتھ سے رسالہ
چھین کر گدیلے پر پھینکتے ہوئے کہا۔ اور پھر دوسرا رسالہ ہاتھ میں
دیتے ہوئے کہا "لو اسے پڑھو۔ یہ مجھے بہت پسند ہے"

اب وہ بالکل صاف زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن
ٹکسال پر اس نے الفاظ کی گردن کیوں مروڑ دی تھی۔ یہ وہ نہ
سمجھ سکا۔

مرد نے رسالہ کھولکر ایک افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ "بیوی کی گود
میں" ـــــ لکھا تھا ـــــ "پہلی مرتبہ جب اُس نے میری رانوں کے
بالائی حصے کو چوما........"

اُف!!! وہ ابھی تک سامنے ہی بیٹھا تھا اور یہ افسانہ
جو ٹھیٹ گلابی بھاشا میں لکھا گیا تھا۔ سُن نہ سکتا تھا۔ اِس لئے
اُس نے ایک چھلانگ لگائی اور اوپر والے تختے پر دراز ہو گیا۔
بظاہر وہ رسالہ ہی پڑھ رہا تھا۔ مگر اس کی قوت سامعہ نیچے ہی
کی طرف لگی ہوئی تھی۔

افسانہ کیا تھا۔ قوت شباب کی گولیاں تھیں جنہیں الفاظی
شکل میں رسالہ کے صفحات پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔

کبھی کبھی وہ افسانے کو چھوڑ کر اپنی پرائیوٹ باتیں بھی کرنے
لگتے تھے۔ مگر وہ اوپر کے تختے پر لیٹا ہوا اچھی طرح سن نہ سکتا
تھا۔ یونہی کوئی کوئی ادھورا فقرہ اُس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا
"ماروتی....... بیچارے کو وقت نہیں ملتا....... روپیہ ہے
سب کچھ ہے....... اکٹھے رہینگے....... زندگی مزیدار
.... جانے دو باتوں کو......"

تھوڑی دیر بعد دونوں کی آواز آنی بند ہو گئی۔ نہ تو وہ افسانہ
پڑھ رہے تھے اور نہ ہی باتیں کر رہے تھے۔ خاموشی تھی ـــــ
بالکل خاموشی۔

اُس نے سوچا۔ یہ ایکا ایکی چپ کیوں سادھ لی انھوں نے۔
چنانچہ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ چہرے پر
سے رسالہ ہٹایا۔ بائیں ہاتھ سے گدیلے کو پکڑا۔ یونہی گردن کو تھوڑا
سا خم دے کر اُس نے نیچے والے تختے پر نگاہ ڈالی.......اُف!!!
اُسے ایسا محسوس ہوا کہ انجن کا تمام دھواں سمٹ سمٹا کر اُسی ڈبے
میں چلا آ رہا ہے۔ اور کوئی دم میں اُس کا سانس رُکا چاہتا ہے حالانکہ
کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور سر پر دو برقی پنکھے باسی ہوا
کو تازہ ہوا میں تبدیل کرنے میں مصروف تھے۔

وہ یہاں سے جلد از جلد کہیں چلا جانا چاہتا تھا۔ مگر کہاں
جائے۔ کیا چلتی گاڑی سے کود پڑے ـــــ کلرک ہونے
سے بیشتر وہ کسی زمانہ میں محکمہ ریلوے میں شنٹنگ جمعدار رہ
چکا تھا۔ اور دس پندرہ میل کی رفتار پر دوڑتے ہوئے انجن پر سے
چڑھنا اُترنا اُس کے لئے معمولی بات تھی۔ مگر پوری رفتار پر جاتی
ہوئی گاڑی سے کودنا کارے دارد ـــــ

باوجودیکہ اُس نے اپنا رومال کوٹ کی جیب سے نکال کر اپنی
آنکھوں پر اس طریقے سے ڈال لیا تھا۔ کہ رومال کے سرے اُس نے

اپنے کانوں کے اندر ٹھونس لیئے تھے پھر بھی اُسکو نیچے سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ننھے ننھے لڑکے ہلکی ہلکی آوازیں تالیاں بجا رہے ہوں۔

پہلے اُسے ایکدو دفعہ ہلکے ہلکے جھنکار کی آواز سُنائی دی۔ پھر ایکدو دفعہ یونہی کچھ پُوچ پُوچ کی آواز سُنائی دی۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک لمبے اور گہرے سانس کی آواز سُنائی دی۔ جیسے کسی نے فٹ بال کے بلیڈر کی نالی کا منہ ایکدم سے کھول دیا ہو۔ یا پھر جیسے کسی چلتی ہوئی موٹر کے ٹائر میں کوئی کیل کانٹا چبھ جاتے ......

...... وہ یقیناً پاگل ہوجاتا۔ اگر گاڑی کے ایک ہلکے سے دھکے کے ساتھ آتے مسلمان گوشت روٹی گرم" کی آواز چونکا نہ دیتی تو۔ آیا تھا افسانہ کا پلاٹ حاصل کرنے کیلئے ــــــ افسانے کا پلاٹ تو کیا ملنا تھا بجائے کو اُلٹا اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھا۔ طبیعت بحال کرنے کیلئے وہ چائے کے سٹال پر گیا۔ ایک پیالہ چائے پیا۔ پھر بکنگ آفس سے واپسی کا ٹکٹ خرید لایا اور واپس جانیوالی ٹرین کے ایک دوسرے درجے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

گاڑی چلدی ــــــ ریلوے لائن کے کانٹے ــــــ اِن ورڈ سگنل ــــــ آؤٹ ورڈ سگنل ــــــ حتیٰ کہ ریلوے کا پھاٹک بھی گذر گیا۔ مگر وہ دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ گھر پہنچنے تک وہ اپنا دماغ کسی حد تک اصلی حالت پر لانا چاہتا تھا۔ اور اسی لئے وہ تازہ ہوا کھانے کیلئے دروازے میں ہی کھڑا رہا ــــــ

ــــــ "اے مسٹر! ذرا دروازہ بند کر دیجئے۔ میرا اخبار اُڑ جائیگا" یہ اس کی پُشت کی طرف بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کی آواز تھی۔ جو اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اگر کوئی اور دجہ ہوتی۔ تو شاید وہ اُس کے کہنے کی کوئی پروا نہ کرتا۔ اور وہیں دروازے میں ڈٹ کر کھڑا رہتا۔ مگر جب وہ کسی کو مطالعہ کرتے دیکھتا۔ تو اسکا سر ادب سے جُھک جاتا تھا۔ چنانچہ اُس نے دروازہ بند کیا۔ ہینڈل گھمایا اور بیٹھ گیا۔ ارے ؟؟؟؟ ــــــ وہ ہکا بکا رہ گیا جب اُس نے دیکھا کہ اُسکی سامنے والی نشست پر وہی دو صورتیں تشریف فرما تھیں۔ جنکا پیچھا کرنے کیلئے وہ یہاں تک آیا تھا اور اب پچھتا رہا تھا۔

اُسے یقین نہ آیا کہ گاڑی واپس رستہ پر جا رہی تھی۔ شاید وہ خیالات میں اتنا محو ہو گیا ہو۔ کہ ٹرین سے اُترا ہی نہ ہو۔

...... اطمینان کرنے کیلئے اُس نے جیب سے ٹکٹ نکالا۔ واپسی کا تھا اور پھر یہ ڈبہ بھی وہ ڈبہ نہیں تھا۔ وہ ڈبہ چار مسافروں کیلئے تھا اور یہ دس مسافروں کیلئے۔ مگر یہ دو صورتیں پھر یہاں کیسے آگئیں۔ میں تو انکا پیچھا کرنے کیلئے آیا تھا اور یہ لوگ ؟؟؟ ــــــ یہ کیوں آئے تھے ــــــ وہ عورت دس دس کے کرنسی نوٹ نکال کر اُس نوجوان کو دے رہی تھی اور وہ بغیر گنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال رہا تھا۔

اُن کا سٹیشن جہاں اُنہیں اُترنا تھا آگیا۔ وہ جلدی جلدی اُترا اور سیدھا بکسٹال پر اپنے اخبارات و رسائل ــــــ جو وہ وہیں چھوڑ گیا تھا۔ لینے کے لئے پہنچا۔ اتنے میں وہ خاتون بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ وہاں آپہنچی۔ سٹال ایجنٹ سے کہنے لگی "یہ چھ آنے والا رسالہ واپس لے لیجئے پانچ آنے میں۔ ہم نے ابھی پڑھا نہیں ہے"

"نہیں میڈم"

"چار آنے میں ؟"

"نہیں مس صاحبہ"

"اچھا نصف قیمت پر ؟"

"نہیں میڈم"

"اچھا چلو دو آنے میں لے لو اب تو گھاٹا نہیں"

سٹال ایجنٹ نے جواب دیا "مس صاحبہ! ہم یہاں اخبارات بیچنے کیلئے کھڑے ہوتے ہیں۔ خریدنے کے لئے نہیں" اور وہ اپنا سا مُنہ لے کر چلدی۔

اُسنے بھی اپنے رسائل اُٹھائے اور چبوترے کی سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے ایک رسالہ کے ورق اُلٹ کر یونہی سرسری نظر ڈالنے لگا۔

رسالے کے اوّلین صفحات پر معزز ایڈیٹر رسالہ ہذا نے اپنی طرف سے لکھا تھا:۔

"مجھے یہ معلوم کرکے نہایت ہی افسوس ہوا ہو کہ چند ایک رسالے ملک میں ایسے جاری ہو گئے ہیں جو اُردو ادب کی بدنامی کا باعث ہونگے۔ اور اس سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے میں ایک اور بات ناظرین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اُردو رسائل کے جتنے بھی خریدار ہیں سب درمیانہ حیثیت کے ہیں۔ آخر اُردو نے امیروں کا کیا بگاڑا ہے جو وہ غیر ملکی اخبارات پر تو دل کھول کر روپیہ صرف کرتے ہیں ــــــ

طوائف

فیروزہ کی ماں نے دوسرا بیاہ کرلیا۔ فیروزہ ماں کے بیاہ سے بہت خوش تھی۔ اس کی ماں نے بیاہ کے قبل اس سے کہا تھا کہ اُسے پھر باوا مل جانیوالے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ اچھے۔ اسکا حقیقی باپ اُسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ شام کو کام سے واپس آتا تو پہلے اُسے گود میں اُٹھاکر پیار کرتا، اُسے اپنے ساتھ کھلاتا اور ساتھ سُلاتا اُس کی ماں جب اس کے باپ کی عدم موجودگی میں اُسے پیٹتی تو فیروزہ باپ کے سامنے رونی صورت بناکر شکایت کرتی۔ اُسوقت اسکا باپ اُس کی ماں پر بہت خفا ہوتا۔ اور فیروزہ ماں کو باتیں سنواکر بہت خوش ہوتی۔ اس کی ماں اسے ایکدم چاہتی نہ تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد سے فیروزہ اس کی محبت اور توجہ کی محرومی کے اثر سے سُست رہا کرتی۔ جیسے اسکا کوئی محبوب کھلونا کھو گیا ہو اور اسکا بدل اسے نہ ملا ہو۔ لسے پھر دوسرا باپ ملنے والا تھا۔ وہ اُسی ویسا ہی پیار کریگا۔ اس کی ویسی ہی خاطر داریاں کریگا۔ باپ سے۔ ماں تھوڑی ہی ہے کہ اُسے بات بات پر جھڑکیاں سناتے اور بیقصور سزائیں دیا کرے۔ اسی طرح کے خیالات کی سی کیفیت فیروزہ کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی جس وقت وہ اپنے نئے باوا کی آمد کی منتظر تھی۔ عبدال گھر میں داخل ہوا تو فیروزہ شوق آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بڑھی۔ لیکن خود بخود اُسکی نگاہ نیچے کو جھک گئی اور وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ شاید عبدال کی آنکھوں میں اُس نے اپنے باپ کی نظروں کا نشان نہ پایا۔ عبدال نے اُسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور اُسکی طرف متوجہ ہوئے بغیر اس کی ماں کے پاس کوٹھری میں چلا گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی عبدال نے دروازہ کی کنڈی اندر سے چڑھا دی۔ باوا نے تو کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ اسکا باوا نہیں ہوسکتا۔ فیروزہ کی ماں نے کوٹھری کے اندر سے آواز دیکر اُسے ساتھ کی کوٹھری میں جاکر سو رہنے کا حکم دیا۔ فیروزہ کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ آج تک وہ دوسری کوٹھری میں نہ سوئی تھی۔ وہ اکیلی کس طرح سوئیگی؟ اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ یہیں سوؤنگی۔ اُس نے ماں کو پکار کر کہا۔ "اچھا لیکن ابھی وہیں جاکر سو رہو میں پھر یہیں لے آؤنگی"۔ اس کی ماں نے جواب دیا۔ فیروزہ کا خوف سے قدم نہ اٹھتا تھا۔ لیکن وہ ماں سے بہت ڈرتی تھی۔ اس کی مار یاد کرکے۔ اسکے حکم کے خلاف نہ کرسکتی تھی۔ "لیکن باوا نے اُسے کیوں نہیں بلایا؟ اسکے باوا تو کبھی اُسے اس طرح تنہا نہ چھوڑا کرتے تھے۔ کیا یہ اس کی ماں کے خلاف اسکی پشت پناہی نکریگا؟" وہ ڈرتے ڈرتے دوسری کوٹھری میں آئی اور کھٹولے پر لیٹ گئی۔ وہ اپنے باپ کی باتیں یاد کرکے ماضی کی دلچسپیوں میں کھو گئی۔ آدمی کا حافظہ اگر چھین لیا جائے تو بیشتر واقعات و مشاہدات کے زہریلے نشتر اُسکے لئے جینا دشوار کردیں۔ لیکن حافظہ ہماری زندگی کی گذشتہ تلخیاں بھی تو پیش کرسکتا ہے بمشکل سے۔ اسلئے کہ حافظہ ہماری خواہشوں کا مطیع ہے۔ وہ ہماری خواہشوں کے مشورہ سے زندگی کے مشاہدات کو رد یا قبول کرتا ہے۔ وہ واقعات کے سنگریزوں میں ہمارے لئے چمکیلے موتی تلاش کرلیتا ہے۔ فیروزہ کو تھوڑی دیر میں نیند آگئی۔

فیروزہ کی ماں کے ہاں ایک بچی اور ہوگئی تھی۔ اُسکی ماں اور عبدال ہر وقت لحاف میں لپٹے رہتے۔ فیروزہ کو دن دن بھر اُسے گود میں لئے بیٹھا رہنا پڑتا۔ اس کی پیٹھ اکثر جایا کرتی۔ ایک دن بچی اس کی گود سے زمین پر آرہی تو عبدال نے اُس پر ایسی خشم آلود نگاہیں ڈالیں کہ وہ بید کی طرح لرز گئی۔ اگرچہ اُس نے جان کر اُسے نہیں گرایا تھا۔ اُسے ماں سے بھی اُس دن سخت جھڑکیاں سُننی پڑی تھیں۔ ننھی کے لئے عبدال نئے نئے کپڑے کھلونے اور مٹھائیاں لایا کرتا۔ لیکن یہ کپڑے اور مٹھائیاں اسے کیوں نہیں دی جاتیں؟ اس کا باپ تو سب کچھ اسی کو لاکر دیا کرتا تھا۔ اس کے ننھے سے دل میں عبدال کے لئے نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ اُس کے جذبات کی مسلسل ٹھیسوں نے اس نفرت کی نیو طیار کی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت جذبے سے بڑھکر ایک مستقل زاویہ نگاہ بن گئی اور فیروزہ کو عبدال کی ہر حرکت میں اپنے ساتھ دشمنی اور ناروا سلوک کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ نفرت کی لازمی پیداوار، انتقام کے جذبات، اُسکے نرم و نازک دل میں خشونت اور کرختگی کا خمیر تیار کرنے لگے۔

رفتہ رفتہ اُسے عبدال کے احکام کی خلاف ورزی میں لذت سی محسوس ہونے لگی اور اس کی حرکتیں اضطراری طور پر ایسی ہونے لگیں کہ عبدال کی برافروختگی کا شکار بن سکیں۔ اسے تاکید تھی کہ وہ اوّل تو گھر سے باہر کہیں جائے ہی نہیں اور اگر جائے بھی تو بہت جلد واپس ہو جائے لیکن فیروزہ برابر باہر نکل جاتی اور اکثر رات ہوئے تک واپس نہ آتی۔ اُسے اس کے لئے سخت سزائیں بھگتنی پڑتیں۔ ایک دن جب وہ رات گئے دیر سے واپس ہوئی تھی تو اس کی ماں نے اسے اچھی طرح پیٹ لینے کے بعد اس کے سارے کپڑے چھین لئے تھے اور ننگا کر کے دروازہ سے باہر کر دیا تھا۔ عبدال اس وقت گھر میں موجود تھا اور فیروزہ کی ماں کی اس نرالی سزا پر داد تحسین دے رہا تھا۔ فیروزہ محسوس کر رہی تھی کہ وہی اسکی ماں کو اُکسا کر اُسے سزا دلوا رہا تھا جس وقت اس کی ماں نے اُسے ننگا کر دیا تھا عبدال اس کے عریاں جسم پر نظر جمائے فاتحانہ شان سے مُسکرا رہا تھا۔ اس وقت فیروزہ کا جی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالے اور اُسکا مُنہ نوچ لے۔ وہ بظاہر کچھ نہ کر سکتی تھی لیکن اس کے دل میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک منصوبوں کی نیو پڑ گئی۔ گو خود فیروزہ کے شعور کو اس کی خبر نہ تھی۔

فیروزہ جوان ہو گئی۔ خوبصورت تو وہ بچپن ہی سے تھی لیکن شباب نے اس کے اعضا میں بجلی کی حرارت ڈالکر اُن میں غیر معمولی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ اسکے میلے چکٹے کپڑے اُسکے حُسن پر پردہ ڈالنے کے بجائے اسکی دلکشی کو دوبالا کر رہے تھے۔ جیسے میلے بادلوں کی آغوش میں چاند۔ اسکی معصوم نگاہوں میں جادو بھر گیا تھا۔ عبدال کی جھونپڑی میں وہ گودڑ کا لعل معلوم ہونے لگی۔ عبدال کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ وہ فیروزہ کی ماں کے بہت چھوٹا تھا۔ اس کے اندر ابھی جوانی کی حرارتیں باقی تھیں۔ شعلہ کو دیکھ کر شعلہ میں لپک پیدا ہوئی۔ اور عبدال فیروزہ کی جوانی کا شکار ہو گیا۔ لیکن وہ فیروزہ کی ماں سے بہت ڈرتا تھا۔ نچلی سوسائٹی کی عورتیں عموماً مردوں پر حاوی ہوا کرتی ہیں۔ انہیں طبقہ اوسط کی طرح مردوں کا محکوم نہیں رہنا پڑتا۔ عبدال کی مجال نہ تھی کہ وہ فیروزہ کی ماں کی واقفیت میں فیروزہ کے ساتھ کسی طرح کا اقدام کر سکتا۔ ممکن ہے گناہ کے تصوّر نے بھی اسے بودا بنا دیا ہو۔ ایک دن عبدال کو اپنے خرمن کی خوشہ چینی کا موقعہ مل گیا۔ فیروزہ کی ماں کچھ دیر کیلئے باہر گئی ہوئی تھی۔ محلہ سے دور کسی بیاہ کی شرکت میں اور کافی دیر سے واپس ہونے والی تھی۔ فیروزہ گھر میں اکیلی تھی۔ عبدال ایسے موقعہ کی راہ ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ شوق آمیز نگاہیں فیروزہ پر جمائے اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ فیروزہ کو وہ ان بدلی ہوئی نگاہوں کا عادی بنا چکا تھا گو فیروزہ کے لئے اب تک اُس کی نظروں کا تغیر ایک معمہ تھا۔ عبدال نے فیروزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پہلے تو فیروزہ کچھ سمجھ نہ سکی لیکن فوراً اس نے آپ ہی آپ عبدال کے ہاتھ کو ایک تیز جھٹکا دے کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اور پھر اپنی اس گستاخی کی سزا کی منتظر پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی لیکن عبدال نے اس کی اس جسارت کا جواب ایک نرم مُسکراہٹ سے دیا۔ یہ بالکل انوکھی سی بات تھی۔ فیروزہ کچھ سمجھ نہ سکی لیکن وہ ایک انبساط کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ شاید اس کے دماغ نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا کہ وہ بھی عبدال پر وار کر سکتی ہے۔ عبدال دوبارہ اس کے قریب آ گیا اور اس دفعہ اس نے فیروزہ کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ فیروزہ نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہو سکی تو اُس نے عبدال کے ہاتھ میں اپنے دانت گڑا دیئے۔ عبدال کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ لیکن اس دفعہ بھی فیروزہ کو کوئی سزا نہ بھگتنی پڑی۔ عبدال نے اُس پر پھر حملہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک نمودار ہو رہی تھی اور اسکے اعضا میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ فیروزہ نے اس دفعہ پھر مدافعت پوری قوت سے کی۔ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے جیسے عنابی شراب بلوری پیالہ سے چھلک رہی ہو۔ اس کے قلب کی تیز دھڑکن اس کے سینہ میں ایک دلکش مدوجزر پیدا کر رہی تھی۔ اسکے کپڑے پسینہ سے تر ہو کر اس کے جسم سے چمٹے جا رہے تھے۔ جیسے وہ بھی عبدال کے خلاف اس کی مدد کر رہے ہوں۔ فیروزہ تھک کر زیر ہو گئی۔ اپنی پسپائی محسوس کر کے اُس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن عبدال نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آخر عبدال نے اُس پر پورا قابو پا لیا لیکن فیروزہ نے اپنے تیز ناخن کے مسلسل عمل سے اسکے جسم کے اکثر حصوں کو داغدار بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد عبدال فیروزہ کو ہزیمت اور کامرانی کی متضاد کیفیتوں کا شکار چھوڑ کر گھر سے کہیں باہر چلا گیا اور رات کو بہت دیر گئے واپس آ کر بیماری کا بہانہ

کرکے چادر اوڑھ کر سو رہا۔ فیروزہ کی ماں کو ان باتوں کا کوئی علم نہ ہوا۔

عبدال نے اکثر اس طرح موقعہ پاکر اپنی ہوسناکی کی تسکین کی لیکن ہر دفعہ اُسے فیروزہ کی طرف سے شدید مدافعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ فیروزہ اس کے ساتھ توہین آمیز سلوک سے پیش آتی۔ اُسے طمانچے لگاتی۔ اس کے کان مروڑتی۔ اکثر اسے راز فاش کر دینے کی دھمکیاں دیتی۔ شروع میں فیروزہ کے ہاتھوں اپنی اہانت عبدال کو بری لگتی تھی لیکن وہ بے بس تھا۔ اگر وہ فیروزہ کے سلوک کا سختی سے جواب دیتا تو ممکن تھا راز طشت از بام ہو جاتا اور اسے فیروزہ سے دست بردار ہو جانا پڑتا جس کی اجازت اس کی ہوس نہ دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ فیروزہ کے برتاؤ کا عادی ہو گیا اور اُسے اپنی خودداری کا کوئی پاس باقی نہ رہا۔ پانی کے قطروں کا تواتر پتھر میں چھید کر دیتا ہے۔ آدمی کا وقار مسلسل ٹھکرانے کے بعد کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ عبدال نے یہ بھی محسوس کیا کہ جب بھی وہ فیروزہ کو بغیر کسی مزاحمت کے اپنی توہین اور سرزنش کا موقعہ دیدیتا تو حصول مقصد میں اسے آسانی ہو جاتی۔ اس طرح وہ اپنی اہانت سے حصول مدعا کیلئے رشوت کا کام لینے لگا۔

فیروزہ کی ماں نے ایک دن عبدال اور فیروزہ کے تعلقات اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے۔ اس نے چیخ چیخ کر عبدال اور فیروزہ کو کوسنے اور گالیاں دینی شروع کیں اور سارے محلہ کو سر پر اٹھا لیا۔ عبدال آہستہ سے گھر سے باہر نکل گیا اور فیروزہ کوٹھری میں چھپ کر رونے لگی۔ اس کی ماں دن بھر رونے پیٹنے کے بعد تھک کر شام کو منہ ڈھانک کر کھاٹ پر پڑ گئی۔ فیروزہ چور کی طرح گھر سے نکل کر کیا کے گھر جا چھپی۔ کیا ایک کہنہ مشق بردہ فروش تھی۔ وہ پہلے ہی سے فیروزہ کی گھات میں تھی۔ اُس نے شکار ہاتھ سے جانے نہ دیا اور فیروزہ کو شہر کے چکلے کے ٹھیکیدار کے ہاتھ فروخت کرکے راتوں رات بلا اس پورت غائب کرا دیا۔

فیروزہ اب دوسری دُنیا میں تھی۔ اُس نے بہت جلد شہر میں کافی شہرت حاصل کرلی اور شیدائیوں کا ایک گروہ اسکی جنبش نظر پر جان سپاری کا ارمان دل میں لئے اس کی دکان کا چکر لگانے لگا۔ پہلے تو فیروزہ اس نئے ماحول سے کچھ گھبرائی سی معلوم ہوئی لیکن رفتہ رفتہ ہوس کی قربان گاہ پر مردوں کی خودداری و وقار اولوالعزمی و بلند حوصلگی کی بھینٹ میں اُسے مزا ملنے لگا۔ وہ اس حاکم کی طرح خوش اور شاداں رہنے لگی جس کی رعایا بُرے سے بُرے مظالم اور ذلیل سے ذلیل تحقیر کے بعد بھی اُف تک نہیں کرتی۔ وہ اپنے ہر نئے خریدار کو جلی کٹی باتیں اور توہین آمیز جملے سُناتی۔ اُسے نشانہ غیظ و غضب بناتی اور مختلف عنوان سے اس کی ہتک عزتی کرتی۔ وہ اس سے خوشامد کراتی ہاتھ جڑواتی قدموں پر سر رکھواتی اور جب وہ ان ساری آزمائشوں سے پار اتر جاتا تو غرور و تمکنت کے ساتھ اس کے حق میں اپنی عارضی سپردگی کا فیصلہ صادر کرتی۔ اگر کوئی نووارد ان آزمائشوں کے لئے تیار نہ نظر آتا تو فیروزہ اُس پر قہر و غضب کی نگاہیں برساتی کسی بہانہ سے کمرہ سے اٹھکر چلی جاتی۔ فیروزہ اپنے چاہنے والوں میں اپنی سخت کلامی درشتی بداخلاقی اور بے تمیزی کے لئے بدنام ہونے کے باوجود انہیں اپنی طرف کھینچے جا رہی تھی۔ وہ اس کی جاذبیت کا سبب اس کا غیر معمولی حُسن بتاتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ اس کی دلکشی کا راز اس کی درشتی اور سخت کلامی ہی میں مضمر ہو۔ انکے ذریعہ جذبہ گناہ کے ساتھ تقاضائے سزا کی تسکین بھی ہو جاتی ہوگی۔ گناہ کے ارتکاب کے بعد آدمی میں سزا کی خواہش بھی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی سبب جس گناہ کی خارجی سزا ممکن نہیں ہوتی اس کے ارتکاب پر ضمیر کے نیش سزا کا کام کرنے لگتے ہیں۔ فیروزہ کا رویہ چکلہ کے ٹھیکیدار کو بہت زیادہ ناپسند تھا۔ اُس نے اُسے اکثر نصیحتیں کیں کہ وہ اپنے شیدائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے لیکن فیروزہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اور چونکہ باوجود اپنی بداخلاقی کے فیروزہ ٹھیکیدار کے لئے سب سے زیادہ آمدنی کا ذریعہ تھی اس لئے اُسے ناچار صبر سے کام لینا پڑتا تھا۔

فیروزہ کے ایک شیدائی نے اپنی ایک مستقل نشانی اس کے پاس چھوڑ دی۔ فیروزہ آتشک کی شکار ہو گئی۔ پہلے تو وہ اس عارضہ کی اہمیت کو کچھ سمجھ نہ سکی لیکن جب رآما نے اس کے خوفناک نتیجے اسے بتائے تو اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان سبھوں کو جب اسکی خبر ہو جائے گی تو وہ ہمارے پاس کبھی بھی نہ آئیں گے۔ اسلیئے کہ تمہارا یہ مرض ان کی نسل تک کو برباد کر دے گا۔ فیروزہ یہ سُن کر کانپ گئی۔ شاید اس لئے کہ اُسے اپنے اقتدار اور حکومت کی بنیاد متزلزل نظر آنے لگی۔ جیسے کسی بادشاہ کی رعایا اُسے تخت سے معزول کر رہی ہو۔ اُس نے رآما سے قسمیں لیں کہ وہ اس راز کو کبھی پر افشا نہ کرے گی۔ وہ خود بھی اپنے مرض کو پوشیدہ رکھنے میں کامل احتیاط برتتی لیکن اس نے اپنے شیدائیوں کی تسکین آرزو کے مشاغل میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ تعداد کو

روز شاد کام کر رہی تھی۔ اس کی اس بڑھتی ہوئی مسرت دقیقت کا اس کی صحت پر نہایت خراب اثر پڑ رہا تھا۔ اس کا مرض اتنا اس کے جسم کو گھن لگا رہا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری رہتی اور اس کے چہرے پر شادابی اور مسرت کی جھلک نمایاں جیسے اس کے کسی نامعلوم دیرینہ جذبہ کی تسکین کا دفعتاً سامان مہیا ہو گیا ہو۔ اپنے خریدار کی تکمیل ہوس پر وہ ایک پُراسرار قہقہہ میں گم ہو جاتی جیسے وہ اپنی کسی غیر معمولی کامیابی سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

اُس کے آشنا اُس کے مرض کے شکار ہو کر ایک ایک کر کے کنارہ کش ہونے لگے اور بہت جلد وہ اس طبقہ کا مال بن کر رہ گئی جو اس قدر ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہے کہ اس کے نزدیک کسی ایک مرض کا اضافہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ فیروزہ کا مرض روز بروز بڑھتا گیا اور رفتہ رفتہ اسکا دماغ ماؤف ہو گیا۔ چکلہ والوں نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ لیموں کی قاش کی طرح جسے پورا رس نچوڑ لینے کے بعد ہم بے پروائی سے پھینک دیا کرتے ہیں۔ وہ اب انکے کس کام کی تھی؟ فیروزہ ایک خطرناک پاگل بن گئی تھی۔ اس کے پاس ڈھیلوں اور ٹھیکریوں کے انبار جمع رہتے جن کا وہ ہر چھیڑنے والے کو نشانہ بنایا کرتی۔ اُس کے پھٹے پھٹے دیدوں سے چنگاریاں سی نکلتی رہتیں۔ جنہیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا۔ لوگ رستہ میں اس سے بچکر چلتے اس لئے کہ وہ پاس سے گذرنے والوں پر تھوک دیا کرتی تھی۔ وہ بہت جلد رستہ چلنے والوں کے لئے خطرناک قرار دیدی گئی اور اُسے پاگل خانے بھیجدیا گیا۔ پاگل خانے پہونچکر اُس نے ایک محافظ کے سر پر کانسہ کا تسلہ پھینک مارا۔ دماغ کے نازک حصہ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے محافظ جانبر نہ ہو سکا۔ جب سے اُسے زنجیر میں باندھ کر آہنی سلاخوں والی کوٹھری میں مقفل کر دیا گیا ہے۔

محمد محسن

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھئے اور جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔ ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

(مینجر)

(بقیہ ادب۔ بسلسلۂ صفحہ ۱۱۶)

مگر اُردو زبان کے رسالے مانگ کر پڑھتے ہیں۔ اور جو خریدتے ہیں وہ پڑھ چکنے کے بعد اونے پونے کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ خریدار نہیں تو بھی غریب۔ افسانے لکھیں تو بھی غریب۔ اور پھر توسیع اشاعت اور نئے خریدار بنانے میں حصہ لیں تو بھی غریب۔

ایسا کیوں ؟؟؟ (ایڈیٹر)

اور اُس نے رسائل کو بغل میں دبائے سوچنا شروع کیا۔ ایسا کیوں ؟ ـــــ ہاں ہاں کیوں ؟ ـــــ کس لئے ؟؟۔ آخر کیا وجہ ہے ؟؟؟ ـــــ اور ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ہی سوچتا سوچتا وہ گھر کو چل دیا۔

ساون مل ترکھا!

تقلیم کی ستم ظریفی

(یعنی پیوندی انسانوں پر ایک نظر)

لوگ کہتے ہیں ایک تحصیلدار صاحب بہ تقریب دورہ ایک گاؤں میں مقیم تھے۔ برسات کا موسم دوپہر کا وقت گھنگھور گھٹا۔ ہلکی ہلکی پھوار خواب آور ہوا کے جھونکے تحصیلدار صاحب استراحت فرما رہے تھے۔ خدا کا حکم۔ سنجوگ کی بات چھپر اُڑا۔ آن پڑا نیچے کا دھڑ کچل کر قیمہ ہو گیا۔ معمولی مزدور ہوتا ختم ہو جاتا۔ تحصیلداری جانداری کا نام ہے۔ بے ہوش تو ہو گئے مگر زندہ رہے۔ سارے گاؤں میں تہلکہ پڑ گیا۔ ماشاءاللہ یہ کاری شکر کیا کم تھا تو عمل میں آیا۔ اتفاقاً موجودہ زمانے کے لال بجھکڑ۔ وارنوف قسم کے جراح بھی موجود تھے۔ اُن سے مشورہ کیا گیا۔ تامل کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی آدمی مل جائے جسکا اُوپر کا دھڑ کچل گیا ہو اور نیچے کا سالم ہو۔ ابھی لاؤ پیوند لگا دوں صحیح سالم ہو جائیں۔ نائب صاحب بولے۔ ارے میاں ...... جرّاح صاحب پھر تامل کے بعد بولے۔ مگر ہاں یہ کب ممکن ہوگا؟ تحصیلدار صاحب، تو چھپر میں تنہا تھے۔ اچھا خوب یاد آیا۔ ہاں ہاں لاؤ لاؤ۔ لاحول ولا قوۃ۔ نائب صاحب جلدی منگائیے کوئی جانور۔ جانور۔ ہاں ٹھیک ہے بکری، بکری منگائیے صاحب بکری۔ یہ الفاظ مُنہ سے نکلنے میں دیر ہوئی ہوگی۔ صدہا بکریاں مہیا تی موجود ہو گئیں۔ دیہات میں ان چیزوں کی کیا کمی۔ آدمی سے زیادہ جانور موجود۔ جراح کی چابک دستی ایک فربہ سی بکری دیکھ کر فوراً دوپارہ کیا۔ آن کی آن میں تحصیلدار صاحب کا اُوپر کا دھڑ بکری کا نیچے کا دھڑ پیوند چڑھا دیا۔ ایک طرف اللہ کا حکم تحصیلدار صاحب کی زندگی کتنی ہزاروں سانس باقی تھے، دوسری طرف جرّاح خرّانٹ حاذق شفا ہی شفا تھی۔ تحصیلدار صاحب صرف تندرست ہی نہیں ہوئے۔ نیم انسان اور نیم بُز ہو گئے۔ ایک کام کے نہیں دو کام کے ہو گئے...... حکیم فلاسفہ نے یہیں تک روایت بیان کی تھی سامعین احباب میں سے شاکر نے پھٹی ہوئی آنکھوں کو اور پھاڑا۔ بے دانت کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ گھبرا کر بولے۔ "واللہ قسم خدا کی"۔ حامد نے کہا۔ "ہاں نہیں"۔ جمود بولے۔ پھر کیا ہوا؟ حکیم جی نے کہا ہوتا کیا پڑھ لو۔ تحصیلدار صاحب جب تک زندہ رہے دونوں وقت میں پاؤ بھر دودھ چائے میں پیتے تھے اور دونوں وقت میں تین پاؤ دیتے" تھے۔

یہ قصہ ہوا فسانہ ہو مبالغہ ہو خرافات ہو، موجودہ زمانہ کی عینک سے دیکھنے والے۔ سائنس کی دوربین استعمال کرنیوالے جانتے ہیں۔ امرود۔ آڑو۔ آم اور بیشتر پھل پیوند لگانے سے قسم اعلیٰ ہو جاتے ہیں۔ جانوروں میں صدہا مخلوط نسلیں بنائی جا رہی ہیں۔ بڈھے۔ کہولت زدہ۔ ناکارہ انسان بندروں کی برکت سے۔ "مجسم شباب" بن رہے ہیں ...... حکیم جی کی داستان کہیئے لکچر کہیئے نامعلوم کس جگہ ختم ہوتا اور کیونکر ختم ہوتا، جمود صاحب کی جمودیت کا پیمانہ لبریز ہو گیا آخر چیخ کر بولے:-

"ارے میاں رہنے دو اس لغویات کے دفتر کو۔ آخر تضیع اوقات سے کیا فائدہ کوئی کام کی باتیں کرو"

"کام کی بات!" فلاسفہ نے کہا

"ہاں ہاں میاں کوئی تفریح سہی" شاکر بولے۔

"تفریح" فلاسفہ نے کہا۔

"اماں بس ہو چکا" حامد نے کہا۔

"عقل سے بے بہرہ۔ عمل سے بے خبر۔ علم سے نابلد انسانوں"۔ فلاسفہ نے کہا" وارنوف اور دیگر علمائے سائنس کے اعادۂ شباب کے اصولات۔ بندر کے غدود کا استعمال۔ "اوکاسا"۔ "جوہر حیات"۔ "حب مسکین نواز"۔ "شاہی حلوا"۔ زانڈو درکشا سو۔ یہ سب لغویات ہیں۔ یا حقیقت۔ حکیم صاحب انکی حقیقت سے انکار۔ یا انکی اصلیت کا اقرار اپنا مسلک نہیں" جمود نے کہا۔

"اب آپنے یہ تذکرہ چھیڑا ہے تو یہ ہی سہی....."

"ہاں صاحب تو ہو" حامد نے کہا

"اچھا صاحب مٹے زبان کی خارش" شاکر بولے۔

"میاں بات اصل یہ ہے کہ حکیم فلاسفہ صاحب "اعادۂ شباب"

اور "تقلیم" کی مہارت تامہ حاصل کرنے ولایت تشریف لیجا رہے ہیں۔"
جمود نے کہا۔ "پہلے اس غیر فطری عمل کے متعلق جتنی معقولات مشقولات اور لغویات کی باتیں ہیں ان سے انکو غیر معمولی دلچسپی ہے۔ اب ہم لوگ چاہے عقل سے بے بہرہ ہوں بے عمل ہوں بے علم ہوں ہم بھی بہ حیثیت دوست ہونیکے ان کے شریک حال ہیں۔"

"یہ واقعہ ہے۔ ناقابل انکار حقیقت ہے"۔ حامد نے کہا۔

"آ پہلے حضرات بیچ کہیں بل تو بل سہی میں تائید کرتا ہوں" شاکر بولے۔

"اے یزد دستو" فلاسفر نے کہا۔ "بھلا میرے یورپ جانے تقلیم سیکھنے یا سکھانے اور ان سب باتوں سے اور جو کچھ آپ کے سامنے پڑھا جا رہا ہے کیا واسطہ۔ میرا مطلب اس مقالہ کے پڑھنے سے محض تنقید ہے۔"

"تنقید" جمود آنکھیں پھاڑ کر بولے۔

"جی ہاں تنقید" فلاسفر نے کہا۔

"وہ کیوں" شاکر بولے۔

"وہ اس لئے کہ میں خود اس فن کا ماہر ہوں۔ عامل ہوں" فلاسفر نے کہا۔ "اصولاً ہم جنس اشیاء کا پیوند ایک دوسرے پر چڑھایا جاتا ہے۔ آم کا پیوند آم پر مگر آم کا پیوند بیر پر یا بیر کا پیوند آم پر کیوں چڑھایا جائے۔ جس طرح ان دونوں میں کوئی نسبت جنسی نہیں ہے اسی طرح بندر اور انسان میں نہیں ہے۔"

"یہ سب لغویات تو آپ جانیں اور اس کے آپ ذمہ دار۔ عقل کے نقطۂ نظر سے ہمارے خیال میں تو دو باتیں آتی ہیں" جمود نے کہا۔

"یعنی" شاکر نے کہا۔

"اول تو یہ حقیقت ہے کہ "ارتقا" اور تقلیم دونوں اصول ایک ہی جگہ سے خارج ہوئے" جمود نے کہا۔ "ارتقا کو تقلیم پر چپکا کر نسبت جنسی پیدا ہوگئی۔ ڈارون صاحب نے بندر کو قلابازیاں کھلا کر انسان بنا دیا۔ وارنوف صاحب نے کہولت زدہ انسان کو پھر بندر سے چپکایا اور اعادۂ شباب کر دیا۔ دوسری بات غالباً یہ ہوگی کہ بندر صاحب کے قوئی بہ اعتبار تولید و تناسل انسان سے زیادہ مستحکم سمجھے جاتے ہونگے۔"

"بھئی خوب کہا" حامد بولے۔ "مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کہ جس طرح ڈارون صاحب نے بندر سے انسان بنایا اور وارنوف صاحب نے یا دیگر ماہرین نے بڑھے انسان پر بندر کا پیوند چڑھا دیا اور جوان بنا دیا اگر فطرت اس پیوندی انسان کو ایک الٹی قلابازی کھلا دے تو کیا ہو؟ پھر بندر بن جائے اور کیا ہو۔" حامد نے کہا۔

"میاں جمود صاحب"۔ فلاسفر نے کہا "کچھ تھوڑی سی حقیقت سے چھوتی ہوئی بات حامد نے کہی۔ میں اسکا تو قائل نہیں کہ فطرت تقلیم شدہ انسان کو پھر بندر بنا دے مگر ہاں اسکا قائل ہوں کہ بندر کی سی عادات اور اطوار کے پیدا ہونے کا احتمال ضرور ہے۔ اور بھی یہ ہی تنقید کے لئے اچھا خاصا مواد ہو سکتا ہے اور میرا یورپ جانے کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ وہاں کے ماہرین سے کچھ مشورہ کرنے کے بعد واپسی پر میرا عمل تو یہ ہی ہوگا کہ انسان کا پیوند انسان پر........"

"ارے میاں تم جاؤ تمہارا عمل" شاکر بولے۔ "بس قصہ ختم پیسہ ہضم، ہم چلیں اپنے گھر اور بس ؎

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

جب سے ہندوستان کی تمام فضیلتیں یہاں سے اٹھ کر مغرب کے عجائب خانوں میں، دارالعلوم میں سائنس کے معمول میں چلی گئیں اور جب یہاں کی معاشرت، وضع قطع وہاں کی بڑی بڑی دکانوں ہی میں مل سکتی ہے تو اس بدنصیب ہندوستان کا حسین چہرہ تمام زینتوں اور رونقوں سے بچ کچھ گزرا "زن شوہ" ہوگیا۔ اب وہ دردمند اور ہمدرد ہستیاں جو آنکھوں لنگوٹیاں باندھے نظر آتی ہیں آمادہ ہیں اور مستعد ہیں اسپر کہ اس زندہ درگور ہندوستان کو صرف چرخے کے بل پر قبر سے کھینچ لائیں۔ حالانکہ اُن کے ہر سانس کی صدا اگر آپ سنیں تو یہ آواز آئیگی ؎

آپکے چرخہ نے حضرت اس قدر بیداد کی
آج تک زنداں سے آتی ہے صدا فریاد کی

اور مشاہدہ یہ کہتا بتاتا ہے کہ ڈیڑھ گز کے لٹھے کا پاجامہ لاگت میں برابر آدھے کھدر کے پاجامہ کے اور عمر میں برابر ہے دو کھدر کے پاجاموں کے۔ مگر واللہ یہ دردمند ہستیاں چرخہ اور صرف چرخہ چلا کر "قریب ترین مستقبل" میں (جسکی پیمائش کا آلہ صرف انہی کے پاس ہے) آپکے مایوس العلاج "بھارت" کو زندہ کر دینگی اور آپ

دیکھیں گے کہ چرخہ اور چرخہ کا "پیوند" اس ضعیف ہندوستان کو "اعادۂ شباب" کی دولت سے مالا مال کر دیگا۔ اب بھی وہ ہستیاں جن کے دماغ میں "زلف یار" کا سودا، جسم میں "کا بلغم۔ لب لعلیں کا خون موجود ہے اور جیبوں میں پیسہ ہے وہ بشرط صدر ولایت آتے جاتے رہیں اور مغربی فضیلتیں پاتے رہیں گے۔ فلاسفہ بھی بہت سی فضیلتیں لے آئے، ہاتھ پاؤں کی کھجلی مٹا آئے۔ جس طرح حیوانات اور نباتاتی نسل کشی کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو چار برس کے بعد خالص نسل کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ تازہ اور اصیل حیوانات اور نباتات پیدائش کی جگہ سے منگائے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح سمندر پار کا علم اور فضیلت بھی دوسرے تیسرے برس تازہ کرنے کے قابل رہتے ہیں۔ فلاسفہ کے عمل میں کوئی گونہ اضافہ تو نہ دیکھا نہ سُنا۔ ہاں البتہ پرانے ساز میں نئے تار پڑ گئے گو بج زیادہ ہو گئی شہرت میں اضافہ ہونا پیسہ زیادہ ملنے کا ذریعہ ہے۔

دوست احباب نے جب پوچھا کیا لائے جواب ملا چند جدید آلات جراحی اور چند مجربات اسپتال کی ترمیم کے لئے نیا نقشہ اور بندر پالنے کے نئے طریقے۔ جسکو خدا پیسہ دے اس کے لئے دوست احباب کی کیا کمی۔ شام کے وقت اس جمگھٹے کا معمول تھا کہ مرغ باز۔ بیٹر باز کی طرح دماغ لڑایا کرتے تھے۔ اور فلاسفہ نے بھی غالبًا اپنے اوپر کوّے کا پیوند چڑھایا تھا کہ کائیں کائیں سے تھکتا نہ تھا۔ سارے مجمع میں البتہ جمود کی ذات ایسی تھی کہ سنتا بہت تھا بولتا کم تھا۔ چند روز سے تو غضب کا جمود طاری تھا۔ فلاسفہ نے بھانپا اور ٹوکا بھی۔ غیر معمولی خاموشی اور تفکر کی وجہ بھی پوچھی آخر ایکدن تنہائی کا موقعہ مل گیا جمود نے بھی جب اصرار دیکھا تو مجبورًا انکشاف کرنا ہی پڑا۔ اور جھنجھلا کر بولا۔ ناک میں دم کر دیا۔ وہی کہاوت ہے کہ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے۔ آپ کے پاس بیٹھنے کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ میں آپکا ایجنٹ بن کر رہ گیا۔

آخر اس میں ہرج کیا ہے۔ فلاسفہ نے کہا۔ میاں بہت کروگے کمیشن لے لوگے۔

لاحول ولا قوۃ کمیشن بھی اس دھوکے کی کمائی کا۔ جمود نے کہا۔

عزیز من۔ فلاسفہ نے کہا۔ یوں جلے پھپھولے پھوڑنے سے کیا فائدہ۔ مطلب کہو مطلب۔

مطلب کیا ہوتا نواب صاحب کو جانتے ہو۔ جمود نے کہا۔

کون نواب صولت یار۔ اُس بزرگ ہستی کو کون نہیں جانتا؟ فلاسفہ نے کہا

فخر قوم و ملت۔ اس مایہ ناز برگزیدہ شخصیت سے کون واقف نہیں۔ کیوں کیوں کیا بات ہے۔

بات کیا ہوتی۔ جمود نے کہا فطرت اور وقت اُن کو منزل پر پہنچانا چاہتے ہیں مگر لوگ باگ اُن کو کھینچ کر وہیں لانا چاہتے ہیں، جہاں سے وہ چلے تھے۔

یعنی؟ فلاسفہ نے کہا

یعنی یہ کہ آپ کے آنریشق بننا چاہتے ہیں جمود نے کہا۔ اور یہ پیغام مجھ تک میرے عزیز دوست دیوان ریاست کی طرف سے پہنچا ہے۔

اچھا!! فلاسفہ نے (لمبی مینڈ کے ساتھ) کہا۔ تو یوں کہئے پھر کیا ہے آپ کے پیسے دونوں طرف سے سیدھے ہوئے مجھ سے بھی لیجئے اور نواب صاحب سے بھی۔

قبل از مرگ واویلا!! جمود نے کہا۔ نواب صاحب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں یہ تو چند تمہارے جیسے ڈاکٹروں کا مشورہ اور دیوان صاحب کی رائے ہے......

ہوں۔ اچھا۔ فلاسفہ نے کھرج کے سروں میں کہا۔ اور پھر نہایت متین چہرہ بنا کر بولا۔ جمود۔ جمود۔ خدا علیم ہے میں اس موقعہ پر اپنی آمدنی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ نواب صاحب جیسی بزرگ پایہ۔ ہمہ صفات ہستی کی خدمت کے لئے اپنی تمام ناچیز کاوشوں کو اُنکے قدموں پر نثار کرنا اپنا فخر سمجھتا ہوں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ کے آقائے نامدار کی خدمت کا فخر حاصل ہو....

خیر جو کچھ ہو جمود نے کہا۔ مجھے بھی ناز ہے کہ میں اپنی خدمت میں کامیاب ہوا۔ آپ بھی وقت اور موقعہ کا انتظار کیجئے۔

(۲)

نواب صولت یار جنگ بہادر کو سرور پور کی گدّی پر بیٹھے ہوئے دس سال کا عرصہ ہوا اور اس مدت میں حقیقت یہ ہے کہ دامے درمے قدمے اُنھوں نے اپنی مساعی میں کوئی دقیقہ ایسا اٹھا نہ رکھا جس سے اپنی ریاست۔ ملک اور قوم کی خدمت نہ کی ہو۔ اُنھوں نے گدّی پر بیٹھ کر حکومت نہیں کی بلکہ اپنی ریاست کے چپہ چپہ کونے کونے میں مارے مارے پھر پھر کر خلق اللہ کی خدمت کی۔ وہ اپنی قوم اور ملک کے لیڈر بھی تھے حاکم بھی۔ وہ رضاکار بھی تھے اور فرمانبردار بھی۔ اُنھوں نے اپنی مدّت حکومت میں چین سے

دو وقت شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ اُن کی شکم سیری یہ ہی تھی کہ اُنکی ریاست کے ادنیٰ مصیبت زدہ مزدور کو دو وقت روٹی مل جاتے اُن کے ارباب عیش و نشاط میں ایک اور صرف ایک اللہ والی بیوی اور بس خدا کی قدرت دیکھئے کہ جس ہستی کے لئے صبح شام ہزاروں یتیم۔ لاکھوں بیوہ گان۔ سینکڑوں بیمار گودیں پھیلا پھیلا کر۔ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگیں اُس کے حرم کی چار دیواری۔ فرزند کے چراغ سے بے نور۔ اُس کی آغوش "لخت جگر" سے محروم۔ اُس کی آنکھیں "نورِ بصیرت" سے خالی۔ اللہ اللہ۔ اور پھر اللہ اللہ۔ کچھ تو بے اولادی کا صدمہ کچھ خدمتِ خلق کی غیر معمولی سرگرمیاں اور دوڑ دھوپ۔ نواب صاحب کی صحت کی بنیادیں ان زلزلوں سے اچھی خاصی ہل چکی تھیں۔ اپنے علاج کے لئے نہ حکیم ڈاکٹروں کی قلت اور نہ سرمایہ کی کمی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ نواب صاحب اسکو "اسراف" "تعیش" اور "تضیع" سمجھتے تھے۔ چارہیہ کی دوائی کھنڈائی بھی اُن کے نزدیک حق تلفی تھی۔ ایسی حالت میں اُن کی تندرستی کا خیال رکھنا۔ ایسے علاج کے سپرد کرنا جس سے "ابھی "زندگی" زندگی بن جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ اُنکو قوت اور دورِ حیات دے اور یہ رفاہِ خلق کے لئے ازبس ضروری تھا۔ دیوان صاحب اور حکیم صاحب کی جو سرگوشیاں ہوئیں وہ یوں ختم ہوئیں کہ حکیم صاحب کی جراحی اور دیوان صاحب کی کوشش سے نواب صاحب پر "جوان" غدود کا پیوند چڑھا دیا جائے۔ حکیم صاحب چونکہ ولایت سے تعلیم کا ج کر کے واپس ہو چکے تھے اس وجہ سے اب اس پر کار بند تھے کہ انسان پر انسان پیوند لگایا جائے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔

اِنسان پر انسان کا پیوند عقل لگتی بات ہے مگر واللہ جس قدر عقل سے نزدیک ہے اسی قدر قانون سے دُور۔ انسان اپنی تندرستی اور نفس کے خاطر تو ہاتھی کو ذبح کر کے تکا بوٹی کر ڈالے "کس نمی پرسد" مگر انسان کے غدود حاصل کرنا قتل۔ اور قتل بھی "قتل عمد"۔ قانون سے بغاوت۔ ع مقام عشق میں شاہ و گدا کا ایک رتبہ ہے۔ قانون نہ حاکم دیکھے اور نہ محکوم کو۔ وہ تو اندھے کی لاٹھی ہے۔ قانون اور انصاف کے صرف افسانہ نے جب اسقدر شور مچایا کہ غریب ہندوستان آج "بیکار" کے پیچھے تباہ ہو گیا۔ اس سے کیا مطلب کہ اس کے حاصل کو سمجھا کتنوں نے۔ تو آپ جانیئے کہ اسکے عمل سے کیا کچھ نہ ہو جائے۔ حکیم فلاسفہ کی کم بختی آئے جو کسی زندہ انسان کے غدود نکال لیں۔ اور قانون سے بغاوت کریں۔ اگر ایسا کریں تو بیکار کا ظلم در کنار زندہ مظاہرہ ہو جاتے۔

مشین کا عقلی ترجمہ اگر معجزہ کیا جائے تو یقیناً علمائے ریش و بروت جانی دشمن ہو جائیں مگر اس حقیقت سے کس کو انکار ہو گا کہ موجودہ دور علم و فضل میں۔ اکیلا انسان آناً فاناً میں بے پر کے اِدھر سے اُدھر پہنچ جاتا ہے۔ آناً فاناً میں اُن شہر اور آبادیوں کو جن کی تعمیر میں سالہا سال لگے ہوں گے تخریب کا ایک ڈھیر بنا سکتا ہے۔ پھر یہ اعجاز نہیں تو کیا ہے۔ ہاں البتہ مبصرین کے لئے اصلی معجزہ اور نقلی معجزہ ایک فرق ہے ایک حدِ فاصل بھی ہے۔ اور وہ فرق وہی ہے جو "اللہ کی دین" اور "بندے کی گھڑت" میں ہونا چاہیئے اور ہوتا ہے۔

اللہ کی دین "یدِ بیضا" ہے۔ بندے کی گھڑت "ٹوپچ" ہے۔ یدِ بیضا کی بیڑی اور مسالا جب گریبان میں ہاتھ ڈالا تیار۔ بندے کی ٹوپچ چند ساعت کی مہمان۔

مقصد اس فلسفہ کا یہ ہے کہ بندے نے قانون بنایا جو حفظ و امن کا ذمہ دار ہے۔ ان ہی ذمہ داریوں میں "جیب" ایسی بھی رکھ دی ہیں کہ جو قانون کی ذمہ داریوں سے خالی ہیں۔ آج اگر زید بکر کو مار ڈالے تو پھانسی پر لٹک جاتے۔ کل اگر زید پھانسی گھر میں نوکری کرلے تو صبح سے شام تک کئی بکر مار ڈالے۔ آج اگر زید کسی کے گھر میں جھانکے۔ کسی ممنوع جگہ تھوک دے یا ناک سنک دے قانون کے شکنجے میں پکڑا جائے۔ کل زید ایک طیارہ میں بیٹھ تمام عالم میں جھانکتا پھرے، تھوکتا اور ناک سنکتا پھرے بے جرم ہے۔ الغرض اسی قسم کے قانونی "حجاب" کی توجیہہ کیجائے تو دفتر کا دفتر ہو جاتے جہاں قانون کا جواز فولادی پنجہ رکھتا ہو وہاں "استثنار" کی صورتیں "ساعدِ سیمین" بھی بن جاتی ہیں۔ حکیم فلاسفہ ننھے بچے نہیں تھے جو قانون کی ہولناکیوں سے اُن کو "ہیجا" کی طرح ڈرایا جاتا۔ جہاں اُن کو ذمہ داریوں کا احساس تھا وہاں استثنار کا بھی علم تھا۔ اور وہ اب ایسے شخص کی تلاش میں تھے جسکا "پیمانۂ حیات" قانون نے لبریز کر دیا ہو۔ پھر قدرت کا ایک کرشمہ یہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ ڈھونڈنے والا اکثر نہیں بسا اوقات پانے والا بن جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ پاتا وہی ہے جو ڈھونڈھتا ہے۔ پھر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کو ڈھونڈنے کے لئے لمبی لمبی خوفناک اور دشوار سڑکیں سمٹ کر ایک بالشت ہو جاتی ہیں۔ ع

"ڈھونڈتی ہیں جسکو آنکھیں وہ حریم دل میں ہے"

لیجئے قصہ ختم ہوا "ایک تارک" جس چیز کو دنیا و ما فیہا سے الگ ہوکر جنگلوں اور پہاڑوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے نفس شعور صاحب علیہ الرحمۃ اس نادر و نایاب چیز کو آنکھوں سے ایک بالشت دور بتا دیتے ہیں۔

فلاسفہ نے بھی اپنی "مطمح نظر" چیز کو ڈھونڈنے کے لئے لمبی لمبی چھلانگیں بھریں۔ خالی ہاتھ نہیں دنرنی اور "کھری کھری" جیبوں کے ساتھ، مگر ان کو بعد از خرابی بسیار یہ معلوم ہوا کہ "ڈھنڈورا شہر میں بچہ بغل میں" یعنی اُن کی وہی کہاوت ہوئی کہ جیسے ایک مامتا کی ماری غریب دکھیاری ماں نے کہیں سن پایا کہ آج شہر میں بہت سے بچے پکڑنے والے بچوں کو لے گئے ہیں گھبرا کر مامتا کی اندھی نے بچے کو بغل میں مارا اور بر قعہ اوڑھ گلی گلی ماری ماری پھر رہی ہے ایک ایک سے پوچھ رہی ہے۔ ابھی میرے بچہ کو تو کسی نے نہیں پکڑا۔ ابھی میرا بچہ کسی نے دیکھا ہے کسی بھلے آدمی نے بھی دیکھ لیا کہ بچہ تو بغل میں ہے غریب مامتا کی دُکھیا حیران ہوتی پھر رہی ہے "ماں کی مامتا میں "قنوطیت" بہت ہوتی ہے اس نے جو سُنا کہ بچے کھوئے جا رہے ہیں معاً اپنے بچے پر خیال گیا کہ ہائے کسی نے پکڑ نہ لیا ہو۔ اس دکھیاری کا شانہ پکڑ کر ہلایا کہ نیک بخت تیرا بچہ تو تیری بغل میں ہے۔ وہی حال فلاسفہ کا ہوا اُن کی بھی آنکھیں "انسانی غدود" کی تلاش میں ایسے انسانوں کو ڈھونڈتی رہیں جو تندرست، قوی اور صحیح الجسم ہو مگر ضرورت مند ہو۔ چند پیسے لیکر غدود دیج دے۔ اور اس چیز کی تلاش میں فلاسفہ کو یہ کیا معلوم کہ اُن سے چند گز کے فاصلہ پر یہ صفات سمیٹ کر "میاں فاجو" کی ذات میں بھر دی گئی تھیں۔ اور مصوّر کے "تختۂ مشق" کی طرح تمام دُنیا کے رنگ اُن کی ذات میں موجود تھے۔ یہ بزرگ ہستی ریاست کے جیل خانہ میں "قانون" اور "انصاف" کی مہمان تھی۔

بر سبیل تذکرہ "فاجو" کی عادات خصائل صورت شکل پر معمولی سا تبصرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس مسئلے کو یوں سمجھئے کہ ازل میں جب میاں فاجو کا پتلا بن کر تیار ہوا وہ ایسا وقت تھا جب دو ہیبت ناک اور خونخوار ستارے ایک برج میں آپس میں ایک دوسرے سے گاؤ زوری کر رہے تھے۔ جب کردار کی وہ تمام خوبیاں جو انسانی پیکر کے لئے فطرت کے خزانہ میں تھیں مقفل ہو چکی تھیں اور وہ تمام خوبیاں جو بہائم کے لئے تھیں کُھلی ہوئی بٹ رہی تھیں۔ کچھ فرشتوں کی گھبراہٹ کچھ میاں فاجو کی عجلت بہائم اور درندوں کے غول میں گھس پڑے اور انسانیت کے بجائے بہیمیت لے آئے۔ ڈیل ڈول میں جتنے لمبے اتنے ہی چوڑے۔ اور بہ اعتبار اپنی لمبان چوڑان کے اتنے ہی خوفناک قوت کے حامل۔ صورت شکل "آدمی" سے دُور اور "بن مانس" کے قریب یعنی ڈارون صاحب کی "گم شدہ کڑی"۔ باوجود اتنی قوت کے دُنیا میں بطریق ثواب اس کا استعمال اُن کے نزدیک ایک ایسا گناہ تھا جو اُنھوں نے کبھی نہیں کیا۔ چوری ڈاکہ، قتل و غارت ایسے افعال تھے جو اُنھوں نے ہمیشہ ثواب جان کر کئے۔ واللہ اعلم ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے یا آسمان سے ٹپک پڑے تھے، دُنیا نے اُن کو لاوارث ہی دیکھا۔ باوجود "مجسّم کُولاڈ" ہونے کے (یعنی وہ ڈلاڈ جسے آج کل ریڈیو کے ارباب بصیرت ہارمونیم پھینکتے ہیں) اپنے اس آخور کے ڈھیر میں ایک جواہر ریزہ ایسا بھی رکھتے جس کو شاعر نفسیات "محبت کی چنگاری" کہتے ہیں اور بقول شخصیکہ ایک اللہ کی بندی کو پیار بھی کرتے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُسکو شریک زندگی بنا کر اپنی دُنیا درست کر لیں مگر آہ یہ دُنیا اس ظالم نے اُن کی اس آرزو کی یہ قدر کی کہ جب کبھی اُنھوں نے مُنہ پھوڑ کر پیغام دیا تو جواب میں یہ ہی آواز آئی "اوئی نوج اس چور ڈاکو اور خونی کو کون اپنی لڑکی دے"۔ کبھی چاہتے تھے کہ اپنی مایۂ حیات کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ کر ایک نئی دُنیا آباد کروں اور اس دُنیا میں اس محبّت کی چنگاری کو کنگ کونگ کی طرح دبوچ کر لے جاؤں، اسکو وہاں لے جا کر بٹھا دوں اور آپ اُس کے قدموں میں لیٹ جاؤں اور انہی جذبات کے زیر اثر وہ یہ سب کچھ کرتے تھے جسکو قانون اپنی زبان میں ہولناک جرائم کہتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی اس کریہہ المنظر صورت۔ اور دبدبے کی بدولت خوفناک قوت اور طاقت کے اثر سے کسی ملک کے ڈکٹیٹر ہو جاتے۔ اپنی قوم کے لیڈر بن جاتے، مگر یہ ہوتا کس طرح ازل سے تو اپنے ساتھ بہیمیت کا کردار اور رفضائل لے کر آئے تھے، اگرچہ حیوان ناطق تھے مگر اس درجہ لُکنت زدہ اور ہکلے کہ بات کرنی دشوار۔ جب بولتے تھے اور تمام چہرے کے رگ پٹھے آپ ہی اکڑتے تھے کھنچتے تھے تمام اعصاب میں وہ اضطراری تشنج اور ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ صورتیں بنتی تھیں جو ہولی وڈ کے بڑے

سے بڑے آرٹسٹ کو نصیب نہیں۔ پھر جناب لیڈر یا ڈکٹیٹر خواہ کتنے ہی قوی الجثہ ہوں اگر تقریر نہیں کر سکتے تو بے کار۔ خواہ کتنے ہی بلند پایہ ادیب ہوں اگر خطیب نہیں تو کچھ نہیں ایسا لیڈر جو "چرخہ" پر تقریر کرے اور اس کی تقریر جھٹکے کھا کھا کر چرخہ کی "مال" کی طرح دم بدم ٹوٹتی رہے "کھادی" کا حال سنائے اور اُس کا تاگا اُلجھتا رہے تو کیا خاک اثر ڈال سکتا ہے۔ ایسا ڈکٹیٹر جو تقریر کے زور سے آپکو اوج پر لے جانا چاہتا ہو لکنت کی دلدل میں پھنسا رہے کیا آپکو ہدایت کر سکتا ہے۔ غریب ان داموں بھی سستے رہے اس لئے اُن کی بن مانسی عقل نے وہ کچھ بنا دیا جو اسوقت تھے۔ جیل خانہ میں بھی جہاں کا ماحول معمولی وارڈر کو قیدیوں پر مار دھاڑ۔ زجر توبیخ کے وہ اختیار دیتا ہے جن کی وسعت والدین کے اختیارات بھی بقدر چند بالشت زیادہ ہے فاجو پر اس کا کیا اثر ہوتا۔ البتہ وہی محبت کی جاں سوز و جاں گسل چنگاری ان کے پہلو میں روشن تھی۔ حکیم فلاسفہ کو جب سے فاجو کی شخصیت کا علم ہوا اسی فکر میں تھے کہ یہ چیز مطلب ہے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اُدھر فاجو کو یہ خیال گھن کی طرح کھا رہا تھا کہ ابکی دفعہ تین تین خون میں پکڑے گئے ہیں رہائی مشکل ہے۔ چلتے چلاتے کوئی سبیل ایسی ہو کہ اپنی مایہ زندگی کو ایک دفعہ جی بھر کر دیکھ ہی لوں۔ "غ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی" حکیم فلاسفہ نے جب فاجو کے لئے زیادہ چھان بین کی تو اس محبت کا حال بھی اُڑتے اُڑتے اُن کے کان میں پہنچ چکا تھا۔ دیوان کو ساتھ لے گورنر جیل پر سوار ہوگئے اور تمام تر حکمت اُنکو صرف اس بات کی راہِ راست پر لانے کیلئے صرف کر دی کہ فاجو کو پھانسی سے قبل میرے سپرد کر دیا جائے کہ میں اُسکی موت سے پہلے زندہ غدود نکال لوں۔ جیل میں جانے کے لئے دیوان صاحب کی ہمراہی کافی پاس پورٹ تھی۔ گورنر غریب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ غدود کیا بلا ہیں فلاسفہ کی حکیمانہ تقریر کی اُلجھن سے گھبرا کر بولا۔ مگر حکیم صاحب میں اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہوں دیوان صاحب مختار ہیں جو حکم دیں۔ بار بار رت سے دلائیں۔

میں ..... میں حکم دوں۔ کیا حکم دوں۔ دیوان صاحب نے ذمہ داری کے بوجھ سے ہانپ کر کہا۔

آپ ...... آپ ریاست کے دیوان ہیں جس کے حکم سے بہتا پانی رک سکتا ہے۔ آپکے حکم سے فاجو کو پھانسی ملے گی اور آپکے حکم سے نجات بھی مل سکتی ہے۔ گورنر نے کہا۔ دوسرے ایک اخلاقی فرض یہ بھی ہے کہ جس شخص کے غدود نکالے جائیں کچھ اُس سے بھی پوچھ لینا ہوگا۔

ضرور ضرور۔ حکیم جی نے کہا۔

ہاں۔ ہاں بے شک۔ دیوان صاحب نے کہا۔

تو پھر چلئے گورنر نے کہا۔ مگر ہاں یہ آپکو معلوم ہونا چاہیئے کہ "فاجو" انسان کی صورت میں "درندہ" ہے ذرا سنبھلکر بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایسی حالت میں حکیم جی صاحب .... دیوان صاحب نے کہا۔

اُونہہ دیکھا جائیگا حکیم صاحب نے کہا۔

نہیں میں تو ...... دیوان صاحب نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ میں ...... اگر غیر مناسب نہ ہو تو ..... گویا یہیں ٹھیروں۔

آخر کیوں؟ ..... حکیم صاحب نے کہا۔

مناسب ہے کیونکہ دیوان صاحب کے حکم سے ملزم کو سزا ہوئی گورنر نے کہا۔ اس لئے ممکن ہے کہ دیوان صاحب کو دیکھکر .....

ہاں بات ٹھیک ہے فلاسفہ نے کہا۔ ایسے موقعوں پر نفرت اور حقارت یا بدلہ کا جوش اور وارفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

سرکسوں میں شیر اور ریچھ سے کشتیاں لڑنے والے جن "واردات قلب" اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ پنجروں میں گھستے ہیں۔ وہ پھر بھی اتنی تیز اور بے قابو نہیں ہوتیں جتنی اس وقت کی دھڑکن اور حضرتِ دل کی اُدچھل کود حکیم صاحب کے سینے میں موجود تھی۔ خدا کی قدرت شیر جیسے خونخوار اور درندہ جانور سے کشتی لڑنے جائے اور پھر بھی دھڑکن کے ساتھ ساتھ کچھ سکون بھی رکھتا ہو اور انسان دوسرے انسان سے بات کرنے جاتے تو فلاسفہ کی طرح لمبے لمبے سانس۔ اُچھلتا ہوا دل کپکپاتے ہوئے اعضا کی ایک فوج بنکر جائے۔

ملزم کی کوٹھری میں داخل ہونے کے بعد اس "ہولناک" باب کا یوں خاتمہ سمجھئے کہ حکیم صاحب کی حکیمانہ تقریریں فاجو کی گھون گھون۔ چھ چھ۔ تھو تھو کی لکنت زدہ غیر مفہوم آوازیں۔ گورنر کا بار بار فاجو کی کمر تھپکنا اور سہلانا اگر ان سب کو تحریر کا جامہ پہنایا جائے تو یہ ہوگا کہ فاجو اپنی زندگی میں اپنے دو عدد غدود بعوض مبلغ پانچ ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت کہ نصف جس کا مبلغ ڈھائی ہزار ہوتے ہیں بہ درستی ہوش و حواس بلا جبر و اکراہ دینے پر

تیار رہیں بشرطیکہ یہ روپیہ سب کا سب اُن کی طرف سے "اُن کی مایہ زندگی" محبوبہ کے پلّے میں باندھ دیا جائے اور یہ بھی کہدیا جائے کہ یہ چور، ڈاکو خونی عاشق چلتے چلاتے اپنا حق ادا کئے جاتا ہے اور یہ بھی کہدیا جائے کہ یہ روپیہ اس بدنصیب عاشق نے اپنا گوشت بیچ کر حاصل کیا ہے۔

چابکدستی۔ اعجاز جو کچھ کہئے، بیچتے فلاسفر نے نواب صاحب پر فاجو کے غدود کا پیوند چڑھا ہی دیا۔ عمل جراحی حد درجہ کامیاب ہوا۔ نواب صاحب یقیناً "اعادۂ شباب" کی لذتوں اور نعمتوں سے اور فلاسفر انعام واکرام سے مالامال ہو گئے۔ نواب صاحب "از کار رفتہ" سے "کار آمد" ہو گئے۔ آہ!! اے ستم ظریف سائنس داں تو نے یہ نہ دیکھا کہ تو نے ایک کریم النفس نیک دل، صحیح الکلام اچھے خاصے گویا انسان پر ایک سارق خونخوار اور بہکلے انسان کا پیوند چڑھا دیا۔ اس کا نتیجہ بھی دیکھ........

نواب صاحب کے غسلِ صحت کے بعد آج پہلا موقعہ ہے کہ ریاست میں دربار عام ہے۔ ہر شخص نواب صاحب جیسے رعایا پرور حکمران کی خدمت میں باریاب ہونے کے لئے حاضر ہے۔

رعایا کی طرف سے ایک منتخب اور معتبر نمایندہ صاحب نے ابھی ابھی ایڈریس کی صورت میں سپاس نامہ پیش کیا ہے حسب دستور نواب صاحب اس کا جواب دینے کی غرض سے کھڑے ہوتے ہیں۔ چند الفاظ ادا ہوتے ہیں کہ شدید لکنت اور ہکلاہٹ کا دورہ ہوا۔ اس فوق العادت انقباض اور گھبراہٹ سے جو نواب صاحب کی کیفیت ہوئی اُسکو قلم بے زبان "زبانِ قلم" ادا کر سکتا ہے۔ البتہ اتنا ہم سے سُن لیجئے کہ نواب صاحب نے ایک چیخ ماری اور اس عصائے الوہیت کو جسے سہارا دیکر "خطبہ" فرمایا کرتے تھے ہاتھ میں لے کر درباریوں کے مجمع میں کود پڑے اور "بنوٹ" کی طرح اس حکومت کے لٹھ کو بجلی کی سرعت کی طرح پھراتے اور بھنبھناتے سینکڑوں کو مجروح اور سینکڑوں کو ہلاک کرتے جنگل کی طرف بھاگے.......

اس کے بعد کیا ہوا۔ لمبی چوڑی داستان سے قطع نظر یہ ہوا کہ نواب صاحب پابجولاں اس طرح لائے گئے کہ یا بدستے دگرے دست بدستے دگرے۔ اور اب بھی "تا درستی حواس" نظر بند ہیں۔

دیوان صاحب بشرح صدر ریاست کا کام نہایت نمک حلالی سے کر رہے ہیں اور دن میں تین چار بار غسل کرتے ہیں۔ کہ نواب صاحب کے لئے کیا تھا کیا اور ہو گیا کیا لہٰذا جو کچھ الزام اُن کے ذمہ ہو وہ "دُھل" جائے۔

فاجو صاحب چونکہ کچھ گندے اور رماؤف قسم کے غدود اپنی "زندگی" چلانے کے لئے ازل سے لائے تھے اُن سے سبکدوش ہو گئے۔ اس لئے اب "انسان" ہیں انسان ہیں۔

حکیم فلاسفر صاحب نے اب ایک بے پناہ نظریہ قائم کر لیا کہ تقلیم کا جراح صرف علم الابدان ہی نہیں بلکہ یہ بھی جانتا ہو کہ جو غدود پیوند کئے جائیں وہ ہر اعتبار سے "صحیح" ہوں صرف تندرست ہی تندرست اور قوی ہی قوی نہ ہوں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اب ایسی "ٹوپی" کی ایجاد میں مصروف ہیں جس کے اُڑھا دینے سے تقلیم کی اِس قسم کی ستم ظریفیاں رفع ہو جائیں اور یہ مایۂ ناز ایجاد "حُبِّ شفا" کے ٹکر کی ہوگی۔

علامہ مضحک دہلوی!

نذرِ انجم

فضا میں مئے رنگ و بو ڈھل رہی ہے — زمیں رقص کرتی ہوئی چل رہی ہے
ہواؤں سے آنچل سنبھلتا نہیں ہے — کوئی جیسے مئے پی کے چلتا نہیں ہے
دماغِ چمن میں ہے رنگیں فسانہ — ہے کلیوں کے کھلنے کا نازک زمانہ
چھڑی اور بھی رنگ و بو کی کہانی — یہ کس کی دبے پاؤں آئی جوانی

اُٹھی موج سینہ سے بالیدگی کی — جوانی کو کشتی چلی کمسنی کی
نیا رنگ طفلی میں گھلنے لگا ہے — کوئی سُرخ سونے میں تُلنے لگا ہے
چمکنے لگے مست آنکھوں میں تارے — بہت جام فطرت نے صدقے اُتارے
جھپکنے میں پلکوں کے رنگینیاں سی — تھرکتی ہوئی جام پر تتلیاں سی
ہوئی اور ہونٹوں کی سُرخی زیادہ — حسیں ہونٹ کھلنے لگے بے ارادہ
وہ سینہ سے اُٹھتی جوانی کی تانیں — وہ کیوپڈ کی چڑھتی ہوئی سی کمانیں
کھنک سی وہ پیدا ہوئی قہقہے میں — کہ چاندی کی گھنٹی کسی تبکدے میں
گُزرتے لڑکپن کی بے باک شوخی — بنی دل میں خاموش اک گُدگُدی سی
نگاہوں میں ہر شے چھلکنے لگی ہے — چھلکنے لگی ہے، جھلکنے لگی ہے
ہر اک بات جادو ہوئی جا رہی ہے — ہر اک سانس خوشبو ہوئی جا رہی ہے
نئے راز فطرت بتانے لگی ہے — کوئی چاندنی دل پہ چھانے لگی ہے
جوانی کو اپنی خبر ہو چلی ہے — ہر اک چیز نزدیک تر ہو چلی ہے
گلے مل رہی ہے مسرت سے حیرت — کہ تعمیر پاتی ہے شاعر کی جنت

ہوا رقص میں ہے فضا جھومتی ہے — کہ شاعر کے لب پر دُعا جھومتی ہے
دیئے تجھکو فطرت نے لاکھوں خزانے — ادا، تازگی، رقص، خوشبو، ترانے
چڑھے اور پروان تیری جوانی — محبّت کہے تجھ سے اپنی کہانی

جوانی محبّت کی منزل ہے انجم
محبت، محبّت کے قابل ہے انجم

جاں نثار اختر

بھوک

اروند بابو کی بود و باش امیرانہ ٹھاٹ کی تھی۔ ایک خوبصورت تعلیم یافتہ بیوی شیلا، دو شوخ و چنچل بچے۔ کمار اور موہن۔ شاندار کوٹھی، سرکاری عہدہ، ریڈیو، کلب، موٹر۔ یہ تھی ان کے کاروبار حیات کی کائنات۔ یا محسوسات کی دنیا۔

میری پرانی بیماری سے صحت یاب ہونیکے بعد اروند بابو کے سالہا سال کے مخلصانہ اصرار کی تعمیل اور زیادہ تر تبدیل آب ہوا کے خیال سے میں اروند کی اس جنت میں مہمان کی حیثیت سے پرسوں داخل ہوا ہوں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تین چار دن میں میری صحت و توانائی میں بہت کچھ ترقی ہوئی مگر سکون خاطر نصیب نہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اروند بابو کا عہدہ اور تنخواہ روز افزوں ہے۔ مگر میرے کالج کے قدیم دوست اروند کی غور و فکر کی قوت خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اروند کو اس خطرہ سے موثر طور پر آگاہ کرنے کا ارادہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ کھیل اور جنگ کے میدان کی دوستی لازوال ہوتی ہے۔ ان دونوں میدانوں میں میرا اور اروند کا ساتھ رہا ہے۔ اس سے آپ کو ہم دونوں کی دوستی کی گہرائیوں کا اندازہ بخوبی ہو جائیگا۔

ہم دونوں ناگپور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے اور کالج میں بھی ایک ساتھ ہی شریک ہوئے۔ کالج کے ہر قسم کے اسپورٹس اور گیمس میں ہم دونوں ہمیشہ امتیازی طور پر کامیاب ہوتے تھے۔ اس لئے لوگ ہم کو "رستم برادرز" کے نام سے پکارتے تھے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد میں میڈیکل کالج بمبئی میں داخل ہوا۔ اس طرح اروند کا کھیل کے میدان کا ساتھ چھوٹا۔

۱۹۱۷ء عیسوی میں محاذِ جنگ پر ڈاکٹروں کی ضرورت تھی۔ امتحان ختم ہوتے ہی مجھے انڈین ملٹری سروس کیلئے منتخب کر لیا گیا۔ کچھ مدت سکندر آباد اور راولپنڈی میں رکھنے کے بعد مجھے عراق کے محاذِ جنگ پر بھیجدیا گیا۔ اس محاذ پر اتحادیوں کا مقابلہ بے جگر ترکوں سے تھا۔ فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھرے پڑے تھے میدانِ کارزار سے ایک میل پیچھے ہمارا دواخانہ تھا۔ اس ہسپتال میں مجھے کیپٹن کی اہم خدمت دی گئی تھی۔ ہم جرمن میڈ لیبان تھے کسی خاص کارگذاری کے بغیر بھی ہمارے عہدے اور تنخواہ میں برابر ترقی ہوتی تھی۔

انٹرمیڈیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد اروند کو بھی انڈین پولیس سروس میں انسپکٹر کا عہدہ ملا۔ وہ اپنی طاقت، تنومندی اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ بہت جلد جلد اس سررشتہ میں ترقی پاتا رہا اور دورانِ جنگ میں اسے فوج میں صوبہ دار میجر کے عہدے پر منتقل کر لیا گیا۔

ایک روز جب کہ بڑے گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی اور ہسپتال میں زخمیوں کے اسٹریچروں کا تار بندھ گیا تھا۔ آفیسروں کے پلنگوں کی طرف ایک اسٹریچر بھیجا گیا اور معاً وہاں میری طلبی ہوئی مریض کو دیکھتے ہی میری زبان سے نکلا "کون؟ اروند!" اس نے میری طرف ذری دیر غور سے دیکھ کر کہا "چندر کانت! تم کہاں؟"

اس کے بعد میں نے اس کے سیدھے بازو سے ایک گولی نکالی۔ خیر گزری کہ دوسری گولی بائیں شانے کو چاٹتی ہوئی چلی گئی ورنہ بایاں بازو بیکار ہو گیا ہوتا۔ زخم مندمل ہونے پر اروند کو بصرہ پر متعین کیا گیا اور میرا تبادلہ بھی بصرہ کے عقبی ہسپتال پر ہوا۔

صلح کے بعد میری عارضی ملٹری سروس ختم ہوئی اور میں نے بمبئی میں "کیپٹن چندر کانت ریٹائرڈ۔ آئی۔ ایم۔ ایس" کا سائن بورڈ لگا دواخانہ کھول لیا۔

اروند کے سینہ پر دو تین فیتے اور تمغے آویزاں تھے اسلیئے اس کو محکمہ پولیس میں اعلیٰ عہدہ پر مامور کر لیا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد اس کو شیلا جیسی تعلیم یافتہ بیوی بھی ملی۔ میں نے سرکاری ملازمت کے زمانے میں دولت و حکومت کے خوب مزے چکھے تھے مگر اب خانگی پراکٹس کے زمانہ میں مفلسی کے چرکے کئی مرتبہ کھا چکا ہوں۔

ایک دن سہ پہر میں اروند اور میں دیوان خانے میں گپ شپ میں مصروف تھے کہ نوکر چائے لے کر داخل ہوا۔ اروند نے ایک ہاتھ سے چائے دانی اٹھائی اور دوسرے سے اس کا سرپوش نکالا ہی تھا کہ شیلا ہاتھ میں پتلی سی چھڑی لئے وہاں آئی اور کمار اور موہن کو پکارنے لگی۔ دونوں بچے دل کی آواز سنکر اپنا کھیل ادھورا چھوڑ کر دوڑے آئے۔

"بتاؤ کس نے الماری میں سے لڈو چرائے ہیں جلدی بتاؤ! ورنہ اس چھڑی سے چمڑی ادھیڑ دونگی!" ہوا میں چھڑی بلند ہوئی

کمار گھبرا گیا۔

"واقعی! اروند جیسے بولین فیصلہ لیتے ہیں بڑا عرس ہو تو کی ضرورت ہی ہے" شیلا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

شیلا غصہ میں بھری ہوئی تھی اس لئے اس نے کچھ نہ سنا۔ جھوٹی بلی کی طرح موہن کی بیت کے قریب آئی تو موہن نے کہا "لڈو کمار نے چرائے۔" چشم زدن میں شیلا کی چھڑی کمار کے سر پر لہرانے لگی۔ کمار نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اماں بھوک جو لگی......" کمار ابھی جملہ ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی پنڈلیوں پر ایک چھڑی پڑی۔ بیچارہ بچہ تلملا اٹھا۔ پھر چھڑی ہوا میں بلند ہوئی۔ معاً میں شیلا اور کمار کے درمیان کود پڑا۔ "دیکھو! اکثر ایسی بیجا رعایتوں ہی سے بچے بگڑ جاتے ہیں اور الزام بچوں کی ماں کو دیا جاتا ہے۔" شیلا نے کہا۔

"گھر کا ڈسپلن سخت ہونا چاہیئے!" میں چونکہ ان کے ڈسپلن کے آڑے آیا تھا اس لئے ذرا تیز آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آؤ چندر کانت! چائے ٹھنڈی ہو چلی ہے۔" اروند نے کہا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے کمار کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر سمجھایا۔ منایا اور ایک بسکٹ اس کے ہاتھ میں رکھ کر کہا "چوری کچھ اچھا کام نہیں۔ تمہیں معلوم ہے نا کمار؟"

"جی ہاں"

"پھر بتاؤ بیٹا تم نے لڈو کیوں چرائے ہیں؟"

"میں نے لڈو نہیں چرائے۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ اماں کلب چلی گئی تھیں۔ رامو بھی گھر میں نہ تھا۔ مجھے الماری میں لڈو نظر آئے۔ میں نے ایک لیا اور موہن کو ایک دیا۔ میں نے لڈو نہیں چرائے۔ کاکا!"

اس نے روتے روتے کچھ ایسے بھولے پن سے کہا کہ مجھے تو خیر اس کے ماں باپ کے دل پر بھی بہت اثر ہوا —— اسی وقت کمار نے اپنی پنڈلی کھجانے کیلئے پاؤں کرسی پر رکھا اس کی گوری پنڈلی پر مار کا سرخ نشان دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"ذرا دیکھو بھابی! تم نے ایک معصوم بچے پر ڈسپلن کے نام سے کتنا ظلم کیا ہے" شیلا کا چہرہ ایک دم اتر گیا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہو رہی ہے۔ اس نے ایک بسکٹ کمار کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹا! باہر کھیلو۔"

اس نے سمجھا کہ کمار کی موجودگی میں میری تنبیہہ سے اس کے رتبہ اور وقار پر برا اثر پڑے گا۔

"افسوس! شیلا تم نے کمار کو بے وجہ سزا دی۔ پہلے تو بچوں کے ناشتہ کا انتظام کئے بغیر تم کلب چلی گئیں دوسرے جب بچوں کو بھوک لگی اور انھوں نے لڈو کھائے تو یہ چوری کیونکر ہوئی —— طرہ یہ کہ انہیں پیٹا بھی گیا۔ یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے شیلا!" اروند نے دبی آواز میں کہا —— شیلا پہلے ہی سے بھری بیٹھی تھی اروند نے ایک اور چرکا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی دم میں ساون بھادوں کا تار بندھنے کو ہے۔ باتوں کا رخ بدلنے کیلئے میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "چلو اروند! ذرا گھوم آئیں۔ باتوں باتوں میں ساڑھے پانچ ہو گئے۔"

"ذرا کپڑے بدل لیں" اروند نے کہا —— ہم دونوں کپڑے بدل کر تیار ہو گئے۔ موٹر گیرج میں کھڑی تھی "مجھے معاف کیجئے" شیلا نے کہا "آج کے جلسہ کی ضروری یادداشتیں نوٹ کرنی ہیں"۔ ہم دونوں ہنستے ہوئے نکل گئے۔

اروند نہایت ہوشیاری سے موٹر چلا رہا تھا۔

میری پریکٹس بیٹھ جانے پر میں نے اپنی موٹر فروخت کر دی تھی —— ریلوے کراسنگ ہم نے پار کیا۔ ہماری موٹر فراٹے بھرتی ہوئی شہر کے باہر کھلی ہوا میں جا رہی تھی۔ نیم برہنہ عورت مرد راستہ کے کنارے چل رہے تھے۔ ہماری موٹر ان پر دھول اڑاتی جا رہی تھی اس کے باوجود وہ جھک جھک کر سلام کر رہے تھے —— ان کا وہ پھٹا ہوا لباس مرجھائے ہوئے چہرے اور دبلے پتلے جسم گویا مفلسی مجسم ہو کر انسانی بھیس میں نمایاں ہو گئی تھی۔

"ایک زمانے میں یہی لوگ اس ملک کے مالک تھے" میں نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آج ان کو تن ڈھانکنے کیلئے کپڑے بھی میسر نہیں۔ اور ہم ہیں کہ محض تفریح کیلئے پانچ چھ روپیہ پٹرول پر صرف کرتے ہیں" متاسفانہ لہجہ میں کہا۔

"ان کو لباس وغیرہ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ان کیلئے مٹھی بھر چاول اور چٹکی بھر نمک کافی ہے۔ ان کی ضرورتیں بہت مختصر ہوتی ہیں" اروند نے بے پروائی سے کہا۔

"شاید پیٹ بھر کر اچھی غذا کھانے سے یہ اکتائے ہوئے ہیں اسی لئے مٹھی بھر چاول پر گزارا کرتے ہیں! زریں اور ریشمی کپڑوں سے بیزار ہو کر چیتھڑے لگائے ہوئے ہیں! کل جب مٹھی بھر چاول بھی بند کر دیجئے تو بیچارے گھاس اور پتھر سے اپنا پیٹ پال لیں گے۔ تو تم جیسے عقلمند کہیں گے ان کی ضرورتیں مختصر ہیں۔ گھاس اور کڑبی ان کیلئے

کافی ہے۔ واہ! کیا اچھی تحقیق ہے!" ـــــ اب ہم ایک قدیم تالاب کے بند پر سے گزر رہے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں اور ہوا کے جھونکوں میں کشتی سطح آب پر بہت دلچسپ نظر آ رہی تھی ـــــ بند کے ایک برج پر ہم اپنی دستیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع آج سے پچیس سال پہلے کی ہماری عراق کی پُرلطف زندگی سے متعلق تھا۔ عراق۔ جنگ۔ ہماری پلٹن۔ دواخانہ وغیرہ کی یاد سے ہم اپنا دل بہلا رہے تھے۔

"چندر کانت! تجھے کبھی اپنی میس کا باورچی رام دلاسے یاد آتا ہے؟ کمبخت بڑا خوش مزاج تھا! ہمارا ملازم رام داس اُسی کا بیٹا ہے۔ یہ بھی بہت اچھا پکاتا ہے۔"

"کیا تنخواہ ہے اس کی؟" میں نے پوچھا۔

"تنخواہ" اروند ہنسا۔ "اس طرف آدمی بہت سستے ہیں۔ دن بھر کی ملازمہ صرف تین روپے ماہوار۔ ملازم چار روپے باورچی دو روپے ماہوار مع خوراک۔ اسی رام داس کو دیکھو گذشتہ پانچ سال سے میرے ہاں نوکر ہے مگر تنخواہ صرف چار روپیہ ہے۔ ہر سال وطن جانے کی رُخصت مانگتا ہے اور تنخواہ بڑھانے کو کہتا ہے۔ یہ اس کی عادت ہوگئی ہے۔ میں خاموش ہوجاتا ہوں وہ بھی بھول جاتا ہے۔ البتہ گذشتہ سال اس کی تنخواہ تین سے چار کردی گئی ہے۔" اروند کی آواز کرخت تھی۔ البتہ مجھے رام داس کی مجبوری پر رحم آ رہا تھا۔

"لطف تو یہ ہے کہ اس نے ہمارے ہندوستانی پکوان تو سب سیکھ ہی لئے مگر بہت سے انگریزی پکوان بھی پکا لیتا ہے انگریزی میں معمولی گفتگو بھی کرسکتا ہے۔ یہ کشمیری برہمن ہے جو کسی دوسرے کی آگ بھی نہیں لیتے مگر میرے ہاں اس نے اپنا مذہب بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ان چار روپیوں میں سے ہر ماہ دو روپیہ برابر اپنے گھر بھیجتا ہے۔"

"اس کے گھر میں کون کون ہیں؟"

"ایک بیوی اور ۲ بچے ہیں۔"

"جبھی تو ہر سال وطن جانے کیلئے رخصت مانگتا ہے۔"

"لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ یہ جاکر واپس کیا آئیگا۔ اور ہمارے گھر کے کاروبار کا دارومدار تو سب اسی پر ہے۔ ہماری بیگم کسی طرح دال بھات تو پکا لیتی ہیں مگر کوئی مہمان آجائے تو ـــــ ہماری مجبوری کا اندازہ اس پر سے لگالو کہ ہر سال لیموں کا اچار ہم بمبئی سے منگواتے ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "شیلا کر انجویٹ جو ٹھیری۔"

"جبھی تو چار سال سے جب کبھی رام وطن جانے کیلئے اجازت مانگتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے سے اُسے روک لیتا ہوں۔ گذشتہ سال جب اُس کا اصرار بڑھ گیا تو ایک روپیہ تنخواہ میں اضافہ کرنا پڑا۔"

"شاباش! زندہ باش!!" میں نے چبھتے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔ مگر اروند بیچ مچ کی آفرین سمجھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ میرے لہجے کا خیال کیوں کرنے چلا؟

"اسی طرح آیا چھمی بھی ہے۔ اس غریب کو دو سال پہلے اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا۔ صاف رہتی ہے محنت منی ہے اور ہمدرد بھی ہے۔ جب موہن چھوٹا تھا تو ہم نے اسے تین روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا تھا۔" اروند برابر بولتا جا رہا تھا۔

میں نے کہا "بھئی پولیس والے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔ اچھا اب گھر چلو۔ دیر ہوگئی۔"

راستے میں اروند کی گفتگو میں بے دلی سے سُن رہا تھا۔ گو میں موٹر میں تھا مگر میرا دل کہیں دوسری جگہ تھا ـــــ دو روپے تین روپے ماہوار آدمی کیلئے! ـــــ میں اپنے ٹامی کیلئے ماہانہ سات آٹھ روپے باوجود اس عسرت کے خرچ کرتا ہوں۔ آدمیوں کی قیمت کتے سے بھی کم ہوگئی ہے؟ ـــــ

گاڑی گیرج میں کب آئی مجھے اس کا بھی خیال نہیں رہا ـــــ

"کس سوچ میں ہو بھیا؟" اروند نے کہا۔

میں چونک کر موٹر سے اتر پڑا۔ ورانڈے میں میز پر اخبار پڑا ہوا تھا۔ اٹھا لیا ـــــ وہاں کچھ اور ہی سماں دیکھا۔ شیلا بلند آواز میں کسی پر برس رہی تھیں "بے شرم۔ کمینے۔ نکل جاؤ ہمارے گھر سے!" ہم اندر گئے دیکھا تو شیلا غصہ میں سُرخ ہوگئی تھیں۔ رام داس دور صحن میں کھڑا تھا اور شیلا برابر گالیاں دے رہی تھیں۔ کمار کودتے پھاندتے میرے قریب آیا اور کہنے لگا "کاکا! میں نے ایک تماشہ دیکھا۔ اپنا رام داس مودی خانہ کی کوٹھری میں......"

"چپ!" شیلا نے کمار کو دھمکاتے ہوئے اروند کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس رام داس اور چھمی (آیا) کو آج اسی وقت گھر سے نکال دیجیئے۔ میں ان کو ایک منٹ بھی نہیں رکھنا چاہتی۔"

"لیکن یہ بھی بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

کمار اور رام داس کی موجودگی میں وہ اردو میں کیسے کہہ سکتی۔ انگریزی میں سارا واقعہ بتادیا ـــــ ہوا یہ تھا کہ پراغ بتی کا وقت

تھا۔ رامو دی جانے میں ایک وہاں چھمی کچھ کام کر رہی تھی۔ چھوٹا کمار وہاں پہنچا۔ وہاں اس نے جو کچھ دیکھا اس کیلئے درحقیقت حیرت انگیز تھا۔ وہ وہاں سے چیختا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچا اور کہا "ماں میں نے ایک تماشہ دیکھا۔ رامو نے آیا (چھمی) کا بوسہ لے لیا!"

ذرا اندازہ کیجئے اس واقعہ سے شیلا پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، مہذب اور ضبط و ڈسپلن کی ضرورت سے زیادہ پابند خاتون تھی۔ اس نے رامو اور چھمی کو خوب لتاڑا اور ہمارے پہنچتے ہی اس کی برطرفی کا حکم اروند کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

اروند نے کہا "بدمعاش کہیں کا! گھر میں میم صاحب ہیں، بچے ہیں اور تم کو ایسی نالائقی کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ اٹھاؤ اپنی گٹھری اور نکل جاؤ یہاں سے!"

"حضور! قصور ہو گیا۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں" رامو نے کہا۔

"نہیں ہم کچھ نہیں جانتے۔ تم نے جرم کیا ہے۔ تم کو سزا بھگتنی پڑے گی!" اروند نے پولیس آفیسری کے ٹھاٹ میں کہا۔

رامو مایوس ہو کر چلا گیا ——

ہم دیوان خانے میں ریڈیو سننے بیٹھ گئے۔ ننھا موہن بھوک سے بیتاب ہو کر "بابا بھوک لگی" کہتے ہوئے ہماری طرف آیا۔ مگر آج تو خاصی دیر ہونے والی تھی۔

"جاؤ اپنی اماں سے کھانا پروسنے کیلئے کہو ہم بھی آتے ہیں" اروند نے کہا۔

"اماں نے ابھی چولھا بھی نہیں سلگایا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے بسکٹ دیدیجئے بابا!"

"جاؤ الماری میں سے لے لو" اروند نے بلا ٹالنے کو کہا۔

اروند کسی گہری سوچ میں تھا۔ مگر میرے خیالات "بھوک" پر مرتکز تھے۔ رامو اپنی گٹھری اور لوٹا لے کر وہاں آیا (پانچ سالہ ملازمت میں اتنا ہی فراہم کر سکا تھا) تھا تو بڑا ہی قوی الجثہ مگر اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"صاحب! پاؤں چھوتا ہوں۔ قصور معاف کیجئے" اس نے اروند کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"پنڈت! تم کہاں جاؤ گے" اروند نے پوچھا

"پیٹ کے پیچھے" رامو نے اوپر ہاتھ اٹھا کر کہا "جس طرف خدا لیجائے"۔ نہیں معلوم اروند کو کیا معلوم ہوا۔ اس نے کہا "جاؤ پنڈت

واپس گھر میں جاؤ! آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اس جرم کیلئے تم کو ایک روپیہ جرمانہ کیا گیا ہے۔ جاؤ گھر میں کام کاج سنبھالو۔"

میں اروند کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"شیلا کی ذات سے توقع نہیں کہ وہ گھر کا کام کاج سنبھال لے گی۔ ایک تجربہ کار ملازم کو ہاتھ سے کھونا قرینِ دانشمندی نہیں ہے۔ چھمی کو نکال دیا جائے تو دونوں کو سزا مل جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا ڈاکٹر!" اروند نے اپنی ہشیاری پر ناز کرتے ہوئے کہا۔

"گناہ۔ بدکاری۔ سزا۔ آخر کون ذمہ دار ہے اسکا" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے! وہی خود"

"ہرگز نہیں! تم ذمہ دار ہو" میں نے کہا۔

"وہ کس طرح؟"

"کمار نے لڈو چرائے تو اس کا الزام اس کی ماں کے سر عائد کیا! چونکہ بھوک کی حالت میں بچوں سے یہ گناہ سرزد ہوا تھا اسلئے تو نے معاف کر دیا۔ ہاں وہ تیرا لختِ جگر بھی تھا! مگر رامو کے گناہ کا وہ خود ذمہ دار! اچھا انصاف ہے!"

"ساری دنیا کے گناہوں کی ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔ یہی مطلب ہے نا ڈاکٹر؟" اروند نے طنز سے کہا۔

"میرا نوکر بڑا ایماندار ہے۔ سمجھدار ہے۔ بہت سستا ہے۔ گھر جانے کیلئے وہ ہر سال رخصت مانگتا ہے مگر میں ہشیاری سے ٹال دیتا ہوں۔ دو روپے میں دن بھر کام کرنے والی مل جاتی ہے! اس پر طرہ یہ کہ ان کو نوکر رکھ کر آپ ان پر احسان کرتے ہیں —— مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر تم ان کو پیل رہے ہو۔ یہ خالص سرمایہ دارانہ بے دردی ہے۔ اس میں ہمدردی یا انسانیت کا نام بھی نہیں ہے۔ قدیم زمانے کے غلاموں اور تمہارے نوکر چاکروں کی حالت میں یہی فرق ہے کہ ان کو علانیہ کوڑے مارے جاتے تھے۔ طوق پہنائے جاتے تھے۔ مگر تم احسان کے نام سے نہایت بیدردی سے ان کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیتے ہو۔ ان کے مٹھی بھر چاول اور چٹکی بھر نمک تمہارے ہاتھ میں ہے اس لئے وہ تمہارے غلامانِ بے طوق ہیں! تم جیسے بڑے لوگوں کیلئے دنیا بھر کی خواہشیں، تمنائیں اور حاجتیں ہیں! غریب لوگ جانوروں سے بدتر ہیں! جانور ان سے اچھے ہیں کیونکہ انہیں انتقام کیلئے سینگ، دانت اور ناخن ملے ہیں۔

تین چار روپے تنخواہ پانے والے نوکر سودا سلف کے پیسوں

میں سے دو چار آنے کی چوری کیوں نہ کریں! مذہب، اخلاق کہ قانون کی رو سے یقیناً یہ جرم ہے! مگر تھوڑا معاوضہ دے کر، قریب قریب بلا معاوضہ ان کی جسمانی مشقتوں پر ہاتھ مارنا۔ لوٹنا۔ کس قانون کے لحاظ سے مبنی برانصاف ہے؟ اُف! تو کتنا نادان ہے!! کمانے کی چوری قابلِ درگزر، مگر غریبوں کی چوری ناقابلِ معافی! ذرا غور کرو، گناہ کیوں سرزد ہوتے ہیں؟ غذا۔ آرام اور مسرت کا معقول نہ سہی کم از کم انسانیت کے شایانِ شان انتظام کیا جاتا تو پھر انہیں اپنے جرموں کی پاداش میں سزا کا مستحق قرار دینے میں کسے تامل ہوتا۔ ۔ ۔ ۔؟"

"ہاں! ایک لحاظ سے ٹھیک ہے تمہارا کہنا" اروند نے کہا۔ "مگر ہم انہیں نوکر نہ رکھتے تو ان کو بھیک ہی مانگنی پڑتی! کیا یہ بھیک سے بہتر نہیں؟"

"اور وہ تمہارے ہاں رہ کر صرف تمہاری خادماؤں پر ہی دست درازی کرتے ہیں، یہی کیا کم احسان ہے ان کا؟ —— یہی تمہارے رام داس کے بیوی بچے ہیں۔ اس کو اپنے بچوں سے ملنے کی خواہش ضرور رہتی ہوگی! وہ بھی تو آخر دل رکھتا ہے! رامو کو جو تم نے پانچ سال سے روک رکھا ہے آخر کیوں؟ —— آپ کی بیگم دو ماہ کیلئے میکے جاتی ہیں تو آپ چار دفعہ کسی نہ کسی بہانے سے سسرال ہو آتے ہیں بالآخر تار دے کر بلوا لیتے ہیں۔ لیکن رام داس پانچ پانچ سال تک کیوں اپنی بیوی بچوں کی صورت سے بھی محروم رہے؟

برس کے باون اتوار، دوسری چھٹیاں۔ رخصتِ اتفاقی۔ رخصتِ خاص، اور رخصتِ بیماری وغیرہ معہ تنخواہ تمہاری جماعت جس وقت چاہے استفادہ کر سکتی ہے۔ مگر غریب نوکر کی ماں بیمار ہوتی ہے مرجاتی ہے لیکن اسکو رخصت نہیں ملتی اگر ملتی بھی ہو تو بلا تنخواہ۔ یہی ہے نا انسانیت!

بھوک اور تشنگی کسی طرح دور کرنی پڑتی ہے۔ کھلے بندوں موقع نہ ملے تو چوری سے ہی سہی مگر اس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ یاد کرو آج سے پچیس سال پہلے تم نے بصرہ میں مجھ سے اس خصوص میں جو ڈاکٹری امداد حاصل کی تھی ۔۔"

اروند میری تقریر سن کر کچھ پریشان سا ہو رہا تھا۔ وہ ایک کانچ کے گلاس میں پانی پی رہا تھا۔ پچیس سال پہلے کے ایک نازک واقعہ کی یاد سے شاید اس کے دل کو کچھ دھکا لگا اور اُسکے ہاتھ سے کانچ کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

گلاس کے ٹوٹنے کی آواز سن کر شیلا باہر آئی اور پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں! بھوک لگی ہے۔ ذرا جلدی کرو۔ شیلا!" اروند نے کہا۔

محمد عبدالقادر فاروقی

(بقیہ بیگاری بسلسلہ صفحہ ۱۳۵)

" آدمی کو حجور؟"

"ارے کیا ہے سکھن کو نہیں لایا بُلا کے؟"

"اُس کی ماں اور جورو تو رو رہی ہیں وہ تو رات ہی کا گیا ہوا ہے"

"کوئی جا کر اُس لاش کو تو پہچانے کہیں سکھن ہی نہ ہو مگر جگہ سے نہ ہٹانا۔ اگر اس وقت شکار نہ ہو سکا تو شام کو پس ماندہ کھانے ضرور آئے گا جانور۔ اور ہمارا شکار ہو جائیگا۔"

ہاتھی بٹھائے گئے اور شکاری سوار ہوئے لیکن سکھ رام کے یہاں کوئی تسلی دینے تک تو کیا اُس کی ماں اور بیوی سے دو لفظ تشفی کے بھی کہنے والا نہ گیا۔

اگر کوئی دیکھے تو نیرو آج بھی زندہ ہے۔

ایس۔ ڈبلو حیدر

(بقیہ ماگھرے بسلسلہ صفحہ ۱۴۳)

یہ کہتی ہوئی وہ دوڑی۔ لڑکا کھلکھلا کر ہنسا۔ دوسرے لمحہ وہ لہروں کی آغوش میں تھی۔ پانی کی سطح پر چند بلبلے پیدا ہوئے مسکرائے اور دُنیا فانی ہے کا سبق دیتے ہوئے غائب ہو گئے۔ دیوانی کے یکایک غائب ہو جانے کا گاؤں میں پھر کچھ دنوں چرچا رہا کیونکہ گاؤں کے ماحول میں وہ بھی شامل ہو چکی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اسے بھول گئے۔ اب بھی کبھی کبھی اُس گاؤں کی مائیں اپنے بچوں کو "دیوانی آئی" کہہ کر ڈراتی ہیں تو وہ روتے روتے خاموش ہو جاتے ہیں۔

سیّد احمد حسن اسعد گیلانی

بیگاری

شام ہونے کو ہے لیکن پرند سے اب تک بسیرے کے لئے اپنے مسکنوں پر نہیں اُترے۔ افسردہ ہو ہو کر جھیل کے چاروں طرف اُڑ رہے ہیں اُن کی مختلف آوازوں سے فضا میں عجب درد سا پیدا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دور کے فاصلے پر کچھ اونچائی پر خیمے لگے ہوئے ہیں اور بیسیوں لوگ جلد جلد اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ جتنی مشرق میں سیاہی بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی گیس اور ہنڈوں کی روشنی جنگل میں پھیل رہی ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے مہمانوں کی خاطر بہت سامان کیا ہے کئی فوجی افسر اور ان کے دوست راجہ کبیر ناتھ آ رہے ہیں اور اب ڈنر بھی شکارگاہ ہی میں ہے۔ زمینداری کے سینکڑوں کسان بیگاری پکڑے ہوئے آئے ہیں سب کام وقت پر ٹھیک ہو گیا ہے بس حکم کی دیر تھی۔

بے فکروں کے قہقہے سُنکر ایک دفعہ فرشتے بھی چونک پڑے۔

جب ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور جناح اور گاندھی اپنی اپنی جگہ مُنہ پھلائے بیٹھے تھے اور مسٹر چیمبرلین کو جرمنی کے خلاف سوائے جنگ کے کوئی چارہ کار نہ رہا تھا ان لوگوں کو ٹیبل پر اور کوئی موضوع نہ ملا یہ تو شکار کو آئے تھے اور یہی مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ کیا کیا شکار ہوتا ہے۔ کس کس قسم کے پرندے ملتے ہیں کس کس طرح سے مار کھاتے ہیں، پارٹیاں تجویز ہوئیں میجر صاحب اور کیپٹن حمید تو تیتر کا شکار پسند کرتے ہیں۔ اور بس صبح کے وقت تک یہ تیتر کا شکار کھیلیں گے۔ راجہ صاحب کو ناکو کا شکار بہت پسند تھا چنانچہ ایک پارٹی اس شکار کے لئے بن گئی اب چودھری صاحب اور کرنل صاحب رہ گئے۔ کرنل صاحب کو تمنا تھی کہ وہ کسی طرح شیر مار خاں بن جائیں، چنانچہ انھوں نے چودھری صاحب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"تو آپ صاحبان کی پارٹیاں تو بن گئیں اب کرنل صاحب اور ہم رہ گئے۔ ہم آپ صاحبان سے بڑھیا شکار کھیلیں گے اسلئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم پینتھر شوٹنگ کے لئے جائیں"۔

"ہاں ہاں ضرور سب مار لائیگا کوئی باقی نہ رہ جانے"۔ میجر صاحب بولے۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں لیکن چھوٹے (چودھری صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا) شکاری کچھ خبر بھی لائے ہیں جانور کہاں کہاں ہے"۔

"ملازم سے معلوم ہوا ہے کہ شام وہ چلے گئے صبح کو کچھ آویں گے"۔

ذرا برہم ہو کر "اور وہ چلے کیوں گئے۔ اور انہیں جانے کیوں دیا گیا۔ اس طرح تو شاید شکار نہ ہو........ کوئی ہے........ کسی آدمی کو بلاؤ مٹھاپور جائے گا ابھی........"

دیکھو تم فوراً مٹھاپور چلے جاؤ اور پورن وغیرہ جو شکاری ہیں اُنہیں جس حال میں ہوں ابھی راتوں رات لیکر پہنچو.... اور دیکھو دیر نہ ہو ابھی چلے جاؤ اور ابھی پہنچو......"

"حضور......"

"کچھ نہیں تم کو جانا پڑیگا........ جاؤ"... ایک فرعون بے سامان کی طرح پھر انھوں نے کرنل صاحب کی طرف بڑھکر دیکھا گویا بے ساختہ تجویز داد کے قابل تھی۔

وہ سہما ہوا بڑے شامیانے سے نکلا جہاں گیس کی روشنی سے دن کا دھوکا ہو رہا تھا۔ جہاں بڑے آدمی بیٹھے تھے جن کے سر غرور اور خودسری کا گہوارہ بنے ہوئے تھے وہ بھلا رات اور دن کو کیا جانیں اُن کا حکم تو اندھیرے اُجالے دونوں وقت چلتا ہے۔

کھادر کے گاؤں ہی کیا دو پھونس کے جھونپڑے دو چار اُنہیں پیلے پیلے چہرے پتلی پتلی ٹانگوں نرالے چار ریاسیانی رہنے والے۔ جب دنیا میں انہیں کہیں ٹھکانا نہیں ملتا تو یہاں آکر رہتے ہیں۔ لیکن یہاں کا جور و تشدد جسے وہ شاید سمجھتے بھی نہ ہوں اور جگہ کی بہ نسبت زیادہ ہے اوّل تو یہ بقول کالا پانی نہ یہاں داد نہ فریاد تھانہ چوکی سے دور، شہر اور قصبوں سے بہت فاصلے پر یہاں کے رہنے والوں نے شاید کبھی کسی شہر کو دیکھا ہو اور ریل کی بابت تو یہ سُن سُن کر اب بھی چونک پڑتے ہیں یہیں پیدا ہو کر جوان ہو گئے بڈھے ہو کر مر گئے لیکن دم کی دم اتنی مہلت نہ ملی کہ دریا کے اُس پار جو دُور بہت دُور اُفق سے ملی ہوئی شہر کی چمنی کا اُٹھتا ہوا دھواں

دکھائی دیتا ہے۔ آنے جانے والوں رات کے لٹے ہوئے مسافروں سے اس کی بابت استفسار ہی کریں۔ یہ بارے تھکے کیا جانیں اور انہیں جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہیں توکل کو زمیندار کو جواب دینا ہے کہ کتنا کام کیا ورنہ پھر ان کی گالیاں جو نیاں بھو برسے سویرے اٹھنا۔ تمام تمام دن کی محنت اور پھر فصل پر جا کر بٹائی کا اناج لیکن وہ بھی آدھا تہائی بچا۔ سکھ رام شامیانے سے نکل کر منہ لٹکائے اپنے جھونپڑے کی طرف جا رہا تھا سارا دن تو ویسے ہی ڈیرے تنبو گاڑنے اور سامان ڈھونے میں لگا روٹی تک کی فرصت نہ ملی اور شام پڑے ہاتھ میں نوالہ تھا کہ پھر ہرکارہ آ کھڑا ہوا۔ پھر دو روز کی نئی بہو پرسوں چالا کر کے لایا ہے۔ بوڑھی ماں نے بڑی خاطر سے دال بھات پکایا مگر وہ بھی جی بھر کے نہ کھا سکا۔ چار کوس کی بیگار رات کا وقت جنگل کا رستہ سیہ سانپ کا ڈر۔ گھر پہنچا تو ماں نے کہا "زمیندار نے کیوں بلوایا تھا۔"

"پورن کو بلوایا ہے" دو چار لقمے مار کھڑا ہو گیا۔ جورو کی طرف دیکھا جو نیا سا لبادہ اوڑھے پرال پر بیٹھی تھی، ماں برتن اٹھا باہر چلی گئی۔

"دیکھ ری سو نہ جائیے، اب آیا دو گھنٹے میں......"

یہ کہہ چادر لپیٹ لٹھیا اٹھا بڑے بڑے قدم ڈالتا مٹیا پور کی طرف چل دیا۔

چاند بڑی آب تاب سے چمک رہا تھا چاروں طرف بڑے بڑے ٹیلے اور بڑے بڑے دیوزاد جھاڑ سینکڑوں شکلوں میں دکھائی دے رہے تھے کوئی ہاتھی کی طرح ہواتے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا، کوئی شیر کی طرح منہ پھاڑے دوڑا چلا آ رہا تھا، کوئی چڑیل کی طرح ہاتھ پھیلائے ناچ رہا تھا۔ کوئی ارنے بھینسے کی طرح پھنکاریں مار رہا تھا، ماہ پوہ کی سردی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی لہک دور سے کبھی قریب سے کسی سانبھر یا چھانک کی دل ہلا دینے والی ڈونک یا بھیڑیے اور گیدڑ کی بھونک لیکن ان سب سے بے پروا سکھ رام تعمیل حکم کے لئے دل پر جبر کئے چادر کو احتیاطاً لپیٹے کسی دفعتاً حملے کی مدافعت کیلئے مضبوطی سے لاٹھی کو کاندھے پر تانے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا دل سے توہمات کو زائل کرنے کیلئے وہ واپسی پر آنے والے واقعات سے دل بہلا رہا تھا...... چپکے سے جا کر بڑ جو کے آہستہ سے چٹکی لے گا۔ وہ چونک پڑیگی...... مجھے سردی لگ رہی ہے...... سی سی سی...... وہ جلدی سے اپنے لحاف میں جگہ دیدیگی۔ اور اس رات کی نرمی کیسی اچھی ہے اور اس کی ساری مصیبت اس رات کے نہ ختم ہو جائیگی...... وہ بڑی بستر رہے...... کھڑکھڑاہٹ نے آہستہ پونکا دیا اس کے قدم وہیں تھم گئے سانس رک گیا۔ قریب کے جھاڑ سے تھوڑا سا شور سا تھا بھاگا۔ جانے کیا سمجھا اور کیا جانا۔ فوراً ہی لاٹھی اس کے کھینچ ماری...... ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ بادل کی گرج دار آواز ہوئی بجلی سی چمکی اور کلدار کے آہنی پنجے سکھ رام کے سینے میں دھنس گئے۔ نکیلے دانت رگہائے گلو میں پیوست ہو گئے۔

بہت دور اپنی جورو کے نواس بھرے آغوش سے بہت دور سردی اور ٹھر میں سکھی شیر کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔ زمیندار کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔

صبح کے ساتھ بڑ جو نے بھی اپنا گھونگٹ الٹا اسکی بوڑھی ساس برابر میں پڑی سو رہی تھی لیکن بڑ جو ایک پل بھی نہ سوئی ساری رات جاگتے جاگتے گذر گئی لیکن اس کے دو گھنٹے نہ ختم ہوئے اور رات آنکھوں ہی آنکھوں میں بیت گئی۔

جب جنگل سے چڑیوں اور تیتروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں شکاری حلقے سے فراغت پا کر جنگل میں بھٹ رہے تھے۔ لیکن چودھری صاحب سراسیمہ ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ ہاتھی کسے کھڑے ہیں، پورن اب تک نہیں آیا آج کرنل صاحب کے سامنے بڑی ذلت ہوئی بری طرح بیٹھ رہے ہیں ایک ایک کو کاٹے کھاتے ہیں سکھ رام پر گالیاں پڑ رہی ہیں۔ "یہ رات گیا ہی نہیں جورو کی گود میں پڑا سوتا ہوگا۔ کوئی لائے تو اس کی ٹانگ کھینچ کے حرامزادے کو ایسا مزا چکھاؤنگا کہ یاد کرے۔"

چار آدمیوں نے جھک کر سلام کیا۔

"پورن...... (قہر بھری نظروں سے دیکھ کر چودھری صاحب نے کہا) تم کل کیوں چلے گئے تھے؟"

"حجور...... اطمینان کر کے...... سب کام لیس کر کے چلے گئے تھے۔ بس سیلو پیچھے ہونے کی دیر ہے۔"

"اور اتنی دیر کیوں ہوئی کیا سکھن......"

"رستے میں حجور نے گاہ کا نوں ٹھا ہم پٹیر نیچہ لگا رہے تھے کھولے میں پاس ہی رکا ہے۔ حجور تین جانور پٹواؤں۔ دن دن میں تین کا شکار ہو۔"

"کس چیز کو مارا ہے؟"

(بقیہ بر صفحہ ۱۴۳)

افسانۂ بہترین

سوہن لال ہندوستان کا ایک بے مثل افسانہ نگار تھا۔ اس کے جذبات اور تخیلات ہر ہر شعبۂ حیات پر حاوی تھے۔ معاشرتی، اقتصادی، رومانی ــــ غرض یہ کہ ہر صنف کے افسانے لکھنے پر اس کے دماغ اور قلم میں مہارت تھی۔ خیالات کا ایک سمندر ہر وقت اس کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ اُسے خدا کی طرف سے آمد کا وہ زبردست عطیہ ملا تھا کہ بعض اوقات وہ خود بھی اپنے افسانوں کو پڑھ کر حیران ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اُسی نے لکھے ہیں ــــ کیونکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے بیٹھ کر کوئی پلاٹ سوچا ہو یا کسی خیال کے اظہار کیلئے دماغ پر زور ڈالا ہو۔ بلکہ خود اس کے تخیلات ہر وقت دماغ سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر پھیلائے جانے کیلئے بیتاب رہا کرتے تھے۔ اور لطف یہ کہ ایک افسانے کے ختم ہو جانے کے بعد ہی دماغ ایک دوسرا قصہ پیش کر دیا کرتا تھا۔ اور وہ بھی اپنے اس غیر معمولی ملکہ کو پوری پوری طرح کام میں لانے کیلئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہتا تھا۔ وہ اپنے دماغ کا قدر دان تھا۔ اور اسی لئے افسانہ نگاری کیلئے اُس کو وقت کی تخصیص نہ تھی۔ عام طور پر وہ رات گئے تک لکھتا رہتا۔ اور پھر دوسرے دن پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ علی الصباح لکھنے میں مصروف نظر آتا۔ اُسے تکان کا احساس نہیں ہوتا تھا، وہ شدید محنت کے خطرناک نتائج سے بے پروا رہتا تھا، اور اپنے اس شغل میں غیر معمولی دلچسپی کے باعث کسی کو اپنا دوست بنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اُسکے افسانے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں۔ ملک کا ہر علم دوست ان کی قدر کرے۔ اور وطن میں چاروں طرف اس کے نام سے لوگ واقف ہو جائیں۔ یہ جذبہ خود غرضی پر مبنی ہی لیکن اس جیسے ادیب کیلئے اس سے بڑھ کر اور کیا تمنا ہو سکتی تھی ــ اور اسی جذبہ کے ماتحت اُس کے خیالات کسی ہندوستانی زبان میں نہیں بلکہ انگریزی کا جامہ پہنے ہوئے افسانہ کی صورت میں شائع ہوتے تھے۔ اس کی ان تھک محنتوں اور عرق ریزی کا وشوں کا صلہ بھی اُسے قبول عام کی شکل میں ملجایا کرتا۔ اور ملک کے انگریزی جرائد اور اخبارات اُسکے ہر افسانے کا استقبال کرنے کو ہر وقت تیار رہتے، نقاد اس کے افسانوں کے متعلق نہایت اچھی رائے رکھتے اور عوام و خواص کی نظر میں وہ ہند کے ایک بلند پایہ انگریزی ادیب کی حیثیت رکھتا۔ لوگ اسکو تہنیت کے خطوط بھیجتے اور وہ پھولا نہ سماتا، رسائل اس کے ہر پچھلے افسانے کی تعریف کرتے ہوئے مزید افسانے کی فرمائش کرتے اور وہ خوشی سے از خود رفتہ ہو جاتا۔ اور رفتہ رفتہ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے ہر دوسرے کام سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی ساری توجہ افسانہ نگاری پر صرف کر دی اور اسکو دن رات سوائے اس کے کوئی کام نظر نہ آتا تھا۔

اس کی اس قدر غیر معمولی ادبی دلچسپی کو اگر کوئی شخص اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا تو وہ اس کی مونس شریک زندگی تھی۔ بلاشبہ وہ اس بات کو سوچ کر بے انتہا مسرور ہوتی کہ وہ ایک غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے کی شریک حیات ہے اور اس کا شوہر اسوقت ملک کے بہترین ادیبوں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ سوہن لال کی اس شب و روز محنت کے نتائج پر غور کرتی تو اسکو اُس کی یہی لیاقت و شہرت بُرے پہلو لئے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ وہ محسوس کرتی جا رہی تھی کہ اس افسانوی جنون کے باعث اس کی صحت دن بدن روبہ تنزل تھی۔ وہ روز بروز کمزور سے کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ اُس کے جسم میں کمزوری کے نمایاں آثار پیدا ہو چلے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اب وہ اپنے جسم سابق کے مقابلہ میں آدھا بھی نہیں رہا تھا اور یہی سبب تھا کہ آئے دن اُس کو کوئی نہ کوئی بیماری ستاتی رہتی تھی۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ مسلسل آنکھ جیسے نازک حصہ جسم سے کام لیتے رہنے کے سبب اس کی نظر پر بھی کافی اثر پڑتا جا رہا تھا یہاں تک کہ ایکدن اُس نے محسوس کیا کہ وہ بغیر چشمے کے کام نہیں چلا سکے گا۔ اور اب بھی وہ پروا نہ کرتا۔ اگر اس کی بیوی نے گویا زبردستی اُسے ایک ماہر چشم ڈاکٹر کے پاس نہ بھیجدیا ہوتا کہ وہ اپنے لئے آنکھوں کا معائنہ کرا کر ایک چشمہ خریدے۔ گو اس کے بعد بھی آرام سے گویا اُسے چڑھ ہی رہی۔ اور وہ پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

جسم کی ان تمام کمزوریوں کے باوجود سوہن لال خوش تھا

اور مطمئن۔ کیونکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی دماغی طاقت ترقی پذیر ہے ۔۔۔ مسلسل لکھتے رہنے سے اس کی تحریر میں پہلے سے زیادہ روانی پیدا ہو گئی تھی اور بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

رشتہ داروں اور سب سے زیادہ بیوی کے کہنے سننے کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب اُس کے دماغ میں ایک خاص قوت ہے تو وہ اس سے پورا پورا فائدہ کیوں نہ اُٹھائے۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جو اسکو دن رات لکھتے رہنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ یہ وجہ اُس کے نزدیک نہایت اہم تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ اُسے کامل یقین تھا کہ اسی طرح لکھتے لکھتے ایک وقت آئے گا جب اُس کے قلم سے دُنیا کا بہترین افسانہ نکلے گا۔ ایسا افسانہ جس سے بہتر نہ کسی نے قبل لکھا ہوگا نہ بعد میں کوئی لکھ سکے گا۔ اسی اُمید پر وہ لکھتا تھا، لکھتا رہا تھا، اور لکھے جا رہا تھا۔

(۱)

کافی عرصہ افسانہ نگاری کرنے کے بعد ۔۔۔ ایک روز صبح جس وقت وہ سو کر اُٹھا تو چاروں طرف اندھیرا محسوس کر کے ٹٹولتا ہوا برقی سوئچ کی طرف بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی ابھی جو افسانہ اس کے دماغ میں آیا ہے اُسے جلد سے جلد قلم بند کر لے۔

”ایسے موقع پر بجلی کی روشنی کتنی مفید چیز ثابت ہوتی ہے“! اُس نے دل میں خیال کیا ”ورنہ اتنی رات گئے صرف صبح کے انتظار میں بیٹھے رہنا کسقدر ایذا رساں ہوتا ۔۔۔ کم از کم میرے لئے“!

اُس نے بجلی کا سوئچ دبایا۔

اسکا کیا مطلب! کیا کسی سبب سے بجلی بگڑ گئی ہے جو روشنی نہیں ہوتی۔ وہ بجلی کے موجد کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہنے لگا۔ جس نے بجلی کے یکایک فیل ہو جانے کا کوئی فوری دفعیہ نہیں بتایا تھا۔ ”آخر کار مجھے صبح ہی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ یا اس وقت تک جب تک روشنی آئے۔ اُف نہ معلوم کب صبح ہو۔!“

وہ جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہوگا کہ اس نے اپنی بیوی کی آواز سُنی ”تم اُٹھ گئے؟ اب بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ چلو منہ ہاتھ دھوؤ۔ یا آج ناشتہ کا ارادہ نہیں ہے؟“

سوہن لال حیران ہو کر بولا ”اتنے اندھیرے سے؟“

”تمہیں اندھیرا معلوم ہو رہا ہے! ۔۔۔ اور یہ بجلی کیوں جلا رکھی ہے دن میں؟“

”کہاں جل رہی ہے۔ کچھ خراب ہو گئی ہے شاید“!

”خراب کیسی ۔۔۔ مذاق کیوں سوجھا ہے آج صبح ہی صبح؟“

لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مذاق نہیں بلکہ واقعہ تھا کہ سوہن لال بارگاہِ افسانہ نگاری میں اپنی آنکھوں کو بھی نذر کر چکا تھا۔

اور اب وہ مکمل اندھا تھا۔

(۲)

لیکن یہ مجبوری بھی سوہن لال کو مایوس نہ کر سکی، نہ اسکی افسانہ نگاری میں کوئی کمی پیدا کر سکی۔ بلکہ ایک طرح سے کہنا چاہیئے کہ یکسوئی ہو جانے کے باعث (رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو) اسکی افسانہ نویسی پہلے سے بھی بڑھ سی گئی۔ اب وہ قلم پکڑنے سے معذور تھا۔ لیکن ٹائپ رائٹر جس کا استعمال وہ پہلے سے جانتا تھا اب اُس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ اسکی بیوی سادہ کاغذوں کا پلندہ مشین کی بائیں جانب رکھ دیتی۔ وہ ٹائپ کرتا اور ٹائپ شدہ کاغذات کو داہنی جانب رکھتا جاتا۔ ان کو صحیح طور سے رکھنا، صفحہ وار ترتیب دینا، اُسکے افسانوں کو رسالوں میں بھیجنا اور ٹائپ کی مشین کی مرمت کروانا وغیرہ اسکی بیوی کے کام تھے۔

اب بھی وہ اسی اُمید پر لکھ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی وقت آئیگا جب اُس کے دماغ سے دُنیا کا وہ سب سے اچھا افسانہ نکلے گا۔ تمام دُنیا میں اُسکی شہرت پھیل جائیگی۔ ہر زبان میں ترجمہ ہوگا۔ لوگ نہایت ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ اُسے پڑھ پڑھ کر تعریف کریں گے۔ ”ایک اندھے کا شاہکار“ ”ایک ہندوستانی نابینا کا کمال“ وغیرہ کی سُرخیوں سے مُلک کے رسالے اور جرائد اُس پر تبصرہ کریں گے اور ہندوستان کے ایک انشا پرداز کو دوسرے مُلکوں کے سامنے فخریہ پیش کریں گے۔ اس قسم کے دل خوش کُن اور حوصلہ انگیز خیالات سے ہر وقت اُس کا دماغ پُر رہنے لگا۔ بلکہ اب وہ یہانتک سمجھنے لگا تھا کہ اس کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ دُنیا کا وہ سب سے اچھا افسانہ اُسکے قلم (؟) سے نکلے۔ اور اسکے بعد شاید اُس کی زندگی ختم ہو جائیگی۔

(۳)

جاڑوں کے زمانہ میں تقریباً تین بجے صبح وہ یکایک چونک پڑا۔ اُسکی آنکھ کھُلی، دماغ میں ایک نئے افسانے کا پلاٹ جو اس نے کل دن میں سوچا تھا اب تک گھوم رہا تھا۔ کل اُسے بیوی پر غصہ بھی آیا تھا۔ کیونکہ اُس نے کل اُسے ٹائپ رائٹر کے پاس جانے سے روک دیا تھا (اب تو گویا وہ اسی کے اختیار میں تھا) بیوی کو نہیں منظور تھا کہ وہ بیماری کی

حالت میں کوئی کام کرے جبکہ ڈاکٹر نے بھی اسکی ممانعت کردی تھی۔ پرسوں رات وہ بارہ بجے تک ایک صوبیار ڈکی بخار کی حالت میں بیوی کی انتہائی منع کرنے کے باوجود ایک افسانہ ختم کرچکا تھا۔ جس سے کافی تھک بھی گیا تھا اور بخار بھی تیز ہوگیا تھا۔ اور جس کے باعث بیوی نے مشین کہیں چھپا دی تھی۔

اس وقت وہ تازہ جوش و خروش کے ساتھ اٹھا کیونکہ یہ افسانہ جسکا پلاٹ اُسکے دماغ میں اسوقت تھا، وہی تھا جو دُنیا کا بہترین افسانہ بننے والا تھا ——— !

"یہ وقت بہت موزوں ہے" اُس نے سوچا۔ کیونکہ وہ بیوی کو بغیر اِطلاع دیئے اس افسانے کو پورا کر ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس وقت جاگ اٹھے گی تو اُسکو ہرگز نہ ٹائپ کرنے دیگی۔ اُسے سوہن لال کی صحت کا بہت خیال تھا۔ ان باتوں کو سوچ کر وہ مسکرایا۔ اور نہایت آہستگی سے بستر سے اُٹھا۔ کسی قدر تکلیف سے ٹٹولتا ہوا بڑھا، اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے خواب گاہ کو چھوڑ کر میزوں اور کرسیوں کا سہارا لیتا ہوا مطالعہ کے کمرے میں پہونچا۔

"مشین اسوقت کہاں رکھی ہوگی ——— اس کمرے کے علاوہ کہیں نہیں ہوسکتی۔ شاید میز پر ہو۔ اُسے بعد میں رکھدی ہو"

مشین میز پر نہ تھی۔

الماری میں ہوگی۔ اوپر کے تختے میں تو ہے نہیں۔

بیچ کے تختے میں ——— ہاں یہ رکھی ہے! ——— اوہ نہیں یہ تو کوئی اٹیچی کیس ہے!

نچلے تختے میں بھی نہیں ——— پھر کہاں ہوسکتی ہے۔

دوسری الماری بھی خالی ہے۔

اس پردے کے پیچھے بھی نہیں ہے!... آدھا گھنٹہ گذر گیا۔

اوہو ——— میز کے ہی نیچے رکھدی تھی۔ شکر ہے مل گئی!

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے میز پر رکھا صندوقچہ کھولا جس میں ہمیشہ کاغذ رکھے رہتے تھے "نہ معلوم اس وقت اس میں کاغذ بھی ہونگے ——— ہیں تو سہی۔ کافی ہیں۔ بس ٹھیک ہے"

اور اب اسکی اُنگلیاں مشین پر رقص کرنے لگیں۔

آہ تسلسل خیالات مربوط عبارت۔ پلاٹ کا انوکھا پن۔ اور تحریر کی روانی۔ کون سی چیز اس وقت اُسکے دماغ میں نہ تھی۔

یکے بعد دیگرے ٹائپ کے حروف کے ملاک اُچھل اُچھل کر کاغذ پر لگ رہے تھے۔ تین ساڑھے تین گھنٹے تک وہ ٹائپ کرتا رہا خیالات دماغ میں آرہے تھے اور دماغ سے نکل کر حرفوں کی صورت میں تبدیل ہورہے تھے۔ حروف بتدریج الفاظ کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ اور الفاظ مسلسل جملے بناتے چلے جارہے تھے۔ ہر ہر جملہ پر اُسکی مسرت اور جوش بڑھتا جارہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہی دُنیا کا بہترین افسانہ ہے۔

اسکی جسمانی طاقت لحظہ بلحظہ گرتی جارہی تھی۔ بخار بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آگیا تھا، تھکن بڑھتی جارہی تھی۔ لیکن اس کے جوش میں کمی نہیں آئی تھی۔ حیرت انگیز تیزی سے وہ ٹائپ کررہا تھا۔ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ جذبات اور خیالات کا مینہ برس رہا تھا۔

اِس دوران میں بے اختیار کبھی کبھی تھکن سے مجبور ہوکر اُسکا جی چاہا کہ وہ ذرا دیر کرسی سے سہارا لگا کر بیٹھ جائے لیکن کوئی آواز ہر مرتبہ اس سے کہتی رہی "بس تھوڑی سی ہمت اور ——— اب ذرا سا تو رہ ہی گیا ہے اس کے بعد تم جانتے ہو یہ افسانہ دُنیا کا بہترین افسانہ بن جائے گا"

اور اس آواز کے ساتھ ساتھ اُسکا ضمیر بھی کہتا تھا کہ ؏

"یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد" ذرا اور جلدی۔ کہیں وہ نہ جاگ اُٹھے اور یہ افسانہ ناتمام رہ جائے"

سورج طلوع ہورہا تھا جب وہ اپنا آخری صفحہ ٹائپ کررہا تھا۔ آخری فل اسٹاپ کا نقطہ اُچھل کر کاغذ پر لگا۔

"ہاں اب میرا کام ختم ہوگیا" اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے سہارا لگا کر بیٹھ گیا۔

اتنے ہی میں اُس کی بیوی اُسے تلاش کرتی ہوئی پہنچی۔ اور دُور سے ہی دیکھکر بولی۔ "پھر تم اس بیماری میں ٹائپ کرنے پہونچے۔ اپنی جان کے دشمن کیوں بن رہے ہو؟"

سوہن لال ٹائپ شدہ کاغذات کو فائل میں لپیٹتے ہوئے بولا "بیوی! میرا کام ختم ہوگیا!" فائل پر انگلی مار کر "دیکھو میں نے اپنا وہ افسانہ پورا کرلیا جو میں تم سے اکثر کہا کرتا تھا کہ دنیا کا بہترین افسانہ ہوگا" اُس نے فائل کو سینے سے لگالیا۔

اُس کی حالت بگڑ گئی۔ لگاتار چوبیس صفحے ٹائپ کرنے کے بعد اُس کی بیماری اور بڑھ گئی تھی یہاں تک کہ اُس نے دم دیدیا۔ اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اُس کی رُوح اپنا کام ختم کرکے پرواز کرگئی

(بقیہ برصفحہ ۱۷۶)

ماگھرے

اِسے بھلا گاؤں کی الھڑ لڑکیوں میں کھیلنے کا موقعہ ہی کب ملا تھا کہ وہ گڑے گڑیا کے بیاہ کی نہ میں کوئی اور مسرت حاصل کرتی۔ اور پردہ ہائے مُستقبل کے پیچھے سے جھانکنے والی خوشی کے تصور میں کھوجاتی۔ وہ تو دن دن بھر گاؤں سے تھوڑے فاصلے پہ بہنے والی ندی کے کنارے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مویشی چرایا کرتی۔ تاہم اُس نے اپنی شادی کے متعلق سُن رکھا تھا جو اُس کے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُسکا شوہر پردیس میں کمانے کے لئے گیا ہوا ہے۔ وہ مویشیوں کو کھیتوں میں چھوڑ خود ہی ندی کے کنارے پاؤں لٹکا کر بیٹھ جایا کرتی۔ اور اپنے نادیدہ شوہر کے متعلق سوچا کرتی۔ اسے اپنے شوہر سے جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا ایک قسم کی محبت سی ہو گئی تھی۔ وہ اُس کے تصور میں مسرت حاصل کرتی۔ وہ سوچتی "میرا شوہر ایک خوبصورت جوان آدمی ہوگا۔ جب وہ آئیگا اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوگا۔ سر پہ سفید پگڑی ہوگی جسکا طرّہ مجھے دُور سے نظر آئیگا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوگا۔ بھلا نوکر چاکر جو ٹھہرا۔ سبھی کماؤ لوگ پردیس سے اچھے اچھے کپڑوں میں آتے ہیں۔ مسرت سے اُس کا دل ناچنے لگتا۔ وہ پھر شروع سے سوچنے لگتی۔ وہ اپنے شوہر کے تصوّر کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اپنی چھوٹی سی پھٹی ہوئی اوڑھنی کو دن میں کئی بار دھوتی وہ بھی صاف رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک نوکر چاکر آدمی کی بیوی تھی۔ شام ہوجاتی اُسکا چھوٹا بھائی مویشی جمع کرتا۔ اور وہ گھر کی طرف چل دیتے۔ وہ مویشیوں کے پیچھے پیچھے اپنے خیالات میں غلطاں چلی جاتی۔ یہاں تک کہ اُسکی ماں کی آواز "ماگھرے میری بیٹی آگئی" اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیتی اور وہ جلدی سے مویشیوں کو باندھنے لگتی۔

"ماگھرے! گاؤں کے گوالے کی یتیم لڑکی! غریب بیوہ ماں کی بچی!! اُس کی آج اور کل میں فرق ہی کیا تھا۔ اُسکی زندگی بالکل اُس چکی کی طرح تھی جو ان کے گھر میں دروازے کے پاس پڑی تھی جس میں اُس کی ماں ہر روز اناج پیسا کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر آج میں دن بھر مویشی چراتی رہی ہوں تو کل بھی وہی مویشی ہونگے! وہی ندی کا کنارہ! اور وہی ماگھرے!!!

اُس نے اپنی اوڑھنی جو دھو کر سوکھنے کیلئے ڈالدی تھی اُٹھائی اور ایک بچھڑے کو جو مویشیوں سے بچھڑ کر اس کے پاس آگیا تھا ہانکتی ہوئی دُور تک لے گئی اور پھر چھڑی گھماتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آبیٹھی۔

اُس نے کسی کی آمد کی موہوم اُمید میں حسبِ معمول سڑک کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جو ندی کے کنارے کنارے بل کھاتی ہوئی اُفق میں چھلانگ لگا گئی تھی۔ ماگھرے نے کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ہر چہار طرف درختوں کا گول دائرہ اس کو محیط کئے تھا۔ اُس نے سوچا دُنیا کتنی بڑی ہے، اور پھر سڑک پر جو اُفق سے ہم آغوش تھی نظریں جما دیں۔ دور سڑک پر اس کی نظر کے انتہائی بیکسانہ نقطہ پر ایک سفید سا دھبّہ نمودار ہو گیا۔ وہ اس بڑھتے ہوئے دھبّہ کو بڑی غور سے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ کل جب نجّو کا شوہر آیا تھا تو نجّو نے تو اسے ان درختوں کی قطار کے درمیان ہی دیکھ لیا تھا۔ اُس نے سوچا شاید نجّو کی نظریں اس سے زیادہ تیز ہیں۔ وہ اور زیادہ غور سے اس دھبّہ کو دیکھنے لگی۔ اُس نے محسوس کیا کہ سفید دھبّہ کے نیچے ایک سایہ سا بھی حرکت کر رہا تھا۔ وہ دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ اُس کی نظریں سمٹ کر بہت قریب آگئیں۔ ایک شخص سفید طرّہ دار پگڑی۔ نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنے۔ گھوڑے پر سوار ماگھرے کے قریب سے گزرنے لگا۔ ماگھرے نے غور سے دیکھا۔ آنکھیں جھپکیں۔ ملیں۔ دوبارہ دیکھا۔ یہ تو وہی تھا جسکا وہ مدّت سے خواب دیکھ رہی تھی۔ بالکل وہی۔ ویسا ہی جو اُسکے خوابوں کی دُنیا کا راجہ تھا۔ مالک تھا۔ اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس کا شوہر اور اُس کے قریب سے یوں گزر جائے؟ وہ برداشت نہ کر سکی۔ نجّو نے بھی تو اپنے شوہر کے ساتھ سڑک کے قریب اُپلے تھاپتے ہوئے باتیں کیں تھیں۔ وہ اُٹھی گھونگھٹ نکالا۔ "اے بھائی گھوڑے والے"۔ گھوڑا رُک گیا۔ دیہات میں ہر انجان شخص کو یونہی مخاطب کیا جاتا ہے۔

وہ گھونگھٹ نکالے جھجکتی۔ اٹھلاتی۔ شرماتی سمٹتی سمٹاتی۔ قدم قدم پر رکتی اس کے قریب پہنچی۔

"تم یہ سامنے والے گاؤں میں جاؤ گے نا بھائی؟"

"ہاں!" سوار نے جان بوجھ کر اُسکی حسب خواہش جواب دیا۔

"کیا منگو کو اسے کے ہاں؟"

"نہیں!"

"نہیں؟" ماگھرے نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا کہا منگو کو ال؟ ہاں ہاں اسی کے ہاں جا رہا ہوں" اس نے یونہی کہہ دیا۔

"وہی نا جسکی ایک لڑکی ہے ماگھرے!"

"ماگھرے: ہاں ماگھرے؟ اسی ماگھرے کے ہاں"

"جسکا شوہر اسکے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے ہی پردیس گیا ہوا ہے"

"ہوں" اُس نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ماگھرے تو میرا ہی نام ہے"

"تمہارا! ارے تم ہی ماگھرے ہو؟"

"ہوں!"

"ارے تمہیں ہی تو میں لینے جا رہا ہوں۔ آج بڑی مدت کے بعد چھٹی ملی تو تمہیں لینے کے لئے آ گیا۔ تمہیں معلوم ہے پردیس کا معاملہ ہے چھٹی ملتی نہیں"

"تو پھر چلئے نا گھر"

نہیں بھئی مجھے بالکل فرصت نہیں۔ اچھا ہوا کہ تم یہیں مل گئیں۔ چلو اب یہیں سے چلی چلو۔ آؤ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔

"اماں!"

"ارے ہم تھوڑے دنوں میں پھر آئینگے نا انہیں ملنے کیلئے!"

اُسکا شوہر کوئی بات کہے اور وہ نہ مانے۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھی۔ سوار نے ہاتھ پکڑ پاؤں کا سہارا دے اُسے اپنے سامنے بٹھالیا اور دوسرے لمحہ میں گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا چرتے ہوئے مویشی اور لہلہاتے ہوئے کھیت پیچھے چھوڑتا ندی کے کنارے کنارے دور نکل گیا۔ ماگھرے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسکا چھوٹا بھائی لکڑی لئے مویشیوں کے پیچھے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں بھی ندی کے پانی کی طرح لہریں اٹھ رہی ہوں۔ اُسکی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تھرتھرائے اور ہری ہری گھاس کی پتیوں پر گر کر چمکنے لگے۔ اب کیسے معلوم کہ ان شبنم کے آنسوؤں میں وہ خونِ دل کے قطرے بھی تھے۔

اُس نے محسوس کیا جیسے وہ ندی کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہروں میں بھی چلی جا رہی ہو۔ اُس کا سر چکرایا اور اُس نے سوار کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"ماگھرے کیا تم نے مجھے پہچان لیا تھا؟" سوار نے مسکراکر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہوں! میں سوچا کرتی تھی کہ جب آپ آئیں گے تو اچھے اچھے کپڑے پہنے گھوڑے پر سوار ہونگے"

"اور تمہارا خیال صحیح نکلا"

"ہوں! جبھی تو میں نے آپ کو روکا تھا"

"تم بڑی ہوشیار ہو" سوار نے فتحمندانہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اور اسکا جواب بھائی کی یاد میں ایک ہلکی سی سسکی تھی۔

اب ماگھرے کو پتہ چلا کہ دُنیا تو اس سے کہیں بڑی ہے جتنی وہ پہلے خیال کرتی تھی۔ اور وہ درختوں کا گول دائرہ ہی دُنیا کو گھیرے ہوئے نہ تھا بلکہ نظریں تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنا نظریہ بدلتی رہتی ہیں۔ وہ ہر کوس پر ایک نئی دُنیا پیش کرتی ہے۔ ہر میل پر ایک نیا افق بناتی ہے اور ہر اُس افق کو جو نگاہیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں ہم عبور کر سکتے ہیں۔

وہ چلتے رہے۔ کسی گھنے سایہ دار درخت کے نیچے دم لیتے۔ پھر چلدیتے۔ آخر راستہ میں ایک گاؤں آیا۔ کنوئیں کے قریب پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ اُترے۔ ماگھرے نے اپنی باجرے کی روٹی کھولی جو اس کی ماں دوپہر کو کھانے کے لئے اُسے باندھ دیا کرتی تھی۔ اور آم کے اچار کے ساتھ کھائی اور پانی پیا۔ تھوڑی دیر رُکے۔ دم لیا اور پھر چل دیئے۔

آخر شام کے وقت وہ ایک چھوٹے سے قصبہ میں داخل ہوئے۔ ایک تنگ و تاریک گلی اور بوسیدہ سا مکان۔ یہی ماگھرے کی مفروضہ سُسرال تھی۔ گھر میں داخل ہوئے۔ گھر میں اُس کی بوڑھی ماں اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ یہی کل خاندان تھا۔ ماں نے اپنے بیٹے کو گلے لگایا "بہادر اپنی دُلہن خود بیاہ لاتے ہیں" اور ایک مغرور فاتح کی طرح ماگھرے کی طرف دیکھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں ماگھرٹے پر حقیقت منکشف ہوگئی۔ اب اُس کی زندگی تلخ ہوگئی۔ وہ کسی خاص شخص سے محبّت نہیں کرتی تھی؛ اُسے تو فقط شوہر سے اُنس تھا۔ ایک بدصورت سے بدصورت انسان بھی اس کا شوہر کہلا کر قابلِ تعظیم ہوسکتا تھا۔

تڑپتے، سسکتے، سلگتے دس سال گزر گئے۔ لیکن اُس کی بےچینی اور بےقراری میں کمی نہ ہوئی۔ اسے افسوس تھا کہ اسے دھوکا دیا گیا، اور رنج تھا کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں رہنے پر مجبور کی گئی ہے۔ اس کی زندگی بالکل اس پتھر کی طرح تھی جو پرنالے کے نیچے رکھا ہوا ہو وہ اب بھی اپنے اصلی شوہر کے پاس جانیکے لئے تیار تھی۔ اور وہ کسی کا انتظار جو ندی کے کنارے بیٹھ کر کیا کرتی تھی اب بھی بدستور تھا۔

ان کے ہاں ایک شخص آکر ملازم ہوا۔ بس یہی کھانے اور کپڑے پر۔ دن گزرتے گئے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ایک دل نے کہا "مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ یہاں رہنے پر مجبور کیا گیا ہے!" دوسرے نے کہا "میں تمہاری ہی تلاش میں سرگرداں یہاں پہنچا ہوں۔ لفظِ شوہر نے دو دلوں کو ملا دیا۔

ایک دن سب لوگ دعوت میں گئے تھے۔ گھر میں صرف ماگھرٹے اور ان کا ملازم تھے۔ آنکھوں نے تجویز پیش کی "یہ موقعہ اچھا ہے" دماغوں نے منظور کر لیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ قصبہ سے باہر جنگل کی طرف جانیوالی سڑک پر جا رہے تھے۔ گھبرائے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھ رہے تھے۔ ماگھرٹے محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اُسکی خفتہ رُوح ایک مدّت کے بعد مسرّت و آزادی کی فضا میں انگڑائیاں لے رہی ہو۔

چور کبھی اپنے سرہانے گٹھری رکھ کے سویا نہیں کرتا۔ جب دعوت میں اس شخص کو اس بات کا احساس ہوا تو وہ گھر کی طرف بھاگا۔ ہرن کے گلے سے رسّی نکال کر اُسے جنگلی ہرن کے بھروسہ پر چھوڑ دینا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں آس پاس چرتا رہیگا حماقت ہے اور وہی ہوا جسکا اُسے ڈر تھا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اگر طویل عرصہ تک صبر کیا جائے تو اُس کا پھل شیریں تر ہوگا۔ لیکن زیادہ حلاوت بھی تو تلخی کا موجب ہوتی ہے جب ماگھرٹے نے دیکھا کہ وہ ظالم گھوڑے پر سوار ان کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے تو اُس نے اپنے اصلی شوہر سے قریب ہی کسی جھاڑی میں چھپ جانیکے لئے کہا۔ اور خود وہیں کھڑی ہوگئی۔ وہ شخص اُس کے پاس آکر رُکا اور اُس نے پوچھا کہ وہ اُس کی اجازت کے بغیر کہاں چلی جا رہی تھی اور ماگھرٹے نے بڑے بھولے پن سے کہہ دیا "میں کیا جانوں؟ تمہیں نے تو مجھے دعوت میں بُلایا تھا اور یہ شخص مجھے تمہارے پاس لئے جا رہا تھا۔ تمہیں دیکھا تو بھاگ گیا"۔ "تم بڑی بھولی ہو ماگھرٹے!" اُس نے کہا۔ اور ماگھرٹے دل ہی دل میں خود اُسکے بھولے پن پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ واپس مڑے اور چلدیئے۔ راستہ میں ایک چھوٹا سا نالہ آیا جو بڑی خاموشی سے جنگل میں سے ہوتا ہوا دُور تک بہتا چلا گیا تھا۔ گھوڑا نالے پر پہنچا اور رُک گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ سوار نے لگام کھینچی اور ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑے نے ایک پاؤں پانی میں رکھا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ تڑ سے ایک چابک پڑا۔ اور پھر دوسرا۔ مگر گھوڑا چار قدم اور پیچھے ہٹ گیا سوار اُترا اور کمر سے تلوار کھول کر ماگھرٹے کو دی۔ لگام تھامی اور تہ بند اوپر اٹھانے کیلئے جھک گیا اور اس سے پیشتر کہ اس کی نگاہیں نالے کے دوسرے کنارے کو دوبارہ دیکھیں اُس کا سر لڑھکتا ہوا پانی میں جا گرا۔

وہ حقارت سے مُسکرائی جیسے اُس نے دس سالہ غلامی کی زنگ آلود زنجیریں توڑ پھینکی ہوں۔ اُس نے مُردہ جسم کو ایک ٹھوکر لگائی اور اسے جنگلی جانوروں کی امانت سمجھتے ہوئے باگ پیچھے موڑ لی۔ وہ اُس جھاڑی کے قریب گئی۔ جہاں وہ اپنے شوہر کو چھپا گئی تھی۔ گھبرائے ہوئے انسان کے ڈگمگائے ہوئے قدموں کے نشان۔ وہ آگے بڑھی اور آگے کئے ہوئے ہاتھ۔ چبائی ہوئی ہڈیاں اور خاک آلود سر ایک کنجان جھاڑی میں پڑے ہوئے ملے۔ ظالم درندے نے سخت اذیت کی حالت میں انسانی جان لی تھی۔ آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جو درندے کی سفّاکی کی شکایت کر رہی تھیں۔

ماگھرٹے گھوڑے سے اُتری۔ سر اٹھایا۔ خاک آلود پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہوگئی، وہ گوشت کے لوتھڑوں اور ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف دیکھ کر مُسکرائی قدرت کے ظالمانہ مذاق پر! جیسے اس نے مُسکرا کر قدرت اور اسکے قوانین کو شکست دیدی ہو۔ مگر اس کی وحشیانہ آنکھوں میں دو ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اُس نے آہستہ سے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ قریب ہی کہیں سے اُلّو بولا۔ گھوڑے نے کنوتیاں کھڑی کیں۔ ماگھرٹے کو ایسا

معلوم ہوا جیسے اس کے ویرانۂ دل میں لاتعداد اُلّو بول رہے ہوں اُس کے دماغ میں ایک نامعلوم گونج پیدا ہوگئی۔ اور معلوم ہونے لگا جیسے اُس کے گرد سینکڑوں شیاطین اور ہزاروں غول بیابانی گھیرا ڈالے ناچ ناچ کر غل مچا رہے ہوں۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی باگ کھینچی اور پھر ڈھیلی چھوڑ دی۔ "لو پھر چلا!" ہُو دہُو دحق! اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ماگھرے رات بھر گھوڑے پر سوار اُسے جنگل میں اِدھر اُدھر دوڑاتی رہی۔ جب گھوڑا تھک کر آہستہ چلنے لگتا۔ ماگھرے کو پھر وہی آوازیں سُنائی دینے لگتیں اور وہ گھوڑے کو پیٹتی اور گھوڑا پھر ایک نامعلوم منزل کی طرف دوڑنے لگتا۔ ماگھرے اپنی منزل خود نہیں جانتی تھی۔ اُسکی منزل تو وہیں اُس کے شوہر کے ساتھ جھاڑی کے پاس ختم ہوچکی تھی۔ اور پھر بھی قدرت نے اُسے زندہ چھوڑ دیا تھا۔ بھلا اب وہ کہاں جاتی۔ جبکہ اس کی کوئی منزل ہی نہ تھی۔ وہ اب چڑیا کے اس بچّہ کی طرح تھی جو گھونسلے سے گر چکا ہو۔ رات بھر گھوڑا قدرت کی انگلیوں پر ناچنے والے سوار کے اشاروں پر ناچتا رہا۔ دوڑتا رہا۔ پو پھٹنے لگی۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ قریب ہی ایک جھاڑی سے شیر دھاڑا۔ گھوڑا بدکا اور اپنی منزل قریب دیکھ کر ایک بار پھر بھاگا۔ ہر شخص اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود منزل پر پہونچنے سے گھبراتا ہے وہ اس کی طرف بڑھتا بھی ہے اور اس سے دور بھی رہنا چاہتا ہے۔ گھوڑا جنگل پیچھے چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب وہ ایک ندی کے کنارے کنارے جس کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر دو بھٹکی ہوئی روحوں کو دیکھ رہی تھیں چلا جا رہا تھا۔ ماگھرے نے جھٹکے سے باگ ایک طرف موڑی۔ گھوڑا یکایک رُکا اور دوسرے لمحہ ماگھرے لہروں کی آغوش میں تھی۔ لہریں سمٹ سمٹ کر اُس کی طرف آنے لگیں۔ جیسے وہ اُس سے آشنا ہوں۔ بُلبلے اپنے پھول سے چہرے نکال نکال کر مُسکرائے جیسے انھوں نے کوئی کھوئی ہوئی چیز پائی ہو۔ وہ پانی میں ڈبکیاں کھاتی۔ ڈوبتی۔ اُبھرتی دُور تک بہتی چلی گئی۔ دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے اُسے بہتے ہوئے دیکھا اور وہ تیرتا ہوا اُسے نکال لایا۔ کیونکہ مویشیوں کو کھیتوں میں چھوڑ دن بھر ندی میں تیرتے رہنا تو اسکا کام ہی تھا۔ تھوڑی میں ماگھرے کو ہوش آگیا۔ نوجوان نے اپنی کھدر کی چادر اُسے دی اور اُسکے بھیگے ہوئے کپڑے دھوپ میں ڈال دیئے۔

وہ دن بھر وہاں رہے۔ ہندوستان سا گرم مُلک۔ ندی کا خوشگوار کنارہ، سکون۔ طویل تنہائی اور ایک جوان جوڑا۔ جذبات سے پُر سینے۔ فطرت نے ترغیب دی۔ تنہائی نے آمادہ کیا اور سکون نے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا۔ دن بھر صنفیات پر باتیں ہوتی رہیں اور پھر تجربہ بھی کیا گیا۔ سورج چھپنے سے پہلے پہلے وہ قدرت کی قوانین کا منہ چڑاتے ہوئے انسانی فطرت کے سامنے سر جُھکا چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے گنہگار ہوچکے تھے۔

شام ہوگئی۔ تمام مویشی جمع کئے گئے۔ نوجوان نے لکڑی سنبھالی اور گھر جانیکے لئے تیار ہوگیا۔

"اب تم کہاں جاؤگی؟"

"جہاں تم لے چلو!"

"تو پھر آؤ!"

مویشی ہانک دیئے گئے۔ گرد و غبار زمین سے اُٹھ اُٹھ کر گاؤں کو جانیوالی سڑک پر ایک دوسری فضائی سڑک بنانے لگا۔ ماگھرے اور نوجوان باتیں کرتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف چلدیئے۔

ایک عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اُس میں کچھ ایسی باتیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں جن پر اگر پہلے غور کیا جائے تو قابلِ تسلیم نہ سمجھی جائیں۔ ماگھرے کی ماں اُس کے چلے جانیکے بعد بھی جب شام ہوتی اور مویشی آکر گھر میں داخل ہوتے تو چلا اٹھتی "ماگھرے میری بیٹی تو آگئی"۔ اور ماگھرے کہا کرتی تھی "ہاں ماں میں آگئی"۔ لیکن اب یہ آواز ایک دس سالہ صدائے بازگشت تھی جو بڑھیا کے اپنے ہی کانوں میں گونج کر رہ جاتی۔ اب اس کی اس پُکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماگھرے اس سے جُدا ہوچکی ہے۔ شاید ہمیشہ کے لئے! لیکن وہ ماں کی فطرت سے مجبور تھی۔ وہ مویشیوں کے آنے پر بے اختیاری طور پر چلا اٹھتی "ماگھرے! میری بیٹی تو آگئی"۔

مویشی گھر میں آکر داخل ہوئے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو پھاندتے، چارے کے گٹھے میں سے نوالے کھینچے۔ برتنوں میں مُنہ ڈالے۔ صحن میں کُڑکُڑاتی ہوئی مرغی کے بچوں کو کچلتے اپنے اپنے تھانوں پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ نوجوان اور ماگھرے صحن میں داخل ہوئے۔ یکایک ایک کپکپاتی ہوئی آواز فضا میں اپنی دردناک گونج چھوڑتی ہوئی ختم ہوئی۔ "ماگھرے! میری بیٹی آگئی"۔ نوجوان یہ آواز ہر روز سُننے کا عادی ہوچکا تھا۔ وہ مویشیوں کو باندھنے کیلئے انکی طرف بڑھا۔ ماگھرے نے یہ آواز سُنی۔ ان ظاہری کانوں سے نہیں

بلکہ خیال کے کانوں سے۔ اس کے دل میں ایک مُردہ یاد نے کروٹ لی۔ وہ ایک بھولی ہوئی یاد نے پھر اس کی روح میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اُس کے خیالات نے ایک لمحہ میں ہی گذشتہ دس سال کا سفر قطع کر لیا۔ وہ اپنے ماحول کو بھول گئی۔ فضا کو بھول گئی۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھول گئی۔ وہ اپنے آپ کو وہی دس سال پیشتر کی بارہ سالہ ماگھر سمجھنے لگی۔ وہ اپنی ماں کی طرف بڑھی۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ہاں ماں میں آ گئی!" نوجوان نے مویشی باندھتے ہوئے مُڑ کر دیکھا اور نقش حیرت بن کر رہ گیا۔ اس کی روح تڑپی۔ برادرانہ جوش سے! اور بیچ و تاب کھانے غیرت اور حمیت کے خون ہو جانے کی وجہ سے! دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے اور اُس کی روح مُردہ ہو گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے کنارِ ندی کے واقعات ایک ایک کرکے پھرنے لگے اُس کا ضمیر چیخ اُٹھا۔ اسے معلوم ہوا جیسے ندی کا پانی سُرخ ہو گیا ہے۔ اُس میں طوفان آ گیا ہے۔ بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں۔ شور و غل مچا ہوا ہے جس میں خوفناک چیخیں اور ڈراؤنی آوازیں رونگٹے کھڑے کئے دیتے ہیں۔ وہ چیخ اُٹھا "تو تو میری بہن تھی" وہ لپکا اور بھوسے والی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ بڑھیا نے ماگھر کی آواز سنی۔ کانپتی۔ تھرّاتی ہوئی اُٹھی۔ لپکتے ہوئے بازو پھیلا دئے ...... ماں ...... بیٹی ...... جدائی ...... طویل جدائی ...... اچانک ملاقات ...... خوشی ...... انتہائی خوشی ...... شادیٔ مرگ ...... تاریک گڑھوں میں بڑھیا کی آنکھیں پھڑپھڑائیں۔ جھپکیں کُھلیں اور پھٹ گئیں "میری بیٹی! میری ماگھر تو آ گئی!" وہ کانپی۔ لڑکھڑائی اور اس سے پیشتر کہ وہ مامتا کی آگ اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر بُجھا سکے زمین پر گر گئی۔ ماگھر دوڑ کر ماں کے پاس گئی۔ اس سے لپٹ گئی روئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی اور جب ذرا ہوش آیا تو دیکھا کہ اس کی ماں "اسے ہمیشہ کے لئے روتا چھوڑ چکی ہے" وہ پلٹی۔ صحن میں مویشی ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی ایک کوٹھڑی میں گھس گئی۔ پھر دوسری میں! پھر بھوسہ والی میں!! نوجوان رسّی کا پھندا گلے میں ڈالے چھت سے لٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُبل آئی تھیں۔ جو اپنے ماحول کو حیرت اور نفرت سے دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ماگھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی "میں تیری بہن ہوں! میرے بھائی!" اُس نے آہستہ سے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ جیسے وہ اُسے سمجھا رہی ہو۔ وہ پھر باہر بھاگی اور اپنی ماں کی لاش سے لپٹ گئی "میں تیری بیٹی ہوں۔ میری پیاری ماں!"

اِس کے بعد کئی دن گذر گئے۔ گاؤں کے گرد و نواح میں ایک دیوانی گھوما کرتی، وہ درختوں سے لپٹتی "میں تیری بہن ہوں!" کہتے ہوئے تہتیروں سے لپٹتی۔ قبروں کو اپنے بازوؤں میں لینا چاہتی "میں تیری بیٹی ہوں! میری ماں!"

جب رات کی پرسکون فضا میں! دودھ کی سفید چاندنی میں!! اندھیری راتوں میں!!! خوفناک برساتوں میں!!!! ایک ہلکی سی غمناک ڈراؤنی آواز آتی "میں تیری بیٹی ہوں ماں!" پھر تھوڑی دیر کے بعد آواز آتی "میں تیری بہن ہوں!" تو بچے کہانیاں سنتے سنتے خوف سے لحافوں میں مُنہ چُھپا لیتے اور بعض سر اٹھا کر دیکھتے اور پھر لحاف کو چاروں طرف سے دبا کر آنکھیں بند کر لیتے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد تو وہ گاؤں میں اچھی طرح مشہور ہو گئی لوگوں نے اس کے متعلق مختلف افواہیں اُڑا رکھی تھیں۔ اور کچھ دنوں تو اس کا چرچا عام ہو گیا۔ چوپال میں اس کے متعلق باتیں کی جاتیں، گھروں میں عورتیں چولہوں کے پاس بیٹھ کر اُس کا ذکر کرتیں۔ بچے درختوں کے نیچے کھیلتے ہوئے۔ تالابوں میں نہانے کے بعد کناروں پر بیٹھ کر۔ کنوئیں کی منڈھ پر چڑھ کر اس کا ذکر کرتے۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ دیوانی بھی اُن کی روزمرّہ زندگی میں شامل ہو گئی۔ بچے اسے چڑاتے۔ اسکو پتھر مارتے۔ وہ فضا میں ہاتھ پھیلا کر کہتی "میں تیری بیٹی ہوں ماں!" اور چڑانے والے بچوں میں سے کوئی چھوٹی سی لڑکی بول اُٹھتی "میں تیری ماں ہوں بیٹی!" وہ اس لڑکی کی طرف غور سے دیکھتی اور پھر چیخ اُٹھتی "میں تیری بہن ہوں میرے پیارے بھائی!" اور کوئی شریر لڑکا چڑاتا "میں تیرا بھائی ہوں میری ننھی بہن!" وہ لڑکے کی طرف غمگین نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

صبح ہی صبح گاؤں کے لڑکے اپنے اپنے مویشی لئے ندی کی طرف جاتے۔ تو یہ ان کے پیچھے بھاگتی۔ وہ اسے پتھر مار مار کر بھگا دیتے۔ ایک دن ایک شریر نے کہا "بھائی کے پاس جائے گی؟" اور دیوانی اُس کے ساتھ ساتھ "میں تیری بہن ہوں بھائی!" کہتے ہوئے جلدی وہ ندی کے کنارے پہنچے وہی جگہ جہاں وہ شوہر نہیں نہیں عاشق نہیں بھائی سے ملی تھی۔ اُس جگہ کو اُس نے غور سے دیکھا اور پھر ندی کی طرف مُنہ کرکے کھڑی ہو گئی۔ لڑکا اس کی حرکتوں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اُس نے بازو پھیلا دئے "میرے بھائی میں آ گئی ہوں میں تیری بہن ہوں!"

بھولا ہوا افسانہ

یاد آرہا ہے دل کو بھولا ہوا افسانہ ‖ آنکھوں میں پھر رہا ہے گزرا ہوا زمانہ
سانسیں سُنا رہی ہیں پیہم سرودِ ماضی ‖ کانوں میں آرہا ہے گونجا ہوا ترانہ
جلوے دکھا رہی ہے بیتی ہوئی جوانی ‖ نظروں کے سامنے ہے کھویا ہوا خزانہ

وہ صبح کا دُھندھلکا، تالاب کا کنارہ ‖ سبزہ کی نرم مسند، پھولوں کا شامیانہ
وہ میرا سر کسی کے زانوئے نازنیں پر ‖ وہ شوقِ حُسن افزا، وہ حُسنِ دل بَرانہ
وہ جذبۂ تغزّل، وہ عشوۂ تجاہل ‖ وہ جوشِ والہانہ، وہ ناز کافرانہ

سونلائی سی اُفق پر وہ شام کا ستارہ ‖ زلفِ نگارِ شب میں وہ زر نگار شانہ
وہ حُسن و عشق باہم باہوں میں باہیں ڈالے ‖ محوِ طرب، غریقِ دریائے بے کرانہ
وہ حُسن... جس کا اک اک شیوہ طلسم آرا ‖ وہ عشق... جس کا ایک ایک انداز جادوانہ

بادِ شمال کا وہ گل زار میں سنکنا ‖ شاخوں کا وہ لچکنا، کلیوں کا وہ چٹکنا
وہ اِبتسامِ رنگیں، رقص و سرودِ دلکش ‖ بُلبُل کا وہ لہکنا، تتلی کا وہ تھرکنا
نغماتِ جاں فزا کے دھارے سے بہہ رہے تھے ‖ وہ جوشِ سازِ فطرت، پتّوں کا وہ کھنکنا
مستی اُبل رہی تھی، مستی برس رہی تھی ‖ پھولوں کا وہ مہکنا، تاروں کا وہ چمکنا
وہ لطفِ باریابی، وہ کیفِ دل نوازی ‖ وہ اضطرابِ ارماں... وہ آگ کا بھڑکنا
وہ حُسنِ آفریں لب، وہ برق زا تبسّم ‖ وہ جوشِ غنچۂ گل.... وہ پیرہن مسکنا
وہ شوخ شنگ چتون، وہ شرمگیں لگاوٹ ‖ وہ عشوہ، وہ کرشمہ، وہ ناز، وہ جھجکنا
دونوں کی ایک حسرت، دونوں کی ایک حالت ‖ وہ میرا کہہ نہ پانا، وہ ان کا کہہ نہ سکنا

بہلا رہے تھے مجھکو، خود کھوئے جا رہے تھے
ہے حشر..... دو دلوں کا اک وزن میں دھڑکنا

حسرت شاہجہاں پوری

نتیجہ

کوشل جس وقت کوٹھی سے نکلا تو اسکا کوئی خاص ارادہ نہ تھا کہ وہ کہاں جائیگا۔ بات یہ تھی کہ صبح ۱۱ بجے سے کمرہ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے اور اُن اندیشوں پر جو کہ پچھلی رات سے اس کے دلمیں جاگزیں ہوتے تھے غور کرنے اور اُلٹ پھیر کر انکو عقلی دلائل سے رد کرنے کی کوشش کرتے کرتے اس کا دماغ اب بالکل بیکار ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں اُمید پر کہ شاید تبدیل ماحول تبدیل تخیلات کا سبب بن سکے وہ کوٹھی کی حدود سے باہر نکل کر ایک طرف کو چل دیا۔ پھاٹک سے باہر قدم نکالنے کے بعد وہ گھر کو بھول چکا تھا مگر پھر بھی وہ اُن خیالات کو اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا جو اس وقت اس کے لئے سوہان روح ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا کیا یہ سب اچھے غلط نہیں ہو سکتے؟" اور پھر خود ہی جواب دیتا "کیوں نہیں۔ بظاہر کوئی صورت مانع نظر نہیں آتی۔" مگر باوجود اس کے کہ وہ ان جملوں کو صبح سے اس وقت تک یکے بعد دیگرے سینکڑوں مرتبہ دُہرا چکا تھا پھر بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا کہ اُن میں وہ کسکو صحیح تصور کرے اور کسکو غلط۔ انہی خیالات میں مستغرق وہ شاید ایک مرتبہ سڑک پر چلتے چلتے رُک بھی گیا اور اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل پڑے "کیوں نہیں" اور پھر وہ خود ہی اپنی آواز پر چونک پڑا۔ گھبرا کر اُسنے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ دھوپ سے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر تا حد نظر کوئی نہ تھا۔ دُور نیلگوں آسمان پر ایک چیل آہستہ آہستہ منڈلاتی چلی جا رہی تھی۔ وہ خود ہی اپنی حالت پر مسکراتا ہوا آگے چل دیا۔ اُمید و بیم کے اس ختم نہ ہونے والے بھنور میں پھنسا ہوا وہ غیر ارادی طور پر اپنے باغ میں داخل ہوا جو اس کی کوٹھی سے تھوڑی دُور پر تھا پھاٹک سے ہوتا ہوا وہ اندر داخل ہوا اور سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اُس کے بڈھے مالی نے جو قریب کی کیاری میں چند سے پودے لگا رہا تھا اُٹھکر مٹی بھرے بدنما ہاتھ سے پیشانی چھوتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں کہا "بندگی حجور"۔

وہ ایک مرتبہ پھر چونک پڑا اُس نے اپنے گرد و نواح پر نظر ڈالی اور خود کو اپنے باغ کے ابتدائی حصہ میں پایا۔ دوسرے لمحہ اسکی نظر مالی پر پڑی جو ابھی تک ایک ہاتھ میں کھرپی پکڑے کمان کی طرح جھکا ہوا دوسرے سے اپنی عرق آلودہ پیشانی چھو رہا تھا۔ کوشل نے کلا صاف کرتے ہوئے جواب دیا "بندگی"۔

اور آگے بڑھ گیا۔ مالی دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا چند قدم آگے بڑھ جانے پر کوشل نے پیچھے مڑکر آواز دی "مرلی!"

بڈھے مالی نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا "حجور" اور اس کے پاس دوڑ آیا۔

کوشل نے بدستور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "گھر جا کر کہو کہ آدرش جس وقت آئے اُسے یہاں بھیجدیں۔ میں یہاں اُسکا انتظار کروں گا۔ سمجھے!"

مالی نے ایک مرتبہ پھر جھکتے ہوئے جواب دیا "جی حجور!"

"بس!"

مالی لوٹ کر چلدیا اور کوشل ٹہلتا ہوا مولسری کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا جہاں وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ شام کو گھنٹوں بیٹھا کرتا تھا۔

۲

کوشل کشور بابو اقبال بہادر کا اکلوتا لڑکا تھا جو نامور جج ہونے کے علاوہ ایک بڑے رئیس بھی تھے، سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اُنھوں نے کافی اثاثہ چھوڑا تھا انکی موت پچھلی سردیوں میں ایک عرصہ تک دق میں مبتلا رہکر ہوئی تھی۔ زندگی میں اُنکی ایک آرزو تو پوری ہو گئی تھی اور وہ تھی کوشل کی شادی، مگر قضا و قدر کے آہنی پنجوں نے اُنہیں اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس جوڑے کو پھلتے پھولتے دیکھتے۔ کوشل نے اس سال انٹرمیڈیٹ فائنل کا امتحان دیا تھا۔ ویسے نہ تو وہ کچھ کُند ذہن ہی تھا اور نہ ہی اُس کے پرچے کچھ خراب ہوئے تھے۔ اپنی طالبعلمی زندگی میں اُس نے کبھی ناکامی کا مُنہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ باپ کی طویل علالت کے باعث اُس کی پڑھائی ٹھیک نہیں ہو سکی۔ پھر ہسٹری کا ایک پرچہ اُس کی اپنی نظروں میں غیر تسلی بخش ہوا تھا اور لاجک کے تو دونوں پرچے بالکل غیر یقینی سے تھے ہی یہی وجہ تھی کہ نتیجہ کی تاریخ جتنی قریب آتی جاتی تھی اُسکی پریشانیوں میں

اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ سوچتا "اگر میں فیل ہو جاؤنگا اور اگر ایسا ہی ہوا تو لوگ کہیں گے کہ شادی ہو جانے سے اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگا۔ یہ کوئی نہیں کہے گا کہ بابا کی بیماری کی وجہ سے اسے تیاری کرنے کی فرصت ہی نہ مل سکی۔ میں آج تک کبھی فیل نہیں ہوا۔ اب کیا شیلا کے سامنے خجل ہونا پڑے گا؟"

اور اس کے ساتھ ہی شیلا کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے اس سے رخصت کے وقت کہے تھے...... "میں اب جا رہی ہوں۔ اب آپ مجھے کچھ دنوں کے لئے بھلا کر پڑھائی کی طرف توجہ دیں۔ بابا جی کی بیماری سے آپکی پڑھائی میں کافی ہرج ہو چکا ہے۔"

اور اسے اپنا کیا ہوا وعدہ یاد آتا "تم اطمینان رکھو شیلا میں ضرور پاس ہونگا۔" پھر اس نے مسکراتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا تھا۔ "میرا رول نمبر تم سیکنڈ ڈویژن میں تلاش کر لینا۔"

اور اب اسے ایسا محسوس ہوا گویا اسکی بیوی اخبار لئے افسردہ دل اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے "اسمیں تو کہیں آپکا رول نمبر نظر نہیں آتا۔"

دردوکرب کی ایک ملی ہوئی آہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

وہ چونک پڑا۔ وہاں بنچ پر وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ صرف فاصلہ پر آم کے درختوں سے ایک کوئل بول رہی تھی "کو۔ او۔ کو۔ او۔"

۳

تقریباً چھ بجے تھے اور جون کی جلتی دھوپ کی تمازت میں کچھ کمی ہو رہی تھی کہ آدرش ایک ہاتھ میں سائیکل پکڑے آہستہ چلتا ہوا کوشل کے پاس آیا۔ کوشل کو غیر معمولی کھوئی حالت میں دیکھکر آدرش کو تعجب ہوا۔ خیال کیا کہ شاید کچھ طبیعت خراب ہو گی اس نے آہستہ سے کوشل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ لیکن وہ ویسا کا ویسا ہی بیٹھا رہا۔ خوف و استعجاب کے ملے ہوئے جوش سے اس نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے آواز دی "کوشل، کوشل۔"

کوشل نے پہلی ہی آواز پر اچھلتے ہوئے سراسیمگی کے لہجہ میں کہا "ہاں۔ ہاں کیا ہے؟"

پھر آدرش کو اپنے سامنے دیکھکر بولا۔ "اوہو! تم ہو۔ آؤ بیٹھو۔ تمہارا تو آج صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ سرجو کو تمہارے گھر بھیجا مگر تم ملے ہی نہیں۔"

آدرش کوشل کی حالت غیر دیکھکر تشفی آمیز لہجہ میں بولا۔

"کوشل ایسی بھی کیا بات تھی جو تم نے کئی مرتبہ نوکر بھیجا۔ میں ذرا سورج نرائن کے یہاں چلا گیا تھا...... مگر آج تو تم ہمیشہ سے بالکل مختلف نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے۔ شاید نتیجہ کی فکر ہو گی۔ آخر اتنی بھی بے چینی کیا؟ اب صرف آج رات کی بات اور ہے پھر کل ہم دونوں اپنی اپنی کامیابی پر خوشیاں مناتے ہونگے اور اس وقت کل تم ہماری دعوت کے انتظام میں منہمک نظر آ رہے ہو گے۔"

ایسا کہتے ہوئے آدرش نے مسکراتے ہوئے کوشل کی طرف دیکھا۔ اس نے یہ باتیں محض اس کی تسلی کے لئے کہی تھیں مگر کوشل کو یہ تیر کی مانند کلیجہ میں چبھتی معلوم ہوئیں۔ اس نے اپنے پپڑائے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "اگر میں فیل ہی ہو گیا تب!" اور ایسا کہہ کر وہ مایوسی کی نظروں سے آدرش کو تاکنے لگا۔

آدرش نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "تم ایسا کیوں کہتے ہو۔ تمہارے پرچے کافی اچھے ہوتے ہیں اور تمہارا شمار بھی اچھے لڑکوں میں ہوتا ہے۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ تم فیل ہو جاؤ۔ چلو۔ کچھ دور سیر کر آئیں۔ کیا پر فضا وقت ہے۔ ضرور اس سے تمہاری بے چینی رفع ہو جائے گی۔"

دونوں اٹھکر چل دیئے۔ کچھ دیر خاموشی سے چلنے کے بعد کوشل نے جو صبح سے آدرش کو اپنا حال سنانے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا کہا۔ "آدرش ویسے تو ہر شخص ہی کو اپنے نتیجہ کی فکر رہتی ہے اور ایسی ہی مجھے بھی تھی مگر کل رات سے اس نے پریشانی کی صورت اختیار کر لی ہے۔"

"یہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ آخر اسکی وجہ؟" آدرش نے اسے نفس مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہا۔

کوشل پھیکی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ میرا قصہ سنکر میرا مذاق نہیں اڑاؤ گے تو کہوں۔"

آدرش بولا "بھلا میں کیوں ہنسی اڑانے لگا۔"

کوشل نے قدرے پس و پیش کے بعد کہنا شروع کیا۔ "نتیجہ کی تاریخ قریب تر ہونے کے ساتھ ہی حسب دستور میرے اندر بھی بے چینی نے ترقی کی، چنانچہ کل رات میں جب پلنگ پر لیٹا تو یہی خیالات میرے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میں پلیٹ فارم پر ہوں گاڑی آئی اور اسمیں سے نتیجہ کے اخبار اتارے گئے۔ اخبار کے ایجنٹ سے میں نے بھی ایک کاپی لے لی۔ اب جو اس کو

دیکھتا ہوں تو میرا رول نمبر ہی ندارد۔ یاس و حسرت کی ایک چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا بیٹا؟" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کچھ نہیں، ماں ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ ماں کی تسلی ہو گئی اور وہ دوبارہ سو گئیں۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگی ہوئی کلاک پر پڑی۔ اسوقت ۱۱ بجنے میں ۳ منٹ باقی تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ رک گیا اور کچھ دیر بعد اپنی پھولی ہوئی سانس کو ٹھیک کرکے پھر کہنے لگا۔ "کچھ دیر بعد مجھے بھی نیند آگئی۔ دیکھتا ہوں کہ پاپا جی کوچ پر بیٹھے ہیں۔ میں سامنے سر جھکائے کھڑا ہوں۔ باوجود اس کے کہ خود ان کے چہرہ سے افسوس کے آثار نمایاں ہیں مگر پھر بھی وہ حوصلہ افزا لہجہ میں کہہ رہے ہیں "غم نہ کرو۔ کوشل ناکامی ہی اصل میں کامیابی کا راز ہے۔ ایک مرتبہ پھر کوشش کرو۔" پھر پاپا کی شکل سینما کی تصویر کی طرح دھندلی پڑ کر معدوم ہوتی معلوم ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پلنگ پر بیٹھا ہوں۔ شیلا مجسم غم بنی سامنے کھڑی ہے۔ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر مہر خموشی توڑتے ہوئے کہا "میں فیل ہو گیا شیلا!" شیلا نے ساری کا پلو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے وفور غم سے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے ناتھ!" اور ایسا کہتے ہوئے اسکی آنکھوں سے دو بڑے چمکدار آنسو ٹپک پڑے، ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے لوہے کی دو گرم سلاخیں میرے دل میں چبھو دیں۔ میں نے انتہائی درد کی کیفیت محسوس کی۔ میں اچھل پڑا آنکھ کھل گئی۔ میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم پسینہ سے شل تھا۔ منہ کھلا تھا۔ گلا خشک ہونے سے شاید چیخ نہ نکل سکی یکایک میرے دل میں خیال آیا۔ کیا یہ متوحش خواب میری ناکامی کا پیش خیمہ تو نہیں ہیں۔ میں اسی وقت سے ادھیڑبن میں پڑا ہوں ایشور جانے کتنی دیر اسی حالت میں بیٹھا رہا کہ گھڑی کی ٹن ٹن کانوں میں آئی۔ دو بج رہے تھے۔ رات کافی باقی تھی۔ بس پھر ایک مرتبہ بادل ناخواستہ چارپائی پر دراز ہو گیا اور اس مرتبہ میری آنکھ جب کھلی جب خود ماں مجھے جگانے آئیں۔ تقریباً ۷ بجے ہونگے دھوپ کافی پھیل چکی تھی۔"

اتنا کہہ کر اس نے آدرش کی طرف دیکھا۔ حقارت آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر صاف نمایاں تھا۔ کوشل کچھ شرمندہ ہو کر بولا۔ "یہی وجہ ہے کہ تم اسوقت مجھے اس حال میں دیکھ رہے ہو!"

چونکہ کافی اندھیرا پھیل چکا تھا اور آدرش نے ایسے موقع پر کچھ زیادہ کہنا سننا مناسب بھی نہ سمجھا اس لئے اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے آج معلوم ہوا کہ تم اتنے کمزور دل واقع ہوئے ہو۔ جاؤ اب اطمینان سے کھانا کھاؤ اور سو رہو۔ تمہارے پاس ہونے کا میرا ذمہ!"

کوشل نے پچھلی رات کا واقعہ سنا کر اپنے کو بہت سے کچھ بہتر پایا۔ آدرش کے جملے نے اس کے دل میں کچھ سکون پیدا کر دیا۔ دونوں دوست اپنے اپنے گھر چل دیئے۔

— ۴ —

کوشل نے وہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ اسے کسی کروٹ بھی چین نہ آیا۔ اس کے لئے وہ رات مجرم کی اس رات سے کسی طرح بھی کم نہ تھی جس کی صبح کو اسے اپنی زندگی اور موت کے فیصلہ سے دوچار ہونا ہو۔ پانچ ہی بجے تھے کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ پہلا فقرہ جو اس کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا "سرجو تم نے تانگہ والے سے کہہ دیا کہ وہ ساڑھے آٹھ بجے یہاں تانگہ لے آئے!"

نوکر نے مودبانہ جواب دیا۔ "جی سرکار!"

میل کا وقت ۹ بجکر کچھ منٹ پر تھا اور اس وقت صرف ۷ بجے تھے کہ اس نے کچھ ناشتہ زہر مار کیا اور نوکر سے تانگہ منگا کر آدرش کے گھر چل دیا۔

آدرش اپنی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ اسکی انگلیوں میں دبی ہوئی ادھ جلی سگرٹ جس کی راکھ بدستور اسی پر لگی تھی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ اس وقت کسی گہرے خیال میں محو ہے۔ کوشل نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کئی آوازیں دے ڈالیں۔ وہ کہہ رہا تھا "آدرش چلو۔ کیسی بیفکری سے بیٹھے ہو۔ آج نتیجہ کا دن ہے۔ چلو اسٹیشن چلیں!" آدرش کا طلسم خیال ٹوٹ گیا۔ اسنے مسکراتے ہوئے سگرٹ کی راکھ جھاڑی اور اطمینان سے ایک لمبا کش لگا کر ناک سے دھواں نکالتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ کوشل ابھی بہت وقت ہے!"

کوشل نے پاانداز پر ہی کھڑے کھڑے جواب دیا "مگر میں تو تانگہ لے آیا ہوں۔ یہیں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اٹھو۔ بیکار دیر کرنے سے کیا فائدہ۔ اتنی دیر اسٹیشن پر ہی بیٹھیں گے!"

آدرش مجبوراً ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں دوست تانگہ میں سوار ہو کر اسٹیشن چل دیئے۔ راستہ بھر دونوں میں آنے والے واقعات کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اسٹیشن پر پہونچکر

تانگے والے کو واپسی پر چلنے کے لئے کہہ کر وہ لوگ پلیٹ فارم پر پہونچے۔ آدرش کو پیچھے چھوڑ کر کوشل تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بکنگ اسٹال پر پہونچا اور ایجنٹ سے پوچھا "کیوں بھئی نتیجہ کا پرچہ تو نہیں آیا؟"

ایجنٹ نے ایک لطیف تبسم کے ساتھ جواب دیا "ابھی نہیں بابوجی۔ اسی گاڑی سے آرہا ہے۔"

کوشل اُس کی پوری بات سنے بغیر ہی مُڑ کر چلدیا اور ویٹنگ روم میں جہاں آدرش بیٹھا تھا چلا آیا۔ گاڑی آنے میں کافی وقت تھا۔ اور اس طویل عرصہ کو جس کا ایک ایک منٹ انتظار اس وقت ایک ایک برس معلوم ہو رہا تھا گذارنے کیلئے گفتگو کا موضوع اس سے بھی طویل۔ ان کا سارا وقت اپنی کی ہوئی محنت کے تبصرہ میں گذر گیا جس کا نتیجہ کچھ ہی دیر میں معلوم ہونے والا تھا۔ وہ ہنوز وہ ان ہی باتوں میں مشغول تھے کہ لائن کلیر کی گھنٹی بجی اور دونوں دوست اپنی اپنی قسمت کے فیصلہ کا خیر مقدم کرنے باہر نکل آئے۔

چند ہی منٹ میں سیاہ فام قوی ہیکل انجن مسرت سے دھواں اڑاتا اپنے پیچھے ڈبوں کی ایک قطار لئے پلیٹ فارم پر آکر رکا۔ لوگوں کی پریشانیاں حد پر پہونچ چکی تھیں۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم نظر آرہا تھا۔ ایجنٹوں نے دوڑکر اخبار کے بنڈل اٹھا لئے۔ آدرش اور کوشل نے بھی جُدا جُدا اخبار خریدے۔ کوشل دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑا اخبار کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکا سانس چڑھا ہوا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بادقت کئی صفحہ پلٹنے پر اسکو انٹرمیجیٹ کا نتیجہ ملا۔ چند منٹ کی مُسلسل کوشش کے بعد وہ اپنا کالج ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اُسنے پہلے سیکنڈ ڈویژن کے کالم کو دیکھا پھر تھرڈ ڈویژن کے رول نمبروں پر نظر ڈالی۔ جس طرح ڈوبتا ہوا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے ٹھیک اسی طرح اُس نے فرسٹ کلاس کے رول نمبروں پر نظر ڈالی۔ مگر وہاں تو صرف وہی لڑکے تھے جن کی اُمید پہلے ہی سے کی جاتی تھی۔ اُس نے دوبارہ پھر سیکنڈ ڈویژن کو بغور دیکھا اور تب ایک اچٹتی ہوئی نامیدی کی نظر سے تھرڈ ڈویژن کو۔ وہاں وہی لڑکے تھے جنہیں وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اُسکو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور اس مرتبہ اُس نے اپنی ساری دماغی و جسمانی طاقت کو آنکھوں پر صرف کرتے ہوئے انگلی رکھکر اپنے کالج کے ایک ایک نام کو آہستہ آہستہ بچوں کی طرح ہجے کرکے شروع سے آخر تک پڑھ گیا مگر وہاں اسکا رول نمبر ہوتو ملے۔ ایک سرد لہر اسکے پاؤں پر سے گذرتی معلوم ہوئی۔ اُسکا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اخبار اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر پیروں پر گر گیا۔ اور وہ خود بھی گرا ہی چاہتا تھا کہ آدرش نے جو اُس کے قریب کھڑا خاموشی سے اُسکے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا پکڑ لیا۔ کوشل نے اس کے کندھے کا سہارا لیکر اپنی پشت دیوار سے لگا لی۔ اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور کانوں میں صد ہا شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ ایسی حالت میں اُس نے محسوس کیا گویا آدرش کہیں دور اُفتادہ جگہ سے کہہ رہا ہے "کوشل ہمیں دلی افسوس ہوا جسکا اظہار ناممکن ..... تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے ...... آدمی بنو .... آدمی ہی یہ ساری مشکلات برداشت کرتے ہیں۔ گو اخبار کو دیکھ چکا ہوں مگر دل اب بھی یقین نہیں کرتا۔ کیا تعجب ہو کہ پریس ہی سے غلطی ہوگئی ہو۔ ایشور پر بھروسہ رکھو ....."

کوشل نے نیم بیخبری کی حالت میں جیسے کوئی خواب دیکھکر بڑبڑا اٹھتا ہے کہا۔ اس کی آواز اس شخص کی آواز کے مانند تھی جو پانی کی سطح کے نیچے سے یا کہیں فاصلہ پر بند مکان کے اندر سے بول رہا ہو "آدرش میں بچہ نہیں ہوں .... مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو ..... میرے بدترین اندیشے ....." عجیب انجن کی تیز سیٹی نے کوشل کے رہے سہے حواس بھی گم کر دئے اور وہ اس تیز خراش آواز کے ساتھ ہی ایکدم اُچھل کر بیجان جسم کی مانند آدرش کے ہاتھوں پر آ رہا۔

(۵)

رات کے تقریباً ۱۲ بج رہے تھے مگر کوشل کے مطالعہ کے کمرہ میں بدستور روشنی ہو رہی تھی۔ نہ معلوم کتنی دیر سے وہ میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر ایک طرف کتابیں سلیقہ سے چُنی رکھی تھیں اور دوسری طرف کچھ کاپیاں۔ سامنے دیوار پر کلاک لگا ٹک ٹک کر رہا تھا۔ اس کے نیچے اس کے والد کا لائف سائز بسٹ آویزاں تھا جو کسی مایہ ناز مصور کا بہترین شاہکار سمجھا جا سکتا تھا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں اسکا چہرہ لاش کی طرح زرد نظر آرہا تھا اور اسپر سختی کے آثار نمایاں ہوچکے تھے۔ آنکھیں اس طرح پتھرائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں جس طرح پھانسی کے تختہ کے قریب پہونچنے پر مجرم کی آنکھیں خود بخود پتھرا جاتی ہیں۔ یکایک اُس نے جوش سے بڑبڑاتے ہوئے کہا "اتنی دولت سے وہ بآسانی اپنی زندگی گذار سکتی ہے۔ ماں تو کچھ ہی دنوں کی مہمان ہیں۔

اِس ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرنے سے مرجانا بہتر ہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ اُس کے گلے سے باہر نہ نکل سکے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اُس نے اٹھ کر اپنی کرسی کو پیچھے کھسکایا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے میز کی دراز میں چابی گھمائی۔ دراز کھولکر لکڑی کا ایک چھوٹا بکس نکالا پھر اسمیں ایک اور چھوٹی چابی لگاکر اُس میں سے ایک شیشی جو روئی میں بہ بحفاظت رکھی تھی نکال لی۔ اُسکو میز پر رکھکر وہ کچھ سوچنے لگا۔ شیشی کے زرد سیال سے خارج ہوکر شعاعوں کا ایک گرداب اُس کے سامنے میز پر ناچ رہا تھا۔ کچھ عرصہ ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اُس نے جرات کرکے طاق پر سے گلاس اُٹھا لیا۔ اُس نے جھک کر باہر نظر ڈالی، سامنے صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماں بےخبری سے پڑی سو رہی تھی۔ اُس نے چاہا کہ باہر جاکر وہ آخری مرتبہ اپنی ماں کا منہ دیکھ آئے مگر عارضی ناتوانی و وفورِ جوش سے وہ ناکام رہا۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھر ایک مرتبہ سوتی ماں پر نظر ڈالی اور شیشی کھولکر گلاس میں اُنڈیل لی پھر لرزتے ہوئے ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ گلاس اُٹھا لیا۔

اُس کے چہرے پر اُس وقت موت کی سی زردی چھائی تھی۔ اس کا چہرہ قبل از وقت ہی خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک مرتبہ غیر معمولی دہشتناک چمک پیدا ہوئی اور پھر وہ پیشتر سے بھی زیادہ پتھرائی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اُس نے اپنے باپ کی تصویر پر نظریں جماتے ہوئے کانپتی ہوئی مدھم آواز میں کہا: "میں بھی ..... آتا ...... ہوں ... پاپا ... تمہا .... رے .... پا .... س"

الفاظ اُس کے گلے میں آکر رُک گئے۔ ہاتھ اُٹھا کا اُٹھا ہی رہ گیا۔ نظریں تصویر پر گڑی جا رہی تھیں۔ باوجود سعیِ بسیار کے وہ اپنی نگاہ کو اُس پر سے نہ ہٹا سکا۔ وہ بھول گیا وہ کیا کر رہا تھا۔ اس وقت کوشل اپنے باپ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہونٹ حقارت سے خمیدہ ہو گئے اور لب اس نے انکو ہلتے محسوس کیا۔ اس عالمِ وارفتگی میں اُس نے اپنے باپ کے مخصوص لہجہ کو پہچانا اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کہیں بہت دُور سے کہہ رہے ہیں: "کوشل نادان نہ بنو عقل سے کام لو۔ آج تم میری وصیت کے بالکل خلاف کر رہے ہو۔ کیا میں نے آخری وقت تمہیں تمہاری ماں اور بہو کا ہاتھ دے کر نہیں سونپ تھا؟ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد انکی آرام و تکلیف کے تم ہی ذمہ دار ہو گے؟ اگر انکو آرام دو گے تو میری روح کو شانتی ہوگی۔ کیا تمہاری ماں تمہاری خودکشی پر خوش رہ سکتی ہے؟ بہو کو کس کے سپرد کر رہے ہو؟ دُنیا میں کامیابی اور ناکامی کا ساتھ ہے۔ کیا تم دُنیا میں رہ کر ناکام کہلانے کے عیوض خودکشی کرکے جو پست حوصلگی کا ثبوت ہے اپنے کو بزدل کہلانے میں فخر سمجھو گے؟"

کوشل کی اُسوقت کی حالت کا بیان کرنا نہایت ہی دشوار بلکہ تقریباً غیر ممکن ہے۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اُسکو اپنے باپ کی آواز اس طرح سُنائی دے رہی تھی جس طرح دور پر جھرنے کی آواز یا معانی الفاظ کا جامہ پہن لے یا جس طرح کوئی خواب میں کسی کی گفتگو سُنے یا یوں سمجھنا چاہیئے جیسے کوئی خدا رسیدہ بزرگ الہام سُنے۔

اپنے وجود سے بےخبر وہ ہمہ تن گوش ان لفظوں کو سُننے میں محو تھا کہ آخری جملہ نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ واقعی وہ غلطی کر رہا ہے اس کے ساتھ ہی اس کو اپنی رگوں میں تیز دوڑتا ہوا خون منجمد ہوتا معلوم ہوا۔ سارا جسم بے سکت ہو گیا۔ ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور گلاس میز سے ٹکراتا ہوا ایک آواز کے ساتھ زمین پر گر کر چُور چُور ہو گیا۔ زرد رقیق فرش پر گر کر پھیل گیا۔ گلاس ٹوٹنے کی آواز سے ماں اور بیٹے دونوں چونک پڑے۔ کوشل نے یاس انگیز نظروں سے زرد رنگ سیال کو دیکھا جو اُس کے پیروں کے قریب فرش پر آہستہ آہستہ جذب ہو رہا تھا۔

ماں فوراً آنکھیں ملتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا ڈیڑھ بج رہا ہے بتی جل رہی اور کوشل ابھی تک کمرے میں بیٹھا ہے۔ اُس کا چہرہ لاش کی طرح زرد ہے۔ میز پر ایک صندوقچی کھلی ہے اور اُس کے قریب ایک خالی شیشی پڑی ہے، قریب ہی فرش پر کانچ کا گلاس ٹوٹا پڑا ہے جس سے کچھ نکلکر پھیل گیا ہے۔ اسکا ماتھا ٹھنکا۔ وقت کی نزاکت محسوس کرکے اس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا "بیٹا اس وقت تک کیا کر رہے ہو؟ دو بجنے کو آئے اور تم ابھی تک نہیں لیٹے۔"

جتنا وقت اُسکی ماں کو کمرہ اور کوشل کی حالت کا جائزہ لینے

میں لگا اتنا وقت اس کو اس سوال کا جواب سوچنے کو مل گیا جو اس سے یقینی پوچھا جانے والا تھا مگر پھر بھی وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکا کہ وہ اگلے سال کے لئے کما ہیں وغیرہ درست کر رہا تھا۔ کوشل کی ماں اصل واقعہ سے لاعلمی کی بنا پر مرتی ہوئی بولی "ابھی سے ایسی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو کافی دن بعد رہے گا۔ اٹھو چلو اب سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی"

کوشل اب اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُسے جس کا ڈر تھا وہ اُس کی نظروں کے سامنے ڈرامہ بن کر جیتا تھا۔ اور پھر اب کچھ اسکا اپنا خیال بھی بدل چکا تھا۔ ناچار اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ رہا۔ اعصاب کشیدہ اور دماغ بیحد تھکے ہوئے کے باعث وہ فوراً ہی سو گیا مگر اس کی ماں کو نیند نہ آئی کیونکہ وہ قریب قریب اسکے بدترین اندیشوں سے واقف ہو چکی تھی۔

(۷)

صبح ۱۰ بجے کا وقت تھا مگر کوشل کی میز پر بدستور ناشتہ چنا ہوا تھا۔ ماں کو جب معلوم ہوا کہ کوشل نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں لی تو وہ بیٹھک میں آ گئی اور کوشل کے قریب ایک کوچ پر بیٹھ کر دنیا کا نشیب و فراز سمجھانے لگی "ایشور کا دیا تمہارے پاس سب کچھ ہے تمہیں کیا پروا فیل ہو یا پاس۔ ہر شخص کو کبھی نہ کبھی ناکامی ضرور ہوتی ہے۔ تم کوئی انوکھے فیل ہوئے ہو؟ میں نے اپنی اتنی عمر میں ذرا سی بات پر اتنا ملال کرتے نہیں دیکھا۔ کوئی تمہاری طرح خیال کرے تو بس۔ دنیا تو یوں ہی ختم ہو جائے۔ یہ تو ایک ....."

اتنے میں نوکر نے تازہ اخبار کی کاپی اور صبح کی ڈاک لا کر میز پر رکھدی۔ کوشل نے ڈاک کی طرف دیکھا۔ اور سبز رنگ کا ایک لفافہ اٹھا لیا۔ یہ شیلا کا خط تھا۔ اُس نے لفافہ چاک کر ڈالا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا:-

پرانٹرناتھ۔

مجھے نہایت تعجب اور افسوس ہے کہ آپنے جو رول نمبر بتایا تھا وہ مجھ کو اخبار میں نہ مل سکا۔ کہیں مجھے ہی آپ کا رول نمبر غلط یاد نہ رہ گیا ہو۔ ایشور نہ کرے کہ آپ فیل ہو گئے ہوں۔ فوراً اپنا رول نمبر لکھیئے اور لکھیئے کہ کیا بات ہے تاکہ فکر ....

وہ اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ آدرش کی چیختی ہوئی آواز اُسے سُنائی دی "کوشل۔ کوشل کہاں ہو؟"

اور دوسرے ہی لمحہ وہ ہانپتا ہوا کھلا اخبار لئے بیٹھک میں داخل ہوا۔ اُس کی ماں کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے بچھڑتی سے کھلے ہوئے صفحے کو ناشتہ کی پلیٹوں کے اوپر پھیلاتے ہوئے فرط جوش سے بولا "یہ رہا کمبخت ۱۵۲۳۔ ۱۵۲۳ سیکنڈ ڈویژن۔ کاش کل ہی اس میں بھی تلاش کر لیتا"

اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ کوشل کی ماں حیرت سے بیٹھی کی بیٹھی ہی رہ گئی۔ کوشل کے مُنہ سے نکلا "۱۵۲۳؟" اور اُسنے جھکتے ہوئے اخبار پر نظر ڈالی جہاں آدرش انگلی رکھے تھا "پندرہ سو تیئیس" اُس نے اپنے حافظہ پر زور ڈالتے ہوئے یاد کیا "میرا رول نمبر ۱۵۲۳ ہی تو تھا"

اور پھر ایک مرتبہ اُس نے یقین کرنے کے لئے دیکھا ۱۵۲۳۔ وہاں ۱۵۲۳ ہی چھپا تھا۔ اُس کی نظر صفحہ قرطاس کے اس حصّہ پر جم گئیں جہاں لکھا تھا ۱۵۲۳۔ اُسکو معلوم ہونے لگا کہ سارے اخبار پر ۱۵۲۳ ہی لکھا ہے۔ حروف اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ سطریں دوڑتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ کانوں کے پاس سیٹی بجنے لگی اور آنکھوں کے سامنے بیشمار پھلجھڑیاں چھوٹتی معلوم ہوئیں۔ چہرے پر سرخی کی جگہ زردی نے لے لی۔ جسم کوچ کی پشت سے لگ گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کرشن چند رسکسینہ

ساون

شہر کی فضا گھنٹوں اور سیٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ خاکی وردی والے پہرے داروں نے بڑے دروازے کھول دئے۔ کارخانوں نے انسانوں کی ٹولیاں اگلنا شروع کردیں۔ مزدور، جن کے پیٹ بھوک کی آگ سے تنور بنے ہوئے تھے، سیاہ چیتھڑوں میں ملبوس باہر نکل رہے تھے۔ گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ تمام جسم پر گرد وغبار کا غازہ چڑھا ہوا تھا۔ بے رونق دھنسی ہوئی آنکھیں اور پچکے ہوئے گال تھے۔ بھوک کی دیوی نے جوانی تک چوس لی تھی۔ وہ سر جھکائے دو کمزور ٹانگوں پر ایک انسانی ڈھانچہ لئے آہستہ آہستہ چلے آتے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ مویشی گردن لٹکائے چراگاہوں سے لوٹ رہے تھے۔

منوہر کا باپ ریلوے میں ملازم تھا۔ ایک دن وہ ریل پر چڑھا ہوا پائپ کے ذریعہ درجوں کے غسلخانوں میں پانی بھر رہا تھا کہ پیر پھسل گیا۔ وہ زمین پر آرہا۔ کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ چند دنوں تک ریلوے کے ہسپتال کے پلنگ پر ایڑیاں رگڑنے کے بعد وہ اس جہان سے رخصت ہوا۔ منوہر ابھی صرف تین برس کا تھا۔ اس کی ماں نے کارخانے میں ملازمت کرلی۔ جب منوہر پانچ برس کا ہوا تو کارخانے کے پارسی ہیڈ کلرک نے اپنا کھانا لانے کے لئے اسے دو روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ چند سال بعد ہیڈ کلرک کی مہربانی سے اسے بھی کارخانے میں نوکری مل گئی

دن بیت گئے۔ تغیرات زمانہ نے منوہر کی ماں کے چہرے پر سینکڑوں شکنیں ڈالدیں۔ اس کا سفر قریب الختم تھا۔ اس نے اپنی آخری آرزو بھی پوری کرلی۔ برادری کی ایک لڑکی سے منوہر کا بیاہ ہوگیا۔

امسال ابر رحمت کا نزول بھی ایک عجیب انداز سے ہوا۔ اگست کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور آسمان نگاہوں کی انتہا تک صاف اور شفاف نظر آتا تھا۔ عاشقانِ ابر باراں کی مشتاق نظریں معشوق دلنواز کی تلاش میں ہر طرف آوارہ اور پریشان گھوم کر ناکام لوٹ آتی تھیں۔ ویسے ہی ہندوستان میں بھوکوں اور مفلسوں کی کیا کمی تھی۔ مرتوں پر سو درے۔ قحط کی بھیانک شکل نمودار ہوئی۔ پہلا حملہ مویشیوں پر ہوا۔ خوراک اور پانی نہ ملنے سے غریبوں کے جانور مرنے لگے۔ لوگوں نے اپنے بال بچے تک فروخت کرڈالے۔ ایک خاندان نے زہر کھا کر اس پاپ کی دنیا سے نجات حاصل کی۔ غریبوں کا جب کوئی آسرا نہ رہا تو لوٹ شروع کردی۔ ہر عبادت خانوں میں بارش کے لئے دعا مانگی جانے لگی۔ یہ بے التفاتی؟ آخر کب تک؟ خدا نے اپنے نیک بندوں کی فریاد سن لی۔ رحمتِ خدا وندی کو جوش آیا۔ بارش ہوئی اور اس قدر ہوئی کہ ساری دنیا سیراب ہوگئی۔ ندی نالوں میں ایسا سیلاب آیا کہ کنارے پر رہنے والے غریبوں کی جھونپڑیاں سطح آب پر بلبلوں کی طرح تیرنے لگیں۔

بڑے باغ کے کنارے۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر غریبوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بانس کی جھونپڑیاں جن پر مٹی تھاپ دی گئی ہے شکستہ قبروں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ مٹی کالی اور چکنی ہے۔ اس پر بارش کی کثرت۔ قدم زمین میں دھنسے جاتے ہیں۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک جانے میں زمین اپنی مادرانہ شفقت سے ننگے پیروں کو ایک کافی لمبا پاپوش خاکی عنایت کردیتی ہے۔

غریب کے مکان میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر افراد کی کثرت۔ اس معاملے میں پروردگار کی اُن پر خاص نظرِ عنایت ہوتی ہے۔ ہر سال ایک انسانی ہستی، مفلسی اور بے روزگاری میں اضافہ کرنے چلی آتی ہے۔ لیکن جب موت کا دیوتا، وبا اور دیگر امراض کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو یہی لوگ پہلے اُسکا استقبال کرتے ہیں۔ سینکڑوں جانیں اُسکی بھینٹ چڑھادی جاتی ہیں۔

حفظانِ صحت کا محکمہ تو صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو اُس سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ جو بڑے سے بڑے ہوادار مکانوں میں حفظانِ صحت

کے اصول پر زندگی گزار رہے ہیں۔ صحن سامنے تنگ وسیع تاریکوں کی سڑک ہے۔ ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہیں نظر آتا۔ یا بیچ بازار نالیاں خوب صاف کی جاتی ہیں مچھر اور تھلکے کے انسداد کے لئے جا بجا دوائیں چھڑکی جاتی ہیں۔ لیکن غریب ان بیماریوں کو اپنے گھروں میں پرورش کرتے ہیں۔ کیچڑ اور دلدل کی گندی فضا میں سانس لینا سیلن لگی ہوئی زمین پر سونا۔ چھت کے رستے ہوئے پانی سے بھیگے ہوئے کپڑے پہنے رہنا۔ بھلا یہ بھی کوئی جینے کے ڈھنگ ہیں۔ حفظانِ صحت والے کیا کریں؟ اور کوئی کیا کرے۔

دس دن سے منوہر کی ماں بیمار پڑی ہے۔ چھت کچھ اس طرح ٹپکتی ہے کہ روکر زمیں ابھی بیمار کے لئے مشکل سے نکلتی ہے۔ ایک کوٹھری ہے وہیں چولہا جلتا ہے کھانا پکتا ہے۔ دھواں بارش کی وجہ سے باہر نہیں نکلتا۔ مکینوں کا دم گھٹا جاتا ہے۔

منوہر دن بھر کارخانے میں کام کرتا ہے اور شام کو ماں کی خاطر حکیم اور ویدوں کے پاس دوڑا پھرتا ہے۔ پہلے تو وہ اس مقام پر آنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ موت کے منہ میں جانا کون چاہئے گا اگر آتے بھی ہیں تو کافی رقم اینٹھ لیتے ہیں۔ منوہر کی حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ رقم جو ریلوے فنڈ سے ملی تھی شادی میں اٹھ گئی۔ مجبوراً مکان بنیئے کے ہاں رہن رکھنا پڑا۔ آخر ماں کا علاج بھی تو ضروری تھا۔ مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا تھا۔ ایک رات جو سوئی تو پھر نہ اٹھ سکی۔ جب بیوی کا زیور بھی بنیئے کی تجوری میں پہنچ گیا تو غریب کی ارتھی اٹھی۔ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ دوسرے ہی روز سے بیوی کو حرارت رہنے لگی۔ گھر کا دوسرا اثاثہ بھی بک گیا۔ مگر بیوی کی بیماری میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔

آج اتوار کا دن ہے کارخانے میں چھٹی ہے۔ منوہر صبح سے دوپہر تک شہر میں مارا مارا پھرتا رہا مگر نہ کسی ڈاکٹر نے اسے دوا دی نہ کسی بنیئے نے اسے قرض دیا۔ جس نے پچھلا حساب نہ چکایا ہو اُس پر کون بھروسہ کرتا۔

گھر میں بیوی کے سرہانے پڑوس کی دو تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ منوہر جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اُس کی نظر بیوی کے چہرے پر پڑی۔ دل پر ایک چوٹ لگی۔ بیوی کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ ایک تو بیمار اور پھر فاقہ۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر کیا کرتا؟ قسمت اُس کا تمسخر اُڑا رہی تھی۔

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سامنے باغ میں لوگ جشن منا رہے تھے۔ بڑے بڑے درختوں پر جھولے پڑے تھے۔ شوخ و شریر کنواریاں، رنگین لباس پہنے جھول رہی تھیں اور اونچے اونچے سُروں میں گاتی جاتی تھیں:

ساون کے دن آئے پریتم۔ ساون کے دن آئے
نئی نئی بوندیں برسیں۔ جیا مورا لہرائے
یاد تمہاری آئے پریتم۔ رہ رہ کر تڑپائے
ساون کے دن آئے

ایک طرف سائبان کے نیچے چولھے جل رہے تھے۔ قسم قسم کے پکوان پکائے جا رہے تھے۔ تمام فضا لطیف آوازوں، مدھم قہقہوں اور مترنم ہنسیوں سے گونج رہی تھی۔

رامی نے آنکھ کھولی ایک مایوس نظر تمام کوٹھری کی گشت کرنے کے بعد منوہر کے چہرے پر جم گئی۔ کچھ دیر تک وہ پھر آنکھ بند کئے شور و غل کو سنتی رہی۔ آخر منوہر سے دریافت کیا:۔

"یہ شور کیسا ہے سوامی؟"

منوہر نے ایک نمناک نظر باغ پر ڈالی۔ "یہ لوگ جشن منا رہے ہیں۔ رامی —— یہ ساون کا مہینہ ہے۔"

"ساون کا مہینہ ہے۔" رامی نے آنکھ بند کئے ہوئے نحیف آواز میں دہرایا

جھونپڑی سے باہر پھوار پڑ رہی تھی۔ اندر چند لوگ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھیں ساون کی جھڑیوں کا سماں پیش کر رہی تھیں۔

ریاض رؤفی!

ممتا کی لاش

(کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ سروپی لال اور اُس کی ماں الاؤ کے کنارے بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں)

بڑھیا ماں:-

کئی دن سے میں تجھ کو دیکھتی ہوں   ترا دل کام میں لگتا نہیں کیوں
ابھی تک جانور بھوکے کھڑے ہیں   کُھڈے کل شام سے سوکھے پڑے ہیں
نہ تجھ کو فکر ہے سودے سلف کی   نہیں گھر میں نمک کی کنکری بھی
پرانا ہوگیا آنگن کا چھپّر   مجھے ہر وقت ہے برسات کا ڈر
ذرا پروا نہیں تجھ کو مری جان!   زمیں سی لگ گئی کھاٹوں کی ادوان
تجھے کھیتوں سے دلچسپی نہیں ہے   یہاں پر تو ہے، تیرا دل کہیں ہے
اگر کھیتوں کی رکھوالی نہ ہوگی   اُجڑ جائے گی ان باتوں سے کھیتی
یہی حالت اگر تیری رہے گی   تو کیا کنبہ کو روٹی مل سکے گی!

تجھے بیٹھے بٹھائے ہوگیا کیا
تجھے کس بات کی چنتا[۱] ہے بیٹا!

بیٹا (سروپی):-

میں اس جیون[۲] سے اب اُکتا گیا ہوں   نہایت گاؤں سے تنگ آگیا ہوں
نہ دن اچھے یہاں کے اور نہ راتیں   کروں میں کب تلک بیلوں سے باتیں
وہی ہل ہے وہی کھیتوں کی نالی   وہی میں ہوں وہی کھُرپا، کُدالی
وہی بارہ مہینے ایک سا کام   مرا اس طرح کے جینے کو پرنام[۳]
میں کب تک خون سے کھیتوں کو سینچوں   میں کب تک خاک کو بھگوان سمجھوں
کسانوں کی بڑی قسمت ہے کھوٹی   نہ کپڑا ہی میسر ہے نہ روٹی
یہاں محنت سے کچھ حاصل نہیں ہے   یہ گاؤں مورکھوں کی سرزمیں ہے
مجھے اب شہر جانا ہی پڑے گا   مقدر آزمانا ہی پڑے گا
وہاں بیوپار بھی ہے نوکری بھی   خوشی بھی، آبرو بھی، زندگی بھی
وہاں سو طرح کے دھندے ہیں ماتا!   وہاں ہر آدمی ہے ان داتا
بھکاری بھی وہاں ہے لاٹ گورنر   وہاں دن رات ہوتی ہے چھینا جھپٹ
وہاں پر کوئی دُکھیاری نہیں ہے   وہاں چنتا کی بیماری نہیں ہے
سُنی ہے میں نے شہروں کی کہانی   وہاں سے آنے والوں کی زبانی
وہاں پر برف بھی ہو جاتی ہے   وہاں ایک ایک بنیا لکھ پتی ہے
وہاں کھاتے ہیں سب ایشور کی سوگند   جلیبی، پوریاں، برفی، قلاقند

ماں:-

میں سمجھی! شہر جانے کی ہوس ہے؟   تجھے دولت کمانے کی ہوس ہے!
مگر یہ ڈھول بیٹا! دُور کے ہیں   مجھے ڈر ہے یہ لڈّو بُور کے ہیں
مری سُن لے امرے نادان بچے!   یہاں کے گڑ چنے برفی سے اچھے

---

[۱] فکر۔
[۲] زندگی
[۳] سلام۔

خوشی ہرنی میرا ہیروں میں نہیں ہے ۔۔۔ خوشی چاندی کے ڈھیروں میں نہیں ہے
خوشی ریشم کے پردوں میں نہیں ہے ۔۔۔ خوشی سونے کی اینٹوں میں نہیں ہے
خوشی ہے دل کے اطمینان کا نام ۔۔۔ نہیں دنیا میں یہ دولت بہت عام
خوشی ملتی نہیں ہے مول بیٹا! ۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں! "تو بھی بول بیٹا!"
یہ اپنے گاؤں کے جنگل کے کانٹے ۔۔۔ پرائے دیس کے پھولوں سے اچھے
یہاں پر ماتما کیا دوسرا ہے؟ ۔۔۔ جو قسمت آزمانے کو چلا ہے
وہاں آکاش اور دھرتی یہی ہے ۔۔۔ یہاں گاؤں میں کس شے کی کمی ہے
ہوا، پانی، اُجالا، زندگی بھی ۔۔۔ تمنا بھی، محبت بھی، خوشی بھی
ہمارے گاؤں شہروں کے بھلے ہیں ۔۔۔ ہمارے باپ، دادا کہہ مرے ہیں
وطن کی خاک سے پلو بندھا ہے ۔۔۔ یہیں مرنا، یہیں جینا بدا ہے
ہمیں لینا نہیں کچھ شہریوں سے ۔۔۔ ہمارا گاؤں اچھا، کھیت اچھے
کسی کی بھی نہ اب ہرگز سنوں گی ۔۔۔ دِوالی پر میں تجھ کو بیاہ دوں گی

چڑھاؤں گی تری شادی میں گہنا
اِسی گھر میں بہو کے ساتھ رہنا

بیٹا۔

تمہیں شہروں کی باتوں کی خبر کیا؟ ۔۔۔ تمہارا مشورہ ہی کیا، نظر کیا
ہمارے گاؤں کے پنڈت کا جوتی ۔۔۔ پہنتا ہے کناری دار دھوتی
ہیں اُس کے پاس جرابیں بہت سی ۔۔۔ سلیپر، بوٹ، عینک بھی گھڑی بھی
وہ صابن سے نہاتا ہے ہمیشہ ۔۔۔ ہے کتنا نوکری دلچسپ پیشہ
ابھی وہ فوج میں رنگروٹ ہی ہے ۔۔۔ ابھی تنخواہ پوری کب ہوئی ہے
نہیں دبتا وہ تھانیدار سے بھی ۔۔۔ ہے اُس کی حاکموں میں بھی رسائی
یہ سب کچھ شہر جانے کا اثر ہے ۔۔۔ مجھے کیا ساری بستی کو خبر ہے
میں جانے کا تہیہ کر چکا ہوں ۔۔۔ سمجھ کر ہی میں آمادہ ہوا ہوں
میں جاتے ہی تمہیں چٹھی لکھوں گا ۔۔۔ تمہارا "داس"[۲] بن کر ہی رہوں گا
میں تم کو روپیہ بھیجا کروں گا ۔۔۔ میں ہر تیوہار پر آیا کروں گا

مجھے جانے کی ماتا! آگیا[۳] دو
"سپوتی لال" کہہ کر مسکرا دو

جو ضد کرتے ہوئے بیٹے کو دیکھا ۔۔۔ اُٹھی آنکھوں میں آنسو بھر کے بڑھیا
کہا ہونٹوں ہی ہونٹوں میں یہ اُس نے ۔۔۔ جواں بیٹے کی ہٹ بھی راج ہٹ ہے

سفر کی تیاری

بہت ہی سخت سردی پڑ رہی تھی ۔۔۔ ہوئیں تیاریاں اُس کے سفر کی
پھٹی سی ایک دھوتر کی رضائی ۔۔۔ بہت میلی کچیلی اک دُلائی
وہ بستر بند اک رسی کا ٹکڑا ۔۔۔ پھٹے کُرتوں کو بھی اُس میں لپیٹا

[۱] گاؤں [illegible]
[۲] غلام۔
[۳] اجازت۔
[۴] [illegible]

چلم کے ساتھ تنباکو کی تھیلی — بڑی ہی شان سے خُرجی[۱] میں رکھی
انگوچھے میں لپیٹا روٹیوں کو — رکھا انٹی میں اُس نے روپیوں کو
اکٹھے ہو گئے بچپن کے ساتھی — کنوں، کالی چرن، موہن مُرازی
محبت نے بالآخر جوش کھایا — گلے ایک ایک کو اُس نے لگایا
نکل آئیں گھروں سے عورتیں بھی — دُعائیں تھیں زباں پر ہر کسی کی
اشارے ہو رہے تھے گھونگھٹوں پر — سَروپی نوکری کرنے چلے ہیں
وہیں آنگن میں بُڑھیا ماں کھڑی تھی — ڈھلک آئی تھی سر کی اوڑھنی بھی
نظر بے چین، چہرے پر اُداسی — کہ جیسے دُھوپ میں ہرنی ہو پیاسی
وہ اپنے دل ہی دل میں گُھٹ رہی تھی — کہ جیسے اُس کی دُنیا لُٹ رہی تھی
زمیں کو، آسماں کو دیکھتی تھی — جُدائی کی گھڑی سر پر کھڑی تھی
جواں بیٹے سے چُھٹنا ہو رہا تھا — بُڑھاپا چُپکے چُپکے رو رہا تھا
سفر کی دُھن میں گرچہ بے خبر تھا — سَروپی پر بھی فرقت کا اثر تھا
بڑھی وہ اور تھاما اُس کا بازو — ڈھلک کر رہ گئے آنکھوں سے آنسو
سَروپی کی بلائیں لے کے بولی — پلٹنا دیس کو اے لال! جلدی

ترا دامن مُرادوں سے بھرے گا
تری پرماتما رکشا کرے گا

شہر میں!

جلو میں لیکے اُمیدوں کا دھارا — سَروپی دیس سے اپنے سدھارا!
سنیچر کو چلا، منگل کو پہونچا — وہاں جا کر دھرم شالہ میں ٹھہرا
نہا دھو کر کئے تبدیل کپڑے — "سروپی لال جی" بن ٹھن کے نکلے
خریدی راہ میں پیسے کی بیڑی — دُکاں کے آئینہ میں شکل دیکھی
بڑے بازار کے نکڑ پہ آیا — وہاں اُس کی نگاہوں نے یہ دیکھا
سڑک پر ایک ہلچل سی مچی ہے — دُکانوں میں نمائش سی لگی ہے
رواں ہیں موٹریں بھی، لاریاں بھی — دُکانوں پر کھڑی ہیں بگھیاں بھی
در و دیوار، کھمبے سج رہے ہیں — گراموفون ہر جا بج رہے ہیں
ہیں آنے جانے والوں کے بدن پر — قمیصیں، شیروانی، کوٹ، مفلر
دھوئیں کے پیچ، سگرٹ کے شرارے — وہ انداز و نزاکت کے اشارے
بہت سی شوخ، چنچل لڑکیوں کا — نظر آیا اُسے اک جمگھٹا سا
کُھلے سینوں پہ زلفیں کانپتی تھیں — وہ اک اک کی نگاہیں بھانپتی تھیں
مہکتی ساریوں میں جسم رنگیں — شرابِ سُرخ در جامِ بلوریں
برہنہ پنڈلیاں بیباک نظریں — بہت مشّاق اور چالاک نظریں

---

[۱] ایک قسم کا تھیلا جسے گاؤں والے کاندھوں کے آگے پیچھے لٹکا لیتے ہیں۔

کُھلی باہوں کی رنگت سیمیں سی | جبینیں چودھویں کے چاند سی سی
نمائش بھی ادب کی حد میں تھی | قیامت لڑکیوں کے روپ میں تھی
تبسم قہقہے شوخی شرارت | جوانی پر جوانی کی حرارت
جواں سینوں میں ہلچل ہو رہی تھی | فضا میں زندگی حل ہو رہی تھی
شباب اپنا اثر دکھلا رہا تھا | کہ سردی میں پسینہ آ رہا تھا
سروپی نے یہ کب دیکھے تھے منظر | نظر گاڑے ہوئے تھا لڑکیوں پر
وہ اُن سے دور ہٹ کر جا رہا تھا | مگر رہ رہ کے اُن کو دیکھتا تھا
سپاہی سے ہوئی چلتے میں ٹکر | لگایا کس کے اُس نے دھول سر پر
سروپی چوکنے والا نہیں تھا | رسید اس نے کیا مُنہ پر طمانچہ
سپاہی نے وہیں سیٹی بجائی | پولس فوراً مدد کو اُس کی آئی
کیا سب نے اُسے مل کر گرفتار | سمٹ آیا وہاں پر سارا بازار

عدالت اور جیلخانہ

عدالت میں کیا چالان اُس کا | سروپی سامنے حاکم کے پہونچا
پولس نے اور ہی نقشہ جمایا | گرہ کٹ اور آوارہ بتایا
وہاں فائل[۱] مرتب ہو چکی تھی | پولس کو کیا گواہوں کی کمی تھی
کہا حاکم نے تم لاؤ صفائی | سروپی کی زباں پر تھا "دُہائی!"
سروپی نے کہا با چشمِ گریاں | مَیں پردیسی ہوں میرا کون ہے یاں

عدالت نے سزا تجویز کر دی
سدھارا جیلخانے کو سروپی

مامتا کی لاش

سروپی نے لکھا ای گھر کو چٹھی | خبر بیمار بڑھیا تک جو پہونچی
وہ پہلے ہی غموں سے نیم جاں تھی | خبر سُننے کی طاقت ہی کہاں تھی
یہ سُننا تھا کہ بس جاتے رہے ہوش | رہی وہ رات بھر بستر پہ خاموش
سرِ آئی تھیں ماتھے کی لکیریں | اُبھرتی ڈوبتی جاتی تھیں نبضیں
رگیں کھنچتی ہوئیں سینہ میں لرزش | نظر بے نُور سی، ہونٹوں میں جنبش
خبر بڑھیا کی بیماری کی سُن کے | اکٹھے ہو گئے اپنے پرائے
یہ نازک وقت ہے بھیجو کسی کو | کہا سب نے بلاؤ ویدجی کو

محبت کام اپنا کر چکی تھی
طبیب آیا تو بڑھیا مر چکی تھی

ماہر القادری

۱؎ مثل۔

شیریں فرہاد

اگر میں یا آپ میں سے کوئی ہوتا تو ضرور رقت آمیز سُروں میں یہی مصرع بار بار دہراتا۔ ع:

سر بام آیئے ہم طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

لیکن اندھیری سنسان گلی میں فرہاد تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دبی ہوئی آہستہ آواز میں، عجب منت آمیز لہجے میں، کھینچ کھینچ کے "آؤ۔ آؤ" ہی کہہ کے شیریں کو بلاتے رہے۔ اور شیریں کے سر بام نمودار ہونے میں جو جو دیر ہوتی گئی، ان کی "آؤ" میں درد کے سُر بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ "آؤ" سے "عاؤ" ہوا اور "عاؤ" سے "عاعو" ہو گیا۔ جب جا کے کہیں شیریں صاحبہ لچکتی ومکتی ٹہلتی ٹہلتی کوٹھے پر آئیں اور بڑے ناز و انداز سے سمٹ سمٹا کر چھجے پر بیٹھ کر نیچے گلی میں کھڑے ہوئے فرہاد کو دیکھنے لگیں۔

فرہاد نے آہ سرد بھر کر کہا: "عاعو۔ عاعو"

شیریں نے لاپروائی سے جواب دیا: "میاں آؤ"

میاں تو عہد کر چکے تھے کہ گھر میں قدم نہ رکھیں گے۔ اس دن رکیٹ ایسا پڑا تھا کہ کمر میں آج تک درد تھا۔ اس لئے وہ اصرار کیساتھ شیریں کو ہی گلی میں بلاتے رہے۔ لیکن شیریں کو کیا غرض تھی کہ وہ جاتی۔ تھوڑی دیر بیٹھی اُن کی عاعو۔ عاعو سنتی رہی اور پھر ایک بار اور "میاں آؤ" کہتی ہوئی اُٹھی اور آہستہ سے کوٹھے پر غائب ہو گئی۔

اب کہاں صبر ہو سکتا تھا۔ کیسا عہد اور کس کا ڈر۔ اُچک پڑوسی کی ڈیوڑھی پر اور وہاں سے پھلانگ چھت پر آ گئے۔ مگر سنگدل شیریں کوٹھے پر سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ مجبوراً اب یہ صحن کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ آہستہ سے چھجے پر آئے۔ گردن بڑھا کر نیچے صحن پہ دیکھا۔ کس قدر دلچسپ سین تھا۔ چاروں پیر جوڑ، دُم کو سمیٹ کر پیٹ سے ملا، دبک کر خاموش ہو گئے۔

صاف ستھرے مختصر صحن کو بجلی کے دو قمقموں نے روشن کر رکھا تھا اور تیسرا لیمپ مچھر دانیوں سے ڈھکی ہوئی پاس پاس بچھی دو مسہریوں کے سرہانے جل رہا تھا۔ اسی کے برابر بجلی کا پنکھا۔ (جس سے فرہاد کو سخت نفرت تھی)، جھلل جھلل چمکتا گھوم رہا تھا۔ کچھ فاصلہ دیکر تختوں کا چوکا تھا جس پر سفید چاندنی بچھی تھی — چاندنی پر بسنتی زمین، گلابی پھول اور نیلے حاشیہ کا قالین بچھا تھا۔ اس پر گاؤتکیہ۔ ایک طرف اُگالدان، دوسری طرف تانبے کا قلعی دار پٹاری نما پاندان اور ڈلی کی ٹوکری۔ تختوں کے برابر ایک تپائی پر سوندھے سوندھے دو نئے گھڑے، ایک جھجری اور ایک صراحی۔ دونوں کے گلوں میں موتیے کے ہار لپٹے تھے۔ لوٹے، صابندانی، بیسن دانی، سب نئے جھلجھلاتے ہوئے۔

دوسری چوکی پر نعمت خانہ (جو کہ کھلا ہوا تھا) اس کے برابر میں چھوٹی سی انگیٹھی پر دودھ کی دیگچی، جس پر موٹی بالائی آ چکی تھی۔

صحن کے دوسری طرف باورچی خانے کی صحنچی کے پاس مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ باورچی خانے میں سے شامی کبابوں کے واسطے اُبلے ہوئے قیمے کی بو آ رہی تھی۔ اور ڈربے میں سے رُک رُک کر مرغیوں کی کُٹ کُٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فرہاد نے بڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ اس خاموش منظر کو دیکھا۔ آخر اُن کو یقین ہی ہو گیا کہ گھر میں انسان کوئی نہیں ہے اور اگر ان سفید سفید کپڑے کی کوٹھریوں میں کوئی ہے بھی تو ضرور سو رہا ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے اب اور جرأت کی۔ اُٹھے اور منڈیر منڈیر باورچی خانے کی طرف چلے۔ مچھر دانی کے اندر اقبال دُلہن کے پاس لیٹی ہوئی شیریں نے ان کو دیکھ لیا۔ ہنجوں ہنجوں مچھر دانی کھسکا سٹ مسہری سے نیچے کود۔ لگیں ٹہلنے۔ کوٹھے پر سے فرہاد نے ان کو جو دیکھا خورش کا خیال ترک کر جذباتِ عالیہ کی طرف رجوع ہوئے۔ عجب سوز و گداز تھا، فرمایا: "عاعو"

اُن دو میں سے ایک سفید حجرہ ہلا اور ساتھ ہی زوردار آواز آئی: "وہ دیکھو! وہ دیکھو! وہ پھر آ گئے آپ کے فرہاد"

دوسرے سفید حجرے میں سے مہین لوچیلی آواز آئی: "یہ نہ کہتی! یہ نہ کہیئے کہ 'آپ کے فرہاد'۔ فرہاد ہو گا تو اُس چڑیل شیریں کا، میرا کیوں ہونے لگا"

"تو تمہارا فرہاد کون ہے؟"

"میرا کوئی بھی نہیں۔ اور... اور... سوائے آپ.....

...اور....."

"کہو، کہو، چپ کیوں ہوگئیں؟"

"بھئی ہوگا۔ میں نے تو ابھی آپ کے پیر ا میں، بہن کی نکالی ہے۔ کچھ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ، آپ ہی اٹھا کر نعمت خانہ میں رکھ دیں۔"

زینب جیسے میں حرکت ہوئی، ... کا پیار ... فرہاد صاحب کی جانب سے گلی کی طرف کھسک گئے۔ اور اقبال احمد صاحب الگزنڈر اسپیلان کمپنی کے نوجوان، کلین شیو، نفیس ... سنہری عینک لگائے، ساقی کا سالنامہ ہاتھ میں لئے، سیاہ دھاریوں کا نائٹ سوٹ پہنے نمودار ہوئے۔ نعمت خانہ کے پاس گئے تو ان کی تین ماہ کی بیاہی دلہن یا بیگم نے لوچ، منت، غرور، محبت اور شرم پانچوں حربوں کو ادا کرنے والے ایک عجیب لہجے میں کہا: "کتابوں کے واسطے ابلا ہوا قیمہ بھی تو ہے۔ آپ بیٹھے رہئیے، بھئی ذرا اور بڑھ جائیے۔ اُس کی پتیلی بھی اٹھا لائیے۔ اور یہ دودھ بھی سب نعمت خانہ میں رکھ دیں!"

اقبال احمد بغیر ایک لفظ بولے آہستہ سے باورچی خانے کی طرف مڑے، اندر گئے۔ جسم سے دور چھینکے میں لٹکائے ہوئے دھوئیں سے کالی پتیلی لائے۔ اس کو اندر رکھا پھر دودھ کی پتیلی رکھی۔ نعمت خانہ بند کیا۔ اب چلے ہی تھے کہ پھر آواز آئی۔

"رحیمن سر شام ہی گھر چلی جاتی ہیں۔ کتنا کہو کہ اے بوا ذرا رک جاؤ مگر وہ کب سنتی ہیں۔ نہ معلوم ڈربہ بند کیا کہ نہیں۔ بھئی اس کو بھی دیکھ لیجئے۔"

اقبال احمد نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی مسہری کی طرف سے ڈربے کی طرف رخ کیا۔

"آخر شوق میں شوق یہ بلی پالنے کا کیا شوق ہے۔ یہی حرامزادی تمہاری شیریں شہر بھر کے بلے بلا کر لائیگی۔ ابھی تو ایک ہی فرہاد آتے ہیں۔ دیکھو تو درجنوں آئیں گے۔"

شیریں اپنی جنس کی فطرت کے مطابق محلہ کے حلوائی کے گبرے بلے کو اپنی دو چار ادائیں دکھا کر پھر اقبال دلہن کے پاس گھس آئی تھیں۔ دلہن نے اپنا حنائی ہاتھ بلی کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا: "کیوں ری شیریں تیرا ایسا ہوائی دیدہ ہوا ہے؟"

شیریں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور خر خر کرتے ہوئے سر کو اور بڑھا کر دلہن کے ہاتھ سے رگڑتی ہوئی چلیں تو دم کی نوک تک چلی آئیں۔

لیکن اقبال احمد مرغیوں کے ڈربے سے واپس لوٹے تو اپنی مسہری پر نہ آئے بلکہ دالان کی طرف بڑھے تو فوراً نسیمہ (دلہن) نے چونک کر پوچھا، "اب کہاں چلے۔ اے کہاں جا رہے ہیں بولتے تو؟"

"فرہاد کی دعوت کا سامان کرنے!"

"بھئی خدا کے لئے نہیں۔ آپ کو ہماری جان کی قسم کچھ نہ کیجئے گا۔ بلی کو نہیں مارنا چاہئیے، سنا نہیں۔ بلی کو مارو تو روئی کے گالے سے مارو۔ واہ آپ تو خوب ہیں۔ اُس روز موتے کے تھاپڑ اس زور سے ماری۔ مجھو ہم آتا ہے۔ بھئی کیا کر رہے ہیں، آخر ارادہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں دعوت کرنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی بالائی کھلاؤنگا فرہاد صاحب کو۔"

یہ کہتے ہوئے اقبال احمد کمرے میں غائب ہو گئے اور وہاں سے چھوٹی میز، ایک مرادآبادی بڑی سی تھالی اور بجلی کے تار کی ایک لچھی لئے ہوئے آئے۔ میز پر تھالی رکھی، تھالی کے بیچوں بیچ ایک چینی کی طشتری میں تھوڑی سی بالائی اور دودھ رکھا۔ پھر بجلی کا ایک تار ننگا کرکے تھالی کے نیچے دبا دیا اور دوسرا چینی کی طشتری میں دودھ میں ڈال دیا اور جب یہ سب ہوگیا تو پلگ لگا دیا۔

"اوئی اللہ، اس وقت تو شیریں تم وبال جان ہوگئیں۔ ایکساں جائیں مائیں، چائیں مائیں گھسی چلی آ رہی ہو۔ اے رحیمن۔ اے رحیمن! بوا تم تو کوٹھری میں جاتی ہو تو بیٹھ جاتی ہو۔ اے چلو آؤ۔ لاؤ گھی۔ بس بس دو ہی ٹکڑوں بھر کا اور چاہئے ہے۔ لاؤ جلے جاتے ہیں۔ عیدو میرا بھیا جلدی سے دھولا۔"

کٹکٹاتے جاڑے، شام کا وقت، منٹوں میں تو رات ہوتی ہے۔ میاں نے پانچ بجے کا وقت پارٹی کا بتایا تھا۔ نسیمہ نے جلدی جلدی سب طرح کا پکوان۔ شاخین، سوہال، کھجوریں، نمک پارے، خستہ کچوریاں، آلو، قیمہ، پوریاں، تلے انڈے، سب تیار کر لئے تھے۔ نان پاؤ کے ٹکڑے تل رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہتی تھی آج ضرور میاں ان سب کو دیکھکر خوش ہو جائیں گے۔ کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ "آئی میاں" کہتی ہوئی رحیمن دوڑی۔ نسیمہ نے دوپٹہ کے آنچل سے چولھے میں سے اڑی ہوئی منہ پر کی راکھ پونچھی۔ مسٹر اقبال احمد چوخا کے دار اونی ہوز، خاکی نیکر نیلا بلیزر پہنے، گلے میں چھ انچ لمبی، تین انچ چوڑی بو لگائے، سر پر بانکا فاختئی مرغی کے پر سے آراستہ فلٹ کیپ اوڑھے گھر میں داخل ہوئے۔ ہاتھ کا پلندہ تخت پر رکھا۔ ڈورے نوچے، کاغذ پھاڑا۔ اس میں سے چار ڈبے نکلے۔ مکھن کا ڈبہ، رس بھری جام کا ڈبہ۔ پنیر کا ڈبہ اور تھری اے سگرٹ کا ڈبہ۔ جیب سے چاقو نکال انہی کے کھولنے میں مشغول ہوگئے۔ اور جب سب سے ضدی مکھن کا ڈبہ بھی بہزار خرابی کھل گیا تو بیوی کو آواز دی،

"کیوں بھئی اب نکلو گی بھی کہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک تمہارے پکوان میں سے کچھ بھی تیار نہیں ہوا۔ میں تو سمجھتا ہی تھا"

"جی نہیں سب ہوگیا، سب تیار ہے۔ لے لیجئے میں ابھی آئی"

یہ کہتی ہوئی نسیمہ باورچی خانے سے ایک پیر کی ٹوٹی ہوئی چپل گھسیٹتی ہوئی نکلی۔

"آخر نئی چپل کس دن کے واسطے اٹھا رکھی ہے۔ خیر ہوگا، تم سے تو کہنا فضول ہے۔ لاؤ ڈبل روٹی لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ سینڈویچز بناؤں۔ دنیا کی بیویاں یہ کام کیا کرتی ہیں یہاں ہم خود کرتے ہیں۔ بیوی ہماری کچھ جانتی ہی نہیں۔ کیا بتاؤں۔ امین آباد میں اِن چیزوں کے لینے میں دیر ہوگئی۔ آ بھی لاؤ۔ کھڑی کیا سُن رہی ہو۔ لاؤ ڈبل روٹی۔ انڈے اور انگیٹھی بھی"

نسیمہ کی صورت افسردگی۔ گھبراہٹ۔ خوف۔ پریشانی۔ مری ہوئی آواز میں پوچھا "نان پاؤ؟ نان پاؤ؟"

"ہاں ہاں نان پاؤ۔ اسے ڈبل روٹی کہونا۔ ہائے افسوس۔ مرگئے نان پاؤ کے کھانے والے اور مرگئے نان پاؤ کے پکانے والے۔ لیکن ہماری بیوی آج بھی نان پاؤ ہی کہتی ہیں۔ ریکیٹ منہ سے نہ نکلا جب کہا تھا پلی۔ اچھا ڈبل روٹی نہ سہی نان پاؤ سہی، وہ ہے کہاں؟"

"مجھ سے بھول ہوگئی"

"اچھا کوئی نیا شگوفہ کھلا ہے ــــ ہاں بھئی کیا بھول ہوگئی"

"میری عقل پر پتھر پڑ گئے"

"ارے کچھ کھل کر کہو تو سہی"

"اب آپ جو جی چاہے کہیئے۔ بیشک مجھ سے قصور ہوگیا ــــ کل آپ نے کچھ کہا تو تھا میں نہ معلوم کیا سمجھی، میں نے تو نان پا.... ڈبل روٹی کے میٹھے ٹکڑے پکا دئے"

اقبال احمد کے ہاتھ کی کہنی تخت پر ٹک گئی۔ سر ہاتھ کی ہتیلی پر ٹک گیا۔ مری ہوئی آواز میں "اچھا وہ انڈے"

نسیمہ کی کچھ جان میں جان آئی۔ کچھ کھلی آواز میں اطمینان کے لہجے میں بولی "وہ تو تیار ہیں ــ سب تلے رکھے ہیں"

"ہائیں! افسوس افسوس۔ ایملٹ بھی ختم۔ ہائے ری قسمت"

نسیمہ کے منہ پر اب ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آنسو ڈبڈبا آئے۔ خاموش سنتی رہی۔

"ارے میں تو سمجھتا ہی تھا کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ پارٹی کیا ہوگی اور شبکی ہوگی۔ کیا کرتا سب سر ہوگئے۔ ترقی ہوتی ہے پارٹی دو، پارٹی دو۔ اسسٹنٹ انجنیر ہوگئے ہو۔ اُس روز رابرٹسن نے پارٹی کی کیسی.... خیر اس کو جانے دو۔ مقبول نے پارٹی دی کس قدر اس کی بیوی سلیقہ مند ہے... کیک بھی گھر کے ہی بنے ہوئے تھے۔ اچھا جو میں کل کیک لایا تھا وہ تو ہیں یا اُن کو بھی کچھ کر ڈالا"

نسیمہ نے کیک لاکے دئے۔ عیدو کو آہستہ سے بلایا۔ اپنا پکایا ہوا سامان پلیٹوں میں لگا لگا کر رکھا۔ اقبال احمد نے عیدو کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے لب سڑک ڈیوڑھی کے کمرے میں میز پر سب سامان لگایا اور ہر ہر طرح عیدو کو سب بجھایا کہ یوں چائے لانا۔ یہاں کھڑا رہنا۔ اس طرح سے برتن رکھنا اور اٹھانا۔ غرض کہ نیا چھوکرا اور ہندوستانی ناشتہ۔ قہرِ درویش برجانِ درویش سب تیار کرہی چکے تھے کہ ہنستے ٹھٹے لگاتے چاروں دوست، جن کو مدعو کیا تھا سائیکلوں پر آگئے۔

خدا کا شکر ہے کہ پارٹی ہر طرح سے کامیاب رہی۔ رابرٹسن نے دہی بڑے بہت ہی مزے لے لے کر کھائے۔ اور کہا کہ "ہماری میم صاحب کو بھی ایسا پکانا آجائے تو اچھا ہے۔ آپکی بیگم سکھا دینگی"

مقبول نے تو صاف صاف کہہ دیا "یار یہ اچھا کیا کہ یہ چیزیں تیار کروائیں۔ واللہ لطف ہی آگیا"

کیک کسی نے چھوتے بھی نہیں۔ اقبال احمد بہت خوش تھے۔ خیر بگڑی بات بن گئی۔ نیا چھوکرا عیدو بالکل جنگلی۔ لیکن خیر وہ بھی خاموش رہا۔ کوئی خاص بدتہذیبی نہ کی۔ ایک دو دفعہ ان لوگوں کی ہنسیوں میں خواہ مخواہ خود بھی شامل ہونے کی شروعات ضرور کی۔ لیکن اقبال نے جونہی گھورا فوراً دانت بند کر لئے۔

ناشتہ بڑے قرینے اور سلیقے سے ختم ہوا اور عین اُس وقت جبکہ یہ لوگ میز پر سے اٹھنے ہی کو تھے، آسمان پر سے ایک بلائے ناگہانی پھنکاریاں بھرتی اور گرزوں اچھلتی ٹپکی کہ اللہ کی پناہ۔ میز الٹی، برتن ٹوٹے، مہمان بھاگے، آپس میں ٹکرائے۔ کرسیوں میں اُلجھے اور گرے۔

عیدو صاحب نے تین ہی بجے سے موقع بہ موقع تھوڑی تھوڑی چیزیں چرا کر تانبے کی بھنڈائی میں جمع کی تھیں۔ تاکہ رات کو فرصت میں ان کا مزہ لیا جائے۔ بھین دانی روشندان کے پاس ہی پتے سے ڈھکی رکھی تھی۔ مقدر کے کھوٹے فرہاد صاحب شیریں کے فراق میں پھرتے پھرتے اِس کے پاس آگئے۔ ناک میں بُو کیسے نہ جاتی۔ اور تر مال کی بُو آہی ہے تو کیسے چھوڑ دیں۔ لیکن بھین دانی کا منہ تنگ تھا، سر اندر تو چلا گیا مگر باہر نکلنا دشوار ہوگیا۔ اندھے بھینسہ بن گئے۔ آگے پیچھے ہٹتے ہٹتے روشندان میں سے ٹپک پڑے۔ اب جو گرے اور اتنی بہت سے اجنبی آدمیوں کی ایسی ایسی آوازیں سُنیں تو پھر کیا تھا۔ چاروں پنجوں کے ناخون نکالے پھنکاریں بھرتے زمین سے آسمان کی طرف رجوع ہوتے

تھے اور آسمان سے زمین پر گرتے تھے ظالم زمانہ کتنا آگے جا رہا تھا۔

ہر طرف تاریکی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ دن ڈھلے کا دھندلا اُجالا ٹیلے کی چوٹیوں پر اٹکا رہا تھا۔ افق مغرب پر سورج ڈوب چکا تھا اور اس کی یادگار کے طور پر یا شاید سرخ بادلوں کے دوپٹہ رنگ سے شرمندہ ہو رہے تھے۔ لیکن ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ سی دُور بہت دُور بازار کی طرف سنائی دے رہی تھی۔ پاس ہی کے ایک مکان سے کسی شیر خوار بچے کی ایک سانس اور ایک شہر میں رونے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ اطراف کی گہرائیوں اور کونوں کی دیواروں کی جڑوں میں سیاہی قدم جما چکی تھی۔ شیریں کو شیشے کی لوتا لگی دیوار پر سامنے کی منڈیر پر نگاہیں جمائے افسردہ بیٹھی کسی گہری سوچ میں غلطاں معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سوچ بچار افسردگی کی حد تک محدود تھا۔ واقعات کی یاد، ان کا تسلسل، حادثات کی دیواریں ان سے نتیجہ نکالنا یہ سب باتیں وہ بھلا ہی کہاں جانتی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی سہیلی نسیمہ کو رنج اور تکلیف میں دیکھتی تھی تو پھر اس پر بھی رنج کا جا تسلسل غلبہ چھا جاتا تھا۔ نسیمہ کیوں اور کس لئے جسمانی تکلیف اور روحانی کوفت میں مبتلا ہے۔ اس سے اس کو کیا سروکار۔ اس کو گذشتہ کے بھی وہ دونوں واقعات یاد نہ تھے جب پہلے دو دو دفعہ نسیمہ کے یہاں ستوانسے بچے پیدا ہوئے تھے۔ اور اب یہ تیسری باری تھی۔ وہ ہی ستوانسہ بچہ پیدا ہوا اور نہ صرف خود ہی پیدا ہوتے مر گیا بلکہ ماں کو بھی بلا دا دیتا گیا۔

پہلوٹھی کی دفعہ زچہ خانہ میکے میں ہوا تھا۔ ماں کے علاوہ خالہ ممانی اور بھاوج سب ہی تیمار دار تھے۔ دوسرے کی دفعہ میکے نہ جا سکی لیکن ماں زندہ تھی، گو قسم کھائی تھی کہ داماد کے گھر قدم نہ رکھیں گی، لیکن وقت پر پیٹ پکڑے دوڑی چلی آئیں۔ ابکی کون کرتا ماں چل بسیں خالہ نے انکار کر دیا۔ بھاوج خود پورے دنوں سے تھیں۔ ان والے نئے پکھیرو نام نمود کے دیوانے۔ گز بھر اونچے ہوئے تو اترا گئے۔ نیچے کی دنیا آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اقبال احمد اسی گوشت پوست کے بنے، ٹھیک اسی ڈھرے پر چل رہے تھے کہ جیسے ہی سیڑھی اوپر چڑھتے تھے نیچے کی سیڑھی کھود ڈالتے تھے شفٹ انجنیر سے اسسٹنٹ انجنیر ہوئے، پرانے دوستوں کو طلاق دی۔ نئے بڑھیا دوست پیدا کئے اسسٹنٹ سے ریزیڈنٹ انجنیر ہوئے تو ان سے بھی بے تکلفی چھوڑی پورے سے زیادہ اخلاق برتا، سادگی چھوڑی، کمال ہمدردی اور محبت جتائی کس خوبصورتی سے ان کو بھی دھتا بتائی۔ اب جو جورو کی طبیعت خراب ہوئی تو کون آیا! مسز چھا

مسز رحمن، مس فوست وغیرہ۔ ایسی پرندیاں جو لپ اسٹک لگائے، کیمرہ ناولیں، تھرماس ہاتھوں میں لئے فیمنزم اور سوشلسٹ مسائل پر گفتگو کرتی، لپ جھپ کرتی، قہقہے لگاتی آئیں، چائے پی۔ چاکولیٹ کھائے، سگرٹ پیئے، بیس منٹ آدھ گھنٹہ ٹھہریں، ہمدردی جتائی، نصیحتیں کیں، معالج بنیں اور چل دیں۔ چلتے چلتے پھر ہمدردانہ نصیحتیں کی گئیں۔

"مسٹر اقبال آپ کو چاہئے کہ ضرور آپ ایک نرس کو ہفتے دو ہفتے کے واسطے کرایہ پر رکھ لیں۔ پرانی لوگ کیا جانیں مریض کا رکھنا اور مریضہ کو بالکل اُٹھنے بیٹھنے نہ دیں۔ آرام کریں۔ بالکل آرام۔ شور غل کچھ نہیں۔ آپ بھی ان کے کمرے میں بہت کم جائیں بلکہ بالکل نہ جائیں خاموشی آرام بس... اور اور... مکان... مکان... بھی ٹھیک نہیں کیوں نہیں آپ شہر سے باہر کوئی چھوٹا سا مکان لے لیتے۔ بڑے سستے مکان مل جائینگے۔"

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے شوہر کی نام لیوا مسز سہیل سند یافتہ نرس مبلغ چار روپے یومیہ پر نسیمہ کی تیمار داری کیلئے دوسرے ہی دن تعینات ہو گئیں۔ اور اس باکمال دل نواز معالجہ نے اپنی ان تھک کوشش اور توجہ سے بہت جلد لب گور نسیمہ کو قطعی موت کے ہاتھوں سے کھینچکر طویل عرصے کیلئے مُردہ زندگی بسر کرنے کو چھوڑ دیا۔

اس کو نہ معلوم کب اور کس وقت کمرے میں اندھیرا سا تھا، کچھ ہوش سا آیا۔ افسردہ دل لرزاں تھا۔ ہاتھوں میں کپکپی تھی، سر میں چکر تھا۔ اماں وہاں تھیں کہ نہیں۔ یاد پڑتا ہو نہ تھا۔ آنکھیں کھولیں کسی کو پھرتے دیکھا۔ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ — مسز سہیل گھومیں بیگم کو ہوش میں پایا۔ او خدا۔ تیرا شکر۔ بیگم اب اچھا ہے۔ فکر نہ کرے۔ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

نسیمہ نے ایک جنبش اور محسوس کی، آنکھیں اور کھولیں، بینائی نے ترقی کی ہر شے صاف نظر آنے لگی۔ دماغ ٹھہرا۔ یاد اور حافظہ نے ہلہ بولا۔ عقل کی دستگیری کی۔ مکان... گھر... اپنا گھر... عورت۔ میم بلکہ ڈاکٹرنی... اس کے بازو میں... مرد اپنا مرد۔ وہ... وہ... وہ ... اللہ شکر، تیرا شکر، وہ وہ کیا کر رہے ہیں... ڈاکٹرنی کو تک رہے ہیں؟ اور اس طرح تک رہے ہیں۔ ڈاکٹرنی حسین ہے وہ ہاں۔ ان ہی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ ادھر اب بھی نہیں دیکھا۔ انکی آواز "مسز سہیل.... انگریزی انگریزی انگریزی....."

میم کی آواز "... انگریزی انگریزی... مسٹر اقبال... انگریزی انگریزی....."

"آنکھیں بند کر کے سنوں"

آنکھیں بند کرلیں اور آوازیں مدھم اور "ڈولی آتی ہے۔ ڈولی آئی ہے" کی آوازیں تیز ہونے لگیں — ہر طرف سے ڈولی آتی ہے۔ ڈولی اترو الو، کی آوازیں ہوئیں اور پچاسوں ڈولیاں تسنیمہ کے چاروں طرف ناچنے لگیں۔

اندھیری دیوار پر آہستہ سے فرہاد کا سر نمودار ہوا۔ پھر سینہ پھر پیر بھی اوپر آئے۔ اور اب فرہاد دیوار دیوار شیریں کی طرف بڑھے اندھیرا چھا گیا تھا انتہائے فلک پر سُرخی کا ایک دھبّا اور باقی تھا۔ بچّہ اب بھی رو رہا تھا۔ دُور کہیں ایک ڈھولک بھی بجنا شروع ہو گئی تھی۔ دو ایک گھر میو جُھمکا ڈر ہوا میں سپاٹے بھر رہے تھے۔ فرہاد "آؤ۔ آؤ" کرتے شیریں کے قریب آئے۔ لیکن بغیر وجہ در وجہ اسباب جانے شیریں کے حیوانی دیدوں میں دو آنسو تھے۔ وہ دیوار سے کوٹھے پر کُودی اور وہاں سے نیچے تیزی سے غائب ہو گئی۔

صدقے صدقے۔ شیریں تیری متبرک آنکھوں کے صدقے۔ دُنیا بھر کے سچے موتی تیرے اِن دو آنسوؤں پر نثار۔

اور چونکہ اس زمانے میں شیریں اکثر افسردہ اور غمگین رہتی تھی اس لئے فرہاد کے دل پر بھی بڑا اثر تھا۔ وہ بیچارا اپنی سی ہر کوشش شیریں کا غم غلط کرنے کے لئے کرتا رہتا تھا۔ گلیوں کے چوہے، دیواروں پر کی گلہریاں یا کسی دور دراز مکان میں سے جھپٹا ہوا طوطا مُنہ میں دبائے ہوئے شیریں کے پاس آتا تھا۔ اور اس طرح سے شیریں کو ان اَدھ مرے جانوروں سے کھیل کُود میں مشغول کر لینے میں کبھی کبھی کامیاب ہو جاتا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے مشغلہ کے بعد پھر شیریں بیزار سی معلوم ہونے لگتی تھی۔ فرہاد کو اپنی ان ناکام کوششوں کو جاری رکھنے کے واسطے بھی بڑی مشکلوں کے سامنے کرنے پڑتے تھے۔ اب وہ قریب قریب روزانہ اقبال احمد کی زد میں آجایا کرتا تھا۔ لیکن معمولی جوتے، رول، پیپر ویٹ وغیرہ کی تواضع سے وہ کچھ زیادہ خائف نہ تھا۔ اسکی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ جس طرح سے بھی ہو وہ شیریں کا غم غلط کرے۔ لیکن اکثر شیریں اس کو نہ ملتی تھی اور وہ اُس کی تلاش میں کمروں میں بھی گھُس جایا کرتا تھا اور چونکہ فطرت سے مجبور تھا اس لئے اُس دن جب اُس نے کھُلے ہوئے نعمت خانے میں سے پنیر کی بُو سونگھی تو شیریں کی تلاش ملتوی کر دی۔ نعمت خانے کی طرف بڑھا لیکن جیسے ہی وہ اندر گھُسا دھڑ سے نعمت خانے کا دروازہ بند ہو گیا۔ فرہاد بڑے زور سے اُچھلا۔ اُس کا سر ڈھکنے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی ہاتھ میں سُتلی لئے اقبال احمد دوڑتے ہوئے نعمت خانے کے پاس آئے۔ فرہاد نے پھنکاریاں بھرتے ہوئے بیٹھ پر کے بال کھڑے کر کے پنجوں کے ناخن نکال نعمت خانے کی جالی کو کھڑکھڑا مارا ممکن تھا کہ وہ نعمت جالی کو نوچ کر باہر نکل بھاگے۔ لیکن مہلت ہی نہ ملی۔ پہلے تو چاروں طرف سے بیت پڑنے لگے، پھر فرشی دری دُہری کر کے نعمت خانے پر ڈال دی گئی۔ اب جو دروازہ کھُلا اور وہ اُس میں سے جھپٹا تو دری میں اُلجھا۔ خدا کی پناہ کس مصیبت کا سامنا تھا اُوپر سے دبا یا گیا، چاروں طرف سے دری کی تہوں میں لپیٹا گیا۔ اس لپٹنے کی حالت میں سانس گھٹتی تھی۔ ہاتھ پیروں کی ہڈیاں چاروں طرف کے دباؤ سے ٹوٹی جاتی تھیں۔ بچّے چلاتا تو کس طرح سے۔ اُلٹ اُلٹ کر ہر ہر پہلو سے رکھا گیا۔ پھر اُس کی دُم دری سے باہر کھینچ لی گئی جس پر کہ ایک سُتلی اس زور سے کھینچ کر باندھی گئی کہ تکلیف سے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ اس کش مکش کی حالت میں بڑی دیر تک وہ مُبتلا رہا۔ خدا خدا کر کے اس دری میں سے جب اس کو رہائی ہوئی تو اُس نے اپنے آپ کو ایک ٹین کے چھوٹے سے تنگ و تاریک ڈبے میں مقید پایا۔ اس کی دُم کے وسط میں اب بھی ایسی تکلیف تھی کہ اس کو معلوم ہوتا تھا کہ دُم وہاں سے کٹ کر گر جائے گی۔ وہ بیچارا سر گھما کر اپنی دُم تک مُنہ بھی نہیں لے جا سکتا تھا، کیونکہ گھُومنا مُشکل تھا۔ اس تنگ و تاریک قید خانے میں ہوا کا گذر تھا اور نہ روشنی کا۔ عُمر بھر میں پہلی مرتبہ اندھیرے سے سابقہ پڑا تھا۔ پنجے چلاتا تو وہ بھی کارگر نہ ہوتے۔ ناخن ٹین پر کچھ کھچاتے ہوئے پھسلتے تھے۔

اُس نے تکلیف اور غصہ میں "ناعاوں۔ ناعاوں" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی حالت میں گھنٹوں گذر گئے، اسے نہ معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی اس کا فولادی قید خانہ ہلتا تھا کبھی پھر ساکت ہو جاتا تھا۔ کبھی ہلتا تھا تو ہلتا ہی رہتا تھا یہاں اس کی یہ حالت تھی کہ دم گھٹتے گھٹتے بیچارا عجیب نیم بیہوشی کی حالت میں تن بہ تقدیر پڑا تھا۔ آواز بھی کمزوری سے نہیں نکلتی تھی اسی حالت میں اسے کچھ تازہ ہوا معلوم ہوئی اس نے لمبا سانس لیا، جان میں جان آئی۔ پھر اسے کچھ روشنی معلوم ہوئی اور تازہ ہوا بھی اور آئی۔ کوئی اس کا ڈبہ کھول رہا تھا۔ کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ یہ اب بھی پیش آنے والی ہر مہم کے واسطے پوری طرح تیار ہو گیا۔ ٹھک۔ ڈھکنا کھُلا۔ جھک سے اُجالا ہوا۔ فش شو! فرہاد پھنکارے اور بڑی زور سے اُچھلے۔ مسز کل "آئی مائی جینجز کرائیسٹ!" کی کیک بھرتی ہوئی صوفے پر پیچھے جھکیں اور فرہاد صاحب

چاروں پنجوں کے بیس سفید ناخن ہوا میں چلاتے ہوئے اُن کی گود میں آ ترے۔ مگر چونکہ دونوں میں ایک دوسرے سے کچھ بھی دلبستگی کا واسطہ نہ تھا اسلئے جس آنا فانا میں یہ وصل ہوا تھا اسی سے کم عرصہ میں دونوں میں فصل ہو گیا۔ بیگم صاحب غسلخانے کی طرف اور فرہاد صاحب برآمدے کی طرف بھاگے۔ ان کو تو غسلخانے کے دروازے بند کر کے امن حاصل ہو لیا۔ لیکن فرہاد بیچارے کی دُم کے پیچھے جھن جھنانی، جھن جھناتی ایک ایسی بلا دوڑ رہی تھی کہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔ جو جو یہ جان توڑ کر بھاگتا وہ وہ جھنجھنانی مصیبت اس کا پیچھا کرتی تھی۔

بھاگتے بھاگتے بیدم فرہاد حضرت گنج کے چوراہے پر پہونچے۔ وہاں پورے دو درجن سادہ سفید کپڑے والے لوگ مختلف قسم کے شیطانی مشاغل میں مصروف ہوا خوری کر رہے تھے جنہوں نے چاروں طرف سے فرہاد پر دوش کی۔ کسی کی گک بڑی، کسی کی بانکی اسٹک اور ایک ڈھائی فٹ کا چھت دری، تو ایسا ہلڑ نکلا کہ اس کا لنگڑا پنج فرہاد کی دُم پہ پڑا اور پڑتے ہی پیچ پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے اینچا تانی طرفین کی طرف سے ہوئی کہ فرہاد کو چار و ناچار اپنی آدھی دم وہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ خیر دُم گئی تو غم نہیں جان تو بچا لایا اور دُم کے ساتھ جھن جھنوں سے تو پیچھا چھوٹا۔ جو کہ تانبے کے تار سے اُس کی دم میں بندھے ہوئے اس کی دُم کے ساتھ بھوت کی طرح لگے ہوئے ڈرا ڈرا کر دَم ہی نکالے دیتے تھے۔ اب دُم اور دُم کے جنجال سے سبکدوش ہو کر ہلکا پھلکا بھاگا تو اُس نے سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ راستے، گلی، کوچے اور محلوں کے جاننے کی کیا ضرورت تھی۔ گھر کی سمت تک کے دریافت کرنے کی اس کو حاجت نہ تھی۔ قدرت نے بلیوں کو ایک خاص حِس اس امر کی دی ہے چاہے جہاں اور جتنی دُور اُن کو بند کر کے لے جاؤ اور چھوڑ دو، جب چلیں گی تو سیدھی گھر کی طرف۔ دُم شکستہ فرہاد بھی چھتیں، دیواریں، منڈیریں، گلیاں پار کرتے، کتوں سے بچتے، مرغیوں، کبوتروں اور چوہوں کے دل دہلاتے، پیٹتے پٹاتے اور راستہ بھر بقیہ دُم کے فاؤنٹین پن سے سرخ روشنائی کی بوندیں ٹپکاتے آخر گھر آ ہی گئے۔

لیکن زمانہ ایک حالت پر نہیں ٹھہرتا۔ فرہاد اور شیریں کی زندگی نے اب ایک نیا دور اختیار کر لیا تھا۔ محبت کی پُر مسرت جستجوئیں اور ناکامیاں، تہمتیں اور پریشانیاں مع اپنی پُر سحر دلچسپیوں کے ختم ہو چکی تھیں۔ اب ایک پھیکی اور سیدھی سادی زندگی یہ دونوں نسیمہ کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ فرہاد حلوائی کی دکان سے بالکل بے واسطہ ہو کر یہاں ہی دن رات رہتا تھا۔ اب اس گھر میں اس کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اقبال احمد نے یہاں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی انہی مسز کپل کو مسز اقبال بنا کر حضرت گنج میں رہنے لگے تھے۔

وہ غزالِ پاشکستہ سے سوا مظلوم نسیمہ بے زبان باس کی تیلی شیریں اور شیریں کے فرہاد ہی کیا گھر بار، کپڑا پیسہ بلکہ خود اپنی جان سے لاپرواہ ایک مسلسل اچنبھے (اور بے ہوشی کی سی) زندگی بسر کر رہی تھی۔ گو اقبال اب بھی اس کو پچاس روپے مہینہ خرچ کے لئے دیتے تھے۔ لیکن اسکو روپے کے ہونے اور نہ ہونے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس روپے سے دلچسپی رکھنے والے افراد یعنی رحمین اور عیدو تھے باورچی خانے اور کوٹھڑیوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ باقی ماندہ گھر پر بظاہر قبضہ شیریں اور فرہاد کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دونوں کمرے کوٹھڑیوں اور برآمدے کے کونوں کونوں میں پڑے پھرتے تھے۔ گھر میں ہر طرف گرد اور کوڑا، پھٹے ہوئے کاغذ اور کپڑوں کے چیتھڑے پڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ صحن میں جا بجا گھاس اُگ کر اس پر کپڑوں میں چپٹنے والی بالیاں اُگ آئی تھیں۔ مرغیوں کے دڑبے کے اوپر اور چاروں طرف چڑپٹے کے چھتے اُگے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی کے پار ایک اونچا اگالدان اتنے عرصے سے اوندھا پڑا تھا کہ اب وہ قریب قریب آدھا چولائی میں چھپ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے کونے میں عیدو کے کھائے ہوئے آموں کے درخت اُگ آئے تھے۔ خود نسیمہ کی چارپائی کو برآمدے کے ایک کونے میں ایک ہی جگہ پر پڑے پڑے اتنا عرصہ گذر گیا تھا کہ چارپائی کے نیچے فرش پر چوکور نشان الگ نظر آتا تھا۔

نسیمہ کا تمام وقت بیٹھے چھالیا کترنے یا "راہ نجات" اور "حلیمہ دائی" کی کتابوں میں سے کسی کو پڑھنے میں گذرتا تھا۔ اس کے پاس نہ صرف یہ دو کتابیں تھیں بلکہ کسی اور کتاب کے پڑھنے کی اس میں لیاقت بھی نہ تھی۔ یہ دونوں کتابیں اس کو حفظ سی ہو گئی تھیں۔ اور انہی کو بار بار پڑھتی رہتی تھی۔

حلیمہ دائی کی مختصر اور سادہ نظم کے ہر ہر شعر میں اسکو عجیب و غریب پُر اسرار کشف اور درد پنہاں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مقدس کتاب (جس کے اشعار کے لفظ بہ لفظ معنی بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی) ایک آنے والی پُر سکون اور اصلی زندگی کے مژدوں سے پُر تھی۔ وہ اسکو معصوم جذبے اور ایسے سچے اعتقاد کے ساتھ پڑھا کرتی تھی کہ آنسوؤں کی قطار اس وقت تک نہ ٹوٹتی تھی جب تک کہ کتاب اسکے سامنے رہتی تھی۔ اور چونکہ بیوی کے آنسو بہتے تھے اس لئے رحمین کا فرض تھا کہ خود

بھی ٹپ ٹپ بوندیاں آنسوؤں سے ساتھ دیں۔ یا کم از کم سڑ اسڑ ناک ہی سُونت سُونت کر پٹنگ کے پلنے سے پونچھتی رہیں۔

ایک روز سہ پہر کے وقت نسیمہ حلیمہ دائی کا قصہ پڑھ رہی تھی۔ حسب دستور رحیمن پلنگ کی پٹی پکڑے زمین پر اکڑوں بیٹھی سُن رہی تھی۔ نسیمہ دو پیسے والی کتاب کے پارہ پارہ اوراق کو دونوں ہاتھوں سے تکیہ پر دباتے ہل ہل کر ایک سادے درد انگیز میلاد کے راگ میں ایک ایک شعر کو دو دو اور تین تین بار ادا کر رہی تھی اور آنسو دوپٹہ سے پونچھتی جاتی تھی، کہ یکایک عیدوا اپنی ڈور لنگیا چھوڑ تھپڑ تھپڑ بھاگتا ہوا کوٹھے سے نیچے دوڑا آیا اور ہانپتا ہوا پاس آکر بولا "بیگم صاحب کوئی آیا ہے"

اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی نسیمہ نے مُنہ اونچا کر کے پوچھا "کون ہے کہتا کیوں نہیں"

"بیوی کیا معلوم کون ہے"

"اے رحیمن دیکھ جا کر، پوچھو کون ہے؟"

ڈیوڑھی سے بھرّائی، گھبرائی ہوئی آواز آئی "اقبال احمد۔ اقبال احمد۔"

نسیمہ کے مُنہ پر مسرت اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر درست کیا اور پھر "اے دیکھنا رحیمن میاں بھائی ہیں، میاں بھائی" کہتے ہوئے چارپائی سے نیچے اتری۔ سڑ پڑ سڑ پڑ جوتیاں پہنتی چار قدم آگے بڑھ کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔ رحیمن نے سمٹ سمٹ کر دوپٹہ سنبھالنے، ہنسی روکنے کے سو سو نخروں کے بعد ڈیوڑھی میں جھانکا پھر اندر دیکھیں، سمٹیں، آدھی ٹیڑھی ہوئیں، اور شیریں آواز نکالنے کی کوشش میں چلپ چلپ کر کے منمنائیں "آئیے میاں اندر آئیے"

لمبا قد، سفید کپڑے، سیاہ چھدری ڈاڑھی۔ چوڑا چہرہ، سُرخی مائل گندمی رنگ۔ ایک ہاتھ میں عصا دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ہینڈ بیگ۔ نسیمہ کے بھائی منشی کاظم حسین سب رجسٹرار تیزی سے گھر میں داخل ہوئے اور بیچ انگنائی میں جھک کر مستقل طور پر ساکت کھڑے ہو گئے۔ نسیمہ نے مجبوراً تیسری مرتبہ جھک کر تسلیم کی۔ نسیمہ کے بھائی نے باواز بلند کلمہ پڑھا "لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"

نسیمہ گھبرا گئی۔ شرم ولحاظ کو قدرے پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھی "خیر تو ہے، میاں بھائی۔ میرے اللہ خیر تو ہے۔ کیا بات ہے میاں بھائی"

منشی کاظم حسین صاحب نگاہیں نسیمہ پر یکساں جمائے ہوئے سیدھے ہی کھڑے کھڑے گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے ہوئے۔ عصا اور ہینڈ بیگ کو طمانیت سے زمین پر رکھ کر پھر ویسے ہی نگاہیں اب بھی نسیمہ پر جمائے ہوئے آہستہ آہستہ سیدھے ہوئے۔ دونوں ہاتھ اُٹھائے ماتھے اور آنکھوں پر سے پھیرتے ہوئے ڈاڑھی کی نوک تک لائے اور پھر قرعت سے "شکر الحمد للہ" کہا۔

یہ سین شیریں اور فرہاد دونوں کے سوا سب کے لئے پُر وحشت تھا۔ چنانچہ آگے آگے فرہاد اور اُنکے پیچھے شیریں، گھر کو چھوڑ زینے پر سے ہوتے ہوتے کوٹھے پر پہونچ گئے۔ اور کئی گھنٹے واپس نہ آئے۔

اِس عرصے میں بھائی بہن میں کافی گفت و شنید ہو جانے سے قدرے پھر سکون پیدا ہو گیا۔ کاظم نے بتایا کہ اس کو اقبال احمد کا تار ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اپنی بہن کا آخری دیدار کرنا ہے تو آکر دیکھ لو کیونکہ وہ حالت بیماری میں دم توڑ رہی ہے۔ گھنٹوں کی جان ہے۔

نسیمہ نے اب اپنی پوری سرگذشت سُنائی اور اقبال کیا کہ بیشک وہ اپنے خطوط میں ان کو صحیح حالات سے آگاہ نہ کرتی تھی۔ اور بیشک بھائی کے بلاوے کے خط اس کو ملے جن کا وہ کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ اس نے اس وقت بھی زار و قطار روتے ہوئے ہچکیاں لے لیکر کہا "میاں بھائی، آپ جئیں ہزاروں برس، پھلیں پھولیں۔ خوشیاں گھر بہوئیں لائیں۔ یہی میری دُعا ہے یہی میری تمنا ہے۔ لیکن سمجھئے تو میرا تو یہی گھر ہے۔ جیتے جی اب اس کو کیسے چھوڑوں۔ اسی گھر کی دہلیز پر میرا دم نکلے یہی میری آرزو ہے۔ قسمت کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اس گھر کو چھوڑوں تو دُنیا اور آخرت دونوں میں مُنہ کالا ہو۔ یہ میرا گھر ہے مَیں اسکو کیسے چھوڑ دوں"

کافی احتیاط اور بار بار آزمانے کے بعد یہ دونوں گھر میں تو آ گئے لیکن رات بھر سوتے ہوئے کاظم حسین کی ڈاڑھی اور ڈنڈے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے اور صبح اُن کے بیدار ہوتے ہی یہ دونوں پھر گھر سے بھاگ کر کوٹھے پر پہونچ گئے۔ اور کوٹھوں کوٹھوں پھرنے لگے۔ فرہاد نے برابر ہی کے دو منزلہ مکان کے زینے میں دھنّی کے اندر چھپا ہوا گلہری کا ایک جھونجھ ڈھونڈ لیا۔ یہ بڑا ہی پُر لطف مشغلہ تھا۔ شیریں اور فرہاد بار بار لکھوری اینٹوں کی دیوار میں پنجے جما کر دھنّی تک چڑھنے کی کوشش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ حالانکہ وہاں تک پہونچنا اُن کے لئے ناممکن تھا۔ پھر بھی اُن کو دیوار پر چڑھنے اور گرنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔ کیونکہ گلہری کا خاتم کانس پر بیٹھی دم ہلاتے پُر رر

چرچر چہ رر ایک سماں شور مچا رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں اور خوش ہو ہو کر اوران کو ڈرا رہے تھے۔ لیکن اسی اثنا میں شیریں کو اپنے گھر میں بڑی پاٹ دار آوازیں جھر جھراتی اور تھر تھراتی سنائی دیں۔ فوراً اس کا دل کھٹکا نسیمہ کی یاد آئی۔ سیدھی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اقبال احمد اور کاظم حسین گھر کے آنگن میں کھڑے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے پر زبانی حملے کر رہے تھے۔ نسیمہ باورچی خانہ کا کھمبا پکڑے گھڑی ہچکیاں لے رہی تھی۔ رحیمن زمین پر اکڑوں بیٹھی، نسیمہ کی پنڈلی پر ماتھا ٹیکے رو رہی تھی۔ وہ مہینوں بلکہ برسوں بیوی کی خوشنودی کے واسطے حلیمہ دائی کے قصے پر نسیمہ کے ساتھ روتی رہی تھی۔ اس لئے مہینوں نہیں بلکہ برسوں دو آنے سیر کا نمک لاکر دیا تھا۔ لیکن یہ نچی اور بیٹھے کی باتیں تھیں۔ آج ان سب جذبات کو ایک طرف کر کے وہ دل توڑ توڑ کے رو رہی تھی۔ آج اس کا دل نسیمہ کی معصوم ہستی، نسیمہ کی پاک و سچی ذات اور صرف ذات ہی سے جدا ہونے کے غم میں بیٹھا جاتا تھا۔

برآمدے میں گھڑونچی کے پاس عبدو کھڑے رو رہے تھے اور کٹورے پر کٹورا پانی کا پی رہے تھے۔ آج ڈوری، لکیوں، لٹو اور بھرکیوں کی محبت غائب ہو کر ایک سچی اور پیاری بہن، ماں سے بھی زیادہ مشفق دیوی سے چھٹنے کا غم ان کو بیتاب کئے ہوئے تھا۔ اسی وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کی کتابوں کا جزدان بن جائے اور ہمیشہ کیلئے اس کے ساتھ چلا جائے۔ چونکہ یہ خیال بار بار ناممکن معلوم ہوتا تھا اس لئے پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا اور پھر پھر کٹورے پانی پیتا تھا۔ شیریں کا بس نہ چلتا تھا کہ کیونکر اقبال احمد اور کاظم حسین دونوں کا ٹینٹوا چبا جائے۔ اس کو اس سے کچھ واسطہ نہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ایک دوسرے پر گلے پھاڑ پھاڑ کے چلانا بہت ہی ناگوار تھا۔ وہ نسیمہ کے پیروں کے اردگرد بار بار پھرتی تھی اور بیکس ماؤں ماؤں کرتی تھی۔

سسکیاں، ہچکیاں، ماؤں ماؤں، کچھ کام نہ آئے۔ تو پھر یوں اجڑا۔ اور یوں اجڑا نسیمہ کا چھوٹا سا گلشن جس میں بہار آتے ہی جا چکی تھی۔ جو برسوں سے پامالِ خزاں پڑا سسنا تا تھا۔ آج وہ بھی نہ رہا۔ چل چلاؤ۔ خاتمہ۔۔۔ خاتمہ۔

کچھ سامان اِدھر سے اُدھر ہوا، کچھ اندر سے باہر، کچھ باہر سے اندر۔ مٹی کے چند گھڑے پھوڑے گئے۔ کچھ کاغذات پھاڑے گئے۔ کچھ پھٹے پُرانے کپڑے بانٹے گئے، کچھ پھاڑے اور پھینکے گئے۔ چینی کے ٹوٹے برتن، خالی ٹین اِدھر اُدھر اور پھینکے۔ گھر کا کوڑا دو چند اور سہ چند ہوا یعنی نسیمہ کا اسباب بندھا اور ٹھیک ہوا۔ بند گاڑی کھڑکھڑاتی آئی۔ سامان رکھا گیا۔ نسیمہ نے مڑ کر اس سات برس پُرانے قیدخانے کو پھر دیکھا۔ آخری مرتبہ پھر آبل کر رو دی۔ شیریں کیا کرتی ماؤں ماؤں کرتی ایک سماں صدقہ ہوتی تھی۔

کاظم حسین نے گھر کا: "بس رو چکیں۔ اب بھی دل نہیں بھرا؟ اُٹھو خدا کے لئے۔"

نسیمہ نے شیریں کو گود میں لے لیا اور بھائی کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل گاڑی میں سوار ہو گئی۔ جانوروں کو بھول جاؤ۔ ان سے بے توجہ ہو جاؤ تو اس کا ان کو شکوہ نہیں ہوتا۔ محبت اور توجہ کرو تو وہ مشکور ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ شیریں کو آج پورے ایک برس کے بعد نسیمہ نے گود میں لیا تھا۔ اس کو اس کی انتہا سے زیادہ خوشی تھی، حالانکہ گاڑی کی کھڑکھڑ اور ہل چل اور دھچکوں سے وہ بہت گھبرا رہی تھی لیکن نسیمہ ہی کے چمٹی بیٹھی رہی۔ گاڑی اسٹیشن پر پہونچی، تھرڈ کلاس کا مسافرخانہ آیا، سامان اُترا، یہ لوگ اُترے لیکن یہاں بے شمار اجنبی آدمی ہر طرف پھیلے ہوئے آجا رہے تھے اور ان میں پچاسوں خوفناک کتے بھی پھر رہے تھے۔ شیریں کا نسیمہ کے برقعے کے اندر دم گھٹتا تھا۔ باہر ان سب کو دیکھکر دل دہلتا تھا۔ یہاں آکر وہ بہت پریشان تھی، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کدھر جائے اور کدھر چھپے۔ ایک دفعہ ہاتھوں سے نکل، کھوئی ہوئی نسیمہ کے پیچھے پہونچی۔ دو کتے اس پر جھپٹے بیچاری بھاگی اور ایسی بھاگی کہ پھر نہ اُسے پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور نسیمہ کدھر ہے۔ فطرت کا تقاضہ تھا کہ چل اسی گھر کی طرف چل۔ عقل کوتاہ بھی یہی کہتی تھی۔ وہی گھر، وہیں ہوگی ہونگی۔ چنانچہ آٹھویں حواس کی مد سے یہ روانہ ہوئی اور سیدھی گھر کی طرف چلدی۔

جس وقت وہ گھر پہونچی دن کے دو بجے تھے۔ اکا دکا چیلیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بگولے چھت پر سے ہوتے ہوئے صحن میں اُترتے تھے اور صحن کے کونے میں چکر لگا کر غائب ہو جاتے تھے۔ یہاں کاغذ کے پُرزے جھاڑو کے تنکے، دونوں کے پتے بار بار اِدھر اُدھر سے لپک لپک کر گول گول چکر، گھمنیاں کھاتے ہوتے چھت کی طرف اُڑتے تھے اور پھر یاس اور حسرت کی حالت میں گر گر کر بے حس ہو جاتے تھے۔ گھر میں ہر طرف کوڑا تھا۔ باورچی خانے کے سامنے کوئلے کا گھڑا ٹوٹا پڑا تھا۔ کوئلے اور راکھ بکھری پڑی تھی۔ برآمدے میں نسیمہ کی برسوں پُرانی چارپائی، برسوں پُرانی جگہ سے دور دو پاؤں پر دیوار سے لگی کھڑی، اوپر کے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا کی

حالت میں گریاں معلوم ہوتی تھی۔ ان کے پاس رحیمن کا ٹین کا پاندان خالی اور اوندھا پڑا رو رہا تھا۔ خاموش دنیا سے علیحدہ راہبوں کی سی زندگی بسر کرنے والے اس گھر کے تین نفر برسوں سے اس اجڑے ہوئے گھر میں سب سے الگ تھلگ چھپے پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی طرح کا ان کے وجود سے دنیا پر کوئی بار نہ تھا نہ یہ دنیا میں مخل تھے مگر آج وہ بھی نہ تھے۔ ڈیوڑھی میں تالا پڑا تھا۔ گھنٹوں شیریں اور فرہاد ماؤں ماؤں کرتے پھرے مگر سب بے سود۔ شام ہو گئی، اندھیرا چھانے لگا مگر اس گھر میں چراغ جلانے والا کوئی نہ آیا۔

اقبال احمد کی صورت سے ایک سے زیادہ دوسرے کو نفرت تھی۔ شیریں اور فرہاد دونوں اس کو حقیر اور ذلیل نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جو کچھ ہو وہ پرانے دوست نہ تھے تو نہ سہی مگر تو یہ ان ہی کا تھا، اس ظالم کو کیا حق تھا کہ یہ اس طرح سے گھر میں گھس کر کھڑ بڑ کرتا، سامان اٹھاتا رکھتا پھرے۔ ان دونوں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی بھگتنا پڑے وہ گھر کو نہ چھوڑیں گے۔ کمروں میں سامان کے پیچھے چھپے ہوئے یہ دونوں اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک اقبال احمد ان کے پاس نہ آ جاتا تھا۔ پھر دونوں وہاں سے بھاگ کر دوسرے کمرے میں اور سامان کے پیچھے جا چھپے تھے۔ اقبال احمد پسینے میں شرابور، منہ میں سگار دبائے، میزوں اور کرسیوں کو گھسیٹتے، چارپائیوں کو دھکیلتے، برتنوں کو کھڑکھڑاتے مسلسل دو گھنٹے تک پھرتے رہے۔ اسکے بعد انہوں نے کمروں میں تالے لگاتے، گھر سے باہر نکلے، ڈیوڑھی میں تالا لگایا اور سیدھے بی آسٹن پر بیٹھ کر گرد میں اڑتے چلدئے۔ یہ واقعہ نسیمہ کی روانگی کے دوسرے روز ہوا اور اس طرح شیریں اور فرہاد سچے عاشق و معشوق کی طرح ایک ساتھ رہنے کے واسطے کمرے میں بند چھوڑ دئے گئے۔

کچھ دیر تو اپنے اس طرح قید ہو جانے کی اہمیت کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ گھر میں خاموشی ہو جانے کے بعد انہوں نے کمرے کے بے ترتیب سامان میں چھپل چھپیا کھیلی۔ سامان جس قدر تتر بتر تھا۔ اتنی ہی ان کو اس سے دلچسپی تھی۔ کیونکہ اس میں سے ایک آدھ چوہے یا چوہیوں کی کھسکھساہٹ معلوم ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی ان کی جھانکتی ہوئی کھوپریاں ان کو نظر آتی تھیں۔ کافی جستجو کے بعد فرہاد نے ایک چوہا بھی پکڑ لیا اور جب اسے ادھ مرا سا چارپائی پر لایا تو برابر کی میز کے اوپر رکھی ہوئی کرسی کے ہتے پر سے شیریں نے جست کی اور چوہے کو چھین لیا۔ کچھ دیر تک چھینا جھپٹی ہوا کی۔ لیکن اب شام ہو رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا تھا

ختم برسات کی گرمی سے کمرے میں گھٹن معلوم ہوتی تھی۔ مرے ہوئے چوہے کو چھوڑ کر یہ دونوں دروازے کے پاس آئے بار بار اس کے سامنے ٹہلے، پنجوں سے کھس کھسایا۔ کمرے میں چکر لگایا اور پھر دروازے کے پاس آ گئے۔ اس کمرے کا یہ ہی ایک دروازہ تھا۔ دوسرے راستے کی تلاش بیکار تھی۔ پھر بھی یہ کمرے میں بار بار چکر لگا کر ساری رات اور دروازوں کی تلاش بھی کرتے رہے اور ہر جگہ میں اس دروازے کی دراز میں ناک رگڑتے تھے۔ ان کو اس کمرے میں کھانے کے واسطے مطلقاً کچھ میسر نہ تھا۔ ایک کونے میں البتہ تانبے کی ٹھکی میں پانی بھرا رکھا تھا اور اس کو چاٹ چاٹ کر باہر نکلنے کی بے سود کوشش میں متواتر پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوسرا دن بھی گذر گیا۔

بلیاں چوہے کا شکار شوقیا کرتی ہیں اور صرف سر چبا کر اسکو پھینک دیتی ہیں۔ انکے مذہب میں چوہا کھانا جائز نہیں ہے۔ اب بھوک کے مارے یہ حالت ہو گئی تھی کہ روز گذشتہ کا مرا ہوا چوہا دونوں نے ملکر خوب کھایا اور اب جو پیٹ میں غذا پہونچی اور بھوک میں چوہے کے گوشت کی لذت معلوم ہوئی تو دونوں نے ملکر اب چوہوں اور چوہیوں کی تلاش شروع کر دی لیکن افسوس کہ ان کی متواتر بتیس گھنٹے کی موجودگی کی وجہ سے یہاں کے سب چوہے اور چوہیاں اس کمرے اور اس کمرے کے بلوں پر لعنت بھیجکر چلدئے۔ غرض یہ کہ بھوکے پھرتے پھرتے ان کو چار دن اور چار راتیں ہو گئیں۔ اب یہ دونوں کونوں کھدروں میں سے جھینگروں کو تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ صرف پانی زندگی کو کہاں تک برقرار رکھتا، جو جو وقت گذرتا گیا ان کی قوت زائل ہوتی گئی۔ اب یہ دونوں کمرے کے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے "ماؤں اور عاؤں" کی صدائیں از خود نکالتے تھے۔ ان کے چکرائے ہوئے دماغ اور دھندلی آنکھیں ہر کونے میں انہیں جھانکتے ہوئے چوہے اور چوہیاں دکھاتی تھیں۔ یہ بار بار امید کی قوت پر اٹھکر جاتے تھے اور پھر ڈگمگاتے ہوئے "ماعوں۔ ماعوں" کی دم توڑ آوازیں نکالتے دروازے کے پاس آ جاتے تھے۔

جو جو وقت گذرتا گیا۔ ہاتھ پیر اور حواس جواب دیتے گئے۔ آوازیں کمزور ہوتی گئیں اور ان کے درمیان وقفے زیادہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ دسواں دن بھی گذر گیا۔ شیریں جو فرہاد سے کچھ دور پڑی تھی خاموش ہو گئی۔ فرہاد اب بھی آدھ آدھ گھنٹے کے بعد نحیف "عععا" کی آواز نکالتا تھا اس کی کمزور آنکھیں کبھی کبھی از خود روشنی سے منور ہو جاتی تھیں۔ وہ چاروں طرف غذا کی تلاش کرتی تھیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ انکی آخری

دُم کے سنبھالوں میں۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک طرف گوشت کا چھوٹا سا ڈھیر معلوم ہوا۔ پچھلے پیروں کو زمین پر گھسیٹتا ہوا اگلے پنجوں کے سہارے آگے کھسکتا بڑھا مگر وہاں آیا تھا۔ دھوکا تھا۔ گوشت نہ تھا اس کی محبوبہ شیریں کا خشک ڈھانچہ آخری اور کمزور سانسیں اب بھی لیتا ہوا موجود تھا۔ ہاں شیریں، وہی شیریں تھی۔ اس کو دیکھا۔ سونگھا گھوما اور رکھے انجوں انجوں پنجوں سے ٹٹولا۔ دھڑ لوٹ گھسیٹتا دروازے کی دراز تک آیا اور پڑ گیا۔ ایک ایک منٹ کئی کئی گھنٹے کے برابر تھا۔ چکر تھے۔ غنودگی۔ پھر زندگی کی لہر سی دوڑی، خون میں ہیجان سا ہوا۔ آنکھوں میں بصارت آئی اور پھر وہی گوشت کا دھوکا ہوا۔ فرہاد پھر گھسٹتا ہوا اس طرف گیا مگر گوشت نہیں وہ تو شیریں تھی۔ اس نے سونگھا بو تھی، شیریں کی بو تھی۔ اور شیریں کی بو میں گوشت کی بو تھی۔ اس نے چاہا پھر یہاں سے واپس ہو لیکن نقاہت نے مجبور کر دیا۔ اسی کوشش میں اس کا سر بے قابو ہو کر کچھ سے زمین پر گرا۔ بے ہوشی سی چھا گئی۔ اور جب ہوش آیا تو گوشت کی بو آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شیریں کا تنِ لاغر اب بھی بقیدِ حیات تھا۔ دفعتاً فرہاد کے ناکمل حیوانی دماغ نے شیریں اور غذا دونوں کو ایک ہی نقطۂ خیال میں وابستہ کر دیا۔ ایک ایک انگل آہستہ آہستہ اس نے اپنا سر بڑھایا، جبڑا کھولا اور شیریں کا گلا دبایا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں، فرہاد کو دیکھا اور آخری مرتبہ خفیف "باؤں" کی آواز نکالی۔ فرہاد نے پورا زور لگا کر تیز دانت شیریں کے نرخرے میں گھسا دئے اور پھر ساکت سا ہو گیا۔ اس سے زیادہ قوت اب اس میں نہ تھی۔ رستے رستے سوکھے ہوئے خون کی چند بوندیں نکل کر زبان پر آئیں۔ دو دو بوند اور دو دو بوند خون اس کے حلق سے اترا، اور آہستہ آہستہ قوت کا ہیجان فرہاد کے دست و پا میں پیدا ہوا۔ اب اس نے گوشت بھی کھایا۔ اور قوت آئی۔ پیاس معلوم ہوئی، مشکل میں جا کر پانی پیا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ ہاتھ پیروں میں جان آ گئی۔ اصلی تڑپتی ہوئی بھوک از سرِ نو پیدا ہوئی۔ اب یہ معمولی غذا کی طرح شیریں پر جھک گیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد چند ہڈیوں کے سوا شیریں کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

طویل فاقے کے بعد شکم پُر فرہاد نشہ کی حالت میں ایک صندوق پر بیٹھ کر نیند کے جھونکے لینے لگے۔ اور ابھی اسی حالت میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر گھر میں کھٹ پٹ ہوئی۔ اقبال احمد اور چند ملازموں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس کمرے کے دروازے کی کنجی کھڑکی۔ دروازہ کھلا۔ تھکے، نشے میں چور، کمزور اور پیٹ پھولے ہوئے فرہاد بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ڈگمگاتے، جھومتے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل زینے پر سے ہوتے ہوئے کوٹھے پر چلدئے۔

عرصے تک لوگوں نے بدہیبت، سیاہ، دُم کٹے بِلّے کو بھیانک آوازیں نکالتے۔ دیواروں دیواروں پھرتے دیکھا۔ عقل اور حافظہ سے مجبور فرہاد اس واقعے کے بعد مدتوں شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں اور گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔

فرہاد، اے حیوانی فرہاد، ناشنیدہ ظلم کے بانی فرہاد، تیری ہستی قابلِ قدر ہستی ہے۔ شیریں کی موت کتنے ہی بُرے پہلو کیوں نہ دیکھی جائے، وہ ایک موت تھی جو آناً فاناً میں آ گئی جس کے مصائب وہیں ختم ہو گئے۔ مگر آہ نسیمہ تجھ کو موت کب آئے گی۔ تیری مصیبتیں کب ختم ہوں گی، تو کب تک بھائی کے گھر میں روٹیاں تھوپے گی۔ برتن مانجھے گی اور کب تک بدمزاج ضدی بھتیجے بھتیجیوں کے زیرِ مشق رہے گی۔

سیّد رفیق حسین

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں دنیا والوں کو سلامِ رخصت کر رہی تھیں۔ آسمان کسی قدر بدلیوں سے گھرا ہوا تھا اور فضا میں وہ مست اور نشیلی کیفیت موجود تھی جو خاص موسمِ بہار ہی کا حصہ ہے۔ فارس کے ایک قہوہ خانہ میں چند زندہ دل اور پُرجوش حضرات بلّوریں جام میں دو آتشہ پی رہے تھے۔ ان کی خمار آلود آنکھیں ایک نازک گلرنگ حسینہ کے اندازِ رقص کا تماشہ کر رہی تھیں جو ساز کے آہنگ سے وابستہ ہو کر فردوس بریں کی لذتوں کو بھی دعوتِ مقابلہ دے رہے تھے۔ چند ہی لمحوں کیلئے سہی لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت ان افراد کو زندگی کا سب سے دلفریب نشاط حاصل تھا۔

معاً اس رنگ و بُو کے دور میں ایک نئے شخص کی آمد سے کسی قدر خلل واقع ہوا۔ نسرلی تانوں اور لطیف جنبشِ اعضا کے درمیان فوجی بُوٹ کی چرچراتی ہوئی آواز اور بھاری بھرکم پیروں کی زبردست چاپ یقیناً اُن پر گراں گذری جن کی عشرت کا طلسم شکست ہو چکا تھا۔ اس باغ و بہارِ انجمن میں وہی ایک افسردہ خاطر معلوم ہو رہا تھا اور اس کی آمد اتنا ہی غیر موزوں تھی جتنا گلہائے رنگا رنگ کے درمیان زاغ کی۔ نووارد نے فوراً ہی اپنی غلطی محسوس کی اور وہ خاموشی کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ کر گرم قہوہ کی دو پیالیوں سے اپنی خستگی اور ماندگی رفع کرنے لگا۔ چند بے فکروں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور رقص و سرود کی محفل پھر فوراً ہی قائم ہو گئی۔

لیکن اس نغمہ کے باوجود نووارد کی جاذبِ نظر ہستی قہوہ خانہ کے بعض افراد کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکی کیونکہ وہ اگرچہ سن و سال میں چالیس تک پہونچ چکا تھا پھر بھی اُس کے مضبوط قویٰ اور سڈول جسم ظاہری وجاہت کو دوبالا کئے دیتے تھے۔ رنگ کسی قدر گندمی مائل تھا اور چہرہ ریش و بروت سے پاک۔ اس کی وضع قطع نہایت ہی انوکھی تھی اور بادی النظر میں کوئی شخص اس کی وطنیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ عالمِ طفلی ہی میں اپنے گھر بار کو خیرباد کہکر ملکوں ملکوں ایک خاص چیز کی تلاش میں مارا پھرا اور آج تقریباً بیس سال کی سیر و سیاحت کے بعد وہ اپنے مکان کو لوٹ رہا تھا۔ چنانچہ اُس کے چہرے پر بیک وقت افریقہ کی چلچلاتی دھوپ، سائبیریا کا کڑکڑاتا جاڑا، برازیل کی بھیگی راتیں، اور کشمیر کی رنگین بہار کے اثرات بخوبی نمایاں تھے۔ جب بیدکہ وہ ٹھیک کر کھڑا ہوتا تھا وہ تبت کے جنگلوں کی پیداوار تھی۔ اس کے ہیٹ نے کتنی ہی بار اُسے آسٹریلیا کے تپتے ہوئے میدانوں کی دھوپ سے پناہ دی تھی اور اُس کے دونوں گال عرب کی گرمی سے کسی قدر جھلس گئے تھے۔ کوہ قاف کی سپید پریاں اُس کی نظروں سے گذر چکی تھیں۔ اور حبش کے سیاہ دیو بھی۔ وہ دنیا کے سب سے وحشی قبائل اور سب سے مہذب قوموں کا غائر مطالعہ کر چکا تھا، لیکن اب یہ سیر و سیاحت ختم ہو چکی تھی اور اُسے اپنے گھر واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ہوٹل میں مے کا دَور ختم ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ساقی کی جلوہ طرازیاں بھی۔ مست نغموں کی بجائے اب ہر طرف خاموشی مسلط تھی، عیش پرست مہمان یکے بعد دیگرے اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو رہے تھے۔ خوبصورت رقاصہ بھی اب جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اور جب فوراً ہی بعد وہ نووارد پر نگاہِ غلط انداز ڈالتی ہوئی جانے لگی تو معاً اُسکے نازک لبوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

"کون؟ خالد؟"

"ہاں" اجنبی نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا "میں دیکھتا ہوں کہ ان بیس برس میں میرے گھر کی فضا میں بالکل ہی انقلاب آ چکا ہے… … اور کسی قدر تم میں بھی"

"تقاضائے فطرت و حاجت۔ کیا تمہاری آرزوئیں پوری ہو گئیں؟"

"میں ناکام و نامراد واپس آیا ہوں"

"میں نہ کہتی تھی کہ یہ سب صرف واہمہ ہے، حقیقت سے دور۔ خیر! گھر چلو نا"

"جاؤں گا۔ تم جاؤ۔ شب بخیر نسرین!"

آج پچیس برس گذرے جب خالد نے ایک خواب متواتر تین شب دیکھا۔ خواب تھا یا طلسم، واہمہ تھا یا سحر، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ صرف عالمِ رویا کے محسوسات انسانی نظام پر اتنا زبردست اثر نہیں ڈال سکتے۔ ایک سفید ریش بزرگ ظاہر ہو کر اُسے یقین دلایا

کہ وہ دنیا میں ایک غیر معمولی دولت کا مالک بن کر آیا ہے۔ ہیرے، اور جواہر، لعل و زمرد اسے روپے کو ملیں گے انسانوں میں وہ ممتاز ہوگا بلکہ ایک اہم جماعت کا حکمران بھی، اور اسے ایک ایسی ہستی ملے گی جو وفا ہی کے لئے تخلیق کی گئی ہے ــــــ بے شک وہ ... بیشمار و حسین اس کی خواہش کے مطابق۔

مگر یہ چیزیں باآسانی حاصل نہ ہوسکیں گی۔ انہیں ڈھونڈنکالنے میں اسے بڑی بڑی زحمتیں پیش آئیں گی، زبردست صعوبات برداشت کرنی ہوں گے۔ قدرت اپنی نعمتوں کی بخشش میں فیاض واقع نہیں ہوئی۔ البتہ جس جگہ پر یہ چیزیں ہیں وہاں ان کی دریافت کی سہولت کیلئے چند علامتیں اور نشانیاں بھی رکھدی گئی ہیں۔ مدفون خزانے کے پاس ایک درخت ہے جس پر حروف "محنت و استقلال" کندہ ہونگے اور ایک تیر ان الفاظ کی طرف اشارہ کرتا ہوا ہوگا۔ حکومت اور فرمانروائی کا پیغام تمہیں تین بزرگ اور معزز ہستیاں لائیں گی جن کا سردار عصائے حکومت تمہارے حوالے کریگا۔ اور وہ خاتون اپنے سینے پر دل کا ایک سرخ نقش آویزاں کئے ہوگی اور شادی کی درخواست پر بیساختہ کہہ اٹھے گی "یہ سرخ نقش اس کی دلیل ہے کہ میرا دل اب تک تمہارے لئے خون روتا رہا۔ اب یہ آئندہ تمہارے عشق کے خلوص کی یادگار بن کر رہے گا......"

یہ تھا وہ خواب جس کے طلسمی اثرات کے ماتحت خالد پچیس برس تک دنیا کی خاک چھانتا رہا صدہا زحمتیں برداشت کیں، ہزاروں مصیبتوں کا مقابلہ کیا، پھر بھی درِ مقصود حاصل ہونا تھا نہ ہوا۔ آج وہ غمگین و پژمردہ اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا۔ اُف، اُس کی بیوہ ماں اُس کے جانے کی کس قدر خلاف تھی۔ رخصت ہوتے وقت اُس کی آنکھیں کتنی اشک آلود ہوگئی تھیں مگر اُس وقت دل میں حوصلہ اور اُمنگ کا طوفان تھا جسکے سامنے ماں کی التجائیں بیکار گئیں۔ آج پھر اُسی ماں سے ملنا ہے جس کا غمزدہ چہرہ ہر وقت اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

خالد نے رات انہی پریشان خیالوں میں کاٹی اور صبح کے وقت وہ اپنے مکان کو روانہ ہوا جو قریب ہی چند میل کے فاصلے پر تھا۔ نسیم سحری کی مستانہ خرامیاں معشوقانہ بے اعتنائی سے جادو جگا رہی تھیں آفتاب پھوٹ پھوٹ کر خون رو رہا تھا اور طیور کی نغمہ سرائی سے حسرت و مایوسی ٹپک رہی تھی۔ بستیاں جن میں ان بیس برس کے اندر تہذیب و تمدن کا دلفریب اثر نہایت ہی نمایاں ہو چکا تھا وہ بھی اپنی دلکشی اور خوبصورتی سے معرا معلوم ہو رہی تھیں۔ سامنے قبرستان میں بعض لوحوں پر وہ نام کندہ تھے جن کی شوخی اور زندہ دلی کبھی ہر محفل کو گرمائے رکھتی تھی مگر جو آج ہمیشہ کیلئے خاموش تھے سامنے ہی اُسے اپنا پرانا بوسیدہ مکان نظر آیا، جس کی دیواروں پر کائی کا سبز غلاف ترقی کے بجائے تنزلی کے آثار ظاہر کر رہا تھا مگر ان بیس برس کے بعد بھی اس میں وہی اگلی جیسی مقناطیسی کشش اور جاذبیت باقی تھی۔

کس گرمجوشی اور مسرت سے یہ دو بچھڑے ہوئے ملے ہونگے، کونسا تسکین دنیا زمندی کا طوفان ان کے دلوں میں لہریں مار رہا ہوگا، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ماں اور بیٹے کی ملاقات، وہ بھی ان حالتوں کے ماتحت، قلم سے بہتر تصور ہی اندازہ کرسکتا ہے۔

ایسے چند گھنٹوں کے بعد آفتاب پھر اپنی مغربی منزل کی طرف گامزن تھا۔ فارس کی شام موسم بہار میں دنیا کو خلد کا ٹکڑا بنا دیتی ہے۔ اس وقت بھی ترچھی شعاعیں ہر خس و خاشاک کی رعنائی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ طیور موسم بہار کی لطیف فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ ایسے میں خالد نے جس کی شوخ طبیعت اُسے نچلا بیٹھنے نہ دیتی تھی، ترکش سے تیر لیکر تفریحاً ایک اڑتے ہوئے پرندے کی طرف چھوڑا اور وہ اُس کو چھیدتا ہوا ایک درخت کی شاخ میں اٹک گیا۔ اُف، حیرت و استعجاب کی انتہا نہ تھی جب خالد نے وہاں پر الفاظ "محنت و استقلال" کندہ دیکھے جو رفتہ رفتہ اسے خیال آیا کہ اُس نے خود ہی بچپن میں اس شاخ پر کھود دے تھے، کیونکہ وہ اس کی کسی پسندیدہ نظم کا عنوان تھا۔ آج اگرچہ وقت نے اس نشان کو دھندلا کر دیا پھر بھی اب تک بخوبی پڑھے جا سکتے تھے۔

"قدرت کی ستم ظریفی!" خالد نے دل میں کہا۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہے کہ جس خزانے کی تلاش میں میں نے دنیا کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالا وہ خود میری ماں کی زمین میں میرے مکان کے بالکل قریب مدفون ہے"

اور اُسے نکالنے کا کام دوسرے دن پر ٹال کر وہ شاداں و فرحاں واپس چلا آیا۔

بستی کے چند لوگ اُس سے ملنے کے شوق میں اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں خالد کی نظر سب سے پہلے تین بوڑھوں پر پڑی جو معانقہ کیلئے آگے بڑھے تھے ان کے درمیان خود اُس کا حقیقی چچا بھی موجود تھا جو اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اب بھی قوی اور توانا نظر آرہا تھا اور جسے نیک مزاجی اور عقل سلیم کے باعث قرب وجوار میں ایک خاص عزت حاصل تھی۔ اُس نے کہا "خالد! میرے آنے کی غرض تم سے ملنے کے سوا ایک اور بھی ہے۔ یہاں کے مکتب کا اُستاد پرسوں انتقال کر گیا ہے اور

(بقیہ صفحہ ۱۷۰)

سلوما

"آج کی ناکامی نے تو میری کمر توڑ دی" میں نے کمبل اوڑھتے ہوئے زبینڈو پدھان سے کہا۔ "اس سیاہ ببر کے پیچھے میرے تین مہینے خراب ہو چکے۔ افسوس! میں اسے دیکھ بھی نہیں پایا...... کل آرام کرکے پرسوں ضرور کیمپ توڑ دونگا اور ہاں۔ شکار کمپنی کا بل بھی تو قریب دو ہزار کے ہوگیا۔ زبینڈو تمہاری کیا رائے ہے؟" زبینڈو نے کچھ اردو اور کچھ زولو الفاظ سے مرکب زبان میں جواب دیا جسکا مطلب یہ تھا کہ وہ پہلے ہی سے کہہ رہا ہے کہ سیاہ ببر کبھی مارا نہ جائیگا کیونکہ وہ شیر نہیں بلکہ بھوت ہے۔ جب تک اُسکے اگلے داہنے پیر میں چاندی کا کڑا ہے وہ اپنی سیاہ کاریوں سے باز نہ آئیگا اور یہ کہ افریقہ کے کل قابل شکار جانوروں کی کافی تعداد میں مار چکا تھا اور محض سیاہ ببر کی لالچ میں پڑا رہنا بیکار ہوگا۔

اس کمبخت سیاہ ببر کی ہسٹری بھی عجیب ہے۔ مقامی لوگ اسکو پچھلے پندرہ سال سے دیکھ رہے ہیں۔ اسکا رنگ صدر نشینان جہنم کے اعمالناموں سے زیادہ سیاہ ہے۔ خونخوار آنکھیں جیسے خون کی طرح سُرخ، جن میں سے دن کے وقت بھی لال لال شعلے نکل کر اس کے خوفناک وجود کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیتے ہیں اور ڈیل ڈول معاذ اللہ، غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ مجھے تو صرف اُسکے نقوش پا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بلا مبالغہ اونٹ کے پیر سے کم نہ ہونگے۔ مقامی لوگ کہتے ہیں اُس نے پچھلے چھ سات مہینے سے اگلے داہنے پیر میں چاندی کا کڑا پہن لیا ہے اور تب ہی سے آدمخوری اختیار کی۔ جنوبی افریقہ کے کالے پہاڑ کے دامن میں چالیس پچاس میل کے محیط میں واردات کر رہا ہے۔

جاہل زولو اس کو بھوت سمجھتے ہیں۔ اور انکا ایسا سمجھنا بجا بھی ہے کیونکہ اس کی حرکتیں مافوق الحیوان ہوگئی ہیں۔ کئی نامور شکاریوں نے اس قہر خدا کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کی اور کیسی کیسی مصیبتیں بھی بیٹیں مگر مجھ سمیت آج تک کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ چھ سات ماہ قبل میجر ولیم نے اس بلائے بیدرماں کو ایک بہت بڑے آبنوس کے درخت کے موٹے سیاہ گدے پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ مگر کچھ تو اس وجہ سے کہ صاحب موصوف خون آشام شعلہ ریز آنکھوں سے مرعوب ہوگئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ ببر آبنوس کے گدے کا ہمرنگ پیوند بنا چپکا بیٹھا تھا۔ صاحب کی گولی صحیح نہ لگ سکی، تاہم لگی ضرور کیونکہ اسکا سیاہی مائل خون ملتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ببر ایک جھاڑی میں داخل ہوگیا اور اسکے بعد سراغ نہ مل سکا۔

میں نے اپنی عقل کو بہت دوڑایا کہ آخر یہ لوگ جو ببر کے پیر میں چاندی کا کڑا بتاتے ہیں اس کی اصلیت کیا ہے۔ میرے خیال میں صاحب موصوف کی گولی ببر کے اگلے داہنے پیر کے گٹے پر پڑی۔ ہاتھ ٹوٹا تو نہیں البتہ زخم نے اُسے اس درجہ معذور کردیا کہ وہ جانور نہ پکڑ سکتا تھا۔ بھوکا تو مرنے سے رہا مجبوراً اُس نے سب سے کمزور جانور یعنی انسان کو اپنے تنور شکم کا ایندھن بنانا شروع کر دیا۔ انسان کا خون بھی شراب کی طرح منہ کو لگے پیچھے چھوٹتا نہیں کرتا۔ اور ہاں وہ چاندی کا کڑا! زخم مندمل ہو چکنے کے بعد سفیدی مائل کھرنڈ رہ گیا جو سیاہ کھال کے پس منظر میں رہ کر نمایاں ہو کر چاندی کا کڑا معلوم ہوتا ہوگا۔

زیادہ عمر کے درندے اپنے سابقہ تجربہ کی بنا پر یوں بھی چالاک اور عیار ہو جاتے ہیں اور پھر جب معمر درندے کو ان کے سلونے اور زود ہضم گوشت کی چاٹ پڑ جائے تو پھر اس کی عیاری اور چالاکی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہتا۔ گویا ایک تو کریلا کڑوا اور پھر چڑھا نیم۔ دراصل انسان کا گوشت کھاتے کھاتے اُن میں انسانوں ہی جیسی عقل آجاتی ہے۔

"آج طبیعت بہت اُداس ہے۔ زبینڈو کوئی قصہ سناؤ ایسا کہ نیند آجائے"

"ہاں حجور۔ ابھی سنیگا حجور"

زبینڈو پدھان نے لیلے کے پتے کا حقہ پیتے ہوئے اردو اور زولو الفاظ سے مرکب زبان میں عجیب پر لطف قصہ سنایا جسے میں قارئین کی ضیافت طبع کیلئے رنگ آمیزی اور افسانے کا جامہ پہنا کر پیش کرتا ہوں۔

"ہلدو گوٹ نا...... وہ حجور گئے تھے نا" زبینڈو نے قصہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "وہی گوٹ۔ وہی نا۔ جو حجور گینڈا مار کر آتا تھا نا۔

جہاں چھپا کلیں بھرا کرتی تھی [illegible] کیسا ٹھنڈا پانی تھا جھرنا کا"

[illegible] ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ کہہ کا بھی یہ میرے یار [illegible] بھی کوٹ نو [illegible] ہمدرد [illegible] بڑا [illegible]"

"خیلیہ بروہ بور [illegible] کوٹ کی چھوکری سلوما کا قصہ سنا چھوڑو"

سلوما بہت ہی حسین چھوکری تھی۔ دور دور تک اسکے حسن کا جواب نہ تھا۔ ہماری دمشتی قوم کے لونڈے اس پر مرتے تھے اور اسکے حسن کے گیت گاتے تھے۔ اس کی کافر جوانی نے نوجوان چھوکروں کو شراب حسن سے مدہوش کرکے آپس میں ایسا کشت و خون کروایا کہ بیچ بیچ دو چھوکرے مر گئے۔ دراصل ہم لوگ بھی جانوروں کی طرح اصول فطرت کے مانحت چلتے ہیں جب کسی چھوکری کے ایک سے زیادہ چاہنے والے ہوتے ہیں تو اس فتنہ کو مول لینے کیلئے آپس میں لڑکر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ قوت اور شجاعت کے اعتبار سے بااصل افزائش نسل کا کون زیادہ مستحق ہے۔ اکثر تو تھوڑی سی کشتم کشتا اور گتھم گتھا کے بعد ایک حریف شکست مان کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات جب ٹکر برابر کی آن پڑتی ہے تو لڑائی سلسل کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے۔ دوران جنگ میں جب رقیبوں کی جوڑی زخموں سے نڈھال ہوکر بیدم ہو جاتی ہے اور لڑنیکا سکت باقی نہیں رہتا تو معشوقہ کمال نازو ادا کے ساتھ مٹکتی اٹھلاتی برآمد ہوکر مضمحل شدہ آتش رقابت کو اپنے دامن حسن سے پھر بھڑکا دیتی ہے اور میدان کارزار پھر اسی جوش اور ولولہ سے گرم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک حسن کی دیوی کے بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔

اوہو! تمہاری قوم میں بھی خوبصورت ہوتے ہیں!" میں نے متعجب ہوکر پوچھا۔ "سلوما میں کیا حسن تھا بھلا" تو اسے لو کیوں نہیں خوبصورت کیا معنی ہماری قوم میں تو بڑے بڑے حسین پڑے ہیں [illegible] پدھان نے مجھ سے زیادہ متعجب ہوتے ہوئے کہا۔ "اور سلوما کا حسن تو بیان سے باہر ہے۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہائے کیسی حسین چھوکری تھی جیسے بہشت کی حور" "اگر خدانخواستہ جنت میں ایسی افریقہ کی حوریں فراہم کی گئیں" میں نے اپنے دل میں کہا "تو بابا ایسی جنت کو سلام۔ دور سے ہی سلام ہے"

"سلوما کا حسن بیان کرنیکے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں گھونگھر والے سیاہ بال تیا شیشہ سی پیشانی کو ڈھکے ہوتے زیرہ سی یہ نورانی آنکھیں جیسے ہڈی کے بٹن۔ ناک چپٹی سی ناک۔ جوانی کے مد سے بھرے کلچے سے گال، دو عدد نرم نرم پھولے پھولے ڈھلکے ہوئے ہونٹ جیسے ریشم کے کیڑے، یا غنچہ دہن۔ رنگ ایسا پکا اور گھٹا ہوا جیسے بھادوں کی کالی گھٹا کہ شب تاریک بھی شرما جائے۔ دانت ایسے جو منہ کا کٹورا [illegible] ٹوٹا آتا رہے جائے۔ جذبات شباب سے پھٹ پڑنے والا چوڑا چکلا سینہ بوٹا سا قد موٹے موٹے مضبوط ہاتھ پیر۔ بمصداق ـــ

شانے سے تمام اعضا نہ کیوں ہوتے سوا من کے
بنے ہیں دو دو دھڑا اس بت ذیشان بھینس کو کفن کے (علامہ صحنک)

الغرض سلوما حسین تھی واقعی بلا کی حسین۔ زنگو نے اسے شجاعت بہادری۔ گاؤزوری اور خونریزی کے بعد اپنی زوجیت میں لیا تھا۔ پھر بھلا وہ جسقدر بھی چاہتی بیوی ہوتی کم تھا۔

زنگو بھی زولو قوم کے دیگر افراد کی طرح نکھٹو تھا۔ دراصل ضروریات زندگی انسان کو بامشقت اور محنتی بنا دیتی ہیں۔ ہم لوگوں کی ضروریات زندگی محدود ہیں۔ پیٹ بھرنے کو خود رو پھل اور شکار اور تن ڈھانکنے کو پتے اور کھالیں بآسانی مل جاتے ہیں۔ مگر معلوم نہیں شادی کے بعد زنگو کو کیوں اپنا معیار زندگی بلند کرنیکا خیال پیدا ہوا شاید اس لئے کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی اور جنگل کا یہ پھول بہتر گلدستے میں رکھنے کے قابل تھا۔ آٹھ دس مویشی دو تین بیگے زمین۔ بڑی سی چھتری نما جھونپڑی یہی منتہائے عیش تھا جسے وہ فراہم کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن رات کو زنگو کا بھائی آیا۔ زنگو سے بڑی رات گئے تک باتیں کرتا رہا۔ سلوما آگ کے سامنے بورئیے پر پڑی اینڈا کی۔ باتیں سننے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی۔ البتہ کبھی کبھی زنگو کے چوڑے چکلے اور اینٹھے توے جیسے خوبصورت چہرے پر، جو مارے سیاہی کے آگ کی روشنی میں چمک رہا تھا اور جس میں ہنسنے سے سفید دانت اس طرح نمودار ہو جانے تھے جیسے کالی گھٹا میں بگلوں کی قطار، سلوما کی نگاہ پڑتی اور جمی کی جمی رہ جاتی۔

بھائی کے چلے جانے کے بعد زنگو عجیب کشمکش میں رہا۔ کبھی فرط انبساط سے اس کی چیاں سی آنکھیں چمک اٹھتیں اور کبھی دل بجھنے سا لگتا۔ اس کی آنکھیں سلوما کے خوابیدہ چہرہ میں گڑھی ہوئی تھیں۔ دماغ میں متضاد خیالات چکر لگا رہے تھے۔ آٹھ دس مویشی۔ . . . سلوما کی تنہائی . . . دو بیگے زمین . . . صدمہ فراق . . . . بہت بڑی چھتری نما جھونپڑی یعنی ایک بنگلہ بنے گا یار! . . . . . . سلوما کا چہرہ آگ کی تپش میں اس طرح پڑا دمک رہا تھا جیسے خورشید کی شعاع اول

... سنگ اشہب۔ خیالات کے بے ترتیب ہجوم نے سلوما کے چہرے میں دل کش جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ فراق کے جانکاہ خیال نے اس کے خد و خال اور بھی دلکش کر دئے تھے

"سلوما! سو رہی ہو تم سلوم!" زنگو نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔ سلوما کسمسائی اور ریشہ سے آنکھیں کھول دیں "تم غالباً یہ سنکر رنجیدہ ہو گی کہ میں تمہارے لئے فراہمی معاش کیلئے چند ماہ کے لئے اپنے بھائی کے ساتھ کل صبح چلا جاؤنگا۔ سامنے کالے پہاڑ کی دھولی چوٹی کے دامن میں سفید آدمی بہت سا روپیہ لے کر آئے ہیں نا!"

سلوما کے دل پر کانوں کے راستے گویا بجلی سی گری۔ دھڑ نلے کی زمین نکل گئی نظریں بے معنی طور پر جمی کی جمی رہ گئیں معصوم چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے مگر پھر بھی وہ خوبصورت تھا اور جاذب نظر۔ چاند بدلی میں چھپ کر بھی اسی طرح منور اور ضیا پاش رہتا ہے جیسے بدلی سے باہر..... نیم عریانی۔ کافر جوانی اور جسم آہنی دعوت لمس دے رہے تھے۔

فراق و ہجر کے صدمہ سے سلوما نڈھال ہو رہی تھی ہر صبح جھونپڑی سے نکل کر کالے پہاڑ کی دھولی چوٹی کو جسے فاصلے نے دھندلا کر دیا تھا سلوما بڑی حسرت و یاس سے تکا کرتی۔ اسکا بس چلتا تو اُڑ کر دھولی چوٹی کے دامن میں پہنچ جاتی۔ آخر کار قدرت کو سلوما پر رحم آیا۔ محبت کے جذبات بٹانے کے لئے اُسے کالا کلوٹا بیٹا عطا فرمایا۔

بچہ بھی تین مہینے کا ہو گیا مگر زمبو نہ لوٹا۔ کس قدر بے وفا ہوتے ہیں یہ مرد۔ جدائی کے صدمات نے پہلے سے زیادہ کاری ضرب لگانی شروع کی۔ پریت کی آگ نے خوفناک عزم پیدا کر دیا......

عورت کا عزم ... زخار سمندر پایاب ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ اپنی بلندیاں پست کر دیتے ہیں۔ ناممکن الگذر گھاٹیاں فرش راہ بن جاتی ہیں...... سلوما نے بچہ کو پشت پر باندھا اور چل کھڑی ہوئی دھولی چوٹی کی سمت۔ باندھکر۔ افریقہ کے لق و دق جنگل۔ ایسے گھنے کہ دن کو گھگی بندھ جائے۔ قدم قدم پر درندوں سے مقابلہ کا خطرہ۔ جھلس دینے والی گرمی۔ راستے سے لاعلمی۔ نومولود کا ساتھ۔ الغرض ایک بھی تو اس کے عزم کو متزلزل نہ کر سکا۔ کیا مجال جو پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش آ جائے۔ اور کیوں آئے۔ ہمارا مسلک تو یہ ہے اللہ ساتھ میں۔ ڈنڈا ہاتھ میں۔ پھر ڈر کس کا۔ خیر یہ پریت کی ماری دن بھر چلتی رہی۔ شاداب چشموں پر کہیں کہیں یوں ہی سا ٹک گئی خود پانی پیا۔ بچہ کو دودھ پلایا اور پھر چل دی۔ بھوک لگی تو جنگلی پھل چاب لئے۔ راستے میں درندوں سے مٹھ بھیڑ بھی ہوئی۔ مگر یہ جنگلی عورت جس نے جنگل میں جنم لیا تھا اور درندوں ہی میں پلی بڑھی بھی تھی باوجود اس قدر حسین ہونیکے بذات خود درندوں سے کم نہ تھی۔ ہر ایک درندے کے حملے سے بچنے کا ڈھنگ اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ چنانچہ جس پگڈنڈی پر یہ جا رہی تھی نکل جو گھوم کر تو سامنے سے ریچھ آ رہا تھا۔ قبل اس کے کہ اُس پر ریچھ حملہ آور ہو اُس نے خود ہی ریچھ پر حملہ کر دیا۔ یعنی ڈنڈا تان کر اور للکار کر جو ریچھ کی طرف بھاگی ہے تو اُس بیچارے کو اپنی جان کی پڑ گئی راستہ چھوڑ دُم دبا کر ایسا بھاگا کہ مُڑ کر بھی تو نہ دیکھا۔ دراصل یہ اصول فطرت ہے کہ دوسرے کی دلیری پر خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو پہلے اپنی دلیری کا وار کرنے سے وہ یقیناً مرعوب ہو جاتا ہے۔

دن ڈھلے ایک مست ہاتھی نے بگل بجا کر اور سونڈ تان کر جو اس پر حملہ کیا تو سلوما پگڈنڈی چھوڑ جھپٹ گھنے جنگل میں ہو رہی کوہ آسا ہاتھی درختوں کو توڑ کر اپنے لئے راستہ ہی بناتا رہ گیا اور یہ۔ یہ جا وہ جا۔ کاوا کاٹ کر پھر پگڈنڈی پر۔ دن سمے ایک کمینہ خصلت سُور نے اُس پر حملہ کر دیا۔ صد آفریں اس پر ذرا بھی تو نہ گھبرائی۔ جب سُور چار قدم رہ گیا پھرتی سے بائیں کو پینترا بدل کھڑی ہو گئی۔ نکلا جو ہے برابر سے تو وہ لٹھ دیا کہ یاد ہی کرتا ہو گا۔

کالا پہاڑ دلی کی طرح ہنوز دُور تھا۔ گھنے جنگل میں تاریکی وحشت افروز اثرات سے مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ درندے نڈر ہو کر آکٹھے ہوئے اور طرح طرح کی خوفناک آوازوں سے جنگل کو گونجانے لگے۔ خاص کر ببر شیروں کی دہلا دینے والی مسلسل دھاڑ بہت ہی روح فرسا تھی۔ یہ غنیمت اپنے پیدا کرنے والے سے رہ رہ کر طلب رزق کر رہے تھے۔ جنگلی ہاتھی کس بیدردی سے درختوں کو گراتے سے توڑ رہے تھے۔ سلوما نے سیر ہو کر پانی پیا۔ لپ جھپ تھوڑے سے جنگلی پھل توڑے اور ایک موٹا سا درخت تاک کر اوپر تیشاخے میں رات کاٹنے پھس پھسا کر بیٹھ گئی۔

درندوں کے ساتھ مچھر بھی نکل پڑے اور بُری طرح نیش زنی شروع کر دی۔ بچہ اس تکلیف کی تاب نہ لا کر پھڑک اُٹھتا اور کئی

دفعہ ادنگھتی ہوئی ماں کے ہاتھوں سے نکلتے نکلتے بچی۔ بچے کے مسلسل رونے نے آدم خور ببر شیروں کو کھینچ بلایا۔ انسان کو ناقابل پہنچ جگہ دیکھ کر بہت جھنجھلائے۔ رات بھر وہ نیچے ڈپٹتے اور دھاڑتے رہے۔ ایسی ویسی عورت ہوتی تو دہل کر ٹپک پڑتی۔ فرطِ دہشت سے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور پھڑکتا ہوا بچہ ہاتھوں سے نکل کر لقمۂ اجل ہو جاتا۔ ماں ہو تو ایسی ہو۔ دن بھر کی تھکی ہاری۔ بچہ کو چھاتی سے لگائے پہاڑ سی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ پو پھٹنے لگی۔ شب بیدار چرند خاموش ہو گئیں۔ درندے یورش کی آگ بجھا کر چپ ہو گئے۔ نسیم سحری بیدار ہو کر جنگلی پھولوں سے اٹھکھیلیاں کرتی اٹھلاتی شام جان کو حیات تازہ بخش کر عرق چینی کرنے لگی۔ بلبل نے صبا الخیر کا مژدہ جانفزا سنایا۔ مگر بھوکے آدم خور شیروں کا یہ گروہ جو رات بھر ایک پریم پجارن کو چٹ کر جانیکے لئے پہرہ دیتا رہا تھا۔ پو پھٹ جانے پر بھی اڑا ہی بیٹھا رہا۔

سلوما باوجود وحشی ہونیکے پھر بھی انسان تھی۔ صبح کے خنک جھونکے نے اُسے تھپک کر سلا دیا۔ وہ رنگین خواب دیکھ رہی تھی۔ زنگو جوشِ پدری سے بچہ کو اس کی گود سے لے رہا ہے۔ آنکھ جو کھلی تو چیخ نکل گئی۔ بچہ ہمک کر گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی شیروں نے ہم آہنگ ہو کر لگائی جو دھر ملوک تو جنگل کانپ اٹھا۔ کائنات لرز گئی۔ قریب تھا کہ دھم سے یہ بھی شیروں میں کود پڑے۔ مگر واہ رے قدرت۔ صدقے جایئے تیری شان کبریائی کے۔ وہ جو کہا ہے "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے"! بچہ گرا اور زمین پر پہنچنے سے قبل ایک دوشاخے میں پھنس کر رہ گیا۔ ببر شیر اپنے بھاری جسموں سے اس پر جھپٹ رہے تھے مگر دستِ اجل کے پہنچنے میں کچھ ہی کسر باقی رہ جاتی تھی۔ ماں کی ماری ماں جو رات بھر کی تکلیف دہ نشست سے اکڑ گئی تھی کس پھرتی سے اتری جھک کر بانک بچے کو جھپٹ لے گئی۔ کلیجہ کا ٹکڑا پھر دھڑکتی ہوئی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ خوشی کے آنسو امنڈ گھمنڈ کر بہہ رہے تھے۔ پریت کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ پیتم کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔

دن کے دیوتا نے بیدار ہو کر تختِ نور پر قدم رکھا تو عالم اس کی ضیا پاشیوں سے روشن ہو گیا۔ دُنیا ہی دوسری ہو گئی۔ نظام ہی بدل گیا۔ اس آتش فشاں دیوتا کی تاب نہ لا کر شیروں کے حوصلے پست ہو گئے ہمتیں سرد پڑ گئیں۔ رات کی تاریکی سے جو دلیری اور ہیکڑ پنا ان میں پیدا ہو گئی تھی ملکہ شب کی سلطنت کے ساتھ ساتھ رخصت ہوئی اور آخر مایوس ہو کر یہ فرشتۂ اجل بھی کھسک گئے۔

دھولی چوٹی نے چمک کر اس صنفِ نازک میں پھر عزم، حوصلہ اور ہمت کی روح پھونک دی۔ کوئی اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔ زنگو تیرا پریتم شام کو تجھ سے مل جائیگا۔

سلوما نے بچے کو پشت پر خوب اچھی طرح باندھا۔ درخت سے اترتے ہی ڈنڈا سنبھالا اور ایک مرتبہ پھر درندوں کے حملوں کی مدافعت کرتی چلی جا رہی تھی۔ پہاڑ قریب ہوتا گیا۔ دھولی چوٹی زیادہ واضح ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اچانک سفید سفید جھونپڑیاں چمکتی دکھائی دیں۔ حیران ہو گئی کہ یہ کیا وبال ہے۔ کمال احتیاط سے قریب پہنچی تو انسان کی آواز سنی۔ مان گمان ہوا ہو نہ ہو سفید آدمیوں کی یہی جھونپڑی ہے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے امید و بیم کے جذبات کو دبائے اور بڑھی۔ جھاڑی کی آڑ سے ابھر کر دیکھا تو واقعی برف سے سفید آدمی دکھائی دئے۔ آڑ پکڑتے پکڑتے خیموں کے قریب پہنچ گئی اور ایک زولو سے پوچھا "میرا زنگو کہاں ہے؟" مختصر بات چیت کے بعد اس نے سلوما کو ایک راوٹی کے دروازے پر لے گیا اور کہا "سفید آدمیوں نے زولو کو یہ جھونپڑی دے رکھی ہے۔ اسی میں ہو گا۔ جا گھس جا" سلوما دھڑکتے ہوئے دل اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے اندر داخل ہوئی۔ اِدھر اُدھر گھبرائی ہوئی نظریں ڈالیں مگر زنگو نہ دکھائی دیا۔ سامنے راوٹی کے اندر ایک منور کھڑکی دیکھی جو راوٹی کے ایک اور حصہ میں کھل رہی تھی۔ اس چمکدار کھڑکی میں جو جھانکی تو نہ پوچھو تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ ایک نہایت ہی حسین شباب میں چُور زولو چھوکری سے نظریں چار ہوئیں۔ آتشِ رقابت اس طرح بھڑک اٹھی جیسے پٹرول میں آگ دیدی ہو۔ سرا زخود اس کی طرف سے پھر گیا۔ پاؤں پیچھے ہٹ گئے۔ اتنے میں کسی کے دوڑ کے آنے کی آواز آئی اور زنگو اندر داخل ہوا! "ارے سلوما غضب کر دیا تو نے!" زنگو نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "چل یہاں سے جلدی چل!" اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتے ہوئے کہا۔ اگر بڑے صاحب کو خبر ہو گئی تو سب کرا دھرا اکارت ہو جائیگا!" زنگو سلوما کو کھینچتا ہوا جنگل میں لے گیا۔ سلوما زولو تھی اسکو اپنے میاں کے قول و فعل پر سوال کرکے اس کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے حقیر ہونا منظور نہ تھا جذبات کی فراوانی نے الگ گلا گھونٹ رکھا تھا "تم جلدی واپس چلی جاؤ اور پھر کبھی آنے کی جرأت نہ کرنا۔ میں بہت جلد آنے والا ہوں۔ اور ہاں

"میرا بچہ۔ بہت پیارا پیارا ہے" اُس نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا "تو سنو دیکھو وہ بڑا صاحب مجھے آواز دے رہا ہے۔ شاید اُسے خبر ہو گئی۔ بھاگو جلدی بھاگ جاؤ۔ ورنہ ایک پیسہ بھی نہ ملے گا۔ میں بہت دولت لاؤنگا۔ پھر خوب عیش کریں گے۔ بھاگ جاؤ۔ خدا حافظ۔ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ جلدی"

بس۔ دو دن اور گزر گئے مگر زنگو نہ آیا۔ سلوما کی آنکھیں دھولی چوٹی کو دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتیں۔ خیالات کا ہجوم ہوتا.... ....معلوم نہیں وہ خوبصورت بلا بیاہتا ہے یا دوشیزہ........ چڑیل تھی تو خوبصورت۔ شاید مجھ سے بھی زیادہ۔ مگر ہماری قوم میں آج تک کوئی بیاہ چپ چپاتے نہیں ہوا...... تو پھر تو وہ داشتہ ہی ہوئی..... ...بیاہ ہوتا اور یہاں تک خبر نہ آتی!... . .....ان مردوں کا کیا اعتبار بے وفا ذات شاید بیاہ ہی کر لیا ہو........ مگر خیر پھر بھی وہ میرا میاں ہی رہے گا۔ بڑی بیوی ہونے کا شرف تو مجھے ہی رہے گا۔ بچہ بھی تو پہلے میرے ہاں ہی ہوا ہے۔ اُس کے ہاں ہوگا بھی تو بعد میں... ...... خیر وہ آ تو جائیں۔ اُس کے تو آنے ہی میں لالے پڑے ہیں..... آگ لگے ایسی دولت کو۔

خدا خدا کر کے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ اور بہت سی دولت بھی کما لائے۔ علاوہ روپے پیسے کے بہت سا سامان بھی از قسم عجائبات جو بطور بخشش ملا تھا باندھ لائے۔ بڑے فخر و مباہات سے ایک ایک کر کے سلوما کو دکھاتے رہے۔ کپڑے میں لپٹا ہوا ایک چوکٹا بھی نکالا اور سلوما کو دیتے ہوئے کہا:-

"لو یہ خاص تمہارے لئے ہے۔ اس میں اپنا حسن دیکھا کرنا"

سلوما اس چوکٹے کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ یہ وہ ہی چمکدار کھڑکی تھی جس میں اُس خوبصورت جوان زولو کی چھوکری سے نظریں چار ہوئی تھیں۔ اس مرتبہ پھر اسی خوبصورت بلا سے نظریں چار ہوئیں اور تھوڑی سی حیرانی اور استعجاب کے بعد بہت جلد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں"

"سوتا ہے جھور نا" بدھان نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں سوتا ہے۔ تو نے تو ایسا قصہ سنایا کہ الٹی نیند اُڑ گئی"

(ریاینگ فی صدی ماخوذ)

سراج الدین احمدؔ

کسی کی یاد

ہاں! پان کھانا بُرا ہے۔ گندگی ہے۔ دانت خراب ہوتے ہیں۔ اور نری ہندوستانیت ہے۔ مگر کیا کروں یہ بھی یادگار ہے کسی کی۔ غالباً شمیم تم مجھ سے یہ نہ پوچھتے کہ میں پان کیوں کھاتا ہوں، اگر تم مجھ سے اور پہلے سے واقف ہوتے۔

لیکن بھی ایک عرصہ گذر گیا جس کی آج تم نے یاد دلادی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حکومت برطانیہ کا یہاں دور دورہ تھا۔ جبکہ ہم آپ سب ہی صاحبوں سے ڈرتے تھے اور بڑے بڑے امیر خود کو صاحب کہلانا پسند کرتے تھے۔ جبکہ وہ اپنے ناشتہ کو چھوٹا حاضری کہلواتے۔ غلام حسین کو بوائے پکارتے اور آبادی سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ میں بھی اُسی ہوا میں پلا۔ میری ماں فوت ہوچکی تھی میں اُس وقت چھوٹا تھا۔ میرے باپ ولایت کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور والد کی شان کے ناموافق نہ ہوگا اگر یہ کہوں کہ وہ سرکاری ملازم نہیں۔ بلکہ سرکار انگلشیہ کے افسر تھے اور میں بے ماں کا یقینی اُن کا چہیتا بیٹا۔

ان دنوں وہ ایک چھوٹے شہر کے افسر تھے۔ وہاں کے وہ سب کچھ تھے۔ شام کو کوٹھی پر روسائے شہر کی گاڑیاں لگی ہوتیں۔ اور میں لال وردیوں والے چپراسی کے ساتھ ہوا خوری کرتا ہوتا۔ ہاں والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد سے جبکہ میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ مجھ سے کسی عورت کی مُلاقات نہ ہوئی تھی۔ میں نے عورتیں سڑک پر ضرور دیکھی تھیں۔ سینما میں اُن کی گفتگو بھی سُنی تھی۔ مگر خود کسی سے بات کرنیکا موقع نہ ملا تھا۔

میں ابھی جوان ہورہا تھا۔ اس سن میں یہ جاننا کہ میں جوان ہوں مشکل تھا۔ مگر ہاں میں یہ جانتا تھا کہ آجکل خواب دیکھا کرتا ہوں۔ بالکل انوکھے خواب۔ جن کا دل پہ گہرا اثر ہوتا تھا۔ بدن میں ایک سنسنی سی پیدا ہوتی تھی پھر ٹھنڈک معلوم ہوتی اور میری نیند ٹوٹ جاتی۔ اس خواب کو نہ جانے کیوں بُرا کہا جاتا ہے۔ میں یہ کبھی نہ سمجھ سکا۔ کتنے پیارے خواب تھے۔

آج آبادی سے دور والی کوٹھی میں جہاں ہمارے والد رہتے تھے۔ چہل پہل تھی۔ کسی غیر معمولی مہمان کے آنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ غیر معمولی میں نے اس لئے کہا کہ کھلے ہوئے کمروں کے ایک طرف کے دروازے جکڑے جارہے تھے۔ شیشوں میں گہرے سبز کاغذ چپکائے جارہے تھے۔ اور کمرے کے بڑے بڑے پردے کھینچے جارہے تھے۔ آخر یہ سب کس لئے کیا جارہا تھا؟

کھانے کی میز پر والد نے مجھ سے کہا۔ ”بھائی علی احمد آرہے ہیں۔ یہ ہمارے بڑے دوست ہیں“ میں نے پوچھا۔ ”یہ کمرے کیوں بند ہورہے ہیں؟“ انھوں نے کہا۔ ”بھائی علی احمد نے ابھی شادی کی ہے۔ انکی بیگم بھی ہونگی۔ وہ یہاں اُس وقت تک رہیں گے جب تک اُن کی کوٹھی ٹھیک نہ ہوجائے۔ تم اُنکو چچا کہنا“۔ مگر میری سمجھ میں ایک بات اور نہ آئی۔ والد کے پُرانے دوست اور ابھی شادی کی ہے! کیسے ممکن ہے کہ یہ جوان آدمی ہونگے۔ کیوں کہ جوان ہی تو فوراً شادی کرتے ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ انکی تیسری بیگم تھیں۔

وہ دن بھی آپہونچا کہ ہمارے مہمان آگئے۔ میں حسب معمول اپنے کام میں مشغول رہا۔ ہر صبح وہی اسکول کا جانا۔ روز شام کو وہی ڈاڑھی والے چپراسی کا ساتھ۔ روز رات وہی میز۔ وہی کتابیں۔ وہی ماسٹر کی آمد کا ڈر۔ اور انکی بیماری کی دعا۔

ایک رات میں اسی طرح بیٹھا اپنی کتابیں دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی میرے کمرے میں آئی۔ یہ کمرہ ایسا تھا کہ اسی سے ہوکر اندر باہر کا راستہ بن گیا تھا۔ میں مشغول تھا کہ آواز آئی ”صاحب کس کمرے میں ہیں؟“ اس کمرے کے بعد دوسرے کمرے سے گذر کر تیسرے کمرے میں ہونگے۔ وہیں سے آواز آرہی ہے۔ آپ اُدھر ہی جائیں“ وہ کچھ چونک پڑی میری سمجھ میں نہ آیا کیوں۔ اور وہ چلی گئی۔ وہ واپس آئی۔ میں اسی انتظار میں تھا نہ معلوم کیوں۔ میں نے پوچھا ”آپکو وہ ملے؟“ وہ پھر چونکی اور مُسکرائی۔ ایسا کہ مجھے بیوقوف سمجھا۔ اور کہا۔ ”آپ مجھے آپ کیوں کہتے ہیں؟ میں ماما کی بیٹی ہوں۔ بیگم صاحبہ کی لونڈی۔ آپ صاحب کے دوست کے بیٹے ہیں۔ آپ بھی میرے صاحب ہیں۔ میرا نام زبیدہ تھا۔ مگر بیگم صاحبہ گلنار پکارتی ہیں۔ اور سب ہی گلنار پکارتے ہیں۔ آپ

بھی گلنار رہی کہیں!" وہ چلی گئی۔

گلنار خوبصورت تھی گندمی رنگ آنکھیں بڑی۔ اُن میں کوئی کشش تھی۔ جو مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ جوانی اپنے پورے اُبھار پر تھی۔ جس کا پتہ اس کے تنگ واسکٹ کے ٹوٹ جانے والے بٹن دے رہے تھے اور جسکو اس کا بار بار سرکنے والا دوپٹہ نمایاں کر رہا تھا۔

میری سمجھ سے یہ باہر تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہوگیا ہے؟ "شاید میں بیمار ہوں" یہی خیال ہوتا تھا اور یہ واقعہ بھی تھا کہ میری دوا اُسکی بھولی باتیں اور وہ میری طبیب۔ مگر وہ لونڈی۔ ماما کی بیٹی۔ ناچیز اور میں افسر کا بیٹا۔ مغرور........ پھر بھی گلنار کی کشش اپنی طرف مجھے کھینچے جا رہی تھی۔ میں کیا کرتا مجبور تھا۔

مورخین۔ سلاطین ترکی اور شہنشاہ مغلیہ کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ وہ حرم رکھا کرتے تھے۔ اُن میں سینکڑوں عورتیں ہوتی تھیں اور ان کا وجود بیکار ہوتا تھا۔ مگر مجھے اب پتہ چلا کہ انکا وجود بھی بیکار نہ تھا۔ یہ رؤسا کے گھر کی لونڈیاں انھیں حرم سرا کی یادگار ہیں اور آج ان ہی میں سے ایک نے مجھے انسانی زندگی کا پہلا سبق پڑھایا۔ ورنہ شاید مجھے کبھی نہ معلوم ہوتا کہ انسانی زندگی میں عورت کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ اور محبت کس چیز کا نام ہے۔

اب گلنار روز ہمارے کمرے میں کسی بہانہ سے آتی اور اپنی بھولی باتیں سُناتی۔ یہی وہ وقت ہوتا جب وہ دو پان میرے لئے چھپا لاتی۔ اور وہ کس چیز سے میری خاطر کر سکتی تھی۔ وہ میری ہی مہمان تھی۔ پان دوسری چیز تھی۔ جسے میں نے زندگی میں پہلی دفعہ چکھا تھا اور اب یہ اُس کی یادگار رہتا۔

ایکدن بجلی کی روشنی خراب ہوگئی ہمارے کمرے میں مٹی کے تیل کا لیمپ جلا۔ مگر اس کی روشنی دھیمی تھی۔ مجھے کتاب دیکھنے میں تکلیف تھی میں نے ایک دوسرا لیمپ بھی منگوایا اور دونوں کو تیز کرکے پڑھنے لگا کہ گلنار آئی اور پان دیتے ہوئے بولی "کیا اندھے ہوگئے؟" اور ہنسی۔ میں نے کہا "ہاں۔ گلنار میں اندھا ہوگیا ہوں۔ میں تمہارے لئے اندھا ہوگیا ہوں"۔ میں کھڑا ہوگیا۔ میں اُسکی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ میں بیہوش تھا والد کے پکارنے کی آواز آئی۔ میں اُن کے پاس چلا گیا۔ اُنھوں نے پوچھا کھانا نہ کھاؤ گے پھر مجھے گھورتے رہے اور کہا بیٹا تم بیمار معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا چہرہ سُرخ ہے تمہاری آواز میں کمزوری ہے۔ تم کرسی پکڑے کھڑے ہو۔ تم وہ پیکر سو رہو۔ میں سو گیا۔

ہماری مُلاقات اب تک والد کے دوست کی بیگم صاحبہ سے نہ ہوئی تھی۔ مگر اُن کا تذکرہ کھانے کی میز پر ہوا کرتا تھا۔ اور ہمارے والدان بیگم صاحبہ کی کمسنی سے کم از کم گفتگو ہی میں لُطف اُٹھاتے تھے۔ اور وہ ان بیگم صاحبہ کو بھابی کہا کرتے تھے۔ والد کے دوست بھی ان باتوں سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اور ہر تذکرہ میں "تمہاری بھابی" ضرور استعمال کرتے تھے۔ ایک دن بیگم علی احمد خاں ہمارے والد کی "بھابی" اور میری چچی صاحبہ نے مجھے دیکھنے کو بُلا بھیجا۔ اور یہ بلاوا گلنار لیکر آئی۔

یہ دوسری عورت تھی جس سے میں اب مُلاقات کرنے جا رہا تھا۔ مجھے شرم تو ضرور آ رہی تھی۔ مگر کیا کرتا۔ جانا ضروری تھا۔ وہ میری مہمان تھیں۔

میں گیا مُلاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ناشتہ کھلایا اور کہا "گلنار تمہاری بڑی تعریفیں کرتی ہے"۔ میں اُن کے پاس برابر جانے لگا۔ بیگم صاحبہ خوبصورت تھیں۔ جوان تھیں تعلیم یافتہ تھیں۔ امیر اور شریف تھیں۔ مگر اُن میں گلنار کا بھولا پن نہ تھا۔ اُنکی باتوں میں سادگی نہ تھی۔ اُن کا ہر لفظ تکلف کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوتا۔ وہ کمسن تھیں مگر جوانی میں ایسی شادابی نہ تھی۔ اگر گلنار نے ابھی زندگی کی تازہ شراب پی تھی۔ تو بیگم صاحبہ نے پہلا ہی گھونٹ تلچھٹ کا نوش کیا تھا۔ اور یقینی زندگی کی پوشیدہ لذتوں سے زیادہ واقف تھیں۔ میں جوانی کی پہلی منزل پر تھا بیگم صاحبہ کی شاید پہلے بار ایسے جوان مرد سے ملاقات ہوئی تھی جس سے اُن کا کوئی رشتہ نہ تھا۔

اُن کے پاس کیا نہ تھا جس کی اُنہیں تمنا ہو۔ ہاں! ایک کھلونے کی ضرورت تھی جس سے وہ کھیلتیں۔ اُنہیں ایک ہم عمر ساتھی کی ضرورت تھی۔ جس کے سامنے وہ بند نل کی طرح پھٹ پڑتیں۔ اور اپنی پوشیدہ آرزوؤں کی بھڑاس نکالتیں۔ میں ہی وہ کھلونا بنا اور

ویسا ہی سانچہ۔

وہ مجھ سے محبت کا اظہار کرنے لگیں۔ میں بھی مجبور تھا۔ جوان تھا۔ مگر پھر بھی میرا دل گلنار کی جانب کھنچا جاتا تھا۔ وہ بھولی تھی۔ الھڑ تھی۔ میں دریا کی دو موجوں کے درمیان میں تھا اور تیر نا نہ جانتا تھا۔ کیا کرتا۔ ایکدن بیگم صاحبہ سے کہہ دیا کہ گلنار مجھے پسند ہے۔ پھر کیا تھا۔ گلنار ان کے غصہ اور جلن کا شکار بن گئی۔

دوسرے دن والد کے دوست نے والد سے کہا "کل ہم لوگ جا رہے ہیں" والد نے پوچھا "کیوں اتنی جلدی کیوں ہے۔ ابھی تمہارا مکان تو ٹھیک ہوا ہی نہیں" انھوں نے فرمایا "تمہاری بھابی گھبرا گئی ہیں۔ اکیلے بیٹھے رہنا اور کوئی کام نہیں۔ عورتیں بغیر خانہ داری کے کام کے تنگ آجاتی ہیں" مگر میں جانتا تھا کہ کیوں جا رہی ہیں! وہ لوگ چلے گئے۔

شاید میں بیمار تھا۔ بغیر گلنار کے دیکھے چین نہ تھا۔ میں روز اسکول سے واپسی پر اُس کے مکان پر اُس سے ملنے جانے لگا۔ مگر بیگم صاحبہ سے نہ ملتا۔ ایک دن بیگم صاحبہ نے مجھے چپراسی سے بلوا بھیجا میں نہ گیا۔

دوسرے دن حسب معمول جب گلنار سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ گلنار بہت بیمار ہے پتہ چلا کہ بیگم صاحبہ نے اُسے سزا دی تھی۔ سخت سزا۔ سیخ تپا کر اُس کے جسم داغ دئے تھے۔ پوشیدہ جسم "اسکو اسی پر ناز ہے" یہ کہا۔ کسی نوکر نے پولیس کو خبر کر دی۔ مگر پولیس کیا کرتی۔ اُن کے شوہر بڑے افسر تھے۔ بڑے افسر اور اُن کے لوگوں سے قصور نہیں ہوتا۔ "یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ جل گئی" میں بھاگا والد صاحب کے پاس پہونچا۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اُن کے پاس ایک افسر اور بیٹھے تھے۔ پولیس افسر۔ میں نے کہا۔ "انھوں نے گلنار کو جلا دیا۔ وہ مر جائے گی" والد نے پولیس افسر کی طرف دیکھا، اور پھر میری طرف۔ اور ڈپٹ کر بولے "خاموش"

میں رونے لگا۔ پولیس افسر نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور آہستہ سے بولے "بیٹا غلطی سے جل گئی ہے۔ اگر مر گئی تو کیا ہوا لونڈی تو تھی۔ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم بڑے ہو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ افسر اپنے بھائی افسر کی مدد کرتے ہیں۔ تم افسر ہونا تو تم بھی کرنا۔ آخر اس لڑکی کی زندگی ہی کیا۔ انھیں نے بنایا اور انھیں نے بگاڑا۔ اس کا صدمہ کیا۔ وہ لونڈی تھی!

میں روتے روتے سو گیا۔ گلنار مر گئی۔ اب اُس کی قبر کا بھی پتہ نہیں۔ مگر ہاں اُسکی یاد!

میں نے نسیم کیطرف پان کی تھالی بڑھائی۔

سید کریم احمد

(بقیہ افسانہ بہترین بسلسلہ صفحہ ۱۳۸)

سوہن لال کا ماتم بھی ہو چکا۔ اُس کی لاش بھی جلائے جانیکے بعد دریا بُرد ہو گئی۔ اس کی بیوی اب تک پُرنم آنکھوں سے خوابگاہ میں بیٹھی ہے نہ معلوم کیا سوچ رہی ہے۔

سوہن لال ——— اُسکا شوہر سوہن لال تو مر گیا۔ لیکن افسانہ نگار سوہن لال ابھی زندہ ہے۔ کیونکہ وہ دُنیا کا بہترین افسانہ چھوڑ گیا ہے۔ شاید اسی سے اس کی ڈھارس بندھے۔

اب وہ اٹھی۔ سوہن لال کے مطالعہ کے کمرے میں پہونچی جہاں وہ فائل اب تک بجنسہ صندوقچہ میں محفوظ رکھا تھا۔ اُسے نکالا تاکہ معلوم کرے کہ وہ کونسا ایسا بہترین افسانہ تھا جو اس کا شوہر لکھ کر سدھارا تھا۔ کسقدر دلچسپ ہوگا! وہ اپنے شوہر کے مذاق کو اچھی طرح جانتی تھی۔ چہ جائیکہ اس کا شاہکار ——— دُنیا بھر کا شاہکار!

اُس وقت اسے شوہر کی موت کا اتنا رنج محسوس نہیں ہو رہا تھا جتنے شوق سے وہ افسانہ پڑھنے جھکی۔

اُف معبود! یہ کیا! اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ ٹائپ کئے ہوئے کاغذات بالکل سادہ تھے۔ ایک لفظ بھی نہیں لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ایکدم سے اُسکے تمام جسم میں بجلی کی رَو کا سا ایک صدمہ گذر گیا۔ خون میں معلوم ہوتا تھا کہ برف پگھل کر دوڑ رہی ہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے ایک زبردست گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ہاں بیشک گناہ! اُسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جس روز سوہن لال نے اپنا "مقصدِ حیات" پورا کیا تھا (یعنی یہ افسانہ لکھا تھا) اُس سے ایک دن قبل اسنے مشین کے فیتہ کو خراب دیکھکر اُسکو بدلنے کیلئے مشین سے نکال لیا تھا اور اُسکی جگہ نیا لگانا بھول گئی تھی۔

اور اب وہ کس کا ماتم کرے۔ شوہر سوہن لال کا یا افسانہ نگار سوہن لال کا ———؟!

(پلاٹ ماخوذ)

امان اللہ

غیر مرئی حادثے

ٹھنڈی ہوا کے فرحت خیز جھونکوں اور چشمہ کی نرنم ریز موجوں نے جلدی ہی نوجوان گڈرئے کو جو درخت کے سایہ میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹا تھا خوابوں کی سحر آفریں دُنیا میں پہنچا دیا۔ سامنے کی کچی سڑک پر کبھی کبھی کوئی مسافر یا بگھی گذرتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھی۔ جو کوئی شخص ادھر سے گذرتا اور اس نوجوان کو ہاتھ پاؤں پسارے، سایہ میں پڑے ہوئے خرّاٹے لیتے دیکھتا تو اس کی اس ہیبت گذائی پر بغیر مسکرائے نہ رہتا۔ مگر نوجوان گڈریا گذرنے والوں کے حقارت آمیز تبسم سے بے نیاز گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

۲

اسے ابھی سوئے ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ اُس طرف سے کسی سوداگر کی بگھی گذری۔ اور جب وہ اس کے قریب سے گذرنے لگی تو سڑک پر پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر سے دھچکا لگنے کی وجہ سے پہیہ کی کیل نکل گئی اور بگھی ایک طرف لڑھک پڑی۔ سوداگر اور اُس کی بیوی جو اندر بیٹھے ہوئے تھے ان کے خفیف سی چوٹیں آئیں، دونوں فوراً اُتر پڑے۔ کوچوان تو بگھی میں پہیہ لگانے لگا اور دونوں میاں بیوی دھوپ کی تیزی سے بچنے کیلئے درخت کے سائے میں آ گئے۔

"کیسے مزے سے سو رہا ہے یہ لڑکا!" سوداگر کی بیوی نے نوجوان گڈرئے کو سوتے ہوئے دیکھکر کہا۔ "بچارے کا گھر بار نہ ہوگا۔ زمین میں پڑا ہے۔ ہائے مفلسی بھی کیسی سخت اور جانگداز ہے"

"ایسی گہری نیند کو تو میں آج تک ترستا ہوں" سوداگر بولا۔ "کمبخت دولت بھی کس قدر منحوس شے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر طرف سے خطرے اور نقصانات کے کالے ناگ رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ راتوں کو چونک چونک پڑتا ہوں۔ کبھی چین اور اطمینان کی نیند نہ سو سکا۔ میں تو اپنی دولت کا آدھا حصّہ اس شخص کو دینے کو تیار ہوں جو مجھے ایسی نیند سُلا دیا کرے۔"

مگر سوداگر کی بیوی برابر گڈرئے کو دیکھے جا رہی تھی۔ جو میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ جُوں جُوں وہ اُسکو دیکھتی جاتی تھی اُس کے دل میں نوجوان گڈرئے کی محبّت بڑھتی جاتی تھی۔ اُس کے چہرے سے رحم و شفقت کے آثار مترشح تھے اور اُس کی آنکھوں میں مادرانہ محبت کے دو حسین و معصوم فرشتے مسکرا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اُسکو اپنا پیارا بیٹا تصور کرکے چاہتی کہ آگے بڑھے اور اس کے رُخسار کو چوم لے مگر حقیقت!...... آہ! وہ بے قابو ہو کر رہ جاتی۔ تخیل کا ایوانِ رنگیں مسمار ہو جاتا۔ اور وہ ایک گہری ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہو جاتی۔ اس کشمکش کے دوران میں اس نے دیکھا کہ درخت کی شاخوں سے چھن کر سورج کی ایک کرن اس نوجوان کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ وہ فوراً اپنا ریشمی رومال لے کر بڑھی اور اُس کے مُنہ پر ڈالدیا۔

"کیا وہ اُسکو اپنا بیٹا بنا سکے گی؟"..... "کیا سوداگر اُس کو متبنیٰ بیٹا بنانے پر راضی ہو جائے گا.....؟"..... بار بار اسی قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں آ رہے تھے۔

"دیشو نے ہمیں یہاں بھیجا ہے..... تاکہ..... تاکہ"... وہ سوداگر کے سخت مزاج سے ڈر کر نرم پہلو لیتے ہوئے بولی "تم دیکھتے ہو جی! اس کی صورت ہمارے منّے سے کسقدر ملتی جلتی ہے۔ آہ! ہمارا بچہ! اشور....." آگے الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئی۔

"کیوں جی جگا دوں اِسے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ اور یہ سوچکر کہ میاں اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا۔ وہ سوداگر کو اشتیاق آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کس لئے؟" سوداگر جو کسی اور خیال میں غرق تھا اُسکی بات نہ سمجھکر بولا۔ "تم بھی عجیب عورت ہو۔ خواہ مخواہ جگاتی ہو۔"

"ہمارا بھتیجا تو نالائق نکل گیا۔" وہ کنایتاً بولی "ہم اس لڑکے کو پال لیں گے۔ بچارا خانہ ویران اور مفلس معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسے پڑھائیں گے...... یہ قابل ہوگا اور ہمارے بڑھاپے......"

کچھ دیر رُک کر وہ پھر بولی "ہماری کثیر دولت کا کوئی ولی وارث نہیں...... اگر تم" یہ کہکر اسکی زبان رُک گئی۔

"خوب!" سوداگر بولا "کیا معلوم یہ کوئی بدمعاش ہو!"

"سوتے وقت بدمعاشوں کے چہروں پر ایسی معصومیت طاری

نہیں ...... کر کی نیند ...... ہے" وہ بولی۔

مگر سوداگر نے کوئی جواب نہ دیا۔ شہر میں اُس کی ٹکر کا ایک بھی سوداگر نہ تھا۔ قسمت سے ایک لڑکا ہوا تھا مگر وہ بھی ایشور نے چھین لیا۔ اور اب ہر وقت یہی اس بات کا فکر تھا کہ اس دولت کثیر کو کس طرح جائز طریقے سے خرچ کیا جائے۔ کیونکہ ان کا بھتیجا جسکو وہ وارث بنانا چاہتے تھے عیش اور سہل انگاری کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں اکثر دولتمند اور امیر لوگوں سے عجیب غریب حرکات جنکو ہم حسن اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ممکن ہے کوئی نوجوان جو مفلسی کے ہاتھوں تنگ آکر گھر سے نکل پڑا ہو اور تھک کر کسی درخت کے سایہ میں سو گیا ہو جب جاگے تو بگھی کو اپنے حسین ترین انداز میں رقص کرتا ہوا دیکھے۔

"کیوں جگا دوں اسے؟" وہ سوداگر کو خاموش پاکر خوشامد آمیز لہجہ میں بولی: "کتنا معصوم چہرہ ہے اس کا!"

"سرکار گاڑی تیار ہے!" دُور سے نوکر کی آواز آئی۔ سوداگر بیوی کا جواب دئے بغیر بگھی کی طرف چلدیا۔ اُس کی بیوی بھی مجبوراً اُس کے پیچھے ہولی۔ مگر چلتے ہوئے بار بار نوجوان گڈریئے کو مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔

"میں شہر میں ایک عالیشان عمارت تعمیر کراؤنگا۔ تاکہ خانہ ویران لوگ وہاں پناہ لے سکیں!" سوداگر نے بگھی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ لڑکا...... اگر اسکو تم......" اس کی بیوی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

گاڑی کو حرکت ہوئی اور تھوڑی دیر بعد سڑک سنسان پڑی تھی۔

(۳)

کچھ دیر بعد اس طرف سے ایک نوجوان حسین لڑکی تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گذری۔ دھوپ کی تمازت سے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ سستانے کی غرض سے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جب اُس نے نوجوان گڈریئے کو سوتے ہوئے دیکھا تو اُسکے رُخسار جو دھوپ کی تمازت سے سُرخ ہوئے تھے شرم و حجاب کی وجہ سے گلابی پڑ گئے۔

[اُس]نے خیال ہوا کہ کہیں وہ جاگ نہ اُٹھے اور یہ سوچکر وہ چلنے ہی والی تھی کہ اُسے خوابیدہ نوجوان کے اوپر کچھ شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہوئی نظر آئیں...... بھن بھن...... بز بز زز...... شہد کی مکھی کا ڈنک وہ نوجوان کی نیند خراب ہوجانے کے ڈر سے لپکی اور ان مکھیوں کو اپنے دوپٹہ میں پکڑ لیا اور ایک پتھر سے کچل ڈالا۔

اس نیک کام کے کرنے سے اس کی روح میں سچی مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اگر وہ نوجوان کو جگا کر سارا واقعہ کہدے تو وہ کسقدر خوش ہوگا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف مشتاقانہ نظروں سے دیکھتی رہی "کیسا خوبصورت ہے!" وہ یہ سوچکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی مبادا کوئی اُس کو دیکھ رہا ہو۔

مگر وہ نوجوان...... اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر لڑکی کا خیر مقدم کرنے کے لئے ذرا بھی مسکراہٹ نہ نمودار ہوئی۔ وہ لڑکی جس کی روح پرانے تخیل کے مطابق اس نوجوان گڈریئے کی روح سے کاٹ کر علیحدہ کردی گئی تھی۔ اور جسے وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز سمجھتا تھا۔ آج اس قرب کے باوجود اس سے کتنی دُور تھی۔

وہ لڑکی چشمہ کے قریب گئی اور دائرے بناتی ہوئی لہروں میں اپنا لرزتا ہوا حسین عکس دیکھکر مُسکرانے لگی۔ "کیا اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیئے؟" اسے خیال ہوا مگر وہ جھجکتی ہمٹتی اور اِدھر اُدھر خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی خوابیدہ گڈریئے کے قریب گئی اور اُسے تکنے لگی۔ اُس کا چہرہ کبھی اندرونی مسرت سے کبھی تو جگمگا اُٹھتا اور کبھی حسرت و ناامیدی کا بھیانک سایہ اس کے معصوم چہرے کو پژمردہ بنادیتا...... وہ دیکھتی رہی...... برابر دیکھتی رہی۔ یکایک چونکی اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دُور تک کسی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اُس نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا اور نوجوان گڈریئے کو حسرت آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی چلدی۔

اِس لڑکی کا باپ ایک مالدار شخص تھا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اُس نے ایک درخت کے پیچھے سے یہ تمام واقعہ دیکھ لیا تھا۔ اسے ایک منشی کی ضرورت تھی اور خوابیدہ گڈریئے کو دیکھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہی ایک ایسا شخص ہے جو اسکا حسب منشار کام کرسکے گا۔ مگر وہ سیدھا چلا گیا اور نوجوان گڈریا اُسی طرح سوتا رہا۔

بگھی رقص کرتی ہوئی اُس کے کس قدر قریب سے گزر گئی۔ اُس کے

نرم نرم لباس کی سرسراہٹ نے نوجوان کے کانوں میں ہلکے سُروں میں ایک شیریں نغمہ گایا...... مگر وہ حسین لمحہ بھی گذر گیا اور نوجوان.... ایک مفلس گڈریے کی حیثیت سے بے خبر پڑا سوتا رہا۔

(۴)

کچھ دیر بعد درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دو بدمعاش آئے۔ ان کے چہرے کالے کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے صرف آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

"دیکھنا! اس شخص کے سر کے نیچے ایک ٹوپی رکھی ہوئی ہے"۔ ایک بولا۔

"نہیں تمہاری شرط رہی" دوسرا بولا۔ "اس میں کچھ بھی نہ نکلے گا۔ یا تو کوئی کتاب ہوگی یا اس شخص نے کسی کپڑے کو موڑ کر تکیہ کا کام لیا ہوگا...... ہاں شاید اس کی جیب"

"اگر وہ جاگ اُٹھا!" یہ کہہ کر پہلے بدمعاش نے اپنی جیب سے ایک چمکتا ہوا لمبا چاقو نکالا۔ اور اُس کے کالے چہرے پر بھیانک سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ٹھیک ہے" دوسرے نے آہستہ سے کہا۔

دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے خوابیدہ گڈریے کی طرف بڑھے۔ پہلا چاقو کی نوک اُس کے سینے کی طرف کئے کھڑا ہوگیا اور دوسرا بڑی احتیاط سے اُس گٹھری کو ٹٹولنے لگا۔

دو ہیبت ناک چہرے۔ دو کالی چڑیلیں اس نوجوان کے اوپر جھکی ہوئی تھیں مگر وہ نہایت آرام سے سو رہا تھا۔ جیسے کوئی معصوم بچہ ماں کی آغوش میں سو رہا ہو۔

"گٹھری نکال کر دیکھو!" پہلا بولا۔

"ہاں! ہاں!!" دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ "اگر جاگا اور چلانے کی کوشش کی تو بھونک دینا سالے کے"

مگر اتنی دیر میں دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ شکاری اپنے کتوں کو لئے اسی طرف آرہے تھے۔

"چل بے چل اب کام نہیں بنے گا" یہ کہہ کر دونوں غائب ہوگئے۔

مگر وہ گڈریا جس پر کچھ دیر پہلے موت کا بھیانک سایہ رقصاں تھا اور اب جس پر زندگی کی دیوی اپنی تمام ضیا باریوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی اسی اطمینان کے ساتھ سو رہا تھا جس طرح کہ اس سے قبل گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ کتے اور شکاری قریب تر ہوتے گئے۔ ان کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی تیز تر ہوتی گئیں۔ وہ اب کافی دیر سو چکا تھا۔ ذرا کلبلایا۔ ایک کروٹ لی۔ پھر اُس کا ایک ہاتھ اٹھا اور انگلیاں گالوں کو کھجانے لگیں، ہونٹ ہلے اور کچھ گن من سی آوازیں نکلیں شاید خواب میں کسی سے باتیں کر رہا ہو۔

شکاری لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے گذر گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اونگھتا ہوا بیٹھا دکھائی دیا۔ آنکھیں ملیں اور گٹھری سنبھال چشمہ کے کنارے جا بیٹھا اور منہ دھونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹاپوں کی آوازیں آئیں۔ اُسنے مڑ کر دیکھا پکی سڑک پر ایک بگھی جا رہی تھی۔ وہ لپک کر پہنچا۔

"ایک سواری ہے! شہر چلو گے" وہ چلایا۔

"آجاؤ پیچھے!" کوچوان بولا۔

بہتے ہوئے چشمہ پر الوداعی نظریں ڈالے وہ نوجوان گڈریا بگھی میں بیٹھ کر چلدیا۔ اسے کیا معلوم کہ جب وہ سو رہا تھا تو حسن کی دیوی اس چشمہ کی حسین موجوں میں اپنا دلکش چہرہ دیکھکر مسکرائی تھی۔ اور جب وہ چلی گئی تو محبت کی دیوی آئی اور اس چشمہ کی ترنم ریز موجوں کو دیکھکر اُس نے ناکامی کا ٹھنڈا سانس بھرا تھا۔ اور جب وہ چلی گئی تو موت کا بھیانک تاریک سایہ اُدھر سے ناچتا ہوا گذرا اور اُس کی خاموش بہنے والی موجوں کو نوجوان گڈریے کے سُرخ خون سے رنگنے کی دھمکی دی تھی..... نیند کے اس مختصر وقت میں زندگی میں کیسے کیسے انقلاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ زندگی کے اس چکر میں ہمارے اردگرد بہت سے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن سے ہماری زندگیوں کی کایا پلٹ ہوتی ہے مگر ان سے ناواقف رہنے کی وجہ سے ہمیں ان کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس وسیع کائنات میں ایک زبردست ہاتھ ایسا ہے جو ان تمام غیر مرئی اچانک ہونے والے حادثات کو جو ہر گھڑی ہماری زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں روکتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے زندگی کی سڑک میں اچانک جلدی جلدی گہرے گڑھے یا اونچے اونچے ٹیلے پیدا ہونے کی بجائے یکسانیت اور ہمواری قائم رہتی ہے۔

(نیتھانیل ہاتھورن)

مترجمہ عبدالجلیل دہلوی

خط و کتابت کرتے وقت پتہ صاف اور خوشخط تحریر کریں (مینجر)

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

(بسلسلہ صفحہ ۱۶۸)

ہم لوگ اس خدمت پر کسی دوسرے کو مامور کرنے والے ہیں۔ چونکہ تم نے اپنے دورِ دراز سفر سے یقیناً نہ صرف عقل وخرد بلکہ تجربہ ذاتی بھی حاصل کیا ہوگا، اس لیے ہم لوگوں کی متفقہ خواہش ہے کہ یہ فرض تم آئندہ سے اپنے ذمے لے لو۔"

خالد کے ہوش وحواس رخصت ہو چکے تھے وہ کسی قدر گھبرایا ہوا سا تھا۔ اسی اثناء میں اسے بچے کی آواز سنائی دی" یہ لو، یہ چوبی عصا آج ایک صدی سے یہ اس مکتب کے اُستادوں کو یکے بعد دیگرے گویا ترکہ میں ملتا آ رہا ہے۔۔۔۔"

اور خالد نے فوراً ہی اپنے ہاتھوں میں ایک خوبصورت عصا پایا جس کا سرا چاندی کے غلاف میں منڈھا تھا لیکن اُسے اتنی جرأت نہ تھی کہ واپس کر دے۔

کچھ دیر بعد ملکۂ شب کی آمد کے ساتھ ساتھ ملکۂ حسن یعنی نسرین بھی آ گئی۔ بچپن میں دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ لیکن خالد اس طلسمی خواب کے بعد نسرین سے بہتر ہستی کا اُمیدوار بن چکا تھا۔ تاہم وہ اپنے طویل سفر پر رخصت ہوتے وقت اُسے ایک یادگار دے گیا ـــــ ایک خوبصورت سا یاقوت جس کی تراش پان کے وضع پر کی گئی تھی اور جسے نسرین نے اشک آلود آنکھوں سے قبول کر لیا تھا۔ اس وقت اُسکی بلوریں گردن میں یہ یاقوت دلکشی کا ایک عجیب کیف پیدا کر رہا ہے۔

"نسرین!" خالد نے کہا "تیس برس کی عمر میں بھی تم بالکل خیز معلوم ہوتی ہو۔ شاید یہی راز ہے کہ بہ حیثیت رقاصہ ابتک تمہاری مقبولیت میں فرق نہ آیا۔"

نسرین حسرت آمیز لہجے میں بولی "خالد! والد کے انتقال کے بعد روزی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اور تم جانتے ہی ہو کہ ایک رقاصہ سے شادی پر راضی ہی کون ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے" خالد نے جواب دیا "مجھے بھی اُس خواب کی تعبیر حسرت و ناامیدی کے سوا کچھ نہ مل سکی۔ خیر اب آؤ اس پرانی محبت کو تازہ کریں۔"

"خالد" نسرین کی رقت آمیز زبان سے بے ساختہ نکلا "دیکھو، تمہارا یہ بخشا ہوا اشرفی یاقوت اسکی دلیل ہے کہ میرا دل ابتک تمہارے لئے خون روتا رہا ہے۔ آئندہ اب یہ تمہارے خلوصِ الفت کی یادگار بنکر رہیگا"

مارے حیرت کے خالد کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی، اُس عجیب خواب ۔۔۔ کہ کر اُسے گویا اپنے ہوش وحواس پر اعتبار جاتا رہا۔

کی یہ معنوں سے

وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ دوسرا خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ کیا واقعی اِن بزرگ نے جو بلند امیدیں دلائی تھیں، جن کی بنا پر اس نے ساری دنیا کا سفر اختیار کیا تھا، کیا ان کی حقیقت صرف اسی قدر تھی۔ ہائے یہ ساری محنت و مشقت سب ہی رائیگاں گئیں۔

اور خالد کو اس رات خواب میں پھر وہی سفید ریش بزرگ دکھائی دئے جو کہہ رہے تھے "انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ خالق کی دی ہوئی نعمتوں پر قناعت اور شکر گزاری کے عوض، حرص و آز میں مبتلا ہو کر خواہ مخواہ آفتیں مول لیتا ہے۔ کیا بہتر ہوتا اگر تم یہ وقت اور محنت کسی دوسرے کار دین میں صرف کرتے ـــــ محنت و استقلال سے تمہاری زمینیں بلحاظ پیداوار سونا اُگلیں گی۔ تمہیں اِن معصوم بچوں پر مکمل حکمرانی حاصل ہوگی، جن کی صحیح تربیت پر ملک و قوم کی آئندہ بہبودی کا انحصار ہے اور شادی کے ذریعے تمہیں ایک رقاصہ ایک کارآمد رفیقۂ حیات، ہم خیال دوست، دلچسپ جلیس، اور فرض شناس اہلِ خانہ دکھائی دے گی۔۔۔۔"

اور دوسرے دن خالد کی سب کلفتیں اور پریشانیاں دور ہو چکی تھیں۔

ایس۔ اے۔ ظفر

مُشاعرے کے بعد

مشاعرہ تقریباً دو بجے ختم ہوا۔ صاحبِ مشاعرہ نے تمام شعراسے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔ کسی سے مسکرا کے کہا: "خدا حافظ!" کسی کا ہاتھ دبا کر کہا "بھئی بہت بہت شکریہ!" کسی کے آگے تعظیماً جھک کر کہا: "حضور بڑی عزت بخشی!" غرض یہ کہ ہر شخص سے دوسرے لفظوں میں یہ کہدیا کہ "جاؤ، جاتے کیوں نہیں ہو!"

دو بجے رات میں کسی سواری کے ملنے کا امکان تو تھا ہی نہیں، ہر شخص پیدل روانہ ہوا۔ وہ لوگ جن کے مکانات شہر میں تھے، مزے میں رہے۔ پورا کارواں شہر کی طرف مشاعرے کی غیبت کرتا ہوا اور اُن شعرا کے کلام پر تنقید کرتا ہوا روانہ ہوا جو مشاعرے میں مقبول ہوئے تھے۔ تنہا رہ گیا میں۔ کیونکہ میرا مکان فصیل شہر سے چار میل کے فصل پر تھا۔ اور بیچ میں ایک گھنا جنگل بھی پار کرنا پڑتا تھا۔ میرے دل میں آئی تو کہ یہیں صاحبِ مشاعرہ ہی کے یہاں پڑ رہوں تو بہتر ہے، صبح ہوتے ہی گھر چلدوں گا۔ لیکن صاحبِ مشاعرہ غالباً شب بھر مہمانوں کی تواضع سے تنگ ہو چکے تھے۔ دوسرے غزلیں تو پڑھی جا چکی تھیں اب اُن کو مہمانوں سے کام ہی کیا تھا۔ وہ متبسم لبوں سے خدا حافظ فرما چکے تھے لہٰذا اب خدا حافظ کے بعد ٹھہرنا کچھ اچھا معلوم نہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ اگلا مشاعرہ بھی پرسوں ہے اور غزل نہیں کہی ہے۔ لہٰذا اس تنہائی میں غزل کیوں نہ پوری کروں۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت بھی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے مکان کی طرف رُخ کیا۔ تقریباً پچاس قدم چلتے ہی مطلع ہو گیا۔ ہمت دونی ہو گئی۔ قلعہ کا دروازہ تو فتح کر لیا، اب کیا تھا۔ میں پھر فکرِ شعر میں غرق ہو گیا۔ فصیلوں تک پہونچتے پہونچتے ایک شعر بھی ہو گیا، بیحد جذباتی۔ میں اُچھل پڑا۔ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ اہو ہو ہو سُبحان اللہ۔ یکایک کسی نے کرخت لہجہ میں کہا "ٹھہر جاؤ۔ کہاں بڑھے جا رہے ہو؟"

میں ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے مخاطب کرنے والا آدمی ایک تنومند انسان تھا اس کے ہاتھ میں ایک ہنٹر تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش نظر دوڑائی، مری سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ میں کہاں ہوں۔ میں فکرِ شعر میں غالباً کسی اجنبی گلی میں پہونچ گیا تھا۔ دُور سے مجھے سیاہ فصیل ضرور نظر پڑی۔ میں اتنا سمجھ گیا کہ میں فصیل کے آس پاس کسی گلی میں ہوں۔ میں حیران ضرور تھا کہ یہ شخص کون ہے جس نے مجھے ٹھہرایا ہے، شاید کوئی ڈاکو ہو، لیکن مجھے خوف کیا تھا میرے پاس کُل نو پیسے تھے۔

میں نے کہا: "حضرت آپ کو آخر مجھ سے کیا کام ہے۔ ارشاد!"

وہ بولا: "چکنی چُپڑی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ فوراً داہنے ہاتھ کی طرف مُڑو اور مکان میں داخل ہو جاؤ۔ میں ایک لمحہ تمہارا ٹھہرنا یہاں گوارا نہیں کر سکتا۔ تمہارا بہت سختی سے انتظار ہو رہا ہے!"

میں نے کہا: "بندہ نواز آپ کسی غلط فہمی میں ہیں۔ میں......!"

"خاموش!" اُس نے بیحد سخت لہجہ میں کہا: "مڑو، داہنی طرف اور داخل ہو جاؤ دروازے میں!"

میں مجبوراً مُڑا، اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس کے ہنٹر والا ہاتھ آدھے سے زیادہ اُٹھ چکا ہے۔ داہنی جانب تقریباً بیس قدم چلنے کے بعد ایک بلند دروازہ ملا جس میں میں اس کا اشارہ پاتے ہی داخل ہو گیا۔ چند گام چلنے کے بعد اُس نے ایک کمرے میں مجھے چلنے کے لئے اشارہ کیا۔ میں کمرے میں جوں ہی داخل ہوا میں نے دیکھا کہ وہاں تقریباً بیس بائیس سفید پوش جمع ہیں۔ بیچ میں مسند بچھی ہوئی ہے۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں۔

میں بیٹھ تو گیا لیکن حیران تھا کہ میں یہاں زبردستی کیوں لایا گیا ہوں اور یہ لوگ کون ہیں۔ تمام کے تمام حضارِ محفل بیحد شریف اور خوش پوش معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اس سے تو ڈھارس ہو گئی کہ یہ لوگ چور اور بدمعاش نہیں ہیں۔ یکایک دروازہ کھُلا اور ایک بیحد قوی ہیکل انسان ایک دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اُسکے دیکھتے ہی سب لوگ تعظیم کے لیے اُٹھے۔ اُس نے کڑکتے ہوئے پوچھا: "محمود! کیا وہ مردود آگیا؟"

وہ شخص جو مجھکو راستے سے لایا تھا بولا: "جی ہاں سرکار صدر میں اُن کو بٹھا دیا گیا ہے!"

وہ شخص پھر بولا: "اُن کو نہیں، اُس کو، کہو اُس کو۔ اس بے ایمان کی شان میں لفظ 'اُن' اچھا نہیں معلوم ہوتا!"

میں حیران تھا کہ میرے متعلق یہ کیسے الفاظ استعمال کئے جا رہے

ہیں لیکن اس شخص کا چہرہ دیکھکر میرے حواس گم تھے۔ میں بولنا چاہتا تھا لیکن میرے ہونٹ ہلنے سے انکار کر رہے تھے۔

وہ پھر بولا: "حضرات۔ آج آپ حضرات کو بیحد زحمت ہوئی ہے۔ اس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ حضرات کے اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ آپ میرے اور اس مردود، بے غیرت، بے ایمان کے درمیان فیصلہ کرادیں جو اس وقت یہاں بیٹھا ہوا ہے ورنہ اللہ جانتا ہے اس کا سینہ ہوگا اور میری چھری۔"

میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا ہے اور وہ بُری طرح سے کانپ رہا ہے۔

وہ پھر بولا: "جناب میر صاحب آپ سید ہیں، اور جناب شیخ صاحب آپ اس محلہ کی ناک ہیں، آپ دو حضرات مرا اور اس کا بیان سنکر فیصلہ فرمادیں۔ مجھے آپ حضرات کا فیصلہ بالکل منظور ہے، خواہ وہ میرے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور باقی حضرات جیوری کے فرائض انجام دیں۔ آپ حضرات یقین مانیں کہ میرے اختیار میں بالکل ہے کہ میں جو چاہوں۔ خدا کی قسم جو چاہوں اس مردود کے ساتھ کرسکتا ہوں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں نے کوئی جبر اس شخص کے ساتھ کیا ہے۔ ہاں میر صاحب کیا ارشاد ہے آپکا؟"

ایک دُبلے پتلے، بیحد شریف سے منحنی آدمی کھڑے ہوگئے اور بولے "مجھے اور شیخ صاحب دونوں کو آپ کی خدمت میں کوئی عذر نہیں ہے اور میری ہی طرح مجھے یقین ہے کہ جملہ حضارِ مجلس آپ کی ہر خدمت کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔"

اس شخص کی کرخت آواز پھر فضا میں گونجی "کرم، مہربانی، عنایت۔ ہاں صاحب تو کیا کارروائی شروع ہو؟"

میر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس شخص نے مجھ سے کہا: "او مردود اِدھر اُٹھ کے آ" اور میر صاحب سے بولا: "جناب میر صاحب اور جناب شیخ صاحب دونوں صاحبان صدر میں تشریف فرما ہوجائیں اور داہنے اور بائیں جانب ایک صف میں ازراہِ کرم اس طرف منہ کرکے باقی حضرات تشریف رکھیں۔"

چند منٹ لوگوں کے اُٹھنے اور بیٹھنے میں لگے۔ ان لوگوں کے سامنے لب فرش میں کھڑا کیا گیا اور دوسری جانب وہ شخص کھڑا ہوا اُس نے اپنی کرخت اور بھدی آواز میں کہا: "جناب میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس میں ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ صرف میری ایک بھانجی ہے جسکو میں نے بچپن سے پال لیا ہے۔ اب اسکی عمر صرف سترہ سال کی ہے۔ میری ساری جائداد، زمینداری اسی کے نام ہے۔"

شیخ صاحب نے کھنکھارتے ہوئے کہا: "مجھے اس کا علم ہے۔"

وہ شخص بولا: "جی ہاں۔ تقریباً تین سال کا عرصہ ہوا کہ میں نے یہ دیکھا کہ نجمہ (میری بھانجی کا نام ہے) کی طبیعت کچھ مکدر اور پریشان سی رہنے لگی ہے۔ میں نے اس کا معالجہ شروع کیا۔ میں سمجھا کہ اسکو کوئی معمولی شکایت ہوگئی ہے۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ دن گذرتے گئے۔ نجمہ کے پاس پوری جائداد کی آمدنی آتی ہے۔ وہی حساب کتاب کرتی ہے۔ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں آپ لوگوں کو معلوم ہے۔"

میر صاحب بولے "درست ہے۔"

وہ پھر بولا: "جی ہاں میر صاحب۔ ایک دن میں نے اُس سے روپے مانگے۔ مجھے کچھ جائداد خریدنا تھی۔ اُس کے پاس ایک ہزار روپیہ کم نکلا۔ جس کا وہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکی اور گھبرا سی گئی میں بھی ٹال گیا۔ حضرات۔ مجھے نجمہ بہت عزیز ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اُس نے اپنی کسی سہیلی کو وہ رقم دیدی ہے۔ اور اغلباً جلد یا بہ دیر وصول کرلے گی۔ اس کے بعد جب کبھی میں نے اس سے حساب مانگا کچھ نہ کچھ رقم کم ہی مجھے ملی۔ اب میرے شبہات نے ترقی پکڑی۔ میں نے ماماؤں سے پوچھ گچھ کی لیکن سب نے قسم کھا کے بیان کیا کہ کوئی بات نہیں ہے۔"

ایک صاحب بولے: "آپ یقیناً حیران رہ گئے ہونگے۔"

وہ شخص پھر ڈپٹ کر بولا: "بیشک میاں صاحب۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ایک سال کا عرصہ ہوا کہ نجمہ اعزا میں گئی، ایک شادی تھی۔ میں اُس کی عدم موجودگی میں ایک دن اُس کے کمرے میں گیا۔ مجھے خط لکھنے کے کاغذ اور لفافوں کی تلاش تھی میں نے اس کی درازیں اپنی کنجیوں سے کھولیں، اس میں مجھے ایک خطوط کا بنڈل ملا۔ جن کو میں آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں، وہ یہ ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں سُرخ رنگ کے لفافوں کا ایک بنڈل تھا۔

میر صاحب نے کہا: "پڑھئے۔"

وہ بولا: "میں محمود سے پڑھواتا ہوں، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ محمود پہلا خط پڑھ۔"

محمود نے بنڈل میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"اچھی نجمہ۔ یہ میں پہلا خط تمہیں لکھ رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم میری بہن مجیدہ کے یہاں آئی تھیں، اور اتفاق سے میرا تمہارا سامنا ہوگیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کی گھڑی۔ میری نگاہوں کے سامنے تم ہی تم ہو۔ میں جانتا ہوں میرے گھر والوں نے میرے متعلق تمہارے کان بھرے ہوں گے اور مجھے بُرے الفاظ میں پیش کیا ہوگا۔ مجیدہ خصوصیت کے ساتھ میری بہت مخالف ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں دُور ہے۔ خدا کے لئے جواب میں چند لفظ لکھ دینا تاکہ مجھے کچھ تو تسلی ہو سکے۔

تمہارا

ممتاز"

شیخ صاحب نے پوچھا "اسکے لفافہ پر کیا پتہ درج ہے"

محمود نے کہا "اس معاملے میں ایک ماما سے کام لیا گیا ہے۔ یہ دوستی سے اور اسکے بعد کے خطوط پر ماما کے مکان کا پتہ درج ہے"

شیخ صاحب بولے "ٹھیک ہے دوسرا خط پڑھیے"

محمود نے کہا "جو خط میں پڑھنے والا ہوں غالباً وہ دوسرا نہیں ہے اور اس کو کوئی نمبر نہیں دیا جا سکتا۔ غالباً بیچ کے خطوط غائب ہیں"

میر صاحب نے کہا "پڑھیے مطلب حل ہوجائیگا۔ ہاں صاحب"

اُس نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"میری نجمہ۔

خدا تمہیں خوش رکھے۔ تمہارے خطوط میری تسلی کا باعث ہیں اس میں شک نہیں کہ آج تک اس دن سے سوا میں تمہارے جمال جہاں پرور کی زیارت نہ کر سکا، لیکن یہی کیا کم ہے کہ تم مجھے خط کا جواب دیتی ہو۔ حالانکہ تمہاری تحریر مبہم ہوتی ہے اُس سے نہ اقرار محبت کا پتہ چلتا ہے نہ انکار کا۔ تم نے پچھلے خط میں لکھا کہ مجیدہ سے تمہیں معلوم ہوا کہ میں بہت جعلساز ہوں۔ میں نے مختلف نام، مختلف مقامات اختیار کئے، اور مختلف پیشے بھی کئے۔ لوگوں کو بقول اسکے دھوکے بھی دئے۔ تم یقین ماننا اس میں ایک حرف بھی دُرست نہیں ہے اصل واقعہ یہ ہے کہ مجیدہ میری سوتیلی بہن ہے اور وہ ہر شخص سے میرے متعلق عجیب وغریب باتیں کہہ دیا کرتی ہے۔ تم بہت بھولی ہو۔ خواہ مخواہ اس کی باتوں میں آتی ہو۔ خدا کے لئے اُس کی باتوں میں نہ آؤ۔ ہاں سنو، آج کل میں بیکار ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کوئی سبیل نکالوں ملازمت کی طرف میری طبیعت مائل نہیں ہے۔ تجارت سے بہتر میں کسی چیز کو نہیں سمجھتا میں جس تجارت کو شروع کرنا چاہتا ہوں اس میں کم از کم ایک ہزار کی ضرورت ہے۔ سرمایہ میرے پاس بالکل نہیں ہے لیکن اللہ مالک ہے وہ کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالدیگا۔ اچھا اب کل۔ خدا حافظ۔ دیکھو اس کی باتوں میں نہ آنا۔

تمہارا

ممتاز"

اب وہ کڑک کر بولا "میر صاحب سُنا آپ نے۔ یہ اس مہینے کی تحریر ہے جس مہینے میں میں نے نجمہ کے پاس ایک ہزار روپیہ کم پایا تھا۔ آگیا فہم اقدس میں"

میر صاحب بولے "دُرست ہے۔ اور خط پڑھوائیے"

اس کے بعد کئی خط پڑھے گئے جن میں محض اظہار محبت تھا، اور کسی نہ کسی ضرورت کا ذکر تھا۔ اس کے بعد مختلف رقوم کے پہونچنے کا اقرار تھا۔

خطوط تقریباً ایک گھنٹے میں ختم ہوئے۔ اب وہ شخص ڈپٹ کر بولا "محمود خط ختم کرو۔ اب میرا بیان سنیے۔ میں نے اس راز کو سینے میں رکھا اور ایک خط اپنی طرف سے اسکو لکھا۔ جس میں میں نے تمام باتوں کے علم کا اظہار کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ تو میری بھانجی کو رشتہ مناکحت میں لیلے۔ اس لئے کہ مجھے میری بھانجی عزیز ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسکی خلاف مرضی اسکی شادی کر کے اس کی زندگی خراب کر دوں۔ اس نے پہلے خط میں تو صاف انکار کیا کہ وہ نجمہ سے واقف ہی نہیں ہے اور میں کسی غلط فہمی میں ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں اڑا آدمی ہوں میں نے ڈیڑھ ہزار گالیوں کے ساتھ دوسرا خط لکھا اور اس میں لکھدیا صاف صاف کہ انسانی جان لے لینا میں ایک کھیل سمجھتا ہوں"

"اس کا کیا جواب ملا؟" میر صاحب نے پوچھا۔

"اس کا جواب" وہ بولا "وہی کہ آگئے میاں سیدھے رستے پر۔ لیکن مجھے لکھا کہ میں چار ماہ کے بعد جمعرات کی شب دو بجے رات کو آؤں گا۔ میں تیار رہوں۔ چنانچہ حضرات میں نے پرائیویٹ طور پر اسکے چال چلن کی تفتیش کی۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص پکا جعلیہ ہے نہ جانے کتنے نام بدل چکا ہے، کیا کیا کچھ کرچکا ہے"

"تو پھر ایسے شخص کے ساتھ صاحبزادی کا عقد عظیم الشان غلطی ہے" شیخ صاحب بولے۔

اُس نے کہا "شیخ صاحب، لیکن آپ بھول گئے کہ میری نجمہ کو اسکے ساتھ لگاؤ ہے اور ایسے شخص کو سنبھالنے میں مجھے ملکہ ہے۔ آپنے شاید محمود کے ہاتھ کا ہنٹر ملاحظہ نہیں فرمایا۔ تو ہاں حضرات آج چوتھا

بیسیہ ختم ہوچکا ہے۔ یہ رات کا دن ہے اور دو بجے رات کے وقت یہ شخص آیا اندر لیکن محمود کا بیان ہے کہ وہ دوسری طرف نکلا جا رہا تھا۔ زبردستی یہاں لایا گیا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو میرے یہاں ممتاز کے نام سے پکارا جاتا ہے اور کہیں ایاز کہیں لکھی رام اور کہیں داتا سنگھ بن چکا ہے۔"

اب میں چونکا۔ اور میری سمجھ میں آیا کہ میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں میں اتنی دیر تک افسانے کی دلچسپی میں کھو گیا تھا۔ اتنے میں میر صاحب نے کہا "ممتاز صاحب آپ اپنا بیان دیجئے۔"

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "حضرات۔ میرا نام فرقت ہے اور میں شاعر ہوں۔"

وہ شخص قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا " اور لکھی رام بھی فرما دیجئے اور ایاز بھی اور داتا سنگھ بھی۔ دیکھا حضرات آپ نے وہی جعلسازی وہی بے ایمانی جس کی مجھے توقع تھی۔ اچھا جی آپ شاعر ہیں اور یہ نہ فرمایا کہ میں واشنگٹ کمپنی بھی کھول چکا ہوں اور فلم کمپنی بھی اور نوکریاں ڈھونڈنے والی کمپنی بھی۔"

میں نے کہا "جناب آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ غالباً کوئی اور شخص ہے۔ میں تو مشاعرے سے آ رہا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

"درست ہے۔" اس نے طنز کے ساتھ کہا "محمود ہنٹر لاؤ۔ آج میں اس کو اس بے ایمانی کا مزا چکھاتے دیتا ہوں۔ خدا کی قسم کھال ادھیڑ دونگا۔ یہ شخص مجھکو جانتا نہیں ہے۔ شاید تو بھول گیا کہ میرا نام زور آور خاں ہے۔"

میں نے کہا "خانصاحب آپ غلطی پر ہیں۔"

خانصاحب نے پھر کہا "خاموش۔ میں غلطی پر ہوں۔ کیا کہا پھر تو کہہ۔ مردود بے ایمان کہیں کا۔"

میر صاحب بولے "خانصاحب۔ فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے، آپ غصہ کم فرمائیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان کا اسی وقت نکاح کر دینا چاہیئے۔ کیوں شیخ صاحب؟"

شیخ صاحب نے کہا "میں تائید کرتا ہوں۔"

اب دونوں صاحبان نے اپنے دائیں اور بائیں نظر کی اور بولے "جیوری صاحبان کی کیا رائے ہے؟"

سب یک زبان ہو کر بولے "ہم متفق ہیں۔ بیشک نکاح ہونا چاہیئے۔"

خانصاحب نے ہنستے ہوئے کہا "میں آپ حضرات کا ممنون ہوں۔ آپ نے بالکل صحیح فیصلہ فرمایا۔ محمود قاضی جی کہاں ہیں؟"

محمود نے کہا "دوسرے کمرے میں۔"

خانصاحب ڈھکے "تو لاؤ۔"

قاضی صاحب ایک عمامہ پہنے ہوئے برآمد ہوئے۔ مجھے پھر صدر میں لا کر بٹھا لا گیا۔ حاضرین کی نشستیں تبدیل ہوئیں۔ میری عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ مجھے ناظرین معاف فرمائیں گے، ایک ذات سے پیمان کر چکا تھا کہ میں شادی اگر کروں گا تو اسی کیساتھ۔ لیکن یہاں سے چھٹکارے کی صورت صرف یہی تھی کہ میں نکاح کروں۔ میں انہیں خیالات میں مستغرق تھا کہ قاضی جی خطبہ وغیرہ ختم فرما چکے اور مجھ سے بولے "ہم نے تمہارا نکاح نجمہ خاتون بنت خاں صاحب زور آور خاں کے ساتھ بالعوض پندرہ ہزار زر سرخ سکہ رائج الوقت معجل کر دیا تمہیں قبول ہے؟"

میں رکا کہ ہنٹر کا ایک سڑاکا مجھے ہوا میں سنائی دیا۔ میں نے عرض کیا "مجھے قبول ہے۔"

تین بار مجھ سے قبول کرایا گیا۔ اور یجے میں بیوی والا ہو گیا۔

نکاح کے آدھ گھنٹے کے بعد تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ صبح ہو رہی تھی۔ محمود نے مجھ سے کہا "برابر کے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" میں نے تعمیل حکم کی۔

وہ کمرہ جس میں میں داخل ہوا بیحد سجا ہوا تھا۔ میں نے صدر کے قالین پر ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جو مجھے دیکھکر تعظیماً اٹھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی وہ گھبرا گئی اور بولی "آپ ممتاز نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ لیکن تمہارا شوہر ہوں۔"

وہ میرا جواب سنکر خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے بغور دیکھا وہ میرے خوابوں سے زیادہ حسین تھی۔ میں تو یہ سوچا کرتا تھا کہ شاعر بدنصیب ہوا کرتا ہے لیکن اس خوش نصیبی کی کیا انتہا ہو سکتی ہے کہ حسین بیوی بھی ملی اور دولت بھی۔

اس نے تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے پوچھا "آپ کیسے پھنس گئے؟"

میں نے کہا۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

بہزاد لکھنوی

عبرت و حیرت

میرا شباب ہے کہ شبابِ گُناہ ہے — دل کیا مری نظر بھی خرابِ گُناہ ہے
میں ہی جواں نہیں ہوں ہوس بھی جوان ہے — مُردہ سی تھیں جو دل کی رگیں اُن میں جان ہے
دل ایک میکدہ ہے وفورِ نشاط سے — میں محوِ اختلاط ہوں حورِ نشاط سے
حاصل ہیں حُسن و عشق کا رعنائیاں مری — کیف و سرور بار ہیں انگڑائیاں مری
جذبات کی ہے دل میں قیامت اٹھی ہوئی — اک آگ سی ہے میرے بدن میں لگی ہوئی
دورِ شباب ہی میں محبت کا لُطف ہے — اک ماہوش سے خلوت و جلوت کا لُطف ہے

میرے لئے ہے مایۂ عشرت نگارِ شام — کرتا ہوں روز صبح سے میں انتظارِ شام
یہ وقت ذمہ دارِ سکوں ہے نگاہ کا — جس میں علاج ہے مرے حالِ تباہ کا
جاتا ہوں روز علم سکھانے میں حور کو — یا درس دینے اپنے دلِ ناصبور کو
آتی ہے وہ بغل میں کتابیں لئے ہوئے — نظروں میں کیف ریز شرابیں لئے ہوئے
آتی ہے وہ جلو میں جوانی لئے ہوئے — رفتار میں غزل کی روانی لئے ہوئے
کرتی ہے شرم سے وہ مجھے اس طرح سلام — دوشیزہ، اجنبی کو کرے جس طرح سلام

چھوٹی سی اک بہشت ہے دارالمطالعہ — اک خوشنما کنشت ہے دارالمطالعہ
کمرہ نئی دلہن کی طرح ہے سجا ہوا — ہر گوشے میں ہے حُسن تکلف بھرا ہوا
کچھ قدِ آدم آئنے ہیں یوں کھڑے ہوئے — انگشتری میں جیسے نگینے جڑے ہوئے
ہر چیز ہے قرینے سے ہر سو رکھی ہوئی — عریاں مجسّموں سے فضا ہے سجی ہوئی
ماحول ہو جب ایسا تو پھر کیا کرے کوئی — کیا انتظامِ ضبطِ نظر کا کرے کوئی
پڑھنے کو بن سنور کے جو آیا کرے کوئی — کیوں عشق کا سبق نہ پڑھایا کرے کوئی
تنہا جو بیٹھتی ہیں یہاں دو جوانیاں — چھڑتی ہیں حُسن و عشق کی رنگیں کہانیاں

قائم اساسِ قلب پہ ہے کائناتِ عشق — سمجھا دئے ہیں اس کو رموز و نکاتِ عشق

ہر طرح اُس کو میں نے سبے چالاک کر دیا
میں نے ہر اُس کے حُسن کو غمزوں سے بھر دیا

بے رنگ سی ادا میں بھی اک رنگ بھر دیا
معصوم سے مزاج کو بھی شوخ کر دیا

نظروں کی مستیوں سے ٹپکتے ہیں میکدے
ہونٹوں کی جنبشوں سے چھلکتے ہیں میکدے

اُس کی ہر ایک بات ہے رومان آفریں
اب اُس کے دل کا جوش ہے طوفان آفریں

سوزِ دروں سے اُس کا تنفس بھی تیز ہے
پہلے جو سانس سادہ تھی اب مشک بیز ہے

فرطِ خوشی سے ہیں گلِ عارض چمک اُٹھے
شعلے جو تھے بجھے ہوئے سب ہیں دہک اُٹھے

جذبات خفتہ میں نے ہیں اُس کے جگا دئے
اُس کی حیا کے میں نے ہیں پردے اُٹھا دئے

صرف اک حجاب ہے جو ابھی تک اٹھا نہیں
تقدیر کب اٹھائے اُسے، کچھ پتا نہیں

کچھ دن کا واقعہ ہے کہ میں محوِ سیر تھا
اعصاب کی تھکن سے مرا حال غیر تھا

جل جل کے بجھ چکا تھا چراغ آفتاب کا
نکلا نہ تھا جلوس ابھی ماہتاب کا

ہلکی ہوئی فضائے گلستاں میں کیف تھا
سنکی ہوئی ہوائے گلستاں میں کیف تھا

ظلمت نے اپنا جال بچھایا تھا باغ میں
میں حُسنِ اتفاق سے تنہا تھا باغ میں

بیٹھا ہوا تھا مست میں اپنے ہی حال میں
وہ مُسکرا رہی تھی مرے ہر خیال میں

پہونچا ہوا تھا اپنے تصوّر میں دُور میں
ڈوبا ہوا پڑا تھا تفکّر میں دُور میں

پیچھے سے دفعتاً کوئی آکر لپٹ گیا
میرے تخیّلات کا نقشہ اُلٹ گیا

اک نازنین تھی چہرۂ زیبا لئے ہوئے
اپنی جوان گود میں لڑکا لئے ہوئے

وہ ملگجے لباس میں بھی رشکِ حور تھی
صورت بھی وضع و قطع بھی لبریز نور تھی

اُس کی فسُردگی میں بھی شانِ جلال تھی
آثار کہہ رہے تھے کبھی وہ نہال تھی

اَبرو میں بل تھا اور شکن آلود تھی جبیں
شعلے اُگل رہی تھی حسیں چشمِ خشمگیں

چہرہ دمک رہا تھا کچھ ایسا عتاب میں
جس طرح برق کوند رہی ہو سحاب میں

حیراں تھا اُس کی حرکتِ بیجا پہ میں بھی
تھا محوِ غور اُس کے سراپا پہ میں بھی

شرما گئی وہ دیکھ کر اک اجنبی مجھے
اُس کے اس انقلاب سے حیرت ہوئی مجھے

آخر کو اُس کے ہونٹ ہلے گلفشاں ہوئی
اک معذرت کے ساتھ وہ یوں نغمہ خواں ہوئی

حضرت کسی کا آپ پہ دھوکا ہوا ہے مجھے
صاحب، معاف آپ نہ کر دینگے کیا مجھے؟
اندھا بنا دیا تھا مجھے انتقام نے
وحشت زدہ کیا تھا دلِ خستہ کام نے
روداد ابتلا ہے مری داستانِ غم
دل میں لئے ہوئے ہوں میں اک کاروانِ غم
میں اک حریم مجد و شرف کا چراغ تھی
تو بادۂ طرب کا چھلکتا ایاغ تھی
رنگیں سی اک بہار تھی ماں کی نظر میں مَیں
اور کھیلتی تھی شام و سحر سیم و زر میں مَیں
اِک نوجوان، حُسن و جوانی کا شاہکار
آتا تھا روز مجھکو پڑھانے بصد وقار
میری نظر میں اُس کیلئے احترام تھا
میری نظر میں وہ بشرِ ننگ و نام تھا
مجھکو خبر نہ تھی، کہ وہ مارِ سیاہ ہے
اُس کے دلِ سیہ میں خیالِ گناہ ہے
قابو میں تھا نہ میرے جو یہ قلبِ ناشکیب
مَیں کھا گئی شباب کا اک بامزہ فریب
لغزش شباب کی مجھے برباد کر گئی
اک عارضی خوشی مجھے ناشاد کر گئی
پھرتی ہوں میں گناہ کا یہ تازہ ثمر لئے
ہر وقت اپنی گود میں اک نیشتر لئے
آوارہ ہوں لٹی ہوئی عصمت لئے ہوئے
یعنی مآلِ تیغِ محبت لئے ہوئے
آنکھوں میں ہوں سماج کے معتوب و نابکار
لیکن مزے سے ہے وہ جوانِ گناہگار
پھرتی ہوں رات دن میں اُسی کی تلاش میں
نشتر بھرے ہوئے ہیں دلِ پاش پاش میں
مل جائے گا تو اُس کے پرخچے اُڑاؤں گی
نقشِ حیات اُس کا جہاں سے مٹاؤں گی
وہ اتنا کہہ کر ایک طرف کو نکل گئی
عبرت کی چٹکیوں سے مرا دل مسل گئی

جاتا ہوں اب بھی اُسکو پڑھانے میں شام کو
تسکینِ صبر دینے دلِ تشنہ کام کو
بالائے طاق اب ہے ہر اک داستانِ عشق
اب مٹ گیا ہے صفحۂ دل سے نشانِ عشق
لبریز ہے سکوں سے مرا بیقرار دل
آسودہ حال ہے مرا پُر انتشار دل
پُر شور ولولے جو تھے وہ اب خموش ہیں
جذبے جو حشر خیز تھے وہ بے خروش ہیں
میرے اس انقلاب سے چیں بر جبیں ہے وہ
اس میری بے حسی سے بہت خشمگیں ہے وہ

اچھا ہے میرے عشق سے وہ باز ہی رہے
یارب یہ خامشی مری اک راز ہی رہے

مخمور جالندھری

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی اَنچھر

میری بھول:۔ اس ڈھب سے لکھنے لکھانے میں مجھ سے یوں ہی سی اک چوک ہو گئی۔ یہاں تک کی لکھت میں نہیں۔ پھر کس میں؟ اسی ڈھچر کی ان چٹھیوں میں جو کئی برس ادھر دلی کے "ساقی" اور "جامعہ" لاہور کے "ہمایوں" "شاہکار" اور "ادبی دنیا" میں چھپ چھپا کے نہ جانے کن کن ہاتھوں میں پہونچیں یہ مانی ہوئی بات ہے۔ وہ نئی ڈگر جو پیروں کے تلے دبی نہ ہو، پہلے پہل اس پر چلنے میں ادھر اُدھر نہیں دیکھا جاتا اور ناک کی سیدھ ہی پر چلنا پڑتا ہے دھیان کی ٹکٹکی ادھر بندھ جانے سے دوسری سانڈ کی چھوٹی، بڑی کوئی بات بھی دکھائی نہیں دیتی۔ نئے ڈھنگ سے اُردو، ہندی جھگڑا چکانے میں ایسا لگا جو نہ لکھنا چاہیے تھا۔ وہ لکھ گیا۔ ایک آدھ ہی نہیں سب چٹھیوں پر بے دھیانی ہی لکھواتی چلی گئی۔ جیسے۔

گاندھی جی سے بات چیت ٹھیٹ اُردو میں؛ پنڈت جواہرلال نہرو سے دو ڈھائی باتیں ٹھیٹ اردو میں؛ تاراچند جی سے دو دو باتیں ٹھیٹ اُردو میں؛

یہ جو بھی لکھا، یونہی چھپ چھپ گیا اور چھپنا چاہیے تھا۔ چھاپے کے سانچے میں ڈھل ڈھلا کے جب اپنا کیا دھرا سامنے آیا تو ایسا اچنبھا ہوا جیسے کسی دوسرے نے یہ بول بڑھا دئے ہیں۔ چھپ چکنے پر بھلا کاٹ چھانٹ کی جگہ کہاں؟ جو ہونا تھا ہو چکا۔ یہ سوچ کے چپ ہو گیا۔ پر جی کی پھانس نہ نکل اور یہ کھٹک نہ گئی۔ اس پر الگ لکھنا چاہتا تھا۔ پر ادھر اُدھر کے جھمیلوں نے نہ چھوڑا اور ان میں پھنس کے ایک بول بھی نہ لکھا جا سکا۔ اب جو بات چھڑی تو وہ دبی ہوئی چوٹ اُبھر آئی۔ نہ جاننے والے کہیں ٹھوکر نہ کھائیں اور لکھنے کے اس ڈھب کو ٹھیٹ اردو نہ سمجھنے لگیں۔ اس ڈر سے یہ لکھنا اور جتانا پڑا۔ وہ چٹھیاں جو ٹھیٹ اردو کے نام سے چھپ چکیں اُن کے لکھنے کا ڈھب اُردو تو ہے پر ٹھیٹ اُردو نہیں۔ پھر ٹھیٹ اُردو کسے کہتے ہیں اور اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کی ہندی کی چندی آگے آتی ہے۔

اب تک کی لکھت، کئی برس اُدھر کی چھپی ہوئی چٹھیوں کا وہ پہلا ٹکڑا ہے جسے فارسی میں "دیباچہ" کہتے ہیں۔ اس ٹکڑے اور اسکے پیچھے والی چٹھیوں کے لکھنے کا ڈھچر بھی ایسا ایک سا ہے جس میں نہ کہیں کوئی اُل بل ہے اور نہ یونہی سی بھی گھٹ بڑھ۔ جو ڈول اس کا ہے، وہی ڈھنگ انکا۔ رہی ٹھیٹ اُردو، اس کا ڈھب اس ڈھچر سے پورا الگ ہے۔ اس میں عربی، فارسی کا ایک آدھ بول ڈھونڈے سے بھی کہیں آپ کو نہیں مل سکتا اور ٹھیٹ اُردو میں سب بولیوں کے ملے جلے اور کھلے ملے بول دھڑلے سے برتے جاتے ہیں۔ ٹھیٹ اُردو کے سامنے لکھنے کا یہ ڈھنگ ایسا ہی ہے جیسے کسی ہری بھری لہکتی ہوئی بڑی پھلواری کے آگے کچھ مرجھائی ہوئی ٹہنیاں۔ ٹھیٹ اُردو کی بانگیاں دکھانے کے لئے اب کون ڈھونڈ ڈھانڈ کے جنجال میں پھنسے اور دوڑ دھوپ کرکے اِدھر اُدھر سے مانگے تانگے کی لکھتیں اکٹھی کرتا پھرے۔ دیس کے مانے ہوئے بڑے بوڑھوں کی چار پانچ لکھتیں جو اپنے پاس ہیں انہی میں سے کچھ ٹکڑے لکھنے سے پہلے آپ کو سرسید کی سبھا میں لئے چلتے ہیں۔ یہ سبھا تو آپ کی دیکھی ہوئی ہوگی۔ اچھا بتائیے تو یہاں کون کونسے لوگ ہیں۔ سب آپ کے جانے پہچانے ہوئے ہیں۔ پھر یہ چپ کیسی؟ دیکھئے نا وہ کیا سامنے شمس العلما مولنا محمد حسین آزاد، شمس العلما مولنا الطاف حسین حالی، شمس العلما مولنا ذکاء اللہ، شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلما شبلی نعمانی، اور ایسے ہی اور لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ ان سب کے بیچ میں دیکھیے سرسید ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے نچھتروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند۔ یہ سب کے سب دُھن کے پکے، بات کے پورے اور ایسے بھاری بھرکم ہیں جو برستے ہیں اور گرجتے نہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ، اپنے آپ کو لئے دئے رہنا، جی میں گھر کرنے والی انکی بات چیت دھیان کے کانوں سے سُنی جا سکتی ہے اور جو لکھ لکھا کے یہ چھوڑ گئے ہیں اُسے آج بھی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

سرسید سوجھ بوجھ کے جیسے بڑے دیوتا تھے اور اُن کی ٹکر کا دیس میں اور کوئی دوسرا نہ تھا۔ ایسے ہی انکے لکھنے لکھانے کا ڈھنگ بھی سب سے الگ اور انوکھا تھا جس بات کو لکھتے ایسے نرالے ڈھب سے لکھتے جس سے وہ پوری کی پوری آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ ایک آرٹکل میں بے ڈھنگل اور اودل جلول کھانا کھانے والوں کا فوٹو کھینچا ہے جسے دیکھتے ہی آنکھوں کے آگے یہ سماں بندھ جاتا ہے۔ سامنے الگ الگ رنگ کے بہت سے کھانے چُنے ہوئے ہیں، لوگ اُن پہ ایسے گرے پڑتے ہیں جیسے کنگلے اور مر بھکّے، آپا دھاپی ایسی ہے جیسے کھانا کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ جدھر

آنکھ اُٹھتی ہے بدمنگے پن کی بھنکار دکھائی دیتی ہے۔ سالن بھرے ہاتھ روٹیوں سے پونچھے جا رہے ہیں۔ انگلیوں سے کھیر چاٹی جا رہی ہے، سی سی کرتے ہوئے چٹ پٹے دہی کے سڑپے پہ سڑپے لگائے جا رہے ہیں۔ بھاڑ سے پھیلے ہوئے منہ چپڑ چپڑ کر رہے ہیں۔ آگے چھوڑی ہوئی ہڈیوں اور تھوکی ہوئی بوٹیوں پہ مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ جو پیٹ کا گڑھا پاٹ کے یہ گڑھی جیت چکے وہ لمبی چوڑی ڈکاروں پہ ڈکاریں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کھانے والوں کے پاس ہی ہاتھ دھونے میں کھنکار کھنکار کے آخ تھو، آخ تھو کر رہے ہیں۔ نہ انہیں سامنے کھانا کھانے والوں کا کچھ دھیان ہے اور نہ کھانے والوں کو ان کے گھناؤنے پن سے کچھ گھن آتی ہے۔ دونوں اپنی اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھ دھل رہے ہیں اور ان کا منہ چل رہا ہے۔

سرسیّد کی سبھا — یہیں تک لکھنے پایا تھا جو ایکا ایکی لکھنے لکھانے سے جی اُچاٹ ہوا اور نیند کے جھونکوں پہ جھونکے آنے لگے۔ کیا کرتا؟ لکھنا چھوڑ چھاڑ جا کے لیٹ رہا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور آنکھ لگتے ہی ایک ستھری، نکھری، جی جماتی سبھا سامنے آگئی۔ ایسی سبھا کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کئی دن ہو چکے اور ابھی تک وہ سہانا سماں آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ کیا دیکھا؟ سرسید اور اُن کے نو تن آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ پہلے سے کوئی بات چھڑی ہوئی ہے۔ مولانا حالی پوچھ رہے ہیں۔ کیا وہ روپیہ لے لیا گیا؟ سرسید کو کہتے سنا لے لیا گیا کیا، وہ سب کا سب اُٹھ اُٹھا بھی چکا۔ وہ بھونچکا ہو کے کہنے لگے یہ کیا کیا؟ کہاں کالج اور کہاں ایسی بُری کمائی۔ یہ دونوں ایسی بیجوڑ باتیں اگر جو ملانا چاہئے پر بھی کبھی نہیں مل سکتیں۔ سرسید نے کہا کیا کیا جائے اب تو بے جوڑ اور اَنمل باتیں مل ملا چکیں۔ اس روپے سے کالج کیلئے جو لائن بنائی جا رہی ہے۔ بن چکنے پر آپ اس میں کوئی جوڑ بتا سکیں تو بات جب ہے۔ مولانا شبلی بولے کچھ تو اتا پتا دیجئے وہ ہے کونسی لائن۔ سرسید کہنے لگے۔ نا بھئی نا۔ پہلے سے کہہ دینے میں بات پھر بات نہیں رہتی سجانے کیا ہو جاتی ہے۔ اس کے بن چکنے میں اب دن ہی کے رہ گئے۔ بہت سے بہت دس پندرہ ہونگے۔ یہ دن ہی کیا؟ بات کہتے میں کٹتے ہیں۔ پھر ان سب کو جنہوں نے نہیں نہیں کی رٹ لگائی ہے وہ دکھا کے اچانک بھانڈا پھوڑا جائیگا۔ ابھی سے بتا دیا تو پھر اپنے پاس کیا رہا۔

میں بڑے اچنبے سے یہ بات چیت سنا کیا اور کچھ نہ سمجھ سکا روپیہ کس کا، بُری کمائی کیسی اور لائن کونسی؟ پھر آپ ہی آپ بڑے بوڑھوں سے سُنی سُنائی باتوں کا دھیان آنے لگا تب یہ گتھی سلجھی۔ بات یہ تھی۔ جب علی گڑھ کالج بن رہا تھا تو ایک بڑی پیسے والی رنڈی نے بھی کئی ہزار سے کالج کے بننے میں ہاتھ بٹانا چاہا اور سرسید سے کہلوایا، انہوں نے مولویوں سے پچھوایا۔ مُلّاؤں نے چھوٹتے ہی کہدیا، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کبھی ایسی کمائی کالج میں نہیں لگائی جا سکتی۔ سرسید پہلے تو چُپ ہو گئے۔ پھر کچھ سوچ ساچ کے چپکے سے وہ روپیہ لے لوا کے یہاں سے لیکر وہاں تک کالج کے سب پاتھ روم اور بم پولس بنوا ڈالے۔ تو یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں جو سرسید نے انگڑائی لیکر کہا۔ بھئی آج تو جی چاہتا ہے کچھ اپنی کہیں اور کچھ آپ کی سُنیں۔ جیسے کوی، کبیشر مل جل کے ایک جگہ بیٹھ کر گھڑی بھر میں آپس میں اپنے اپنے چھند اور دوہے سُنا کر جی بہلایا کرتے ہیں۔ ایسے ہی آج ہم آپ سب کے سب اپنی اپنی نئی پرانی لکھتوں میں سے جتنا سُنا سکیں سُنائیں اور گھڑی دو گھڑی جی بہلائیں۔

یہ سُنتے ہی پہلے تو کچھ کانا پھوسی ہوئی اور پھر سبھا والے پہلے آپ، پہلے آپ کہہ کے آپس میں ایک دوسرے پہ ٹالنے لگے۔ سرسید نے مُسکرا کے کہا بہت اچھا، پہلے ہمیں سہی لیجئے سُنئے۔ سب سنبھل بیٹھے اور سرسید اپنے آرٹکل کا یہ ٹکرا سنانے لگے۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں، مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابوں، رکابیوں، غوریوں، تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی، ہر طرح کے کباب، فیرنی کے خوانچے، بورانی کے پیالے اور اچار، مُربّے کی پیالیاں سیتلا کے پوجا کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔ اور اس ایک دسترخوان پر کوئی فیرینی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے، کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن سے نکلی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصے میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اُس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے اور اور بے تکلف

بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں نہ ہاتھ، مونہہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کریہہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھو تھو کرکے چلمچی یا ناش میں تھوک دینے اور بتاسے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا ہے۔"

لکھنے کا انوکھا ڈھنگ، کمال ہی کی بات تھی۔ پھر سرسید کا پڑھنا سونے پہ سہاگا تھا۔ مولانا شبلی کہنے لگے اچھے اچھے کھانوں کی بہتات سے تو منہ میں پانی بھر آیا تھا پر جلے دلے روٹی کے ٹکڑوں، چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور سالن میں کی نکلی ہوئی مکھیوں کو دیکھ کر ابکائی آنے لگی۔ مولانا ذکاء اللہ نے کہا یہ لکھنا نہیں جلتا ہوا منتر ہے۔ مولانا حالی بولے لکھنا اسے کہتے ہیں، یہ سب سُن سُنا کے سرسید کہنے لگے اچھا اب سمجھ سے ہیٹے جھگڑالو دل کی لیٹنٹ بھی دیکھ لیجیے، یہ کہہ کر ایک اور آرٹیکل کا یہ ٹکڑا پڑھا۔

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، مونہہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر پر، اس کا کان اس کے مونہہ میں، اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کے بھاگ نکلا۔ نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے، واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو، دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ ناک بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی ڈاڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔"

ایسی لکھت سُن کر بھلا کون چپ بیٹھ سکتا تھا۔ سبھا کی سبھا پھڑک اٹھی۔ مولانا نذیر احمد نے کہا انگریزی کے دھیان کو اپنا کر لیا، یہ بات انگریزی میں کہاں، اس سے کہیں آگے بڑھا دیا۔ سرسید بات کاٹ کے کہنے لگے کیوں بھئی اب کس کا نمبر ہے۔ یہ کہہ کے مولانا نذیر احمد کو دیکھا۔ یہ سنبھل کے بیٹھے، گلے کے کالر اور ٹوپی کو ٹھیک کیا، ادھر ادھر دیکھا اور کھنکار کے "توبۃ النصوح" کا یہ ٹکڑا سنانے لگے۔

"باپ نے جو یہ رام کہانی سنائی، بیٹے پر اس طرح کی ہیبت چھائی کہ چونک پڑا، جاگا تو پھر وہی دالان تھا اور وہی تیمارداریوں کا سامان۔ بی بی پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی، میاں کی آنکھ کھلی ہوئی دیکھ کر اس کی جان میں بھی جان آئی۔ ورنہ جس گھڑی سے میاں نے جی برا کیا تھا سہموں کے مارے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ نصوح آٹھ بجے ڈاکٹر کی دوا پی کر جو پڑا تھا تو اس وقت کا سویا سویا اب کہیں دو بجے جا کر ہوشیار ہوا۔ چونکہ ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نیند اگر آگئی تو جاننا کہ بیمار بچ گیا۔ اسکے سو جانے سے سب کو تسلی سی ہو گئی تھی۔ مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو عورتیں پھر گھبرانے لگیں کہ نہیں معلوم کمبخت ڈاکٹر کیسی دوا پلا گیا ہے کہ دو پہر پڑے پڑے گزر گئے، کروٹ تک نہیں بدلی، خدا جانے اندر سے جی کیسا ہے اور دل پر ایسی کیا آن بنی ہے، کیوں کر ہوش آئیگا؟ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ نصوح بیدار ہوا تو بی بی نے پوچھا کیسی طبیعت ہے؟ اچھے سوتے کہ گھر میں رونا پیٹنا ہوا کیا اور تم کو خبر نہیں۔ بولو۔ بات کرو کہ اوپر والوں کی تسلی ہو۔ کسی بچے کے مونہہ میں دانہ تک گیا ہو تو حرام۔ چھوٹے بڑے سب کل کا کھائے ہوئے ہیں، روتے روتے لڑکیوں کی آنکھیں سوج گئی

ہیں، لڑکے ہیں کہ مضطر اور پریشان پھرتے ہیں۔ بی بی نے ہر چند نجوی کی باتیں کیں مگر نصوح کو خواب کا سارا ماجرا پیش نظر تھا مطلق جواب نہ دیا۔ بی بی سمجھی کہ بیماری کی وجہ سے بولنے کو جی نہ چاہتا ہوگا۔ مگر وہ خدشہ سب کے دل سے دفع ہو گیا۔ مبارک سلامت ہونے لگی اور گھر بھر نے بے رمضان کی عید منائی۔ گو دیر ہو گئی تھی مگر لوگ بھوکے تھے، بازار سے حلوا پوری منگوا کر سب نے تھوڑا بہت کھایا پیا، کھانے ہی پینے میں کسی نے یہ بات بھی چھیڑ دی کہ مریض کا غسل صحت ہو تو ایک رتجگا بڑی دھوم سے ہو جائے اور اچھے ہونے کی شادی کریں۔ یہ لوگ تو شادی اور رتجگے کے ارادے رہے تھے اور نصوح اپنے خواب کے تصور میں غلطاں پیچاں تھا۔"

جو ایک ایک بول کی ناپ تول کے رسیا اور بولیوں کی گلیاں چھانتے ہوتے ہوں وہی ان مول لٹریچر کے سڈول موتی پرکھ سکتے ہیں۔ یہاں سب کے سب ایسے ہی لوگ اکھٹے تھے۔ اس لکھت کی کڑیاں بانچنے والوں نے جانچیں اور پرکھنے والوں نے جی بھر کے پرکھیں۔ ان لڑیوں میں کا ایک ایک سڈول اور انمول موتی اچھے کے کانٹے میں لگا تار تلتا رہا۔ مولانا شبلی بولے رات دن کی بات چیت میں بھی کہیں نہ کہیں رکنا، ٹھہرنا اور سوچنا پڑتا ہے۔ ایسی لکھت کا بھلا کیا ٹھکانا ہے جس میں بہتے ہوئے پانی کا سا بہاؤ اور کسی روک ٹوک کا کہیں پتا بھی نہ ہو۔ ان ہی باتوں میں سرسید نے کھنکارا اور مولانا حالی سے کہا۔ کیوں، کیا آپ یونہی چپ رہیں گے؟۔ انہوں نے کہا۔ جی نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں نہیں تو پھر کہاں سناؤں گا۔ ایسی شبھ گھڑی کہاں ہاتھ آتی ہے۔ برا بھلا جو بھی کچھ لکھا ہے جی چاہتا ہے وہ سب کا سب سنا ڈالوں۔ پر بڑی پوری لکھت ایک سانس میں کیسے سنائی جا سکتی ہے۔ اس لئے سوچ رہا تھا اس میں سے کیسے چھوڑوں اور کیسے سناؤں۔ سرسید بولے یہ سوچ ساچ کیسی۔ جہاں سے بھی ہو سنا دیجیے اور جتنا پڑھا جا سکے پڑھئے۔ یہ سنتے ہی مولانا سنبھل کر بیٹھے اور یہ پڑھنے لگے۔

"بہر حال مثنوی میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا خاص کر جبکہ اس میں تاریخ یا قصہ بیان کیا جائے نہایت ضرور ہے۔ دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں میں ایسی باتیں بیان کرنے کا دستور نہ صرف ایشیا میں بلکہ کم و بیش تمام دنیا میں قدیم سے چلا آتا ہے اور جب تک کہ انسان کا علم محدود تھا ایسی باتوں کا اثر لوگوں کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن اب علم نے اس طلسم کو توڑ دیا ہے۔ اب بجائے اسکے کہ ان باتوں کا لوگوں کے دل پر کچھ اثر ہو اور ان پر ہنسی آتی ہے اور ان کی حقارت کی جاتی ہے اور بعوض اس کے کہ ان سے کچھ تعجب پیدا ہو شاعر کی حماقت اور سادہ لوحی معلوم ہوتی ہے۔ اب شاعر یا ناولسٹ کی لیاقت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جو مرحلے پہلے محالات کے ذریعے سے طے کئے جاتے تھے اور جنکا عادتاً طے ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا ان کو علم اور فلسفے کے موافق نہایت آسانی کے ساتھ طے کر جائے مثلاً شاہنامہ میں جہاں رستم و سہراب کو لڑایا ہے وہاں فردوسی یا اصل قصہ بنانے والے کو دو متضاد باتیں ثابت کرنی منظور ہیں۔ ایک سہراب کا رستم سے بہت زیادہ قوی اور تنومند ہونا، دوسرے رستم کے ہاتھ سے آخرکار اس کو قتل کرانا۔ پہلی بات تو اس نے اس طرح ثابت کی ہے کہ پہلے مقابلے میں سہراب سے رستم کو پچھڑوایا ہے مگر اب دوسری بات بغیر افق کے ثابت نہیں ہو سکتی کہ رستم میں غیر معمولی طاقت خود بخود پیدا ہو جائے۔ پس اس غرض کیلئے یہ بات گھڑی گئی کہ رستم نے جوانی میں جبکہ وہ اپنی طاقت اور زور سے تنگ آگیا تھا، خدا سے دعا کی تھی کہ میری طاقت کم ہو جائے۔ چنانچہ اس کی اصلی طاقت بہت کم ہو گئی تھی۔ اب سہراب سے مغلوب ہو کر اس نے پھر دعا کی کہ میری اصلی طاقت مجھ کو مل جائے۔ چنانچہ اس کی اصلی طاقت جو خدا کے ہاں امانت رکھی تھی، اس کو واپس مل گئی اور دوسرے یا تیسرے مقابلے میں وہ سہراب پر غالب آگیا۔ لیکن اس زمانے میں ایسے ڈھکوسلوں سے کچھ کام نہیں چلتا۔ آج کل کسی کو ایسا مرحلہ پیش آئے تو وہ اس کو اس طرح طے کر سکتا ہے کہ رستم جو کسی سے مغلوب نہ ہوا تھا اور جس کی شہرت تمام ایران اور توران میں ضرب المثل تھی، ایک لونڈے کے ہاتھ سے پچھڑ کر اس کی غیرت سخت جوش میں آئی اور اپنی عمر بھر کی ناموری اور عزت قائم رکھنے کا ولولہ اس کے دل میں نہایت زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ گو وہ طاقت میں سہراب سے بہت کم تھا۔ مگر سپہ گری کے کرتبوں اور تجربوں میں سہراب کو اس سے

کچھ نسبت نہ تھی۔ لہٰذا دوسرے یا تیسرے مقابلے میں جوشِ غیرت اور پاسِ عزّت اور فنِ سپہ گری کی مشّاقی سے اُس نے سہراب کو مار رکھا۔"

"نہیں! رکنا چاہتے تھے پر ابھی اور ابھی اور کی پکار سے لکھت جو ہاتھ میں تھی اسے اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کے کچھ ایک اور جگہ سے پڑھنے لگے:

"میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ شوق نے غالباً واجد علی شاہ کے اخیر زمانۂ سلطنت میں یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں سے تین مثنویوں میں اُس نے اپنی بوالہوسی اور کامجوئی کی سرگزشت بیان کی ہے۔ یا یوں کہو کہ اپنے اوپر فقرا باندھا ہے اور ایک مثنوی یعنی لذّتِ عشق ایک قصّہ بالکل بدرِ منیر کے قصّے سے ملتا جلتا اسی کی بحر میں لکھا ہے۔ ان مثنویوں میں اکثر مقامات اس قدر ان مورل اور خلافِ تہذیب ہیں کہ ایک مدّت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک ان کو بدرِ منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جو اب متروک ہو گئے ہیں اور حشو اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ ان میں ایک قسم کا بیان اور زبان کی گھلاوٹ، روزمرّہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدرِ منیر کے بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بےتکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔ اگرچہ ان مثنویوں میں بدرِ منیر کی طرح ہر موقع کا سین نہیں دکھایا گیا جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔ مگر جو کچھ اس نے بیان کیا ہے خواہ وہ مورل ہو اور خواہ ان مورل۔ اس میں حسنِ بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اس نے برخلاف عام شعرائے لکھنؤ کے لفظی رعایتوں کا مطلق التزام نہیں کیا اور اردو کے عام روزمرّہ کو صحتِ الفاظ پر جس کے اہلِ لکھنؤ سخت پابند ہیں اکثر ترجیح دی ہے۔ ردیف و قافیہ میں عروضیوں کی بیجا قیدوں کی بھی چنداں پابندی نہیں کی۔ مگر جو اصل مقصود ردیف و قافیے سے ہوتا ہے اُسکو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً ؎

کوئی مرتا ہے کیوں؟ بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس ردیف کو ہمارے شعرا ضرور غلط بتائیں گے۔ مگر ردیف کا جو اصل مقصد ہے وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ سامع کو یہ شعر سن کر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا ماحصل ہے۔ اختلاط کے موقع پر جس بےتکلفی کے ساتھ معاملات کی تصویر اُس نے کھینچی ہے۔ اس کی نسبت سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ "چور کی ماں گھٹنوں میں سر دیے اور روتے" افسوس ہے کہ شوق کی مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جا سکتی کہ جو شاعری اس نے ایسی ان مورل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے اگر وہ اس کو اچھی جگہ صرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام نہ لیتا تو آج اُردو زبان میں اُسکی مثنوی کا جواب نہ ہوتا۔"

ایسی جچی تلی اور رکی تھمکی لکھت کا کیا کہنا اور کیا پوچھنا کہہ کر سب نے لگاتار سراہا اور پوچھا اس کا نام کیا رکھا؟ کہنے لگے "مقدمۂ شعر و شاعری" ان کے پڑھ چکنے پر سر سید کے نورتنوں میں سے اور بھاری بھرکم لوگ اپنی اپنی دھوم دھامی لکھتیں سنا کے سبھا پر چھا گئے اور دھیان کو مٹھی میں لے لیا۔ جب یہ پڑھنا پڑھانا ہو چکا تو سر سید نے اِدھر اُدھر دیکھ کر مولنا آزاد سے کہا۔ لیجے، سنبھلیے اب آپ ہی کا نمبر ہے۔ وہ بولے۔ سنبھلوں کیسے؟ جی لبھانے والے پھولوں کی بھینی بھینی باس بھی تو سنبھلنے دے۔ الگ الگ دھیانوں کے مہکتے ہوئے کٹوروں سے پھولوں کو جی چاہتا ہے یوں ہی چپ چاپ بیٹھا سونگھتا اور دیکھتا رہوں۔ مولنا ذکاء اللہ مسکرا کر کہنے لگے۔ پھول والے اب تو آپ کی ہری بھری پھلواری کے دیکھنے کے لیے ٹکٹکی باندھے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ پھلواری کیسی، کانٹوں بھری جھاڑی کہیے، کیا پڑھوں؟ جب تک ہاتھ میں کوئی لکھت نہ ہو، تب تک مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔ یوں تو پہلے ہی سے بھلکڑ تھا۔ پر اب بھول بہت بڑھ گئی، کوئی بات دھیان میں نہیں رہتی۔ نجانے کیسے ایک پرانی دھرانی لکھت کے دو تین ٹکڑے دھیان کی جھولی میں پڑے رہ گئے ہیں۔ ہو سکا تو انہیں کو نکال کے دکھاتا اور سناتا ہوں۔ یہ کہتے ہی سنبھل بیٹھے، مونہہ پر ہاتھ پھیرا، انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کی، کئی سکنڈ تک سامنے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، جیسے کچھ سوچ رہے ہیں۔

پھر سبھا والوں میں سے ایک ایک کو نیچے سے اوپر تک دیکھ بھال کے یہ سنانے لگے :-

بھاشا کی پھلواری "درختوں نے جھنڈ چھائے ہیں، گھن کے پتے ہیں۔ اُن کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں، کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیل ہوئی ہیں، چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے، عشق پیچہ لگر وندے پر چڑھا جاتا ہے، اس کی ٹہنیاں لٹکی ہیں، جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں، میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے بور میں اس کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بو جی کو بھاتی اور لبھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں، مولسری کے پھولوں کا مینہ برستا ہے۔ پھل پھلاری کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا ان کی بو باس میں بسی ہوئی، روشوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹکھیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز، کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی سماں باندھ رہی ہے۔ پرند درختوں پر بول رہے ہیں اور کلول کر رہے ہیں۔ حوضوں میں چادر اس زور سے گرتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہراتا جاتا ہے تو ایک عجیب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اترتے ہیں، نہاتے جاتے ہیں، آپس میں لڑتے جاتے ہیں، پروں کو پھڑاتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ چند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک، ایک طرف سے کوکلے کی آواز، اسی جھمگھٹ میں مصیبت زدہ عاشق بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے اور اپنی جدائی کے دکھ کو مزے لے لیکر اٹھاتا ہے"

برکھا رت - "سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی، ابر دھواں دھار ہے بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں، بہاریں دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جدا جھنگارتے ہیں، پپیہے لگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چنبیلی کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے"

جھٹپٹے کا سماں - "پہاڑیاں ہری بھری ہیں۔ ارد گرد سرسبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہہ رہا ہے، جیسے موتی کی آب، بیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اُس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لب دریا کے پھول بوٹوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دودھیلن گایوں اور بکریوں کا چارہ ہو جاتے"

ٹکسالی بولی۔ پھر اُس کا بناؤ سنگار، بانکپن اور تیکھاپن، لوچ، لچک اور گھلاوٹ سے سب کے سب چھک چھکا گئے۔ اور لے پنے سبھا کی سبھا جھومنے لگی۔ مولنا حالی بولے۔ کیا کہنا، آنکھوں میں سماں پھرنے لگا، ایک ایک بول موتیوں میں تولنے کا ہے۔ لکھنا اسے کہتے ہیں۔ مولنا شبلی نے کہا۔ انہی سے دلی کی ناک اونچی ہے اور ایسے ہی لوگوں سے دلی دلی ہے، نہیں تو اب اجڑی ہوئی دلی میں کیا دھرا ہے! سر سید کہنے لگے۔ بھئی جی کی کلی کھل گئی۔ ہمارے شمس العلما کی البیلی بولی اور اس کی گھلاوٹ کا کیا ٹھکانا ہے۔ کتنا ہی سنیئے پر جی نہیں بھرتا۔ یہ کہہ کے سنہری پنّوں کی ایک لکھت نکالی اور سبھا والوں سے پوچھا۔ کیا آپ نے نظم طباطبائی دیکھی ہے؟ کسی نے کہا جی نہیں، کسی نے ہامی بھری، کسی نے کہا۔ یونہی کچھ تھوڑی سی۔ انہوں نے کہا میں نے بھی ابھی تھوڑی ہی سی دیکھی ہے۔ پر جتنی دیکھی اُسے دیکھ کر جی پھڑک گیا۔ لکھنا کیا ہے۔ یہ دکھائی دیتا ہے، جیسے سنہری بادلے پر موتی ڈھلکتے آتے ہیں۔ اس کے جتنے ٹکڑے اچھے لگے انہیں بے سنائے جی نہیں مانتا۔ آپ سنیں گے؟ کیا پڑھوں؟۔ پڑھتے پڑھتے کی پکار سے سبھا گونجنے لگی اور سر سید رک رک کر اور ٹھیر ٹھیر کر ایسے ڈھنگ سے پڑھنے لگے جیسے اس کے ایک ایک بول کا انمول ہونا دکھانا چاہتے ہیں :-

"ندی کا چڑھاؤ اور پانی کا بہاؤ پیراک کو اور طرف نہیں جانے دیتا۔ یہی حال کلام میں روانی و جوش کا ہے کہ شاعر کو

سیدھ بحرین ودریت ... پہنچ کر کہتا ہے کہ اب جی کھول کھول کے غواصی کر اور رول رول کر موتی نکال۔ دیکھ استعاروں اور کنایوں کی تاریکی میں معنی ... کی جھلک اس طرح نظر آئے جیسے کالی گھٹاؤں میں بجلی کوند کر آنکھوں کو خیرہ کر دے یا پچھلے کے اندھیرے میں پو پھٹنے سے روشنی پھیلے یا ابر گھر کر آئے اور برس کر کھل جائے۔ نسیم صبح کا چلنا، جھومتی ہوئی ڈالیوں سے سبزے پر پھولوں کا بکھرنا اس قدر لطف نہیں رکھتا جس قدر ایک برجستہ شعر سے لطائف کا پیدا ہونا وجد میں لاتا ہے۔ لفظ و ترکیب کی شان و شوکت حیرت انگیز تو ہے۔ لیکن معانی کی بے تکلفی کچھ دل آویز ہے۔ تاروں کی چھاؤں سہانی ہے۔ لیکن نور کا تڑکا اس سے زیادہ دلکش ہے۔ یاقوت و زمرد کی چھوٹ آنکھوں کو لبھا لیتی ہے۔ لیکن ہیرے کے کنول میں مہتاب کی تڑپ اور ہی عالم رکھتی ہے۔ شعر سے معنی کے نکلنے کا لطف وہی جانے جس نے چینی کا کھنکھنا سنا ہو یا ریتی ٹپکنا دیکھا ہو۔ سننے میں عرض کا پڑنا اور ذہن میں معنی کا اترنا دونوں کی ایک ہی سی سرعت ہونی چاہئے۔ تیر اُسے کہتے ہیں جو ترازو ہو جائے، تلوار وہی ہے جو تسمہ نہ لگا رکھے۔ جس شعر کے معنی میں اُلجھن پڑ جائے، نکتہ سنج طبیعتیں مطلب کے تعین میں اختلاف کریں، سمجھ لو شاعر ادا نہ کر سکا۔ صاف شعر کھلا ہوا شگوفہ اور کھلا ہوا نافہ ہے جس کی خوشبو خود بخود دماغ تک پہونچ جاتی ہے۔ بولتے ہوئے قافیے چٹکتی ہوئی کلیاں ہیں جو دلکش صدا کے ساتھ نفس دلکشا بھی رکھتی ہیں۔ اول کلام اس طرح آخر کلام کا پتہ دے جیسے کہتے ہیں کہ تار باجا، راگ بوجھا۔ برجستہ شعر چلتا ہوا جادو اور بولتی ہوئی تصویر ہے اور یہ بات جب تک لفظ کے ساتھ لفظ لپٹا ہوا نہ ہو حاصل نہیں ہوتی۔ قافیہ و ردیف جو راستہ بتائے جب تک غزلگو اسی راہ پر نہ جائے منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا۔ شعر کا مقتضائے وقت سے مطابق ہونا ایسا ہی اثر رکھتا ہے جیسے شام کو شفق کا پھولنا، ہلال کا نظر آجانا، تاروں کا کھلنا، صبح ہوتے نسیم سحر کا چلنا، سہیل کا جھلملانا، زہرہ کا طلوع کرنا، کچھ کم دن رہتے فواروں کا چھوٹنا، پچھلی رات کی نیند میں کوئل کا کوکنا، آبشاروں کا لوری دینا، دوپہر کو ابر کا آجانا، موروں کا شور کرنا دل کو بےچین کر دیتا ہے۔

"چند لفظوں میں معنی کثیر کا ادا کر دینا ایجاز نہیں اعجاز سمجھئے۔ دانے کی گرہ میں خرمن، غنچے کی مٹھی میں گلشن کا سما جانا تو دیکھئے۔ ذرا سی بات کو پیرائے بدل بدل کر کہنا اطناب نہیں نور کی طناب سمجھو جس سے سات طرح کے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں اور شعاع ایک ہی ہے۔"

"بادل میں کبھی روشنی سی ہو کر رہ جاتی ہے جسے کوندا کہتے ہیں، کبھی خون کی طرح رگ ابر میں بجلی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کبھی کچھ لہریں اس کی باہر بھی نکل آتی ہیں، کبھی اس بھیگی کملی کو پھینک عریاں ہو کر آغوشِ خرمن میں آجاتی ہے۔ یہ سب صورتیں معانی کی جلوہ گری میں بھی موجود ہیں۔ کبھی گھونگٹ میں ایک جھلک نظر آگئی، کبھی محمل کا پردہ اڑا کر ہوا نے بے پردہ کر دیا، کبھی خود منہ نکال کر جھانک لیا، کبھی ایک برہنہ تصویر سی سامنے آگئی۔ معانی کے وضوح کی یہ چاروں شکلیں دلفریب، دل آویز، دلکش و دل کشا ہیں۔"

"خلف الاحمر سے کسی نے کہا میں تو اپنی پسند کو پسند سمجھتا ہوں تم اس شعر کو پسند نہ کرو نہ سہی۔ اُس نے جواب دیا کہ کوئی روپیہ تمہیں پسند آجائے اور صراف کہے کھوٹا ہے تو اس پسند سے نقصان کے سوا کیا حاصل ہوگا۔ اپنی رائے، اپنے مذاق کو لوگوں پر ظاہر کرنا آسان امر نہیں ہے۔ کمال تہذیب خیال اور تہذیب کلام کی ضرورت ہے۔ ٹھنڈی گرمیاں، پھیکی شوخیاں، بے لطف غمزے، بے مزہ چوچلے کس کام کے۔ فرض کیجئے۔ کلام اچھا ہے، پُرجوش بھی ہے، لیکن غلطیاں بھری ہیں۔ عین گرتا ہے، وزن ٹوٹتا ہے، قافیے میں ایطا ہے۔ اس کی وہی بات ہے۔ بکری نے دودھ دیا مینگنیوں بھرا، گدڑی کا ایک چیتھڑا، اس میں بھی جوئیں، کودوں کا دلیا، پھر بھی کسی نوالے میں مکھی، کسی میں بال، کھاری کنواں اور اس میں مُردار۔"

یہ سنتے سنتے آنکھ جو کھلی تو اب نہ کہیں وہ سبھا تھی اور نہ سبھا والے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں دھرا کیا تھا جو دکھائی

دیتا۔ بڑا سوچتا رہا۔ کیا دیکھا؟ پھر آپ ہی آپ سمجھ میں آیا۔ جاگتے میں جس دھیان سے مڈبھیڑ رہی تھی، سوتے میں بھی وہی دھیان نئے روپ اور نئے ٹھاٹ سے سامنے آگیا۔ میں نے جو بھی دیکھا اُسے جوں کا توں نہ دکھا سکا۔ بات یہ ہے گنے چُنے گنتی کے وہ ادھ کٹے بول جو برتے جا رہے ہیں اُن میں اتنا پھیلاؤ اور گہراؤ کہاں جو دیکھا تھا پورا سماں سمیٹ سکیں۔ اچھا اب اسے تو چھوڑیئے اور اس کی لپیٹ میں سر سید کے آرٹیکل، مولانا نذیر احمد کی "توبۃ النصوح"، مولانا حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری"، مولانا آزاد کی "آبِ حیات" اور علامہ حیدر یار جنگ طباطبائی کی "نظم طباطبائی" کے چھوٹے بڑے جتنے ٹکڑے آگئے ہیں اُنہیں جی بھر کے دیکھئے۔ یہ ہے ٹھیٹ اُردو، ٹھیٹ اُردو اسے کہتے ہیں اور لکھنے کا یہی ڈھنگ اور یہی ڈھچر ٹھیٹ اُردو کہلاتا ہے۔ کئی برس اُدھر میں نے جو لکھا اور اب جو لکھ رہا ہوں بھلا اسے ٹھیٹ اُردو سے کیا لگاؤ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ٹھیٹ اُردو کی باندگیاں جو پرکھنے اور برتنے کی کسوٹیاں ہیں وہ سب کی سب آپکے سامنے ہیں۔ جیسے جی چاہے ان پہ کس کے دیکھ لیجے۔ چٹکی بجاتے میں کھرا کھوٹا سامنے آجائے گا۔

اُردو جن جن بولیوں کا نچوڑ کہلاتی ہے اور جتنی بولیوں سے مل ملا کے بنی ہے۔ ان سب کے گھُلے ملے بولوں کی یونہی سی بھی کوئی روک ٹوک ٹھیٹ اُردو میں نہیں۔ ایسے بول دھڑلے سے اس میں برتے جاتے اور انہی کی بھرمار سے یہ پھلتی پھولتی ہے۔ جیسے ابھی اس کی باندگیوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اُردو، ہندی جھگڑا چکانے پر لگی، پچھلی میری لکھتوں میں تو یہاں سے لیکر وہاں تک بڑی بھاری روک ٹوک ہی روک ٹوک ہے جس سے پوری چھان بین اور لگا تار ڈھونڈ ڈھانڈ ان میں سے عربی، فارسی کے ڈھائی بول بھی نہیں نکال سکتی۔ تو لکھنے کے اس ڈھچر کو سید انشا کی لکھی ہوئی کہانی "رانی کیتکی" کا پورا ٹھپا تو آپ کہہ سکتے ہیں۔ پر ٹھیٹ اُردو کبھی نہیں کہہ سکتے۔ کہاں پوت اور سیپیوں کا مول ان کنٹھا اور کہاں سچے اور اچھے سڈول موتیوں کا انمول ستلڑا، دونوں میں بڑا الل بل ہے۔

کچھ بھولے بسرے بول

جیسے سپنا (خواب)، پستک (کتاب)، کوی (شاعر)، کبیشر (ملک الشعرا)، ودوان (عالم)، مکٹ (تاج)، مکت (معانی)، نچھتر (ستارے)، یہ گنتی کے وہ بول ہیں جو لکھنے کی لپیٹ میں آگئے اور کترا کے نکلنے پر بھی ان سات آٹھ بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی۔ پر جس لکھت کا پھیلاؤ ولٹریچر کے ساتھ ساتھ اور اور کٹھن باتوں کو بھی سمیٹتا چلا جا رہا ہو، اس میں کچھ بھولے بسرے بولوں کا سمٹ آنا کوئی انوکھی اور اچنبے کی بات نہیں۔

نام اور رنگ یہ دونوں بول بھی جگہ جگہ اس لکھت میں لکھے گئے ہیں۔ بھولے سے نہیں جان بوجھ کے۔ جو نہیں جانتے وہ تو انہیں نرے فارسی بول ہی سمجھیں گے۔ پر جاننے والے ان کو دونوں گھرانوں کے میل ملاپ کا اجالا سمجھتے ہیں۔ پرانی فارسی اور سنسکرت کی اپنایت کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اسی لکھت میں جہاں ان دونوں کے ملے جلے بولوں کا ڈھچر دکھایا گیا ہے وہاں دیکھئے وہ کیسا ایک سا دکھائی دیتا ہے اور کہیں کچھ گھٹ بڑھ ہے بھی تو وہ ایسی نہیں جس کی آڑ میں بولوں کی پوری بناوٹ چھپ چھپ کے رہ جائے۔ فارسی اور سنسکرت کے جیسے اور بولوں کی جھلکیاں آپس میں ملتی جلتی سی ہیں ایسے ہی نام اور رنگ میں بھی کھوج لگانے والوں کو ایک ہی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے ان بولوں کو فارسی اور سنسکرت دونوں سمجھنا چاہیئے۔ جب یہ دونوں کے دونوں فارسی بھی ہیں اور سنسکرت بھی تو پہلے سے جو کنڈل کھینچ دیا گیا تھا اُس سے بال بھر بھی یہ لکھت باہر نہ نکل سکی اور اسی گھوم گھام اسی کنڈل میں رہی۔

اُردو، ہندی جھگڑا چکانے کے لئے کئی برس ادھر اُردو اکیڈمی الہ آباد کے سکریٹری تاراچند جی، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ایک کے پیچھے دوسرے کو الگ الگ چھوٹی بڑی سب سات چٹھیاں لکھیں۔ میرے لکھنے لکھانے پران لوگوں میں سے ایک ایک نے جو کچھ بھی لکھ لکھا کے بھیجا وہ سب کا سب آپ ابھی دیکھیں گے۔ ان چٹھیوں کے آمنے سامنے ان لوگوں کی لکھتوں کو رکھ کر جانچنے اور پرتالنے پر چھوٹی سی چھوٹی بات بھی نہیں رہ سکتی اور سوجھ بوجھ والے چاہے ہندو ہوں چاہے مسلمان وہ یہ اچھے سے دیکھیں گے۔ میں نے کیا کہا اور ان لوگوں نے کیا سمجھا؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا میں نے جو لکھا اسے کوئی نہ سمجھ سکا۔ بات یہ ہوئی اپنے کئے کی لاج آپڑی۔ دھیان نے یہ پٹی پڑھائی اسے مان لیں تو پھر اپنی بات کی پچ کیسے کریں۔ اس لئے جان بوجھ کے سب کے سب انجان بن گئے، ایکے کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا گیا' سنی ہوئی باتیں ان سنی بن گئیں، بات رہ گئی اور گھڑی نکل گئی۔ پھر بھی ابھی ایسی گھڑی نہیں جو یہ کہا جا سکے۔ "گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر" لکیر پیٹنا کیسی، بگاڑ کا بس بھرا ناگ ابھی نکلا کہاں؟ وہ تو من کے کونے کھدروں میں گنڈلی مارے چھپا چھپایا بیٹھا ہوا ہے۔ سبکے سب ایکے کا موٹا

سالٹے پکے پر، پڑیں تو گھڑی بھر میں کھل کھلائے اس کا کچومر نکال دیں۔

یہ سچ ہے آس کا دھاگا سانس کی ڈور میں بندھا رہتا ہے۔ پر یہاں کا بھونچال دیکھ کر آس نہیں بندھتی اور یہی دھیان آتا ہے۔ جب اب تک کچھ نہ ہو سکا تو بھلا آگے کیا ہو سکے گا۔ بڑھتا ہوا انگارہ پہلے پورا ہو لے اور پورا ہو چکنے پر گھٹنے لگے جب کہیں سدھار کی گھڑی سے مڈبھیڑ ہو۔ ابھی تو یہ ادھورا ہے، جونیوں میں دل بٹ رہی ہے، ان کی بجھائی کی آگ بھڑک رہی ہے پھوٹ کا بھوت چٹا ہوا دیس کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہے۔ کسی بات کا کوئی تھل بیڑا نہیں، جدھر دیکھئے اک اودھم مچا ہوا ہے۔ مسلم لیگ اور کانگرس یہ دونوں کی دونوں اپنی اپنی دھن میں لگی ہوئی جل کٹی سنا رہی ہیں۔ ادھر اُدھر کے لڑاکو آپس میں بھڑ پڑنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ ہندو مسلم جھگڑا چکانے کیلئے مسلم لیگ "پاکستان" بنانا چاہتی ہے۔ کانگریس جھلا کے کہتی ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم دیس کے کبھی ٹکڑے ٹوٹے نہیں ہونے دینگے۔ تو جب!

نام لیتی ہی نہیں گھٹنے کا بات بڑھتی ہی چلی جاتی ہے

یہ رنگ ہو تو پھر کیسے کوئی آس بندھے۔ سر سید کے منہ سے جو ڈھائی بول نکل گئے تھے وہ پتھر کی لکیر بن گئے اور اب تک کسی کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ ہندوستان کا راج پاٹ چھوڑ چھاڑ کے انگریز چلے بھی جائیں تو کیا ابھی یہ بھاری بوجھ دیس اٹھا سکے گا؟ اس بوجھ کے اٹھانے کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجا چاہیئے۔ سچی بات تو یہ ہے راج پاٹ سنبھالنے کی سکت ابھی نہ ادھر ہے نہ اُدھر۔ دیسیوں میں جب یہ سکت آئے گی تو رکت ہی پلٹ جائے گی۔ پر یہ اچانک نہیں آتی۔ ہولے ہولے اور دھیرے دھیرے آیا کرتی ہے اور یہاں ابھی اس کی پروا کہاں۔ جی سے نئی نئی باتیں بٹ کے اس ڈھنگ سے کہی جا رہی ہیں جیسے یہ سب کی سب سچی ہیں۔ پر جانچنے بیٹھیے تو یہاں سے وہاں تک سب جھوٹ ہی جھوٹ اور ایک آدھ بھی سچی نہیں۔

جیسے یہ پولٹیکل کانفرنس سنٹرل پراونس" میں ایک بڑے بھاری بھرکم دیسی کی اسپیچ کا یہ ٹکڑا۔

"ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کے معاملات ازمنہ وسطیٰ کے قریب قریب ہیں۔ سیاسی رجعت اور پستی میں اس کا مقابلہ ہندوستان کی چھوٹی سی چھوٹی ریاست سے کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شخص اس ریاست میں جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کئی صدیوں پہلے کی ایک بالکل جداگانہ دنیا میں چلا گیا۔ وہاں کے حالات کا جدید حالات اور معیار کے لحاظ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اپنی شخصی راحت پر صرف کرتے ہیں اور عامۃ الناس کے افادی امور پر کچھ صرف نہیں کرتے"

یہ بول ڈنکے کی چوٹ دیس کے اس پربی اور ایکا ایکا پکارنے والے کے منہ سے نکلے جس کی سوجھ بوجھ کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا ہے اور جسے ٹہاتما جی پیار سے بے مکٹ کا راجا کہہ چکے ہیں۔ ایسے بھاری بھرکم سے ایسی بے سُری سرگم سُن کر اچنبا دانتوں میں انگلی دباتا ہے۔ پنڈت جی نے بے سوچے سمجھے جو چاہا وہ کہہ دیا اور انہیں یہ دھیان نہ آیا اسے سُن کر لوگ کیا کہیں گے۔ بات ایسی تو کہی جاتے جسے کوئی نہ جھٹلا سکے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں جو منہ میں آیا وہ کہہ ڈالا اور اس کی پوچھ کچھ پر ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے جی کی کھوٹ لاکھ لاکھ چھپانے پر بھی نہیں چھپتی۔ ہٹ دھرمی اور دھاندلی کی دھول اکٹھی ہو ہو کر آنکھوں کے آگے پہاڑ بن جاتی ہے اور سامنے اس اوٹ کے آ جانے سے پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دھول اڑانے سے چاند پر کبھی دھول نہیں پڑ سکتی۔ سورج کو نہ دیکھ سکنے سے یہ نہیں ہو سکتا جو سورج سورج نہ رہے اور اس کا پھیلا ہوا اجالا بھیانک اندھیرا بن کے رہ جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو سمجھنا چاہیئے یہاں کا راج پاٹ پرماتما کی سی دیا ہے۔ وہ کسی کو اونچا نیچا، چھوٹا بڑا نہیں سمجھتا سب کو ایک نکھ سے دیکھتا ہے۔ اس کے سامنے اپنے پرائے سب ایک، دھرم ورم چھوت چھات کا کوئی جھگڑا انٹنٹا نہیں۔ اس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں کسی ایک کے لئے نہیں، سب کیلئے ایسی ہی ہے جیسے لڑکوں بالوں کے لئے ماں کی گود۔ اس کی دیا کے اُمنڈتے ہوئے بادل برستے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے وہ گھُورا ہے اور یہ پھلواری۔ دونوں پر ایک ہی ڈھنگ سے برسے اور برس رہے ہیں۔ راجا راج پر جا سکھی یہ کہاوت یہیں ٹھیک اُترتی ہے۔ کانگریس نے اپنی ڈھائی برس کی لگائی بجھائی اور توڑ جوڑ سے یہاں جو پاکھنڈ پھیلانا چاہا تھا اُسے چھوڑ کر دیکھئے تو یہاں کبھی کوئی ایسی بے تکی بات آپ کو دکھائی نہیں دے سکتی۔ سب کے سب آپس میں مل جل کے رہتے سہتے چلے آئے اور "آصف جاہی" راج ان پہ دھن برساتا رہا۔

ہندوؤں کو بہت سے گاؤں گراؤں دے دلاکے بڑا "جاگیردار" بنادیا اور اُنہیں بڑی بڑی جگہیں دیں۔ چندولال آنجہانی سامنے نہیں نہ سہی مہاراجا کشن پرشاد بہادر تو ہیں اُن سے اور ان کی کٹر کے اور اُونچے گھرانے والوں ہندوؤں سے راج کی دیا کی لمبی چوڑی کہانی سُنئے اور سوچئے۔ ہے کیا اور بتایا کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں چھوٹی بڑی اسٹیٹوں کی گنتی چھے سو کے لگ بھگ پائیے گا اور یہاں سمستان اور "جاگیریں" ملاکر سب پانسو ہوتی ہیں۔ ان کے آگے بڑھانے اور انہیں راج رچانے کا دھیان "آصف جاہی" راج پاٹ کے سامنے سے کبھی نہ ہٹا اور ہندوؤں کو سکھ دینے اور دُکھ سے بچانے کے لئے یہ راج لگاتار جتن کرتا رہا۔ اس نے تو یہ کیا۔ پر آج اس کی برسوں کی انمول باتوں کو جھوٹے پروپگنڈے سے سمجھ کے پیٹھ پیچھے چھپادینا چاہتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اتنی جگہ کہاں جو بڑے بڑے ہندوؤں، سمستانوں، جاگیروں کی باتیں پھیلا کے لکھی جاسکیں۔ ایک چھوٹی سی لسٹ جو ۴۰ نمبروں سے آگے نہیں لکھی جاتی ہے۔ سوجھ بوجھ والے اسی کو سامنے رکھکر بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں اور کھوج لگا سکتے ہیں یہاں کے راج نے ہندوؤں کو کہاں سے کہاں پہونچایا اور اُن کے ساتھ کیا کیا۔ اس لسٹ کی جو کھنڈی دیکھنے کی ہے۔ بڑے بڑے گاؤں گراؤں والے جنہیں "جاگیردار" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک کے پاس کتنے گاؤں ہیں اور برس کے برس ان گاؤوں سے انہیں کیا ملتا ہے اس کی ہندی کی چندی نیچے لکھی ہوئی لسٹ کے دیکھنے سے سامنے آجائے گی۔

نام جاگیردار	مواضع	آمدنی	نام جاگیردار	موضع	آمدنی
(۱) راجہ شیوراج بہادر	۲۲۲	۷۱۳۶۰۰	(۲۱) سمستان راجا پیٹھ	۹	۵۹۳۶۱
(۲) سمستان ونپرتی	۱۷۹	۵۳۴۰۰۰	(۲۲) بلپ اگھووینڈر راؤ	۵	۲۸۰۰۰
(۳) مہاراجا سرکیپن السلطنۃ	۱۹۸	۵۱۲۴۱۶	(۲۳) راجیا ولد راما	۲۲	۲۷۵۷۴
(۴) سمستان گدوال	۱۳۰	۵۱۲۴۷۷	(۲۴) راجا درگا پرشاد	۷	۲۶۶۲۴
(۵) سمستان امرچنتا	۶۹	۳۳۰۰۰۰	(۲۵) ونکٹ لچھما ریڈی	۹	۲۶۰۰۰
(۶) راجا رائے رایاں بہادر	۱۲۰	۲۸۲۹۶۴	(۲۶) راجا دھرم پال	۶	۲۳۰۰۰
(۷) سمستان جٹپول	۸۶	۴۴۵۲۰۶	(۲۷) نیل کنٹھ راؤ	۱۹	۲۱۸۱۵
(۸) دوم کنڈا	۱۶	۱۴۱۴۱۹	(۲۸) بنکٹ رام	۴	۲۲۲۵۴
(۹) سمستان گوپال پیٹھ	۳۶	۱۲۴۷۷۳	(۲۹) بندرا بائی زہرتیا	۱۳	۱۹۲۴۷
(۱۰) راجا راؤ رنبھا	۴۳	۷۵۰۷۶	(۳۰) اما پرشاد	۱	۷۰۰۰
(۱۱) سمستان پاپنا پیٹھ	۷	۵۴۰۰۰	(۳۱) پدماوتی بائی	۶	۱۷۱۶۵
(۱۲) امر شیور راؤ	۳۴	۴۴۳۳۵	(۳۲) ترمبک لیشونت راؤ	۸	۱۶۲۷۱
(۱۳) راجا کشٹا نانک	۵	۳۹۰۸۲	(۳۳) رنگ راؤ	۸	۱۶۱۷۹
(۱۴) رانی اما بائی	۵۴	۳۹۰۲۵	(۳۴) ناگا ریڈی ویسائی	۱	۱۵۰۰۰
(۱۵) راجا بھگوانداس	۹	۳۸۰۲۷	(۳۵) گردوارہ سکھاں	۴	۱۷۷۲۰
(۱۶) رانی کرشنا بائی	۳۰	۳۷۸۳۵	(۳۶) سیتا راجیندر راؤ	۱	۱۶۶۴۲
(۱۷) ونکٹ راجو بائی	۲	۳۶۰۰۰	(۳۷) رائے ہری لال	۳	۳۱۸۱۳
(۱۸) راجا ونایک راؤ	۱۳	۴۷۲۶۳	(۳۸) راجا بھونت سرینواس راؤ	۶	۱۵۰۴۸
(۱۹) راجا موہن لال	۱۳	۴۲۸۱۳	(۳۹) پرمانند داس	۱	۱۴۰۰۰
(۲۰) راجا نیم چند	۹	۴۳۵۶۳	(۴۰) مانک راؤ بالکشن	۳	۱۲۰۰۰

ے یہ مضمون مئی میں لکھا گیا تھا۔ "شاہد"

نام جاگیردار	مواضع	آمدنی	نام جاگیردار	مواضع	آمدنی
(۴۱) شیو رام سرجا	۵	۱۲۳۱۳	(۴۳) سیو شنکر راؤ	۹	۱۲۲۴۴
(۴۲) کرشنا بائی	۱	۱۲۲۴۴	(۴۴) رام راؤ نیمونت بہادر	۳	۲۱۵۴۵ ؁

(نظام گزٹ ، ۸ مئی سنہ ۴۷ء)

یہ لسٹ پوری نہیں ادھوری ہے۔ پر دیکھنے والوں کو اسی سے اتنا پتا تو مل سکتا ہے۔ یہ راج ہٹ دھرم نہیں اور تیہ امیراء اپنا پرایا کا جال بچھانا اسے اچھا نہیں لگتا اور اس کی دیا اپنی پوری پرجا (رعایا) پر ایسی ہے جس کا کوئی اور چھور ہی نہیں۔ لاکھوں، کروڑوں کی وہ اسکیمیں جو ابھی باہر نہیں نکلیں انہیں گنانا اور بتانا نہیں چاہتا۔ انہی کو دیکھ لیجے جو کب کی پوری ہو چکیں اور جن کے پورا ہونے میں یہ راج کروڑوں اُٹھا چکا۔ جیسے ہائیکورٹ، عثمانیہ ہسپتال، آرٹ کالج اور ان کی سی اور دوسری آکاس سے باتیں کرنے والی بلڈنگیں۔ اُبلتے اور اُمنڈتے ہوتے نظام ساگر، عثمان ساگر، حمایت ساگر جیسے سمندر۔ "نگرسدھار" کچہری کا جگہ جگہ گھٹے ہوئے گھروں کی لائنوں کی لائنیں توڑ تاڑ کے سُکھ چین سے رہنے کے کیلئے جھڑے پچھے، کھلے کھلے ان گنت گھروں کا بنانا، گاؤں گاؤں پکی سڑکیں، ہسپتال، پڑھائی گھر، کیا یہ سب کروڑوں کی نچھاور ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے راج نے اپنے سکھ چین کے لئے کی اور اپنی پرجا کا کچھ دھیان نہ کر کے انہیں بھوکا مرنے اور ایڑیاں رگڑنے کے لئے چھوڑ دیا؟ یہ باتیں کہہ کے کسی اَن پڑھ سے ان پڑھ سے بھی پوچھئے تو وہ چھوٹتے ہی کہہ دیگا۔ راج نے یہ جو کچھ کیا وہ اپنے لئے نہیں سب پرجا کی بھلائی اور انہی کے سُکھ چین کے لئے۔

جب یہاں کا راج پاٹ اپنی پرجا کے سُکھ چین ہی پر سب کچھ لٹاتا ہے اور اپنے اوپر کچھ نہیں اُٹھاتا تو پرماتما کیلئے کہئے پنڈت جی کن باتوں سے تول رہے ہیں اور یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان کا کن کے راج پاٹ والے کیلئے یہ کہنا۔

"وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اپنی شخصی راحت پر صرف کرتے ہیں اور عامۃ النّاس کے افادی اُمور پر کچھ صرف نہیں کرتے"

نری دھاندلی اور نری ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے۔ اِسے کون مانے گا اور اس کھلم کھلا جھوٹ کو کون سچ جانے گا۔ ہم پنڈت نہرو کی سوجھ بوجھ کو مانتے اور اب تک انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ سب جانتے ہیں۔ پر یہ تو نہیں ہو سکتا، پنڈت جی جو اُٹکل پچو بات کہیں اُسے بھی مان لیں اور ہونٹ سیئے چُپ چاپ بیٹھے رہیں۔ وہ دن کو رات سمجھتے ہیں سمجھیں۔ جن کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں وہ تو دن کو دن ہی کہیں گے۔ پنڈت جی کے کہنے سے دن کبھی رات نہیں بن سکتا۔ ان کا ایکا ایکی یوں برس پڑنا بتاتا ہے سجانے یہ کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ ادھر بیدر میں ہندو مسلمانوں میں جھڑپ ہوتی اور اُدھر یہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اِنہیں سوچنا چاہیئے تھا الگ الگ جتھے والے جہاں کہیں بھی ہونگے اُن کے آپس میں مار دھاڑ اور گتھم گتھا کبھی کبھی نہ کبھی ہو کر رہے گی۔ کوئی ایسی جگہ نہیں بتائی جا سکتی جو اس آگ سے بچی ہوئی ہو۔ بیدر میں کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں ہوئی وہی ہوا جو سنسار میں جگہ جگہ ایسے لوگوں کے اکٹھا ہو جانے پر ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کا الاہنا راج کو دینا بڑی بھاری چوک ہے۔ کیا راج نے آپ یہ آگ بھڑکا کیا راج کی ہوں پر یہ سب کچھ ہوا۔ کیا راج سب دیکھ دکھا کے کانوں میں تیل ڈالے بیٹھا رہا؟ کیا راج نے اس جھگڑے کو چھپا ڈالا؟ کیا راج نے دونوں جتھوں میں کسی ایک کی پرچک لیکر دوسرے کو روند کر ادھ موا بنا دیا۔ پنڈت جی کہیں تو ان باتوں میں سے کونسی بات انہوں نے دیکھی جو وہ راج پر چھدا دھرنے کے لئے تلملا رہے ہیں۔ انہیں جاننا چاہیئے یہاں کی گورنمنٹ نے یہ جھگڑا اُٹھتے ہی وہی کیا جیسے اور بڑے بڑے راج ایسی گھڑی پر کیا کرتے ہیں۔ جھگڑالوؤں کی پکڑ دھکڑ ہوئی، انہیں جیل میں ڈالدیا گیا اور اس جھگڑے کی پوری چھان بین کچہریوں میں ہونے لگی۔ چھان بین ہو چکنے پر جو جس نے کیا ہے وہ بھگتے گا۔ اس سے بڑھ کر راج اور کیا کرتا۔ پنڈت جی بتلائیں تو اُن کا اونٹنا، بگڑنا، بھنا جھنک پٹک کرنا کس لئے ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں؟ سچ پوچھئے تو بیدر میں جو بھی کچھ ہوا یہ سب کانگریس ہی کا بِس بویا ہوا ہے۔ یہاں نہ یہ ستیاگرا کی ہولی کھیلتی اور نہ یہ آگ بھڑکے دبے سلگتی۔ اس سے پہلے بھی تو یہی بیدر تھا جہاں کبھی کیل کا کھٹکا تک نہیں ہوا۔

پنڈت جی کے اِس لکھنے پر ایک پکے کانگریسی نے "حیدرآباد میں قرون وسطیٰ" کے ہیڈنگ سے جو کچھ لکھا اُس کے کئی ٹکڑے دیکھنے کے ہیں:-

"ہماری نظر میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت محض ایک کانگریسی لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک وسیع النظر انسان کی

حیثیت سے بھی قابل احترام ہے۔ لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جہاں تک حیدرآباد کے متعلق موصوف کے احساسات کا تعلق ہے وہ بہت مبالغہ آمیز ہیں اور ان سے نہ صرف ایک افسوس ناک ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ موصوف کے الفاظ کا عدم توازن ہمارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کرتا ہے کہ حیدرآباد کے متعلق ہندوستان کے لیڈروں کا یہ غلط مسلک کہیں ان دونوں کے درمیان موجودہ بیگانگی میں اور زیادہ اضافہ کردے۔

کوئی ترقی پسند حکومت جو اعتراضات کو سننا پسند نہ کرتی ہو، ترقی پسند نہیں سمجھی جا سکتی۔ حیدرآباد کی حکومت بھی اگر ہندوستان کے قوم پرست لیڈروں کی معقول تنقید کو گوارا نہ کرے تو وہ ترقی پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن تنقید اور تعریض میں بڑا فرق ہے اور ہم افسوس کے ساتھ اپنے اس احساس کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی جذباتی تنقید جو حقائق سے کوئی تعلق نہ رکھے سوائے تعریض کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ پنڈت جی حیدرآباد کو "قرونِ وسطیٰ" سے قریب تر تصور فرماتے ہیں۔ لیکن اگر یہ رائے فرقہ واری بے امتیازی بنا پر قائم کی گئی ہے تو پھر ہم موصوف سے یہ سوال کریں گے کہ وہ اُن کانگریسی صوبوں کی حکومتوں کو قرونِ وسطیٰ سے کتنا قریب سمجھتے ہیں جہاں وحشیانہ فرقہ پرستی کے مظاہرے جاری رہے اور کبھی نہ روکے جا سکے! "پیام" نے کانگریس اور کانگریسی حکومت کے ترقی پسند رجحانات کی توصیف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور آج بھی ہم ان شاندار قومی خدمات کے معترف ہیں جو کانگریس نے انجام دی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم کانگریس کی کوتاہیوں، غلطیوں اور خرابیوں پر پردہ ڈال دیں۔ اسی طرح ہم کسی قومی لیڈر سے خواہ وہ کانگریسی ہو یا غیر کانگریسی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ حیدرآباد کی ہر بات کی تعریف کرے اور کسی بات پر اعتراض نہ کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارا بالکل جائز مطالبہ یہ ہے کہ تنقید، تعریض کا پہلو اختیار نہ کرے اور حیدرآباد کی ترقیوں کو نظرانداز کر کے بیک جنبشِ قلم اس کا رشتہ قرونِ وسطیٰ کی جہالت سے ملا دیا جائے۔ ترقی پسند سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کی گفتگو کا یہ عدم توازن خود ان تحریکوں کو نقصان پہونچا دیتا ہے جن کے وہ نمائندہ ہوتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ سے کسی ایسے ملک کو کیا نسبت ہو سکتی ہے جس کی حکومت منظم حالت میں موجود ہو۔ جس کے باب حکومت کے ارکان جدید تعلیم و تمدن کے بہترین نمونے ہوں اور جہاں ایک مجلس وضع قوانین موجود ہو، ہائی کورٹ موجود ہو، عاملہ اور عدالت کے اقتدارات جدا گانہ ہوں، بجٹ کا توازن قائم ہو اور خزانہ عامرہ کا روپیہ قومی زندگی کی ترقی میں صرف کیا جا رہا ہو، جس ملک میں دس بڑے کالج ہوں، ۵۹ ہائی اسکول ہوں، ۱۴۸ مڈل اسکول ہوں، ۴۰۴ پرائمری مدرسے ہوں، ۸۰۰ مخصوص مدارس ہوں، عثمانیہ یونیورسٹی ہو جو قومی زبان میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر چکی ہو، کیا اس ملک کے حالات اتنے خراب فرض کئے جا سکتے ہیں کہ اُن کو قرونِ وسطیٰ کے حالات سے نسبت دی جائے؟ جس ملک میں ۱۴۸ سرکاری شفاخانے ہوں جن کا روزانہ مرجوعہ ۲۲ ہزار ہو، جس کے صدر شفاخانے میں ۷۰۰ مریضوں کے رہنے کی جگہ ہو، جس کا اسٹاف بلحاظ فنی اسناد کے برطانوی ہندوستان کے شفاخانوں کے اسٹاف سے کسی طرح کم نہ ہو۔ کیا وہ ملک "قرونِ وسطیٰ" کی وحشیانہ زندگی سے کوئی مماثلت رکھ سکتا ہے؟ جس ملک میں بارہ سو میل لمبی ریلوے ہو، تین سو سرکاری بسیں روزانہ چار ہزار میل کا سفر طے کر رہی ہوں، جہاں ملک کا سکہ جدید ترین اُصولوں کے مطابق رائج ہو، جہاں ڈاک اور ٹیلیفون کا جدید ترین سلسلہ قائم ہو، جہاں لاسلکی کی نشرگاہیں موجود ہوں، تعمیرات عامہ، آب رسانی، آب پاشی کے وسیع انتظامات کئے جا چکے ہوں۔ کیا ایسا ملک تصورات کی تمامتر وسعت میں کسی حیثیت سے بھی "قرونِ وسطیٰ" کی یاد تازہ کر سکتا ہے؟ ہم حیران ہیں کہ کس طرح پنڈت جی یا دوسرے تجدد پرست ایک ایسے ملک کا دامن قرونِ وسطیٰ کی تاریخ سے باندھ سکتے ہیں۔ جس کے بجٹ میں ایک کروڑ ۹ لاکھ روپیہ تعلیم پر، ۳۳ لاکھ صحت عامہ پر، ۲۴ لاکھ زراعت اور صنعت و حرفت پر اور ۳۳ لاکھ آب رسانی پر صرف کیا جا رہا ہو۔ جو حکومت سالانہ ۲½ کروڑ روپیہ صرف تعمیری شعبوں پر صرف کر رہی ہو، اس کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی پست حالت سے منسوب کرنا ایک افسوسناک ناواقفیت ہے۔ پنجاب کے علاوہ اس وقت برطانوی ہند کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جو تعمیری

شعبوں پر حیدر آباد سے زیادہ صرف کر رہا ہو۔ لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ باوجود اس کے دنیا کو بتایا جا رہا ہے کہ ممالکِ محروسہ جدید تمدن کے دورِ جاہلیت کا ایک تاریک اور پست خطہ ہے جو ترقی، آزادی اور حقوقِ انسانیت سے گویا بالکل بیگانہ ہے!!"

پنڈت جی نے سنی سنائی باتوں پر بھروسا کر کے بیدر میں آگ لگنے سے جو گھاٹا اور ٹوٹا ہوا اسے پچاس لاکھ سے بھی آگے بتایا۔ اس کیلئے "پیام" کی لکھت کا یہ ٹکڑا بھی دیکھئے:—

"واقعے کی تفصیلات پر ہم کوئی بحث نہیں کر سکتے، اس لئے کہ مقدمہ اب عدالت کے روبرو پیش ہے۔ لیکن عدالت سے غیر متعلق امور کی نشاندہی بے محل نہ ہوگی۔ مثلاً پنڈت جی نے نقصان کا اندازہ پچاس لاکھ سے زیادہ بتایا ہے۔ حالانکہ معتبر شہادتوں کی بنا پر یہ امر یقینی ہو چکا ہے کہ آتش زدہ مال کی مالیت زیادہ سے زیادہ ۷ لاکھ تھی۔ البتہ بعض مرہٹی اخباروں نے اس نقصان کو ۲۰ لاکھ بتایا ہے اور پنجاب کے بعض فرقہ پرست جرائد تو بلا تکلف ایک کروڑ تک پہونچ گئے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس امر سے واقف ہوتے کہ بیدر کتنا چھوٹا سا شہر ہے اور اس کی شہری حیثیت کیا ہے اور اگر موصوف کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ بیدر میں پچھلے سات برس کے عرصے میں فرقہ وارانہ مفسدہ کس طرح جگایا جاتا رہا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ موصوف کے بیان کے الفاظ اس قدر اونچے نہ ہوتے جس قدر کہ ہیں۔

اسی بیان میں یہ گمان بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ حکومت حیدر آباد نے خبروں کی اشاعت کو روکا۔ اس واقعے کے شاہد مقامی جرائد کے صفحات ہیں کہ فسادِ بیدر کی بہت کافی تفصیلات جلد سے جلد ان جرائد میں شائع ہوئیں۔ بلکہ ہماری رائے میں اگر ان تفصیلات کی اشاعت کو حکومت نے روک دیا ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اس لئے کہ ایسی خبروں کی اشاعت سے فائدہ تو کچھ نہیں البتہ فرقہ وارانہ جذبات کے مشتعل ہونے کا امکان قوی تر ہو جاتا ہے۔ مقدمہ عدالت کے سامنے آ جانے کے بعد یہ شکایت کہ حکومت نے تفصیلات کو فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کا ذریعہ نہ بننے دیا بے نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے جو لیڈر ان تاریک تفصیلات کو معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ عدالت کی روداد سے اپنی یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ خود اپنے صوبے میں جہاں کانگریسی حکومت برسرِ اقتدار ہے کیا پنڈت جی نے کبھی یہ شکایت کی کہ صوبے کی حکومت کانپور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات کی فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں پر کیوں سنسر عائد کرتی ہے؟ اگر خود پنڈت جی کسی حکومت کے صدرِ اعلیٰ ہوتے تو کیا کرتے؟ موصوف نے بیدر کے غیر مصدقہ واقعات کو اپنے بیان کی بنیاد قرار دے کر سوال کیا ہے کہ کیا "اس ریاست میں عوام کا ہجوم حکومت کی جگہ لیا کرتا ہے؟" کیا یہی سوال موصوف نے کانپور کے دو درجن اور لکھنؤ کے متعدد بلووں کے متعلق پنڈت گوبند بلبھ پنت سے بھی کیا تھا؟ کیا فرقہ پرستی کی پھیلی ہوئی فضا میں کوئی حکومت بھی اس امر پر قادر ہو تو وہ اس بات پر بھی قادر ہو سکتی ہے کہ اپنے علاقے میں کبھی کوئی فرقہ وارانہ بلوہ ہونے ہی نہ دے۔ لیکن برطانوی حکومت کے زمانے میں بھی ______________ اور پنجاب و بنگال کی "اتحادی" حکومت کے زمانے میں بھی یہ معراج کسی حکومت کو نصیب نہ ہو سکی کہ وہ اپنی قوت سے اس فتنے کا سر ہمیشہ کے لئے کچل سکتی۔ پھر جب حقیقتِ حال یہ ہے تو صرف حیدر آباد ہی کی حکومت ہدفِ ملامت کیوں؟

یہ واقعہ بھی کوئی راز نہیں ہے کہ بیدر کے ہندو اور مسلمان حکومت سرکارِ عالی سے اس مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں اور آئندہ ایسے ہنگامی واقعات کے انسدادی تدابیر پر غور کیا جا رہا ہے، پھر کیوں شمالی ہندوستان اور صوبہ بمبئی اور صوبۂ متوسط کے جرائد اس قدر بے چین ہیں کہ اخباری بیانات اور مضامین کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے؟ کیا یہ مضامین اور بیانات اس مفسدے کا علاج ہو سکتے ہیں جو ہماری زندگیوں پر چھایا ہوا ہے اور کیا حیدر آباد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات اس طرح بہتر بنائے جا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے فرقہ پرست اپنے اپنے فرقے کو مختلف ترکیبوں سے حکومت حیدر آباد کے خلاف مشتعل کرتے ہیں؟ ان فرقہ پرست لیڈروں سے تو تخاطب ہی فضول ہے جو ہمارے نقطۂ نظر کو

سمجھنا نہیں چاہتے۔ لیکن جن لیڈروں کی قوم پرستی اور وطن پرستی اور جذبۂ قربانی اور گذشتہ خدمات پر ہم بھروسا کر سکتے ہیں، اُن سے صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حیدرآباد کے مخصوص حالات کا مطالعہ کئے بغیر بیانات کے شائع کرنے میں عجلت روا نہ رکھیں۔ بلکہ حیدرآباد کی اجتماعی زندگی اور اُس کی مشکلات کو غیر جنبہ دارانہ طریقے پر سمجھنے کی کوشش کریں۔"

(پیام ۷ مئی سنہ ۱۹۴۰ء)

یہ اُن لوگوں کی سوجھ بوجھ کی رام کہانی ہے جو راج لینے کے لئے اُٹھے ہیں اور اسے مُنہ کا نوالا سمجھ کے نگل جانا چاہتے ہیں۔ دیس کا یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھئے کب تک رہے۔

ابھی لکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ پر جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے۔ یہاں اب سکت کہاں، میں تھک گیا۔ آپ کتا چکے، اس لئے اب اور لکھنا لکھانا کیسا۔ اسی کو سمجھ لیجے لکھت پوری ہو گئی۔ جیسی رتے یہ لکھی گئی وہ تو کچھ بھی نہ ہوا، اس آڑ میں یہی ہوا بُری بھلی جیسی بھی سہی ایک نئے ڈھنگ کی لکھت اردو لائبریری میں بڑھی۔

سیّد ابوالقاسم سُرورؔ

ساقی کے دسؔ سال کا انتخاب

ریزۂ مینا

جس میں پچاس افسانہ نگار حضرات کے بہترین افسانے شامل ہیں

اِن پچاسں بیمثل افسانوں کا انتخاب شاہد احمد اڈیٹر ساقی نے کیا ہے۔

ضخامت چھ سو صفحات۔ کتابت وطباعت اعلیٰ درجے کی۔ جلد مضبوط کپڑے کی اور سنہری ٹھپّہ والی ہے۔

مندرجہ ذیل افسانے اِس جلد میں شامل ہیں۔

(۱) عجب تماشا تیست	خاں بہادر میر ناصر علی دھلوی
(۲) فقیر کا تکیہ	میر باقر علی دھلوی (داستانگو)
(۳) یوسفی اور صادقہ	علّامہ راشد الخیری دھلوی
(۴) دربار اکبری کی ایک جھلک	شمس العلما مولوی عبد الرحمٰن۔
(۵) جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا	خواجہ حسن نظامی دھلوی
(۶) لال قلعہ کی ایک جھلک	خواجہ ناصر نذیر فراق دھلوی
(۷) دربار شاہانِ اودھ	خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی
(۸) پورن چندر کی کہانی	مولانا عنایت اللہ دھلوی
(۹) برات	منشی پریم چند
(۱۰) خزانچی کی بیٹی	مولانا اسلم جیراجپوری
(۱۱) سیرِ گل فروشاں	افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی
(۱۲) شکست کی آواز	پروفیسر مرزا محمد سعید دھلوی
(۱۳) جذبۂ کور	سلطان حیدر جوشؔ
(۱۴) میری بیوی	مرزا فرحت اللہ بیگ دھلوی
(۱۵) عقد مکرر	لطیف الدین احمد اکبرآبادی
(۱۶) نخلِ بے ثمر	ایم۔ اسلم۔
(۱۷) ممولے کا خطبۂ صدارت	ڈاکٹر سید عابد حسین
(۱۸) دُکھیاری ماں	خواجہ غلام السیدین
(۱۹) عید کا بناؤ	آغا حیدر حسن دھلوی
(۲۰) خرافات	سید امتیاز علی تاج

ساقی بک ڈپو دہلی کی دلکش کتابیں

سلامبو۔ دو ہزار سال پہلے قرطاجنہ کی تہذیب و معاشرت کے پس منظر پر حسن و عشق کی خونیں داستان ضخامت ۵۰۰ صفحات؛ قیمت

نجم السحر۔ پانچ ہزار سال پہلے مصر کی شان و شوکت اور ایک ملک کی دلربا داستانِ عشق۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے؛ ۔ ۔

تائیس۔ سرزمینِ مصر کی عروسِ بازاری، نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حسن میلا ہوتا تھا، اُس کی عبرتناک داستان؛ ۔ ۔

ہیرودیاس۔ سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اس نے پیغمبر یوحنّا کا سر انعام میں مانگا اور اُس کے مُردہ لبوں کو چوما۔ ۔

چنگیز خاں کے سوانحِ حیات۔ خدا کا غضب چنگیز خاں کی صورت میں نازل ہوا۔ اس قہر اللہ کے حالاتِ زندگی؛ ۔ ۔

سحر بنگال۔ طاہرہ دیوی شیرازی کی دلکش نثر اور اچھوتے پلاٹ کے افسانوں کا مجموعہ۔ مجلّد؛ ۔ ۔

نرگس جمال۔ موریس متر لنک کی ایک رنگین تمثیل جس میں حسن و عشق پر بحث کی گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد۔ مجلّد؛ ۔ ۔

فاؤسٹ۔ شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی۔ اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرائے میں پیش کی گئی ہے؛ ۔ ۔

سرگذشتِ عروس۔ دلہن کا روزنامچہ جس میں اس نے اپنے دل کے تمام زخم کھولکر پڑھنے والے کو دکھا دیے ہیں؛ ۔ ۔

پروین و ثریا۔ بلجیم کے مفکرِ اعظم موریس ماترلنک کی دلدوز تمثیل، جس میں محبت کا نازک موضوع پیش کیا گیا ہے۔ مجلّد؛ ۔ ۔

چندرا موہنی۔ انصار ناصری کا لکھا ہوا غمناک ناول۔ جسے پڑھکر آپ اپنے آنسو نہ ضبط کر سکیں گے؛ ۔ ۔

تیجمنغیری۔ ماں کی مامتا اس ڈرامے میں جس کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہے کسی اور ڈرامے میں پیش نہیں کی گئی؛ ۔ ۔

سلومی۔ شہرۂ آفاق آسکر وائلڈ کی تمثیل "سلومی" کا سب سے عمدہ ترجمہ۔ از سید انصار ناصری؛ مجلّد؛ ۔ ۔

تعلیم زدہ بیوی۔ فضل حق قریشی کا لکھا ہوا ڈرامہ جس کو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ عبرتناک بھی ہے؛ ۔ ۔

لال قلعہ کی ایک جھلک۔ سید ناصر نذیر فراق نے مغلیہ دربار اور محلات کے دلکش واقعات بیان کئے ہیں؛ ۔ ۔

دلی کا آخری دیدار۔ غدر سے پہلے کی دلی کی منہ بولتی تصویر آپ کو اس کتاب میں نظر آئیگی۔ یہ کہانی ایک شہزادی کی زبانی ہے؛ ۔

اخوان الشیاطین۔ سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ ایسے افسانے اُردو میں بالکل نہیں لکھے گئے۔ عجیب و غریب فسانے؛ ۔ ۔

عروسِ ادب۔ دل میں کھب جانے والے افسانوں کا تین سو صفحے کا مجموعہ زبان نہایت سادہ اور صاف؛ ۔ ۔

خانم۔ دیورانی جیٹھانی کی نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلّد سُنہری ٹھپّہ؛ ۔ ۔

کولتار۔ تھی تو بیچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھدیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات پیش آئے ہیں کہ ۔۔۔۔

ویمپائر۔ زانی مرد خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس عصمت مآب خاتون پر جھپٹتا ہے، اُس کی زندگی برباد کرتا ہے، مگر ۔۔۔۔

شریر بیوی۔ اس قدر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اس شریر بیوی نے؛ ۔ ۔

کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت، سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اُس کی زندگی خراب کی؛ ۔ ۔

جھکی۔ عورت کی فطرت، جان جاتے پر آن نہ جاتے۔ غیرت و شرافت کی منہ بولتی تصویر "جھکی" میں دیکھئے؛ ۔ ۔

روحِ ظرافت۔ "انگوٹھی کی مصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا؛ ۔

روحِ لطافت۔ "ہماری کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک فسانہ آپ نے آجتک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش؛ ۔ ۔

سر کے بل۔ ایک بے انتہا ہنسانے والی کہانی۔ مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی جدید ترین تصنیف؛ ۔ ۔

دیکھا جائیگا۔ ایک لڑکی پر تین مرد دے عاشق ہوگئے تو "دیکھا جائیگا صاحب" کچھ فیصلہ نہ کرسکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ۔۔۔۔

ملفوظات نامی۔ مرغے، مُرغیاں اور گھریلو جانور انسانی زبان بولنے لگے۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے ۔ ۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——!

(ایک لپسند رومان بغداد)

ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو - یہ طویل افسانہ ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے - عورت کی شوہر پرستی اور دلداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے - ہوس پرست حسن بن عاشق زر، شوہر محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ مطر بسط پائیں گے۔

بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینہ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے - اکثر نیک نفس بیویاں، انیس جلیس جیسی عفت مآب اور دیوانہ شوہر، بیوی بننا پسند کریں گی -

خلیفہ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ - بغداد کی روزمرہ زندگی خالص الف لیلائی ماحول - عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ - روح کی بیباک تمنائیں - عورت کا تڑپتا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں پُر تکلف ایوان - لق و دق صحرا - رنج، راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو -

احمد جوہری اور انیس جلیس کی پُر سوز اور حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی - بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے - نفیس عبارت - بلیغ طرز بیان - چست و رواں عبارت پڑھنے والے کو حواس پر چھا جاتی ہے - سرورق نہایت خوشنما مجلد قیمت عمر

ایک کہانی پھلادیوں کی زبانی

اُردو میں اس طرز کی آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی گئی کہ چند مشہور انشاپردازوں نے ملکر اسے لکھا ہے یہ دلچسپ کہانی اور بھی زیادہ دلچسپ اس وجہ سے ہو گئی ہے کہ ہر انشاپرداز نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا ہے علامہ نیاز فتحپوری نے قصے کا آغاز کیا ہے اور پروفیسر علی عباس حسینی سجاد حیدر یلدرم لطیف الدین احمد، امتیاز علی تاج اور حکیم احمد شجاع نے کہانی کی مختلف کڑیاں پیش کی ہیں کہانی کا موضوع ہے "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" دو عجیب و غریب نتائج نہایت درجہ دلکش ہیں اور جی چاہتا ہے کہ اس کہانی کو بار بار پڑھا جائے ضخامت ۲۴ صفحات کاغذ عمدہ سرورق رنگین قیمت ۶ر

مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!

اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں ——

—— ایک شاندار مرقع!! سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!!!

نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطہ نظر سے، کانگریس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ، خود اس کی اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے - اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ انداز تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اسوقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں، اور اس کے سیاسی مسلمات اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ - اور دوسری "نیم سیاسی نیم مذہبی" جماعتوں "خلافت"، "جمعیۃ العلماء" احرار وغیرہ کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں!

اس کے علاوہ مارچ ۱۹۴۰ء تک کے سیاسی حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں درج کر دئے گئے ہیں حتیٰ کہ حال ہی کے کیکسٹن ہال (لندن) کے سانحہ (قتل سر مائیکل اوڈوائر سابق گورنر پنجاب اور اس کے رد عمل کے امکانات پر بھی نہایت صفائی سے بحث کی گئی ہے!! غرض مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی - جو مصنف کے سالہا سال کے سیاسی افکار و مطالعہ اور صحافتی تجربہ کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان پر جو اپنے ملک اور اپنی سیاست سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا پڑھنا فرض ہے!

کتاب ایک محدود تعداد میں طبع ہوئی ہے - اس لئے اپنی کاپی حاصل کرنے کے لئے جلد لکھئے - ضخامت ۲۵۶ صفحات، کتابت طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب - مجلد قیمت صرف عہ

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا فسانۂ محبت

اس پڑ اسرار و سحر خیز داستان میں مصنف نے سرزمین حسن کا ایک انوکھا قصۂ عشق سنایا ہے جس میں محبت و نفرت، خشم و انتقام، ظلم و ستم اور جبر و تشدد کبھی آپ کے رونگٹے کھڑے کر دینگے اور کبھی حسن کی سحر کوشیاں، عشق کی کج ادائیاں اور رقابت کی صعوبتیں آپکو انگشت بدنداں کر دینگی۔ بنت شیخ کی تعیش گاہ ما جری ہوئی خلفاء کی الوہیت، ہیلن کی جرأت دمحائی، رانعہ کا ہیمان وفا الاامتہ کا جنون رقابت نابینا یوسف کا لرزہ براندام کر دینے والا انتقام اور حسین و جمیل زہرا کا ـــــ جس کی دہشتناک خونریزی اور بے پناہ قتل و غارت سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے ـــــ ہیلن کے محبوب کی الفت میں گرفتار ہونا، مگر حصول مقصد میں ناکام و مایوس ہو کر اور صحرا کو پاؤں تلے روندتے ہوئے فراموش شدہ محبت و محبوب کو تہ تیغ کر دینے کی کوشش کرنا...... یہ سب چیزیں آپ کو ایک نئی دنیا میں لے جائیں گی۔ اس ناول کو پڑھ کر آپ عرب اور عرب کے جنگجو لوگوں کے جملہ حالات، مثلاً ان کے رسم و رواج، ان کی مہمان نوازی، عادات و خصائل، بہادری اور جرأت، فنون حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب و معاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ اس کی مصنفہ مس جون کو نکوسٹ ہیں، جنہوں نے ایک عرصہ تک عرب میں رہکر اور وہاں کا بہ نظر غائر مطالعہ کر کے اس کو قلم بند کیا تھا اور اب اسے اردو کے مشہور ادیب و مترجم مسٹر صادق الخیری ایم۔ اے دہلوی نے نہایت دلکش اور دلفریب اسلوب میں ہماری زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ کتابت طباعت بہترین سرورق نہایت خوشنما قیمت مجلد ۲ر

اتاترک:۔ لائبریری ایڈیشن

کتب خانہ علم و ادب دہلی کا تاریخی شاہکار

یہ وہ منفرد اور معرکہ آرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک بانی جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کا مشہور رسالہ "اردو" (جولائی ۱۹۳۹ء) اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے "اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دہلوی نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعے کے بعد لکھے ہیں"۔ اور یہ غازی اعظم کی تمام و کمال سوانحعمری ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر کارنامے سے بحث کی ہے اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع کتاب ابتک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی"۔ اور ہندوستان کا مشہور رسالہ "نگار" اسکے متعلق لکھتا ہے۔ یہ کمال اتاترک پر آخری تصنیف ہے جس میں ان کے جانشین عصمت انونو کے حالات زندگی بھی جمع کر دئے گئے ہیں۔ فاضل مولف نے اس میں کمال اتاترک کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر نہایت جامعیت سے روشنی نہ ڈالی ہو ضخیم ۳۰۰ صفحات اتاترک اور ترکی مشاہیر کی (۲۰) بلاک کی تصاویر...... لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت اعلیٰ ٹائیٹل نہایت ہی دلکش اور دیدہ زیب مجلد قیمت صرف ع۸ر

ل۔ احمد

طامس مور لالہ رخ

ایڈیشن جدید مصوّر

۱۹۳۹ء کا ادبی کارنامہ

انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصوّر اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے تین ہزار گنی دے کر لانگ کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھکر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دیگا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کرینگے۔ مقنع زنقاب پوش پیغمبر "آتش پرستان فارس" "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں ترجمہ ملک کے نامور ادیب ل۔ احمد اکبرآبادی نے کیا ہے۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اس کو مصوّر چھاپنے کے لئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک ناپید ولایتی ایڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ بے پناہ ادب و رومان۔ دلنشین تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (ع۸ر) علاوہ محصولڈاک۔

سات تارے

ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور افسانہ نگار صاحبان

ایم اسلم۔ قیسی رامپوری۔ شاہد احمد۔ فضل حق قریشی۔ انصار ناصری۔ اشرف صبوحی۔ ابوطاہر داؤد

کے شاہکار افسانے۔ ہر افسانہ کچھ ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ اچھوتا معلوم ہوتا ہے۔ ہر افسانہ نگار نے اپنی انشا پردازی کا سارا زور صرف کر دیا ہے اس ہفت رنگ مجموعہ میں ادب لطیف کا کمال دیکھئے۔ پلاٹ ایک ہی ہے لیکن ہر افسانہ نگار کی جنبش قلم نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حسن کاری کا ایسا نادر مجموعہ آپ کو غیر زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸ر) علاوہ محصولڈاک۔

ہر کتاب کا محصول ڈاک بذمہ خریدار

افسانوں کے دلچسپ کتابیں

خاموش حسن	عہ ر	ڈاچی	عہ ر	درانتی	عہ ر
پھول اور کلیاں	عہ ر	طلسم خیال	عہ ر	خوابِ خیال (مجنوں)	عہ ر
پنگھاسیاں	۱۲ر	طلسم حیات	عہ ر	انشائے لطیف	عہ ر
خواب و خیال	عہ ر	عورتوں کے افسانے	عہ ر	چاند کا گناہ	عہ ر
نقری ...	عہ ر	دنیا کی حور	عہ ر	سیاہ کار	عہ ر
...دات	عہ ر	غدر دہلی کے افسانے کامل	عہ ر	سحر فرانس	عہ ر
... اور راہ	عہ ر	صحرانوارد کے خطوط	عہ ر	سوز ناتمام	عہ ر
سولہ سنگار	عہ ر	اندھی دنیا	عہ ر	شفرستان	عہ ر
کیلے کا چھلکا	عہ ر	ریزۂ مینا	ے ر	معیار محبت	عہ ر
غریب کی آہ	۱۲ر	دانہ و دام	عہ ر	منزل	۱۲ر
غنچہ افسانہ	۸ر	باسی پھول	عہ ر	انوکھی مصیبت	۱۲ر
بانسری کی آواز	۸ر	نجات رنگیں	عہ ر	پھول اور کانٹے	۶ر
شب کی پکار	۸ر	کارزار حیات	عہ ر	دنیا کے بچے افسانے	عہ ر
الہامی افسانے	عہ ر	تفسیر حیات	عہ ر	لندن کی ایک رات	عہ ر
شرارے	عہ ر	آشوب زمانہ	عہ ر	دنیائے تبسم	عہ ر
سات تارے	عہ ر	گناہ کی راتیں	عہ ر	کامیاب افسانے	عہ ر
عروس ادب	عہ ر	رقاصہ	عہ ر	انگریزی افسانے	عہ ر
نظر کے دھوکے	عہ ر	محبت اور نفرت	عہ ر	قدیم افسانے	عہ ر
غنچۂ تبسم	عہ ر	اخوان و شیاطین	عہ ر	چینی افسانے	۹ر
سوج تبسم	عہ ر	چار چاند	۸ر	دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ	۴ر
سیلاب تبسم	عہ ر	سحر بنگال	عہ ر	سات طلاق تو کی کہانیاں	۴ر
سیب کا درخت	۱۲ر	چغتائی کے افسانے کامل	ے ر	تماشہ پہ تماشہ	۴ر
لیلےٰ کے خطوط	عہ ر	روح ظرافت	عہ ر	گمنام عورت کا خط	۴ر
مجنوں کی ڈائری	عہ ر	روح لطافت	عہ ر	خواب پریشان	۴ر
تین پیسے کی چھوکری	عہ ر	خطوط کی ستم ظریفی	۸ر	عشق کی گولیاں	۴ر
لاشوں کا شہر	عہ ر	آتشی پارے	عہ ر	انکشاف حقیقت	۴ر
نیلوفر	عہ ر	روسی افسانے	عہ ر	صدائی	عہ ر
ساز فطرت	عہ ر	پریم کا جادو	عہ ر	دردناک افسانے	عہ ر
صدا کے جرس	عہ ر	کیمیا گر	عہ ر	دلگداز افسانے	عہ ر
حاجی لق لق کے افسانے	۱۲ر	نیرنگ	عہ ر	مجنوں کے افسانے	۱۲ر
طلسمات	عہ ر	شہید وفا	عہ ر	کیفستان	عہ ر
عورت	عہ ر	دودھ کی قیمت	عہ ر	ایک کہانی	۶ر

نئی کتابیں

نام کتاب	مصنف یا مترجم	قیمت
خنداں	رشید احمد صدیقی	عہ ر
خوددار خاتون	محمد مرزا دہلوی	۸ر
نظارے	کرشن چندر	عہ ر
انقلاب فرانس	باری علیگ	۶ر
جدید جغرافیہ پنجاب	سند باد جہازی	عہ ر
کیلے کا چھلکا	,,	عہ ر
پریم کا جادو	سراج الدین احمد	عہ ر
گل نو	ایم اسلم	عہ ر
رقاصہ	,,	عہ ر
جوہر اقبال	جوہر اقبال نمبر	عہ ر
اقبال (اردو اقبال نمبر)	مرتبہ انجمن ترقی اردو	عہ ر
مضامین محمد علی حصہ دوم	مرور بی اے	عہ ر
ٹیپو سلطان	امجد علی اشہری	عہ ر

سیاسی کتابیں

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی عہ ر	کیمونسٹ مینو فسٹو (عبداللہ بیگ) ۶ر
تاریخ مسلم لیگ عہ ر	تعمیر نو (عبداللہ انور بیگ) عہ ر
میری جدوجہد (ہٹلر کی آپ بیتی) عہ ر	ہمارے زمانہ کی غلامی ۶ر
مسولینی .... عہ ر	غلامی کا انسداد ۱۰ر
کمپنی کی حکومت (باری علیگ) عہ ر	ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں ۴ر
اتاترک (محمد مرزا) عہ ر	تاریخ کانگرس عہ ر
عہد حاضر کے بڑے لوگ کامل مجلد عہ ر	غدر ۱۸۵۷ء عہ ر
حصہ اول ہندوستان (محمد مرزا) ۸ر	سیاسیات ہند عہ ر
,, دوم چین و ایران (,,) ۸ر	مزدوروں کا پیغمبر ۴ر
,, سوم عراق و عرب (,,) ۸ر	رلجا و پرجا (ٹالسٹائی) ۱۲ر
,, چہارم مصر و مراکش (,,) ۸ر	میری کہانی (جواہر لال نہرو) للعہ
چیمبرلین ۱۲ر	سوویٹ روس (,,) عہ ر
روزولٹ ۱۲ر	تلاش حق (گاندھی جی) ے ر
اسٹالن .... عہ ر	لیگ آف نیشنز (ایم ایچ سیمی) ۱۲ر
لینن (ڈاکٹر اشرف) عہ ر	یورپ کی حکومتیں (نجم الدین جعفری) عہ ر
کارل مارکس (باری علیگ) ۶ر	گاندھی جیون (ظفر نیازی) عہ ر
سوشلزم (چھبیل داس) ۸ر	تقاریر ظفر علی خاں ۹ر

پتہ: مکتبہ خانہ علم و ادب ... دہلی

لرزہ خیز افسانے

انسان کی شقی القلبی و سفاکی کی حیرت ناک داستانیں پڑھکر آپ ششدر رہ جائینگے۔ انسان پر جب حیوانیت چھا جاتی ہے تو درندوں سے زیادہ بے رحم اور شیطان سے زیادہ سیاہ کار ہو جاتا ہے۔ ملک کے مشہور ادیب نصرت ایم اسلم نے خوفناک جرائم کو افسانوں کے پیرایہ میں لکھ کر اردو افسانہ نگاری میں ہیبتناک افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔

رقاصہ

اور دوسرے خوفناک افسانے

جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک کر لینگے۔ بعض مقامات ایسے بھیانک ہیں کہ آپکے رونگٹے کھڑے ہو جائینگے۔ مثلاً رقاصہ جب اپنے گھر پہونچی تو اس کا آدھا منہ ہمیشہ کے لئے نیلا ہو چکا تھا۔ کیوں؟ یہ آپکو پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا۔ یا "شادی کی رات" میں جنگ بہادر نے سوما کو اس کے عاشق اور ہونے والے شوہر کا خون پچھاڑ کر پلایا اور جب اس نے منہ بند کر لیا تو اس کے ہونٹ کاٹ کر خون پلایا۔ اور شمشیر سنگھ کو سوما کا خون پیالہ بھر کے پیش کیا۔ اُس نے پینے سے انکار کیا تو اس کے بھی ہونٹ کاٹ ڈالے اور چھری کا دستہ مار کے ۱۲ اگلے دانت توڑ کر خون بھرا پیالہ حلق میں اُلٹ دیا۔ زندہ آدمی کا گوشت کاٹ کاٹ کر کُتے کو کھلایا۔ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لئے چونے کے بھٹے میں زندہ آدمی کو ڈالکر اوپر سے پانی ڈالدیا گیا۔ نارِ جہنم سے بھی زیادہ شدید تھی یہ آگ! اور —— خوفناک اذیتوں کی ایک طویل فہرست ہے جو یہاں پیش نہیں کی جا سکتی۔ جب آپ اِن سات دہشتناک افسانوں کو پڑھیں گے تو انسانی سرشت کی خباثت دیکھکر انگشت بدنداں رہ جائینگے۔

"رقاصہ" چھپ گئی ہے۔ نہایت خوشنما ہفت رنگ سرورق۔ مجلد۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ ر) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی

پتہ: کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی